ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ہندی ناول
اردھ ناریشور
وشنو پربھاکر

اَردھ نارلیشور

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی مہاتما بدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں۔ اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلمبند کر رہا ہے۔

یہ شاید ہندوستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگ ارجن کونڈ دوسری صدی عیسوی)

(بشکریہ نیشنل میوزیم۔ نئی دلی)

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ہندی ناول

اردھ ناریشور

Ardhanarishwar : Urdu translation by Khursheed Alam of Akademi's award-winning Hindi novel by Vishnu Prabhakar, Sahitya Akademi, New Delhi (1998), Rs. 200.

پہلا ایڈیشن : ۱۹۹۸ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون۔ ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز آفس :

سواتی، مندر مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بھون، ۲۳ اے/۴۴ ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالے مارگ، دادر، ممبئی ۴۰۰۰۱۴

اے ڈی اے رنگ مندر، ۱۰۹، جے۔ سی۔ روڈ، بنگلور ۵۶۰۰۰۲

گنا بلڈنگ، ۳۰۴-۳۰۵، انا سلائی، تینام پیٹھ، چنئی ۶۰۰۰۱۸

ISBN 81-260-0312-X

قیمت : ۲۰۰ روپے

طباعت : سپر پرنٹرس، دہلی

حصّہ ایک

انفرادی سوچ

سمیتا

گھنٹی پر ہاتھ رکھنے سے قبل میں کئی پل کھڑی سوچتی رہی۔ کتنے بوجھل تھے وہ ٹھٹھرے لمحے کہ میں پسینہ پسینہ ہوگئی۔ ... تو کیا لوٹ جاؤں یہاں سے اور فون پر کوئی بہانہ بنا دوں؟ وہ جانتی تھی یہ سب فضول ہوگا کیونکہ تب تو اندر امنڈتا دھواں اور گاڑھا ہو جائے گا۔ باطن میں جو اتنی شدّت اختیار کر کے امنڈتا ہے اُس سے سانس گھٹ بھی سکتی ہے کیونکہ نکلنے کا راستہ کہیں چھوڑا ہی نہیں سنسکاروں نے۔

نہیں، میں نہیں لوٹوں گی۔ اپنے کو دُکھ دیتے دیتے اس قدر تھک گئی ہوں کہ نجات چاہتی ہوں اور نجات اپنے آپ کو بے نقاب کرنے میں ہی ہے۔ کیے اور بغیر کیے افعال کی سزا سے کب تک کوئی بھاگتا رہے گا؟ لفظ اندر رہتے ہیں تو ڈستے ہیں، نجات پا جاتے ہیں تو زندگی کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ جو نہیں دیکھا اس سے ہم دہشت زدہ کیوں رہتے ہیں؟ جو بھوگا ہے اُسے چھپاتے کیوں ہیں؟...

نہ جانے کتنی کتنی بار ایسے ہی جوجھی ہوں اور ٹوٹی ہوں، کتنی کتنی بار اپنے آپ سے بحث کی ہے، گناہ و ثواب کی تعریف لے کر، کتنی کتنی بار، لیکن ایک بات مَیں کبھی نہیں کر پائی ـــــ خود کو بے نقاب نہیں کر پائی...

آج میں وہی کرنے کا پکّا ارادہ کر کے یہاں آئی ہوں۔ اپنے کو کھول دینا چاہتی ہوں، اُتار پھینکنا چاہتی ہوں، سنسکاروں کے دھوئیں کی چادر۔ لیکن باطن میں امنڈتا ہر پل مجھے پریشان اور ہراساں کیوں کر جاتا ہے؟ کیوں بھرے رہتے ہیں ہر روز اخبار عصمت دری

کے شرمناک حادثات سے، کیوں دانشور بر پل بحث کرتے ہیں اس لفظ کو لے کر؟ ملک کی پارلیمنٹ میں بھی گونجتا رہتا ہے یہ لفظ بار بار لیکن کہیں کچھ ہوتا کیوں نہیں؟ لفظ، لفظ اور لفظ عمل کے بغیر لفظ اپنا وجود منوا پایا ہے کیا؟

شاید ایسا تو نہیں کہ ان شرمناک حادثوں کی خبریں پڑھ کر ہمیں درد کی جگہ ایک سحر انگیز احساس ہوتا ہے۔ کاش ہم نہ ہوئے کے طرز پر... اس لیے اور بھی کہ ثبوت کے نہ ہونے کی وجہ سے ملزم صاف چھوٹ جاتے ہیں...

اور وہ کیا عورت نہیں تھی جس نے کہا تھا "میرے ساتھ کئی بار بلات کار ہوا ہے۔ اس میں بُرا کیا ہے، مزا ہی آتا ہے۔"

لیکن اپنا نام بتانے کی ہمت اس میں بھی نہیں تھی۔

یہی تو مسئلہ ہے۔ اسی سے تو نجات چاہتی ہوں میں۔ اور تب اچانک نجات کی اسی خواہش نے مجھے مجبور کر دیا کہ گھنٹی کو زور سے دبا دوں۔ گھنٹی پر حملہ ہوا نہیں کہ ادھر فضا کرینگ کرینگ کے مسلسل اُٹھتے ہوئے شور سے گونج اٹھا۔

کچھ لمحوں بعد دروازہ کھول کر ایک قبول صورت خاتون سامنے آگئیں۔ چہرے پر کھینچی استقبالیہ لکیریں۔ آنکھوں میں اعتماد، مانگ میں چمکتی سندور کی لکیر، سفید ہوتے سیجے سنورے لمبے بال، چوڑے پاڑ کی ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی نہایت نرم اور رسیلی آواز میں بولیں، "آپ ہمیتا جی ہیں نا؟ آپ کی ہی راہ دیکھ رہی تھی میں۔ گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ صرف آپ اور میں..."

اور مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔ میں طنز کو سمجھ گئی۔ لیکن مسکرائی نہیں، کہیں کچھ کسک اٹھتی جانے انجانے میں۔ کیا کہہ گئی یہ۔ پھر بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھ کر نرم آواز میں بولی، "کن الفاظ میں میں آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھ سے ملنا پسند کیا۔"

"آپ کسی رسالے کے ساتھ وابستہ ہیں شاید؟"

"بتایا تھا نہ کہ میں دہلی اسکول آف سوشل ورکس میں کام کرتی ہوں لیکن لکھنے کا شوق ہے۔ کہانیاں لکھتی ہوں۔ کبھی کبھی خواتین کے مسائل کو لے کر مضمون بھی لکھ لیتی ہوں، 'ناری من' کے لیے

آج کل...."

"جانتی ہوں آج کل ماحول میں دو ہی لفظ گونجتے ہیں، بلات کار اور شادی شدہ عورتوں پر ظلم... بیٹھو۔"

ابھی تک ہم دونوں چل رہے تھے۔ اب سامنے ڈرائنگ روم تھا۔ میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ سلیقے لیکن سادگی سے ایک شلیف میں کتابیں لگی تھیں۔ دوسرے میں دو تین آرٹ کے نمونے۔ پورے کمرے میں دیوار پر ہمالیہ کے شولنگ شکھر کی ایک خوبصورت تصویر فطرت کا شاہکار۔ ایک طرف دیوان، دوسری طرف صوفہ۔ درمیان میں کانچ کا ایک دائرہ کار میز اوپر نیچے رسائل۔

"پڑھنے کا شوق ہے آپ کو؟" اچانک مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

"جی ہاں، ہم چاروں ہی پڑھتے ہیں۔"

"چاروں؟" سوالیہ نگاہوں سے میں نے دیکھا۔

"ہم دو، ہمارے دو۔" وہ اچانک ہنس پڑیں۔ میں بھی کھل گئی۔ کمرہ بھر اٹھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں کبھی کتنا خوش کر جاتی ہیں۔ انھوں نے بتایا، "بیٹی شادی کر کے کینیڈا میں ہے اور بیٹا کالج میں پڑھاتا ہے۔ ابھی شادی کی ہے، بہو ریزرو بینک میں ہے۔ دونوں ہنی مون پر ہیں۔"

میں بات کا سرا اپنے ہاتھ میں لے پاتی کہ وہ پھر بول اُٹھیں، "چائے ابھی لینا پسند کریں گی یا بعد میں؟"

"بعد میں۔" میں کہنا تو نہیں چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں کہہ گئی۔ کبھی ہم خود سے اتنے انجان ہوتے ہیں کہ لگتا ہے ہمارے اندر ہمارا اپنا ہیں، نہ ہو کر کبھی اور کا، ہم، آبیٹھا ہے۔

انھیں میری بات اچھی لگی۔ دروازہ بند کر کے میرے پاس ہی بیٹھ گئیں، بولیں: "ہاں، بعد میں ہی پینا اچھا ہوگا۔ اب میں آپ کے سامنے ہوں، لیکن ایک بات کہہ دوں صاف صاف۔ تبھی کچھ بتا سکوں گی جب مجھے یقین دلا دو گی کہ کہیں بھی میرا یا میرے پتی کا نام ظاہر نہیں کرو گی۔ ناری ہو تم بھی...."

ایک بار تو میں کانپ اُٹھی، بار بار سات پردوں کو پھاڑ کر وہی بات سامنے کیوں اجاگر ہو جاتی ہے؟ کیوں بے نقاب نہیں کر پاتے ہم اپنے آپ کو، کیوں... کیوں... کیوں...؟

جیسے بھونچال آگیا ہو، لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو سنبھال لیا میں نے۔ بولی۔ "یقین کر سکتی ہیں تو سچ مانیے کہ کسی اخبار یا رسالے میں آپ سے لیے گئے انٹرویو کو شائع نہیں کروں گی۔"

"تب ؟" اپنی سوالیہ اور چبھتی نگاہیں انھوں نے میری طرف گھمادیں۔

"سب کچھ بتاؤں گی، پر پہلے آپ سے سُن لوں۔۔۔ آپ کی بیٹی جتنی عمر ہے میری لیکن جرأت اتنی کر بیٹھی کہ آپ کے زخم کریدنے چلی آئی کیوں کہ میں نے یہ جرأت۔ اس کے پیچھے صرف حقیقت جاننے کا تجسس ہی نہیں ہے۔ کچھ اتنا گہرا ہے، کچھ اتنا ذاتی ہے کہ آپ کے ساتھ ایک گہرے اپنے پن سے جڑ گئی ہوں۔۔۔"

ان کی میرے روئیں روئیں کو چیر جانے والی تیز نگاہ ابھی بھی میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔۔۔ پر اب وہاں ایک پہچانا پہچانا درد تیر گیا تھا۔ درد کا درد سے ایک ان کہا رشتہ ہوتا ہے۔ اُس درد کو انھوں نے پہچان لیا۔ اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ نہ جانے کس خلا میں نگاہیں گڑائے رہیں کئی پل، پھر وہیں سے بولنے لگیں۔ وہ لفظ نہیں تھے۔ ایک ایسی آواز تھی جو الفاظ میں منتقل ہو کر بھی اپنے کل میں موجود تھی۔ ایک ایسی یادداشت جو چیر چیر دیتی ہے اور ہر چیرا ہو اپل ایسا نکیلا ہو اٹھتا ہے کہ وجود تک لہولہان ہو جائے۔ پتہ نہیں وہ کیا بول رہی تھیں، پتہ نہیں میں کیا سن رہی تھی۔ اتنا ہی یاد ہے۔ انھوں نے کہا تھا: "نئی نئی شادی ہوئی تھی ہماری خوابوں کے سنہرے سنسار میں تم جی رہے تھے۔ وہ اور میں، میں اور وہ۔ اس مہانگر میں ان کا دفتر تھا۔ گھر میں ایک نوکر تھا، ان کا پرانا نوکر۔ جی جان سے کام کرتا۔ میرے آگے پیچھے گھومتا رہتا۔ ایک دن وہ ہنس کر بولے، تمھیں اپنا بنانے کو کیسی چاپلوسی کرتا ہے بیوقوف۔ جانتا ہے اب تو تم ہی مالکن ہو میری بھی، اس کی بھی۔

"وہت، میں پیار سے ہنس دی تھی۔ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ زہر میٹھا بھی ہو سکتا ہے۔

"اور اس طرح دن بیت رہے تھے۔ اُس دن وہ ہمیشہ کی طرح مجھے پیار سے تھپ تھپا کر دفتر گئے۔ میں آرام سے غسل خانے میں گھسی۔ دیر تک کھیلتی رہی پانی سے اور اپنے تن سے۔ پیار کی شراب سب کچھ کو نشیلا بنا دیتی ہے۔ بہت دیر بعد گنگناتی ہوئی باہر بیڈ روم میں آئی کہ

سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھی۔ میرے سامنے میرے بیڈ روم میں ہمارا نوکر کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ ایک دم میں نے ساڑی لپیٹتے ہوئے اس سے کہا۔ 'یہاں کیا کر رہے ہو تم؟ جاؤ رسوئی میں جاؤ۔۔۔

"پہلے اس کے کہ میں اپنا جملہ پورا کر پاتی اُس نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ ساڑی سمیٹنے کے عمل میں میرے دونوں ہاتھ گھرے تھے۔ میں تیزی سے فرش پر گر پڑی۔ میرا سر پلنگ کی پٹی سے ٹکرا یا۔ دوسرے ہی پل ہاتھ میں چھری لیے وہ میری چھاتی پر تھا۔ اس کا وہ وحشتناک چہرہ، آنکھوں سے ٹپکتی وحشت، میری آنکھوں میں دھواں بھر گیا، جما ہوا کڑوا دھواں۔۔۔ میری چیخیں اسی دھوئیں میں جم گئیں۔۔۔"

ان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ آنکھیں نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھیں، جیسے وہاں کوئی نہیں تھا۔ بس درندگی کی دہشت ناک گونج تھی جسے ہم دونوں یکساں طور پر جی رہے تھے۔ کیا المیہ تھا۔ کئی پل بعد وہ پھر بولیں۔ کیسا درد تھا ان کی آواز میں۔" اتنا ہی یاد ہے کہ ہاتھ میں گہرا زخم کھا کر بھی میں اپنے کو نہ بچا سکا۔ اب بھی ٹھیک ٹھیک یاد نہیں، وہ کیسے ہوا؟ میں تو گرتے ہی حواس کھو چکی تھی۔ جو کچھ جدوجہد میں نے کی ہوگی وہ اچانک ہی کی ہوگی۔"

وہ پھر خاموش ہو گئیں۔ وہ دھواں جیسے ان کے وجود میں بھر گیا۔ میں عدالت میں بحث کرنے والی وکیل تو تھی نہیں کہ پریشان کرنے والے سوال پوچھتی، 'آپ نے جان بوجھ کر جدوجہد نہیں کی تو آپ کی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی سطح پر رضامندی رہی ہوگی!' میں صرف عورت تھی اور کم و بیش اسی عمل سے گزر چکی تھی۔ کئی لمحے بعد اتنا ہی پوچھا۔ "آپ کی چیخ سن کر پڑوس میں ہلچل نہیں ہوئی؟"

"بڑے شہروں میں پڑوس کی اتنی فکر کیسے ہوتی ہے؟ اور ہم تو نئے نئے تھے پھر بھی ایک بہن نے میری چیخ سنی، لیکن جب تک وہ کچھ کرنے کا حوصلہ کر پاتیں درندہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اُن کے پتی کے آنے سے اتنا ہی ہوا کہ میری جان بچ گئی۔ کیا مطلب تھا اس بچنے یا نہ بچ پانے کا؟"

"ایسا کہیں گی اب بھی؟" میں پھر بے چین ہو کر بول اُٹھی۔

انھوں نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔ جلدی سے کچھ کہنا چاہا، لیکن اتنی ہی تیزی سے چُپ بھی ہوگئیں۔ میں دیکھ رہی تھی کتنی مشقت کرنی پڑی تھی اس خاموشی کے لیے۔ وہی سوال تو مجھے کرید رہا تھا۔ وہی سوال مجھے ان تک کھینچ لایا تھا۔ پھر بھی میں نے دھیرے سے کہا،

"معاف کر دیجیے۔ آپ کو تکلیف پہنچائی میں نے۔"

اپنے آپ کو وہ سنبھال چکی تھیں۔ چہرے پر پہلے کی سی لطافت لوٹ آئی۔ بولیں، دھیرے دھیرے، "نہیں بیٹی، تم نے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی مجھے۔ تکلیف تو ہم اپنے کو خود دیتے ہیں۔ خود سے یہی سوال پوچھ پوچھ کر۔ کیوں پوچھتی ہیں ہم یہ سوال؟ کیوں ہمیں فکر رہتی ہے کہ کوئی ہمیں حقارت کی نگاہ سے تو نہیں دیکھ رہا؟ میں اپنی بات کہتی ہوں۔ پڑوسن کے پتی نے فوراً میرے پتی کو فون کیا۔ جب تک وہ پہنچے مجھے ہوش آچکا تھا۔ میں سسک رہی تھی۔ میں نے انھیں دیکھا تو میرا باندھ ٹوٹ گیا۔ پتہ نہیں، بھروسہ پانے کی امید میں یا کھونے کے ڈر سے۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولے۔ بہت دیر تک اپنے سے سٹا کر سہلاتے رہے۔ میں نے ہمت کر کے حسرت ناک اور پریشان نگاہوں سے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ٹٹول کر ان کا ہاتھ پکڑا کہ ہونٹوں تک لے آؤں کہ پھر باندھ ٹوٹ گیا۔ میں پھر سسکنے لگی۔ وہ میرے اوپر جھک گئے۔ اپنے ہونٹ میرے جلتے ہونٹوں پر رکھ دیئے، یہ کہتے ہوئے، 'بیٹی! تم ذرا بھی پریشان مت ہو۔ تمھاری کوئی خطا نہیں ہے۔ میں اس درندے کو۔۔۔'

"اس بار میں واقعی ان کی بانہوں میں بے ہوش ہو چکی تھی۔ بھروسے کی تسلی بھی کم تکلیف نہیں دیتی، بیٹا! اس بھروسے کی وجہ سے ہی میں وہ ہوں جو تم دیکھ رہی ہو۔ نہیں تو کیا ہوتا۔۔۔"

"میں جانتی ہوں کہ کیا ہوتا۔ آپ خوش قسمت ہیں نہیں تو۔۔۔"

وہ بولیں، "میں تو ان کا حوصلہ دیکھ کر حیران ہوتی جا رہی تھی۔ آج سوچتی ہوں، انھیں وہی کرنا چاہیے تھا جو انھوں نے کیا۔ پولس آئی۔ اس درندے کو گرفتار کیا اس نے۔۔۔"

میں نے اچانک پوچھا، "تب تو آپ کو عدالت میں جانا پڑا ہوگا اور۔۔۔"

"نہیں۔" انھوں نے کہا، "وہ سب نہیں سہنا پڑا مجھے۔ پولس نے رشوت لے کر اسے چھوڑ دیا۔ میرے پتی سے تھانیدار نے کہا، کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے۔ وہ قصوروار ہے یہ

ثابت کرنے کے لیے آپ کی پتنی کو جس عذاب سے گزرنا پڑے گا اُسے برداشت کر سکیں گی وہ...؟"

"تو بات یہاں آکر ختم ہو گئی۔ یہی ہو سکتا تھا۔

"سوچتی ہوں، یہ نہ ہوتا تو کیا میں وکیل کی جرح کو سہہ پائی؟ میرے پتی نے میرے اس عذاب کا تصور کیا اور خاموش ہو گئے۔ مجھے یاد ہے وہ بہت تڑپے تھے لیکن جیسا ہمارا سماج ہے، ہمارے سنسکار ہیں، اس میں اور ہو بھی کیا سکتا تھا؛ انھوں نے کئی دن بعد کہا تھا، کیسا ہے ہمارا قانون اور اخلاق! انسانیت کے خلاف اتنا بڑا وحشیانہ ظلم صرف جھوٹی شرم کی وجہ سے سزا پائے بغیر رہ گیا۔ کون توڑ سکتا ہے اخلاق کے اس انسانیت کش جال کو...؟"

"آپ کے پتی کیا بعد میں اس حادثے کا ذکر کرتے رہے؟"

"نہیں کبھی نہیں۔ انھوں نے مجھے اسی رات یقین دلایا تھا، 'یمی، تم بے قصور ہو، پاک ہو۔ تم میرے لیے وہی ہو جو پہلے تھیں اور ہمیشہ وہی رہو گی' میں جانتی ہوں وہ مختلف ہیں، آج کے مردانہ سماج میں۔ لیکن انھوں نے آج تک اپنے اس یقین کو کبھی نہیں جھٹلایا؟"

"اور آپ نے؟"

سوال سُن کر میری طرف دیکھتی رہ گئیں وہ۔ جیسے اُسی سے بچنا چاہ رہی ہوں، لیکن جیسے پاؤں کے نیچے سے ریت کھسک جاتی ہے ویسے بچنے کا لمحہ کھسک گیا تھا۔ میری آنکھوں میں جھانکتی وہ بولیں، "سچ سمیتا! اس سب کے باوجود میں وہ نہیں رہی تھی جو غسل خانے سے نکلتے وقت تھی۔ سماج کی حکمت عملی، اخلاقیات، مقدس کتابوں میں گناہ و ثواب کی تفسیر، نر ناری کے تعلقات، سب نے مل کر میرے باطن میں یہ بات پیوست کر دی ہے کہ کچھ حادثات ایسے ہوتے ہیں جو نہیں ہونا چاہیے جو کچھ واقع ہوا ہے وہ پاپ ہے۔ ایسا پاپ جس کا پرائشچت نہیں ہو سکتا۔ مجھے مجرم اس درندے نے نہیں بنایا بلکہ میرے سماج نے بنایا۔ اندر سے میں جسے قبول نہیں کر سکی تھی، وہی مجھ پر تھوپ دیا گیا۔ جس کے لیے جرم کیا تھا، سزا بھی اُسی کو ملی۔ زخمی، ذلیل... میں کسی کے رحم کی حقدار بھی نہیں رہ گئی..."

وہ رُکیں جیسے کہیں درد کسک اٹھا تھا اور وہ کسک چہرہ کو مکدر کر گئی تھی۔ مجروح آواز میں بولیں، "کتنا بڑا اسنسار ہے میرے اندر درد سے سنا۔ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتی۔ کسی کی ہمدردی

کبھی نہیں چاہ سکتی۔ اسی لیے گھر اور پتی کا پیار اور عزت پاکر بھی مجھے آج بھی لگتا ہے کہ جیسے ہر کوئی مجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ اس شرمندگی سے کانپ کانپ اُٹھتی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ کوئی مجھے قصوروار سمجھتا ہے بلکہ اس لیے کہ میں خود اپنے کو اس خطا سے نکال کیوں نہیں پا رہی ، سماج کو جھٹک کیوں نہیں دیتی ؟"

وہ اب بھی کہیں کھوئی کھوئی سی بول رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ہیں ہی نہیں۔ یہ تو بس میں خود اپنے آپ سے سوال کرتی ہوئی کہ میں اپنے سماج کو اپنے سے جھٹک کیوں نہیں دیتی ؟ پتہ نہیں کب انھوں نے پھر بولنا شروع کیا۔ کب میں سننے لگی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ "من کی پرتیں جب کھلنے ہی لگی ہیں تو کچھ نہ چھپاؤں گی۔ اُن سے بھی نہیں چھپا سکی تھی۔ چاہا بھی نہیں تھا۔ کئی دن انھوں نے مجھ سے کچھ نہیں چاہا۔ مجھے تسلی ہی دیتے رہے۔ میرا اپنا دل تو جیسے مرد کے لیے بے حد نفرت سے اُمنڈ اُمنڈ پڑتا۔ آنکھیں بند ہوتیں تو ان کو بھی اپنے سے پرے ہٹانے کے لیے بے چین ہو اُٹھتی۔ چیخ اُٹھنے کو ہوتی کہ آنکھیں کھل جاتیں اور میں سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھتی۔ وہ پوچھتے، کیا ہوا ہے؟"

"میں بدحواس سی چیخ اُٹھتی، 'تم مرد ہو۔ مجھے مرد سے نفرت ہے'

وہ مجھے اپنے سے اور بھی لپٹا لیتے اور میں ہوش میں آکر اُن کی چھاتی میں مُنہ چھپا کر سسک اٹھتی، 'مجھے معاف کردو۔ معاف کردو مجھے'

. . . .

"بھئی ! ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا، 'کب تک کرتی رہو گی اپنے آپ سے نفرت ؟ کب تک دیتی رہوں گی اپنے آپ کو دکھ ؟'

کیا کروں میں، بتاؤ میں کیا کروں ؟

میرے بارے میں سوچو، سب سمجھ جاؤ گی۔

کیا کہہ دیا انھوں نے ؟ میرے باطن کا آکاش چمک اُٹھا پلک جھپکتے بھر میں۔ وہ بھی مرد تھے۔ نفرت کر سکتے تھے مجھ سے . . .

"لیکن وہ تو کچھ اور ہی کہہ رہے تھے، 'بات بالآخر تم پر ہے، تمھاری اپنی طاقت اور تمھاری اپنی اہلیت پر ہے۔ تم گرو گی، سماج تمھیں روندتا چلا جائے گا۔ تم کھڑا ہونا چاہو گی، میں تمھارے

ساتھ رہوں گا۔ تم میں چلنے کا ارادہ ہوگا تو میری طاقت تمہیں شکتی دے گی۔

"سچ کہتی ہوں اس لمحے بھر اُٹھی تھی میں اور میں نے پاگلوں کی طرح اپنے آغوش میں بھیس ڈالا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ بس ہم دو پاگل تھے، جڑنے کو پاگل، روح کبھی ایک تھی، پھر دو میں بنٹ گئی، اب پھر ایک ہونے کو بے چین ہو جیسے۔ اس پریشاں حال صورت میں نہ جانے کیا کیا کہہ گئی ان سے۔ اتنا ہی یاد رہ گیا ہے میں نے کہا تھا، 'کتنا ڈر رہی تھی میں اب تک، جیسے بے شمار خونخوار جانور مجھے گھیرے ہوئے ہوں، میری بوٹی بوٹی نوچ لینے کے لیے، پر اب، اب میں مکمل شانت ہوں، بے فکر ہوں۔ میں ان خوفناک جانوروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتی ہوں۔ اب مجھے تمہارا ڈر نہیں۔ میں پوری طرح محفوظ ہوں۔ مجھے ایسی پناہ حاصل ہے جو مجھے کبھی نہیں چھوڑے گی'۔"

اس پل ان کا عذاب سے جھلسا چہرہ ایک دم روشن ہو گیا، لیکن تبھی اپنے آپ کو حیران کرتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔ "آپ نے یہ پناہ انھیں سے کیوں پانا چاہی؟ اپنے اندر سے کیوں نہیں تلاش کی؟"

سُن کر وہ حیران سی میری طرف دیکھنے لگیں۔ پل بھر پہلے کی وہ چمک غائب ہو گئی۔ درد سہنے کے عذاب سے پژمردہ چہرہ پھر میرے سامنے اُبھر آیا۔ کئی پل سمٹتی رہیں اپنے آپ کو۔ مدت گزر گئی ان المناک لمحوں میں۔ نارمل ہوئیں تو بولیں، "لاکھوں لاکھوں بار یہی سوال میں نے پوچھا ہے اپنے آپ سے۔ لیکن بٹیا، میں جس پیڑھی کی ہوں اس میں عورت کا آزاد وجود تھا ہی کہاں؟ ہاں کبھی کبھی یہ تصور ذہن میں کوندھ جاتا تھا اور یہ سوچ کر صبر کر لیتے تھے ہم لوگ کہ نہ سہی ہم، ہمارے بعد کی یا اس کے بعد کی نسل کی عورت اس پناہ کو پانے کے لیے باہر نہیں بھٹکے گی۔ پتی پتنی ایک دوسرے کے تکملہ اور معاون ہیں، ایک دوسرے کے دست نگر نہیں۔"

اس بار حیران ہونے کی باری میری تھی۔ تعجب، اس حد تک سوچ سکتی تھی یہ پیڑھی۔ پھر جیسے کسی نے تنبیہ کی ہو — نہ سوچ سکتی تو تم اتنا حیران و پریشان ہو کر کیوں تلاش کرنے نکل پڑیں؟

میں نہ جانے کہاں پہنچ گئی تھی۔ اچانک لوٹی تو وہ کہہ رہی تھیں، "ان کے تعاون سے میری کوشش یہی رہی کہ وہ یاد میرے ذہن سے مٹ جائے، لیکن اس زلزلے سے کوئی کیسے بھاگ سکتا ہے۔ شروع شروع میں تو مجھے ان کی محبت پر بھی شک ہونے لگتا تھا، لیکن جیسا کہ انھوں نے مشورہ دیا، میں نے خود سے ہی لڑنا شروع کر دیا۔ چوٹ کھائی، لڑکھڑائی بھی، لیکن بھیڑ سے الگ ہو کر فرد بننے کی میری

کوشش میں ان کا بھرپور تعاون ملا۔ وہ کہتے، 'کسی شخص میں اہلیت و ہمت ہو گی تبھی تو سماج طاقتور ہو سکے گا۔'

"اس جد و جہد سے ایک اور فائدہ ہوا۔ میں ان سے اور وابستہ ہوتی چلی گئی۔ ان میں کھوئے رہنے کی خواہش پھر جاگ اٹھی۔ جب میں نے جانا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو میں جیسے مطمئن ہو گئی کہ میرے پتی کا پیار پیار ہے، رحم نہیں۔ بیٹا گود میں آیا تو گھر کی مصروفیات میں میرا باطن ایک نئے ناقابل بیان سکھ کے احساس سے بھر اُٹھا۔ ایک برس بعد بیٹی بھی آ گئی۔ تب وقت ہی نہیں ملتا تھا سوچنے کے لیے۔ کبھی کبھی وہ طنز کرتے، 'اب تم ماں ہو، میری پتنی نہیں۔ میری فکر کیوں کرو گی...؟'

"دھت! میں بیٹی کو ان کی گود میں ڈال کر ان کے کندھے دبا دیتی۔ لیکن نہ جانے کب اور کیسے سکھ کے سات پردے چیر کر وہ خوفناک پل میرے ذہن میں کوندھ جاتا اور میں..."

وہ اچانک چُپ ہو گئیں۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا، ان کا سر صوفے پر ٹک گیا ہے اور وہ کہیں بہت دور پہنچ گئی ہیں، وہاں جہاں کوئی کسی کے وجود کی فکر نہیں کرتا۔ میں بھی تو اس پل مہاشونیہ میں پہنچ گئی تھی کیونکہ میرے اندر بھی تو وہی ہنگامہ برپا تھا۔ لیکن میں اس کا احساس نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے انھیں اپنے آپ سے جوجھنے دیا اور آنکھیں موند لیں۔ کوئی تیسرا دیکھتا تو سمجھتا کہ جیسے درد کے مہاساگر میں ڈوبی دو مظلوم روحیں اپنا پنکھ پھڑپھڑانا بھول گئی ہیں...

لیکن جس تیزی سے وہ چپ ہو گئی تھیں اسی شدت سے مجھے حیران کرتی وہ بول اٹھیں، "میں تمھیں ایک بات بتاتی ہوں..."

وہ پھر خاموش ہو گئیں۔ میں نے پوچھا، "آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔"

"ہاں، اچانک ایک دن کیا ہوا، میری بچّی تب سترہ برس کی ہو چکی تھی تب کی بات ہے یہ۔ اس نے مجھ سے پوچھ لیا، 'ماں، تمھیں کبھی اپنی زندگی میں ایسا کچھ سہنا پڑا ہے جو کوئی بھی عورت نہیں سہنا چاہتی؟'

"ایک پل کو لگا جیسے ایک زلزلہ کا جھٹکا ٹکرا کر نکل گیا ہے۔ لیکن دوسرے ہی پل میں سنبھل گئی۔ میں نے اپنے پتی کی طرف دیکھا۔ نگاہیں ملیں۔ اُسی پل ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ان سے کچھ نہیں چھپانا

ہے۔ میرا بیٹا بھی وہیں تھا۔ میرے پتی نے دھیرے دھیرے بڑے محتاط انداز سے سب کچھ بتادیا۔ پوری کہانی سننے تک دونوں بچوں نے نگاہیں نہیں اُٹھائیں۔ میرے پتی خاموش ہو گئے تب بھی کوئی ردِّعمل نہیں ہوا۔ کئی پل لگے خود کو سنبھالنے میں۔ وہ خاموش، ٹھہرے کچھ پل میرے لیے جیسے یگوں کے کرب کو مجسّم کر گئے۔ کیسے زندہ ہو جاتے ہیں وہ لمحے، جو ماضی بن چکے ہیں۔ زندگی کبھی اُسی روپ میں نہیں لوٹتی لیکن وقت ویسے کا ویسا آکھڑا ہوتا ہے سامنے۔ وقت مرتا نہیں، بس گزرتا ہے . . .

"میں نہ جانے کہاں پہنچ گئی تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ میری بیٹی کی نازک لیکن مضبوط باہیں مجھے آغوش میں باندھ کر جیسے اپنے میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ اس نے اپنا چہرہ میرے چہرے سے سٹا دیا۔ ماں کے پیارے بھرپور آواز میں بولی، 'ماں، تمھاری تو اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ تم کبھی اپنے کو قصوروار مت ماننا۔'

"میرا بیٹا ذرا غصّے میں آگیا تھا، بول اُٹھا، 'سب کچھ بدلنا ہوگا، سارے سماج کی ذہنیت، بدلنی ہوگی'

"پتی اور بچوں سے گھری مجھے اس دن اپنے عورت ہونے پر فخر ہوا۔ اس لمحے میں خوشی سے جھوم اُٹھی۔ پتی کی طرف دیکھ کر میں نے آنکھیں پونچھ لیں۔ جو اپنے تھے وہ مجھے حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے، اس اعتماد سے بڑا سکھ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد پھر کسی نے اس حادثے کا ذکر آج تک نہیں کیا۔"

"لیکن اپنے اندر وہ واقعہ آج بھی زندہ ہے۔ بھولنے میں یقین نہیں ہے شاید؟"

"وہ ہمارے یقین کرنے یا نہ کرنے کا محتاج نہیں ہے۔"

"ہاں، ہوتا تو آپ خود کو حقارت سے کیوں کر دیکھتیں؟"

میں جانتی تھی کہ میں انجانے میں بے رحم ہو اُٹھی ہوں، لیکن شاید وہ ہونا ضروری تھا۔ اسی لیے ایک پل کے لیے کہیں دور انھوں نے دیکھا، پھر بولیں، "جانتی ہوں بیٹی، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ وہ ٹھیک بھی ہے . . . سماج کی ویسی ذہنیت کیوں بنی، سنسکار ہے کیا؟ کیا یہی سنسکار ہمیں ہماری نگاہ میں قصوروار نہیں بنا دیتے؟ لیکن جیسا میں نے کہا تھا، میری بیٹی یا کہوں میرے بعد کی نسل انھیں سنسکاروں سے نجات کی بات نہیں کہتی کیا؟"

"لیکن کیا نجات مل سکی؟ میں ہوں اس نسل کی۔"

وہ کہنا چاہتی تھیں کہ خواہش ہے تو نجات کیوں نہ ملے گی، لیکن میری دوسری بات سُن کر ٹھٹھک گئیں۔ بولیں، "تم... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ کچھ اس سے الگ۔ ایسا کچھ جس پر آپ بھی یقین نہیں کرنا چاہیں گی۔"

اچانک فضا میں پھر سے سرد لہر دوڑ گئی ہو۔ جیسے سمندر کی بے کراں لہروں میں ڈوبتی اتراتی ناؤ کنارے سے پھر منجدھار میں بھٹک جائے۔ ان کی خوفناک آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں جیسے پوچھتی ہوں، تم... تم... بھی کیا؟

میں نے فوراً ادھر سے نگاہیں ہٹا لیں۔ میرے اندر خون منجمد کر دینے والی ٹھنڈک مجھے زخمی کر رہی تھی اور میرے من کے آکاش میں بڑی تیزی سے کچھ ستارے ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ مجھے خود کو سنبھالنے کے لیے جی توڑ کوشش کرنی پڑی۔ وقت لینے کے لیے میں نے ایک فضول سا سوال پوچھ لیا: "کیا آپ کے پتی جانتے ہیں کہ میں...؟"

وہ ہنس پڑیں۔ بولیں: "ساری کہانی سن کر بھی کیا تم سوچ سکتی ہو کہ میں اب ان سے چھپ کر کچھ کروں گی؟ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔"

میں یکبارگی کچھ نہ کہہ سکی۔ انھوں نے ایک پل رک کر پوچھا، "تم اپنی بات کر رہی تھی نا؟"

میں نے دھیرے دھیرے کہا، کہیں دور دیکھتے ہوئے، "ہاں اپنی بات کہوں گی میں۔ اسی لیے تو یہ تمہید باندھی تھی۔ اجازت دیں گی تو کل آؤں گی۔"

انھوں نے گھڑی کی طرف دیکھا، "ہاں، چار بج گئے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ میں چائے لاتی ہوں۔ پی کر جانا اور کل ضرور آنا..."

لیکن اس کل میں وہاں نہیں پہنچ سکی۔ اگلے دن فون پر معافی مانگ لی تھی اور پھر کبھی آنے کے لیے وعدہ کر لیا تھا۔ اس اصرار کے پیچھے میری اپنی غرض تھی۔

اُس شام کو گھر پہنچی تو دیکھا کہ اجیت لوٹ آئے ہیں۔ وہ ایک ماہ کے لیے گئے تھے اور تین

ماہ میں لوٹے تھے۔ وہ تب کرسی پر بیٹھے ڈاک دیکھ رہے تھے کہ آہٹ پاکر انھوں نے میری طرف دیکھا۔ ہماری نگاہیں ملیں، ٹھٹھکی، جیسے ایک دوسرے کو تول لینا چاہتے ہوں۔ پھر وہ ایک شکاری کی طرح تیزی سے آگے بڑھے، مجھے باندھ لیا اور تابڑ توڑ چومنے لگے۔ میں نے ہر چند کوشش کی خود کو آزاد کرانے کی، غصّہ بھی کم نہیں کیا، کیا کیا نہ بول گئی، لیکن ہوا یہ کہ کوشش کے بعد میں خود ہی کمزور ہوتی چلی گئی۔

پھر سب کچھ اچھا لگنے لگا۔

کیوں ہو جاتا ہے وہ سب جو ہم نہیں ہونے دینا چاہتے؛ شاید ہم اپنے آپ کو نہیں جانتے یا جاننا ہی نہیں چاہتے۔ چائے پر جب وہ اپنے تجربے سنا رہے تھے تب دھیرے دھیرے میرے اندر بھرے تلخی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا مرحلہ بھی آیا جب میں ان کی بات بالکل نہیں سُن رہی تھی، بلکہ خود سے بحث کر رہی تھی۔ میں نہیں جانتی انھوں نے تب کیا کہا تھا جب میں چیخ پڑی تھی، "سچ بتاؤ اجیت! تم گھر کو اس طرح نظر انداز کیوں کرنے لگے ہو؛ تم ہر بار آنے کا ایک وقت دے کر جاتے ہو اور لوٹتے ہو تو وقت کبھی کا بیت چکا ہوتا ہے۔"

اس رخنہ سے وہ ایک پل کے لیے حیران ہوئے پھر اسی خاموش انداز سے جواب دیا، خاموش انداز سے اس لیے کہ یہ سوال ان کے لیے اچانک نہیں تھا، وہ اس حملے کے لیے پوری طرح سے تیار تھے؛ بولے "سچ کہتا ہوں، میں ایک مہینے کے لیے ہی گیا تھا، لیکن دیکھتا ہوں کہ پروجیکٹ کے لیے وہاں اور سامان مل گیا ہے..."

"سامان یہاں نہیں آسکتا تھا؟"

"آسکتا تھا لیکن..."

"بہانے مت بناؤ۔ تم نفرت کرتے ہو، تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ تم مجھ سے نجات چاہتے ہو۔ تم کہتے کیوں نہیں؟ میں تمھیں نجات دینے کو تیار ہوں لیکن ... لیکن تمھارے اس بیٹے کا کیا کروں...؟"

میں تب غصّے میں تھی جو اندر تھا وہ باہر آنے کے لیے اُبل رہا تھا۔ میں نہ جانے کیا کیا بول گئی۔ تعجب! وہ ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے۔ صرف اتنا کہا" ہم دانشوروں کے ساتھ یہی پریشانی ہے۔ ہر بات کا کوئی غائب معنی تلاش کرنے لگتے ہیں۔ تم کیا جانو کہ میں کوچین میں کس قدر مصروف رہا۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ مصروف نہیں، پریشان رہے۔ اسی پریشانی کو چھپانے کے لیے اس پروجیکٹ کا بہانہ کیا تم نے۔ اتنی دور کہ اچانک پہنچ کر حیران کر دینے کی فرصت بھی نہ رہے۔"

اجیت میرے پاس آ گئے تھے۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بولے۔ "وعدہ کر چکا ہوں۔ یقین نہیں کرتیں مجھ پر؟"

"وعدہ کرنا اور اس کا نباہ کرنے کے درمیان کتنا کچھ لوٹ بکھر جاتا ہے، وہ کیا تم نہیں جانتے؟ وعدہ کرنا ہی بے پروائی کا ثبوت نہیں ہے کیا؟ اور پھر میں نے کب چاہا کوئی وعدہ؟ میں نے تو تمہیں چاہا تھا۔ تم دور ہو گئے تو وعدے کی کیا اہمیت؟"

وہ میرے پاس والی کرسی پر بیٹھ کر میرا ہاتھ سہلانے لگے۔ بالکل سرد تھا وہ لمس۔ کبھی اسی لمس سے سارا رواں رواں کانپ جاتا تھا۔ اس لمس کے اندر بہتا سکھ خود بخود نسوں میں جاری ہو جاتا تھا۔ ہم دونوں کئی پل خاموش بیٹھے رہے۔ جان بوجھ کر اجنبی ہونے پر کیسی کیفیت ہوتی ہے اس کا احساس مجھے...

خود کو بچانے کے لیے اجیت نے پوچھ لیا۔ "انکت کیا روز پتاجی کے ساتھ لوٹتا ہے؟"

"ہاں۔ سوچتی ہوں پتاجی نہ ہوتے تو کیسے سنبھالتی اسے؟ اس عمر میں کیا کیا کہتا ہے وہ۔ اس دن نیند آدھی میں بڑبڑا رہا تھا۔ ایک ہمارے پاپا ہیں، انہیں بخار چڑھا ہے ہمارے پاس بیٹھتے ہی نہیں، ہم سے دور رہتے ہیں، ہماری ممی روتی ہیں..."

دیکھتی ہوں، چٹان پگھلنے لگی تھی۔ آنکھوں پر رومال رکھ کر اجیت وہاں سے اٹھ گئے ہیں۔ اکیلی بیٹھی آکاش میں اڑتی چیلوں کو دیکھتی رہی کہ وہ نیچے جھپٹیں کچھ چھین لینے کو، لیکن وہ تو اور اوپر اوپر چلی گئیں، کھو جانے کے لیے وہاں، جہاں کسی کی پہنچ نہیں۔

ہم اسی میں کیوں کھو جانا چاہتے ہیں جو ہر طرح ہماری پہنچ سے باہر ہے؟

کہ تبھی وہ مانوس شہد جیسی آواز گونجی۔ انکت بھاگتا ہوا میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔ "ممی! دیکھو آج مجھے کتنے 'ویری گڈ' ملے ہیں۔ حساب میں، ہندی میں، انگریزی میں اور سوشل سائنس میں۔ بس ڈرائنگ میں گڈ ملا ہے۔ ایک لائن ترچھی ہو گئی ہے نا!"

وہ ہر کاپی کھول کھول کر میری گود میں رکھ رہا تھا۔ اس کے پاپا آواز سن کر کمرے کی چوکھٹ پر آ کھڑے ہوئے تھے اور دیکھ رہے تھے ایک ٹک...

میں نے پوچھا، "انکت بیٹے! بابا کہاں ہیں؟"

"بازار گئے ہیں جلیبی لانے۔ میں نے کہا تم کھاتے ہو نا!"

اندر ہی اندر کچھ بھیگ گیا۔ سنبھل کر کہا، "انکت بیٹے! تمھارے پاپا بھی تو آ گئے ہیں۔"

اور دوسرے ہی پل انہونی واقع ہو گئی۔

انکت نے اچانک اس طرف دیکھا۔ کئی پل دیکھتا رہا۔ پھر یکایک تڑپ کر اُن کی طرف بھاگا، غصے سے سرخ، "آپ اتنی دیر سے کیوں آئے؟ چلے جاؤ یہاں سے، ہم آپ سے نہیں بولیں گے، ہم آپ کو مار ڈالیں گے۔ آپ کا گلا گھونٹ دیں گے . . ."

اپنے اور پاپا کے درمیان کا راستہ طے کرتے کرتے وہ اسی طرح بولتا رہا۔ پاس پہنچ کر دونوں ہاتھوں سے انھیں پیٹنے لگا۔ پھر اُن کے ہاتھوں کے سہارے اُن کے پیر پر پیر رکھتا ہوا اوپر چڑھا۔ دونوں ہاتھوں سے ان کا گلا پکڑا اور تیزی سے گھونٹنے لگا . . .

میں، انکت، انکت، پکارتی اس کی طرف لپکی کہ وہ گرج پڑے اور لے زور سے چھاتی میں دبا کر اس کا مُنہ چوم لیا، "انکت بیٹے! دیکھو ہم تمھارے لیے کیا لائے ہیں . . ."

اسے بکس کے پاس بٹھا کر انھوں نے سوٹ کیس میں سے ایک کے بعد ایک کئی چیزیں اس کے سامنے بکھیر دیں۔ مختلف قسم کے شنکھ، سیپیاں، اُن سے بنے کھلونے، رنگ بکھر گئے پھول جیسے . . .

وقت پھر ایک لمحے کے لیے تھم گیا۔ اس کے بعد باندھ ٹوٹ کر ایسا بہا کہ بابا کے لوٹ آنے پر ہی انکت اُن کی گود سے اترا، یہ اطلاع دینے کے لیے، "باباجی! پاپا آ گئے ہیں۔ ہمارے لیے شنکھ لائے ہیں اور مالا بھی۔ مالا آپ کے لیے ہے۔"

پتاجی بیٹے کو دیکھ چکے تھے، مسکرا کر بولے، "مالا ہم کیا کریں گے؟ یہ تو لڑکیاں پہنتی ہیں۔ اپنی . . ."

بات کاٹ کر بول اُٹھا، "ارے نہیں۔ اماں کی فوٹو پر لگانی ہے نا!"

اچانک ہم تینوں نے اس لڑکے کو دیکھا اور پھر ہماری نگاہ وہاں سے گھومتی ہوئی اماں جی کے فوٹو پر آ کر ٹھہر گئی۔ پوری تصویر کو ہی نہیں، پورے کمرے کو روشنی سے بھرتی ہوئی وہ معروف اور پاک مسکان جیسے اب اور کھل اُٹھی تھی۔

وقت پھر ٹھہر گیا تھا۔ ہم سب کا گھائل من خاموشی میں ہی پناہ ڈھونڈ سکتا تھا، لیکن انکت کا

معصوم دل تو کھل ہی سکتا تھا۔ اس نے بابا سے کہا، "ٹانگیے باباجی۔"

اور وہ کود کر پلنگ پر چڑھ گیا۔ پھر کود کود کر اپنے ننھے ہاتھوں سے تصویر تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی بیچ اجیت اندر چلے گئے۔ میں بھی اس منظر کا سامنا نہ کر پاتے کی معذوری ظاہر کرتی واپس آ گئی۔ لیکن پتاجی نے انکت کو گود میں لے کر وہ مالا اس طرح تصویر پر ٹانگی جیسے بر بھوی مورتی پر لگاتے ہیں۔ تن من کی عقیدت سے لبریز بولے، "اچھی لگتی ہے؟"

"ہاں باباجی،" انکت نے بڑے بوڑھوں کی طرح گردن ہلاتے ہوئے ان کی تائید کی پھر مجھ سے بولا، "جلیبی لاؤ۔ باباجی کھائیں گے، پاپا کھائیں گے، میں کھاؤں گا..."

"میں نہیں کھاؤں گی؟"

"تم تو ہمیشہ سب کے بعد کھاتی ہو۔"

میں چپ چاپ اندر چلی گئی یہ سوچتی ہوئی کہ انکت نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

رات میں باباجی سے انکت نے کہانی نہیں سنی۔ پاپا کے اردگرد ہی اس کی دنیا محدود ہو کر رہ گئی۔ کتنا کچھ کہنا تھا، کتنا کچھ سننا تھا۔ ان بوجھے سوال، اٹ پٹی دلیلیں، بے جا حادثے، لیکن سب کے پیچھے ایک چاہت، بے لوث خوشی۔ نیچے کے ٹائیگر کی بات ہو یا پڑوس کی پالتو پوشی کی، یا لمبروں میں بے لگام گھومتے نیولے کی یا پھر رشتے کے ہم عمر بھائی بہنوں کی جنھیں وہ جس حوصلے سے جوڑتا ہے اتنی ہی تیزی سے دور بھی کر دیتا ہے۔

جب وہ ان کے کندھے سے چپٹا سو گیا تو آدھی رات بیت چکی تھی۔ پاس ہی لٹایا اور میرا ہاتھ سہلاتے بولے، "بہت تنگ کرتا ہے پتاجی کو؟"

میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر سرد آواز میں کہا، "پتاجی کیا اس سے تنگ ہوں گے۔ گھر سے جوڑے رکھنے کی ایک ہی تو کڑی ہے، نہیں تو ان کا اوپر سے دکھنے والا بیراگی من نہ جانے کہاں لے جاتا۔"

اوپر سے دکھنے والا...

اماں کے جانے کے بعد ان میں کتنا حیران کن حوصلہ آ گیا ہے۔ لیکن میں گواہ ہوں... رات کے

بولتے سناٹے میں بچّوں کی طرح میں نے سسکتے سنا ہے...

اجیت خاموش تھے، لیکن ان کے ہاتھوں کا دباؤ مجھے کتنا پیس رہا تھا۔

میں کہتی رہی بغیر کچھ سوچے، "ایک طرف پتا ہیں اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے کہ کسی کو ان کے دُکھ سے تکلیف نہ ہو، دوسری طرف بیٹا ہے ایک گہرے احساس جرم سے پریشان بار بار بھاگ جانے کو بے چین کہ...!"

اچانک مجھے لگا کہ ان کا لمس برف کے پہاڑوں سا سرد اور بھاری ہو گیا ہے۔ میں نہ اسے ہٹا سکتی ہوں، نہ برداشت کر سکتی ہوں۔ اسی غصے میں میں بولتی رہی "سچ بتاؤ، کیا تمھیں ایسا نہیں لگتا کہ جسے ہم اپنا مان رہے ہیں وہ پچھتاوا ہے؛ چاروں طرف پھیلے ان کہے الفاظ اور ایک ناقابل برداشت تکلیف کے درمیان اُدھار کی مسکان چپکائے کب تک بیٹھی رہ سکوں گی میں اور تم بھی... مجھے بتاؤ اجیت، میں کیا کروں؟ میں کیسے جیوؤں؟ کب تک اوڑھے رہوں خیالی صبر کی جھوٹی چاندنی؟ میں مانتی ہوں، تم میرے احساسات کا بہت خیال رکھتے ہو۔ مجھے قصوروار نہیں مانتے۔ اسی وجہ سے ہماری زندگی میں توازن ہے، لیکن کیا یہ بھی سچ نہیں ہے کہ ہم اپنی اپنی جگہ پر بالکل تنہا ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم میری پوجا کرتے ہو۔ لیکن مجھے تمھاری قربت نہیں تمھارا پیار چاہیے جسے تم دینا چاہ کر بھی نہیں دے پا رہے ہو۔ کیوں... کیوں ہے ایسا؟ کیوں... ہم سہل نہیں ہوتے؟ کیوں ہم زندگی کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش میں اسے اور بڑھائے جا رہے ہیں؟"

تعجب، میری آواز میں ذرا بھی لغزش نہیں تھی، نہ غیر مستقلی ہی تھی۔ ایک ایسا اعتماد جو خود مجھے بھی حیران کر رہا تھا۔ انھوں نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ میری طرف جھکے اور بولے، "اس سوال کا کیا جواب ہے، یہ تم جانتی ہو، میں بھی جانتا ہوں۔"

ان الفاظ میں نہ جانے کیا تھا جو نسوں سے گزر کر میرے وجود کو چیرتا چلا گیا۔ میں نے دھیرے دھیرے ہاتھ کھینچ لیا اور پھر بہت دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ اپنے اندر کی توانائی کو سمیٹنے کے لیے خاموش ہو جانا ہی ضروری تھا۔ انھوں نے انکت کی طرف منہ کر لیا۔ مجھ میں بھی شوبھنا کا سامنا کرنے کی تاب نہ تھی کیونکہ وہیں تو شخص اپنا آئینہ دیکھتا ہے۔

پھر بھی کتنے ہی دن اوپر سے اوڑھے ہوئے ایک بے لوث خوشی کے سہارے گزر گئے۔ ان کے دوست، پتاجی کے معاون و مداح۔ انکت کی ترقی کرتی ننھی کلیوں کی دنیا۔

کبھی کبھی سچ مچ لگتا کہ کتنا سکھ بکھرا پڑا ہے میرے چاروں طرف اور مضبوط ارادوں میں ڈوبتی چلی جاتی ہوں اس میں جی جان سے۔

دُکھ ہی نہیں، سکھ بھی بغیر پوچھے چلا جاتا ہے۔ ایک دن دیکھتی ہوں کہ ورتکا دیدی سامنے کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ حیران، خوشی سے پیر چھونے کو جھکی تھی کہ انھوں نے چھاتی میں سمیٹ لیا۔ چہرہ اٹھا کر دو پل کے لیے دیکھا، پھر دونوں گالوں پر بوسے داغ دیئے، بولیں، ''بہت دن اسٹیٹ میں رہی ہوں نا۔ جی کرتا ہے ان کی طرح پیار کرنے کا۔ کیسے ہیں سب — ماما، اجیت اور انکت اور...؟''

بولتی بولتی سیدھے کمرے میں پہنچ گئیں، ٹٹولتی، ڈھونڈتی نگاہیں دیوار، چھت، شیلف ہر طرف گھوم کر اماں کی تصویر پر جا ٹکتی ہیں۔ مشینی انداز میں سر پر پلو لیتی ہیں اور ہاتھ جوڑ کر شیلف پر سر ٹکا دیتی ہیں۔ کئی پل بعد مڑ کر میری طرف دیکھتی ہیں، ''دھوپ بتی کہاں ہے سُمی؟'' آواز میں نرمی تھی باغی دیدی کی۔

میں نے تب تک چپ چاپ سب کچھ شیلف پر رکھ دیا تھا۔ انھوں نے پانچ دھوپ بتیاں جلائیں۔ بولیں، ''کتنا اچھا لگا انھیں جلا کر۔ دیکھو سمی، کہیں کچھ نہیں بدلا۔ اس کمرے میں کوئی بھی نہیں ہے۔ سب کچھ اجنبی سا، سونا سونا سا لگتا ہے۔ اپنا دل ہی تو اپنے آپ کو ملزم ٹھہراتا رہتا ہے۔ ماحول پر... تمھیں یاد ہے نا سُمی! آخری سفر سے دو دن قبل ایک ناقابل برداشت درد کے عذاب کو جھیلتے ہوئے ماں نے کہا تھا، 'وتی! ایک وچن دے گی مجھے؟'

اس پل لگا تھا کہ ان کا درد آنکھوں کی راہ میرے رگ رگ میں پیوست ہو رہا ہے۔ درد کے منتقل ہونے کا بھی اپنا ایک سکھ ہوتا ہے۔ وہی زندہ رکھتا ہے اور خالق بناتا ہے۔ میں نے جواب دیا، ''آپ کو میں کچھ دے سکوں اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہے میرے لیے نہیں جانتی آپ کی بیٹی ہوں، حکم دیں۔''

'سیدھی سادی کہہ گئیں ماں اس دن، ''وتی! جانتی ہوں، اولاد ماں کی ہوتی ہے لیکن

قانونی مقبولیت اسے پتا سے ملتی ہے۔ جب تک یہ ناانصافی نہیں مٹتی تب تک ہم اولاد کو کیوں سزا دیں؟ ماں بننے سے قبل پوری طرح بیوی بننا ہوگا تجھے۔

"تعجب، بغیر کسی بہانے کے میں نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا اور کہا تھا، ابھی ہوگا ساتھی!"

"نارائن، اجیت اور ماما تینوں گواہ ہیں۔ وہی وچن نبھانے آئی ہوں آج"

افسردہ دل پنکھڑیوں سا کھل اٹھا۔ خوشی سے چیخ اٹھی اس تنہائی میں" سنو! اس خوشی میں میں سُمیتا اعلان کرتی ہوں کہ اپنی پیاری پیاری نندی رانی کو شاندار دعوت دوں گی منیشا میں"

اور ا ردعمل میں زور سے بھینچ لیا تھا دیدی کو چھاتی میں۔ دو برابر دھڑکتے ہوئے دل بہت کچھ کہہ گئے کہ تبھی دوڑتا ہوا انکت وہاں آپہنچا" ممی، ممی بتاؤں ..." کہ نگاہ بُوا پر جا کر ٹھٹھک گئی۔ دو پل دیکھتا رہا، آگے بڑھتا رہا کہ دیدی نے لپک کر گود میں اٹھا لیا" ارے انکت بھول گیا بوا کو!"

انکت نے فوراً چھاتی میں سر گڑا لیا۔ پھر ان کے منہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا" بُوا بتاؤں، آج ہمیں حساب اور سوشل سائنس دونوں میں 'ویری گڈ' ملا ہے"

"ارے سچ ..."

"ہاں، بُوا، کل انگلش میں بھی 'ویری گڈ' ملا تھا"

"تب تو ہمارا انکت بہت ہوشیار ہوگیا ہے"

"بوا، آپ ہمارے لیے کیا لائی ہیں؟"

میں بولی" انکت یہ کیا بات ہے؟ نہ بُوا جی کے پیر چھوئے، نہ نمستے کی۔ لگے ..."

انکت فوراً گود سے اترا، دیدی کے پیر چھوئے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا" نمستے بوا جی! آپ کب آئیں اور ہمارے لیے کیا لائیں"

اس کی اس ادا پر ہم دونوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے۔ تبھی پتا جی، اجیت اور نارائن آگئے۔

رنگ بکھر گیا دسوں دشاؤں میں، میرا درد نہ جانے کس دشا کے اندر جا چھپا...

در اصل دیدی کا تعارف کرادوں۔ اجیت کے کسی دور دراز کے رشتے کی بُوا کی بیٹی ہیں۔ کسی

تہمت کی وجہ سے ناقابل برداشت درد سہنا پڑا تھا۔ متوسط خاندان کی اس ہندو لڑکی کو سماج سے بھی، خاندان سے بھی۔ لیکن اس عمل میں وہ ٹوٹی نہیں بلکہ اور بھی حوصلہ ان کے اندر جاگ گیا۔ اسی نے انھیں باغی بنا دیا۔ پڑھ لکھ کر ٹیچر بنیں، سماجی کاموں میں حصّہ لیا اور بالآخر باپ کی راہ پیدا ہوئے ایک انجان خاندان کے صحافی کو اپنا ساتھی بنالیا، بغیر سپت پدی (ہندو رسوم) یا بغیر رجسٹریشن کے۔۔۔

ایسی جیجی کے آنے پر میرا خوش ہونا فطری تھا۔ میرے اس دکھ کے دنوں میں یہ ہی تو میرا سب سے بڑا سہارا تھیں۔ لیکن اجیت کی خوشی کی وجہ اور بھی کچھ تھی۔ میں مسلسل دیکھ رہی تھی کہ اجیت میرا سامنا کرنے سے بچ رہے ہیں۔ اسی لیے کسی کے آنے کا ایسا ہر موقع انھیں خوشی دے جاتا ہے۔ کیونکہ سب کے بیچ سنجیدگی کے مکھوٹے لگائے رکھنا بہت آسان ہوتا ہے، لیکن تنہائی میں اندر کا تلخ دھواں سارے ماحول میں بھر جاتا ہے۔ اسی سے ڈرتا ہے اجیت۔ ڈرتی میں بھی ہوں تبھی تو مجھے لگ رہا ہے کہ وہ ہوا ایسے ہی بہتی رہے۔

اور وہ بہتی رہی۔

تیسرے دن اکیلی گھر میں رسوئی کی کھٹر پٹر میں مصروف تھی۔ ریڈیو کھلا ہوا تھا کہ اچانک چونک پڑی۔

نیوز ریڈر نے ابھی ابھی پتاجی کا نام لیا ہے۔ بھاگی بھاگی سیٹ کے پاس پہنچی۔ ریڈر معمول کے مطابق پڑھتی چلی گئی، "ایوارڈ کمیٹی نے رائے عامہ سے اس سال کے راشٹریہ ایکتا ایوارڈ کے لیے معروف ہندی ادیب شری مہندر بھینک کو چنا ہے۔ ایوارڈ جلد ہی کسی مناسب موقع پر دیا جائے گا۔ اس میں دس ہزار نقد، ایک شال اور ایک تانبے کا نشان دیا جاتا ہے۔ شری بھینک اپنے ادب میں مسلسل ذات، دھرم، رنگ، نسل، صوبہ، جنس سب سے اوپر اُٹھ کر 'انسان' کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں، وہ سہی معنوں میں ہندوستانی ادب کے نمائندہ ادیب ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادیبوں کو لے کر جو تحقیق انھوں نے کی ہے، اس وجہ سے وہ پورے ملک میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔۔"

کیا ہوا مجھے کہ چپ چاپ اماں جی کی تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس پل واقعی ان کی

بہو ہونے پر مجھے فخر ہوا تھا لیکن . . .

اس 'لیکن' سے کہیں نجات نہیں. خوشیوں کے سمندر میں تیرتے تیرتے خود سے یہی سوال پوچھ بیٹھی ہوں لیکن . . .

اس رات جب سب سونے چلے گئے تو لوٹ کر پتاجی کے پاس آئی۔ حیرانی سے انھوں نے میری طرف دیکھا، بولے۔ "کچھ کہنا ہے بیٹی؟"

"کچھ پوچھنا ہے . . ."

"پوچھو!"

"راشٹریہ ایکتا ایوارڈ کے بارے میں کیا آپ کو پہلے ہی معلوم نہیں ہو گیا تھا؟"

پتاجی اس سوال کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں واضح طور پر دیکھ رہی تھی کہ ان کے چہرے پر کرب کی لکیریں امنڈنا چاہتی تھیں اور وہ ہر بار کوشش کر کے اسے روک دیتے تھے۔ تب مجھے اپنے آپ پر پشیمانی ہوئی، بولی۔ "جانے دیجیے، آپ کو . . ."

انھوں نے بیچ میں ہی مجھے روک دیا۔ کہا، "میں سمجھ رہا ہوں، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ بار بار یہ سوال میں نے اپنے آپ سے بھی کیا ہے۔ میں اپنوں کے درمیان اتنا اجنبی کیسے ہو گیا کہ کسی کو اعتماد میں بھی نہ لے سکوں۔ مجھے ایک مہینہ پہلے پتہ چل گیا تھا . . ."

اس اعزاز کو آپ ایک ماہ تک چھپائے رہے۔ اتنا عدم اعتماد"

پتاجی نے سر جھکا لیا اور میں بولتی چلی جا رہی تھی، "یہ ٹھیک ہے جو آپ کے لیے اماں جی ہو سکتی تھیں وہ ہم نہیں ہو سکتے، لیکن آپ کے اعزاز سے کیا ہمیں کچھ خصوصی ہونے کا ذرا بھی حق نہیں ہے؟ وہ ہوتیں تو کیا آپ چھپا پاتے اپنی اس خوشی کو . . .؟"

میرے اندر میں نہ جانے کس کس وقت دبا ڈھکا غصہ بہہ نکلا، لیکن پتاجی اسی طرح سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میں جانتی ہوں وہ امنڈتے من کو قابو میں کرنے کی جی جان سے کوشش کر رہے تھے۔

اچانک سر اٹھا کر بولے، آواز ابھی بھی بھرائی ہوئی تھی، "بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ اصل میں میں اچھا برا جیسا بھی ہوں بس کچھ لکھ لیتا ہوں، لیکن آواز میرے پاس نہیں ہے، 'وہ' میری آواز تھی، 'وہ' چلی گئی، میری آواز چلی گئی۔ اسی کی آواز کے سہارے میں باہری دنیا سے جڑا تھا نہیں تو . . ."

جملہ پورا نہ کر کے وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ کیسی چبھنے والی ہے وہ نگاہ۔ اندر کہیں بہت دور تک چیر جاتے ہیں ان کے وہ سیدھے سچے لفظ۔ برف کی سل سی پگھل جاتی ہوں میں۔ جی میں آتا ہے لپک کر پاؤں پکڑ لوں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ میں بھری بھری پوچھ بیٹھتی ہوں، "بہت پیار کرتے تھے آپ اماجی کو؟"

اچانک نصف شب کی وہ خاموشی ان کے قہقہے سے لرز گئی۔ ہنسی روکنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کرتے ہوئے وہ بول اُٹھے، "پیار! کتنا اجنبی لگنے لگا ہے یہ لفظ۔ اب تو شبہ ہونے لگا ہے کہ اس کا کوئی معنی بھی ہو سکتا ہے یا...؟"

پھر جس قدر اچانک ہنسے تھے اسی طرح سے خاموش ہو گئے۔ وہ دو تین پل نہ جانے کہاں چلے گئے۔ لوٹے تو مکمل شانت تھے۔ ہمیشہ کی طرح گمبھیر بولے، دھیرے دھیرے "دیکھو، ازل سے علما اس ڈھائی آکھر لفظ کی تشریح کرتے آ رہے ہیں، لیکن کیا کر سکے؟ لیکن یہ عہد تو دماغ والوں کا ہے۔ سب کچھ جان لینے کا دعوا ہے ان کا۔ دن رات چیر پھاڑ کرتے رہتے ہیں الفاظ کی۔ پیار کو کبھی آتما سے جوڑتے ہیں، کبھی جسم سے، کبھی ہیروڈ کشش سے۔ جس کے دماغ میں زیادہ وزن ہوتا ہے وہ جیت جاتا ہے اس وقت لیکن پیار ہمیشہ کی طرح ان کی پہنچ سے باہر ہی رہ جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی گرفت میں لفظ ہے معنی نہیں۔ کیونکہ جو معنی ہے وہ تو ماضی ہے سب سے۔ سب کی بنیاد، سب میں ہم آہنگ، پھر بھی سب کی کشش سے آزاد بھی تو ماضی ہے۔ سب سے جڑا... سب سے الگ..."

میں خاموش سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بول نہیں رہے ہیں محبت کے جو معنی ہیں، جو احساس ہے، وہ بہہ رہا ہے کسی ماورائی ذرائع سے "میرے اور اس کے بیچ جو کچھ تھا اسے پیار کا نام دیا جا سکتا ہے یا نہیں، وہ جانیں۔ اکثر ہم لڑ بھی بیٹھتے تھے۔ کئی کئی دن ہمارے بیچ بات چیت تک بند رہتی، لیکن معاہدہ کا پیغام لے کر کسی کرشن کو نہیں آنا پڑتا تھا۔ ہم میں سے ہی کوئی کرشن بن جاتا تھا وقت آنے پر۔ پھر من میلے کیسے ہو سکتے تھے؟ میل تو باہری چیز ہے۔ سمجھ سکو تو اتنا ہی سمجھ لو۔ اپنی تو قبر سہی ہم دونوں مانتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے اپنے ہیں۔ کوئی اور اتنا اپنا نہیں ہو سکتا۔ اس اتنا اپنا کا کیا مطلب ہے یہ تم محسوس کر سکتی ہو، سن پڑھ نہیں سکتی۔ آنکھ اور کان کے عمل کے ساتھ تو من جڑا ہے۔ ہم معنی ڈھونڈنے کے عمل میں اپنے من کو ہی تو الزام دیتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ زبان کتنی گونگی

ہے اور من کتنا چنچل...۔"

کہاں سے کہاں پہنچ گئے پتا جی۔ میں اُن سے اتفاق کروں یا نہیں لیکن مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ دو دن قبل ورتکا دیدی نے بھی من کی بات کہی تھی۔ من کسی جامد احساس کا نمائندہ تھوڑے ہی ہے۔ وہ تو ہمیشہ نئے اقدار کی علامت کے طور پر ہے۔ بدلتی ذہنیت کی علامت جب کہ پیار میں کچھ نہ کچھ ایسا ہے جو مستقل ہے...

میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کل آنے کا، لیکن کتنی رکاوٹیں آگئیں اس کل کے آنے میں۔ کتنی گھڑیاں بیت گئی ہیں۔ ورتکا دیدی، نارائن، پھر ورتکا دیدی کے ماتا پتا، بہن بہنوئی، میری نند وِبھا، ان کے پتی اننیہ، کیسا بھر گیا تھا گھر بھی اور من بھی۔ کیسے ٹوٹنے لگا تھا وہی من جب وہ دھیرے دھیرے جانے لگے تھے سب سے آخر میں وہی گئے جو سب سے پہلے آئے تھے۔ ورتکا دیدی اور نارائن بھائی صاحب...

اس دن تو باندھ ٹوٹ گیا۔ دیدی کی چھاتی سے چپک کر میں پھپھک اٹھی "مجھ سے اکیلے یہ سب نہیں سہا جاتا۔"

دیدی نے ذرا بھی ہوش کھوئے بنا مجھے تھپتھپاتے ہوئے کہا، "پھانس تیرے اپنے اندر ہے۔ اسے نکال پھینک اور مرد کی طاقت سے مرعوب ہونے سے نجات پانے کی کوشش کر تب سب آسان ہو جائے گا۔"

یہ کیا کہہ گئیں دیدی۔ پھانس میرے اپنے اندر ہے اور مرد کی طاقت سے مرعوبیت سے نجات... پھانس میرے اندر ہو سکتی ہے لیکن مرد کی طاقت سے مرعوبیت سے نجات ممکن ہے کیا... ممکن ہے کیا، کون جواب دے اس سوال کا جو باطن میں ہلچل مچائے ہوئے ہے۔

اجیت کے پاس لیٹی میں اس سے ہی نجات پانے کی بات سوچتی اور ہنس پڑتی کہ کسی نے دھیرے سے کہا، "اجیت سے نہیں، مرد کی طاقت کی کشش سے نجات... مرد کی طاقت کی کشش سے...!"

تبھی نہ جانے کیا ہوا، میں فوراً اٹھی اور ایک نوٹ بک ڈھونڈ لائی۔ جلدی جلدی صفحات پلٹتے ہوئے میں نے وہ حصے ڈھونڈ لیے جن پر کبھی اجیت نے نشان لگائے تھے۔ انجانے میں انھیں زور زور سے پڑھنے لگی۔

"... مجھے نہیں معلوم کہ کامیابی کی سطح پر ہم پاشان یگ سے کچھ آگے بڑھے ہیں یا نہیں۔ وجہ، آپسی تعلقات میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے پوری طرح سے بے لگام اور ساتھ ہی کچھ قابل رحم غلام بھی ہیں۔

"ہاں واقعی غلام، کیونکہ جب تک انسان میں خواہشیں ہیں، دلچسپیاں اور فریفتگی ہے، تب تک وہ ان چیزوں کا اور ان اشخاص کا بھی غلام ہے جن پر ان خواہشوں کی تکمیل کا انحصار ہوتا ہے۔

" عورت مرد کی غلام اس لیے ہے کہ وہ مرد اور اس کی طاقت کے لیے کشش محسوس کرتی ہے، اس کے اندر گھر بسانے کی خواہش ہوتی ہے، وہ گھر سے حاصل ہونے والی پناہ کو چاہتی ہے اور آخر میں اس کے اندر ممتا کے لیے موہ بھی ہوتا ہے۔ ادھر مرد بھی عورت کا غلام ہے، احساس برتری کی وجہ سے، طاقت اور اقتدار کی تشنگی کی وجہ سے، کام واسنا کی آسودگی کی خواہش اور ازدواجی زندگی کی چھوٹی موٹی سُکھ اور سہولتوں کے لیے اس کی محویت کی وجہ سے۔

" اس لیے کوئی بھی قانون عورت کو تب تک بندھن سے نجات نہیں دے سکتا جب تک وہ خود ہی اس بندھن سے نجات نہ پالے۔ اسی طرح مرد بھی حق جمانے کی عادتوں کے ہوتے ہوئے بھی تب تک غلامی سے نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ اپنے اندر کی ساری غلامی سے نجات نہ پالے ..."

آگے نہیں پڑھا جا سکا۔ کتاب ایک طرف رکھ کر میں نے آنکھیں بند کرلیں، اجیت انھیں پڑھ چکا ہے۔ یہ سوال اسے بھی پریشان کر رہا ہے۔ کیا وہ مجھ سے اس لیے دور جانے کی کوشش کر رہا ہے کہ حق کا جذبہ، کام واسنا اور شادی شدہ زندگی کی سُکھ سہولیات کی محویت سے نجات پاسکے ... یا وہ میرے وجود سے نفرت کرنے لگا ہے یا وہ دو راکشس اس کا پیچھا کر رہے ہیں جیسے، جیسے ...؟

میں حیران تیزی سے ہانپنے لگی۔ باہر ایک بے چین خاموشی سی پھیل رہی تھی۔ پتاجی اپنے اسٹڈی میں آرام کر رہے تھے۔ انکت اسکول جا چکا تھا اور اجیت کو یونی ورسٹی میں کچھ کام تھا۔ وہیں سے وہ انکت کو لے آئے گا۔ میں نے کہہ دیا تھا، مجھے کہیں کسی سے ملنے جانا ہے ...

مہری نے دھیرے سے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ میں بولی، "کیا ہے شنی؟"

"جاؤں بی بی جی؟"

"جا!"

اچھا ہوا یہ رکاوٹ آگئی۔ نہیں تو میں ہانپتے ہانپتے... ہاں، کیا ہو جاتا مجھے... کیا ہو جاتا۔ کیا میں خودکشی کر لیتی...

کھٹ کھٹ ہوئی، پکار اُٹھی "ششی!"

"جی!"

"ایک گلاس پانی دیتی جا!"

دو پل بعد پانی رکھ گئی۔ کہتی گئی "جا رہی ہوں!"

اچھا ہوا، ابھی تھی وہ۔ اُٹھی، پانی پیا اور ساڑی بدلتے ہوئے ہنس پڑی۔ کیا ہو جاتا ہے مجھے، اپنے آپ پر سے اپنا ہی حق کھونے لگتی ہوں!

لیکن حق جتانا تو غلامی ہے اور غلامی سے نجات پائے بغیر... انھوں نے کہا تھا، پچیس برس بعد بھی مجھے لگتا ہے کہ جیسے مجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں... غلامی نہیں ہے بڑکیا!

گھڑی دیکھی، دو بج رہے تھے۔ اسکوٹر پندرہ منٹ میں پہنچا دے گا۔ تین کا وقت ہے ملنے کا۔ پاس ہی لائبریری ہے۔ کتابیں دینی ہیں اور لینی بھی۔ یاد آیا، رانگے راگھو کا ناول کب تک پکاروں پڑھنا ہے اسے۔

اس کے بعد جب لائبریری میں گھڑی دیکھی تو تین بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ ناول کے صفحات پلٹتے پلٹتے بھول ہی گئی۔ چونک کر اُٹھی، پانچ منٹ پھر بھی چلنا تھا۔ اکتوبر کے آخر میں بھی پسینہ ٹپکنے لگا۔ ان کا کمرہ ٹھنڈا تھا۔ کھڑکی نہ کھولو تو ہلکی روشنی میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ دیکھا وہ اپنی سادگی اور حیا میں وہی سنجیدگی بنائے ہوئے ہیں۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا انھیں دیکھ کر کہ ان کے ساتھ بھی ویسا کچھ واقع ہو چکا ہے۔ کیسے شروع کرے، کہاں سے پکڑے سرا کہ انھوں نے ہی پوچھ لیا، "بہت مصروف رہیں اِن دنوں!"

"جی ہاں! وہ اسی دن لوٹے تھے۔ پھر دیدی آگئیں۔ اس کے بعد تو گھر بھر گیا!"

"ان کے لوٹ جانے پر جی بہت دُکھا ہوگا؟"

"جی ہاں، دن بھر گھر گرہستی کی ذمہ داریوں کو لے کر جوجھنے میں کبھی کبھی بڑا سکون ملتا ہے۔ مصروفیت کا اپنا ایک لطف ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہے بیٹی، ہوتا ہے۔"

"آواز میں اتنی پختگی تھی کہ میں انھیں حیران سی دیکھنے لگی۔ نہ جانے کہاں سے آکر بادل کا ایک ٹکڑا ان کی آنکھوں کے سامنے پھیل گیا۔ وہی بولیں، "تم کچھ بتانے والی تھیں نا؟"

یکبارگی میں کانپ گئی، "جی ہاں . . ."

میں پھر خلا میں ڈوب گئی، ایسا خلا جس میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں جانتی تھی کہ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی ہیں، پھاڑ رہی ہیں میرے باہری لباس کو۔ میں چیخنے کو ہوئی کہ ورتکا دیدی دکھ گئیں — پھانس تیرے اندر ہے نکال پھینک . . .

حواس لوٹے۔ میں نے خود کو سمیٹ لیا۔ دھیرے دھیرے مدھم آواز میں میں نے اپنی کہانی شروع کی۔

اس رات دس بجے ہم تینوں، میں، میرے پتی اجیت، اور میری نند ویبھا، "روچیرا" میں سنگیت دیکھنے گئے تھے۔ کوشش کے باوجود بھی شام کے ٹکٹ نہیں مل سکے تھے۔ اپنا اسکوٹر تھا اس لیے کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ "روچیرا" کامرشیل کامپلیکس کے درمیان میں ہے۔ دن میں جتنی گہما گہمی رہتی ہے رات میں اتنا ہی سناٹا۔ آمد و رفت بھی سیدھے راستے کو چھوڑ کر بہت کم ہو جاتی ہے۔ پکچر کچھ لمبی تھی ختم ہوتے ہوتے پون بج گیا۔ لیکن ہم فلم میں کچھ ایسے گم تھے کہ ادھر دھیان ہی نہیں جا سکا۔ پھر اس وقت بھیڑ بھی تھی۔ زیادہ تر کار اسکوٹر والے۔ کچھ ٹیکسیاں بھی تھیں۔ ایک جانا پہچانا شور، شرارت بھری کھلکھلاہٹ، کندھوں کا ٹکرانا، ساری، ایکسکیوزمی، گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے اور روانہ ہونے کی آوازیں . . .

راستہ بناتے ہوئے ہم خوش خوش اپنے اسکوٹر کے پاس پہنچے۔ اجیت یکایک پہچان نہ سکے، بولے، "یہ نہیں۔"

میں نے کہا "یہی ہے!" لیکن دوسرے ہی لمحے نگاہ نے اجیت کی نگاہ کی تقلید کی۔ اسکوٹر کا ادھر کا حصہ کھلا پڑا تھا، پرزے بکھرے تھے۔ یہاں وہاں . . .

اجیت کی شکل ایک دم سخت ہو گئی۔ "بدمعاش، غنڈے۔ پرزے چرا لے جانا چاہتے تھے شاید لیکن شو ختم ہو گیا۔"

"نہیں اجیت!" میں نے کہا "پرزے چرانے ہوتے تو چرا لے جاتے۔ شو کب ختم ہوتا ہے، یہاں کے لوگ جانتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ سازش..."

"سازش!" وبھا کی آواز میں لغزش تھی، "کیسی سازش بھابھی؟"

"ہمیں فوراً یہاں سے نکل چلنا ہوگا۔ دیکھو تو اجیت، اسکوٹر ٹھیک ہو سکے گا؟"

اجیت تب تک نارمل ہو چکے تھے، لیکن ان کی کیفیت بتا رہی تھی کہ کچھ نہیں ہو سکے گا۔ پھر بھی وہ...

غیر یقینی اور بے وقت ہونے کی وجہ سے میرے اندر کی جھنجھناہٹ تیز تر ہو رہی تھی۔ میں نے کہا، "کیا یہاں کوئی ورکشاپ نہیں ہوگا آس پاس؟ وہاں تک دھکیل کر لے جا سکتے ہیں؟"

"وہی کرنا ہوگا۔" اجیت کھڑے ہوئے تو پسینہ چونے لگا۔ کہنی سے پونچھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ تب تک بھیڑ چھنٹ چکی تھی۔ صرف ملازمین دروازے بند کر رہے تھے۔ وبھا نے میری کہنی کس کر پکڑ لی۔ اس کی تیز دھڑکنیں میرے وجود میں پیوست ہو گئیں۔

کہ تبھی دو سانولے رنگ ان گھڑ اکھڑ نوجوان جھومتے کہیں سے آ نکلے۔ ٹھیک میرے پاس رکے بڑے ادب سے بولے، "بابو صاحب، اسکوٹر خراب ہو گیا، ہم مدد کریں؟"

مکینک ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اجیت نے ایک پل انہیں دیکھا پھر گدگد ہو کر کہا، "بڑی مہربانی ہو، اگر آپ کچھ کر سکیں..."

"چ...چ...چ... اتنی رات اور آپ دو بہنوں کے ساتھ اکیلے۔ ایسے میں بھی انسان مدد نہ کرے گا تو کب کرے گا؟"

میں جب تک ان کے جسم سے اٹھتے ایک گہرے بدبو اور چاروں طرف پھیلی گہری خاموشی کے مصیبت سے نکلوں، وہ پورے دل سے پرزوں کو مقررہ مقام پر لگانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا... وبھا سرگوشی کر رہی تھی، "کتنے اچھے ہیں یہ لوگ!"

اجیت ان کی مدد کرنے میں مصروف تھے اور میرے اندر کہیں گھنٹی بج رہی تھی، تنبیہ دیتی کہ

انجانے مصیبت کی۔

مصیبت کی بھی ایک بو ہوتی ہے۔

نوجوان اُٹھے۔ ہاتھ پونچھے۔ اسکوٹر اسٹارٹ کی۔ سارے ماحول میں سبھی ممکنہ خطرات کی گھنٹیوں کی آواز کو مٹاتی ہوئی کیسی خوشیوں بھری تھی اسکوٹر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز۔۔۔

"ٹھیک۔۔۔" ایک نوجوان نے اجیت کی طرف مڑکر کہا۔ "دیکھ لیجیے۔"

اجیت نے دیکھا، سب کچھ ٹھیک تھا۔ وہ کتنے ممنون تھے۔ بولے "آپ نہ آتے تو جانے کیا ہوا ہوتا۔ کیسے شکریہ ادا کروں۔۔۔ لیکن کیا دوں آپ کو؟"

اجیت نے پرس نکالا تبھی اچانک ایک منظر بدلا۔ کھٹکا ہوا۔ بجلی کوندھی، دونوں نوجوانوں کے ہاتھ میں ننگے چھرے تھے، چم چم چمکتے ہوئے ہماری آنکھوں کے سامنے۔ وبھا کی آنکھیں پھٹ گئیں، ایک دہشت بھری دبی چیخ۔ پاس والے نوجوان نے سنبھال لیا، لٹا دیا اپنے بیروں کے گھیرے میں۔

اتنے ہی وقفے میں دوسرے نوجوان نے کہا، "پیسے بہت ہیں ہمارے پاس۔ ہمیں ایک لڑکی چاہیے۔ بس، ایک صرف ایک۔۔۔ لالچی نہیں ہیں ہم۔"

"کیا۔۔۔ ک۔۔۔ آ۔۔۔!" جبراً اجیت چیخ پاتے کہ چھرا ان کی گردن پر ٹنگا تھا۔ اسی وقت کہیں سے ایک کھٹری وہیل وہاں آکر رکا۔ ڈرائیور ان کا ساتھی تھا۔ وبھا کے پاس کھڑے نوجوان نے کہا، "اٹھا، اس مال کو اور رے چل۔ ہم ابھی آتے ہیں۔ صاحب اور میم صاحب کو روانہ کردیں۔"

اب تک میرے اندر گھنٹیاں بجنی بند ہو چکی تھیں۔ میں مصیبت کے سامنے تھی۔ میں نہیں جانتی وہ سب کیسے ہوا۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے دھیمی لیکن سخت آواز میں کہا، "اُسے مت چھونا!"

پہلے نوجوان نے گھور کر میری طرف دیکھا، وہ ہنسا، خوفناک ہنسی، "میم صاحب! بچ کر نہیں جا سکتیں آپ۔ صاحب کو دفا کر کے دونوں کو لے جائیں گے۔۔"

"میں کہتی ہوں، اُسے مت چھونا۔ میں چلوں گی تمھارے ساتھ۔"

اجیت نے میری طرف دیکھا اور کہا، "کوئی نہیں جائے گا۔ تینوں مر جائیں گے۔۔۔"

ان کے سامنے کھڑے نوجوان نے فوراً بات کاٹ دی، "نہیں بابو صاحب! مریں گے صرف

آپ۔ اس لیے سوچ لو ایک دو گے یا دونوں؟"

"میں نے کہا نا، میں چلوں گی تمھارے ساتھ۔ وعدہ کرو انھیں کچھ نہ کہو گے۔"

ایک پل اس نے مجھے دیکھا، پھر دھیرے سے کہا "وعدہ ..."

اجیت نے خطرہ مول لیتے ہوئے مزاحمت کرنا چاہی لیکن میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، "میری شادی ہو چکی ہے۔ وبھا کا سرو ناش نہ کرو۔"

اور میں ان غنڈوں کی طرف مڑی، "چلو!"

ایک پل کے لیے ایک خیال ذہن میں آیا کہ وہ چونکیں گے، لیکن وہ تو پیشہ ور تھے۔ سخت جان۔ ان کی خوفناکی سارے جذبات سے عاری تھی۔ ہنس دیا۔ کہا، "نہیں، نہیں، اتنی اتاؤلی نہیں۔ پہلے تمھارے شوہر اور ان کی بہن کو وداع تو کر دیں ..."

"نہیں ... نہیں ..." وبھا کی ایک بھیگی بھیگی سرد بغیر الفاظ کی چیخ سے پیدا جان لیوا ٹیس، پیٹھ پر سرد لوہے کا گرم چیرتا احساس۔ اجیت کا بے معنی ہوتا ہوا جد و جہد ...

مجھے پتہ نہیں پھر کیا ہوا۔ کوئی بتا سکتا ہے؟ ہسپتال میں لیٹے لیٹے ٹکڑوں ٹکڑوں میں یاد آیا تھا۔ پھر اجیت نے بتایا تھا ... وہ لوگ اجیت اور وبھا کو گھر کے پاس تک چھوڑ کر آئے تھے۔ میں کہاں کہاں سے ہو کر گئی پتہ نہیں۔ آنکھوں پر، منہ پر، پیچھے ہاتھوں پر بندھن تھے اور اندر سب کچھ حیران، شوبنہ ہو رہا تھا۔ بے حس کتنا درد، کتنی نفرت ... حد ہے اس کی ...

یہاں آکر انجانے ہی میں خاموشی ہو گئی۔ شاید مجھ میں اس حادثے کو پھر سے جینے کی طاقت نہیں تھی۔ یوں اس سے نجات ملی بھی کہاں ہے؟ ملی ہوتی تو میں وہاں ہوتی کیوں۔ لیکن سوچنا اور الفاظ دینا دو الگ عمل ہیں ... دو الگ احساسات ...

کئی لمحے خاموشی چھائی رہی۔ بھرے جینے کی وجہ سے نگاہ میں نے ہی اٹھائی۔ دیکھا — ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور وہ یہاں نہیں ہیں۔ ویسے ہی رہنے دیا اور آنکھیں موند لیں۔ ابھی تو مجھے بے شمار سوالوں کا سامنا کرنا ہے۔ بہت دیر راہ نہیں دیکھنی پڑی۔ ان کی محبت بھری آواز کانوں میں پڑی تو آنکھیں کھول دیں۔ وہ کہہ رہی تھیں، "عورت کب تک ڈھوتی رہے گی اس عذاب کو؟"

میکانیکی انداز میں کہنے کو ہوئی، جب تک مرد کی طاقت کے اثر سے خود کو آزاد نہیں کرلیتی عورت، لیکن کہہ نہ سکی۔ ان کی طرف دیکھتی رہی۔ وہی تھوڑا بہتر ہوئیں تو بولیں، "تمھاری سوجھ بوجھ اور ہمت پر فریفتہ ہوں بیٹی۔ تم پر تو فخر ہونا چاہیے۔"

"کسے...؟" میں یکبارگی بول پڑی۔

"سبھی کو!"

میں ہنس دی، "آج اگر یہ ساری کہانی اخباروں میں چھپ جائے تو کیا آپ سمجھتی ہیں مجھے پھولوں کی مالاؤں سے لاد دیا جائے گا؟ میں قابو میں کھڑی رہ سکوں گی اس بوجھ کے نیچے...؟"

انھوں نے ایک لمبی سانس لی، "سوال اپنے پاؤں کی طاقت کا ہی ہے، سمیتا بیٹی۔"

"یہ پاؤں کی طاقت کہاں سے آتی ہے؟"

ہاتھ اٹھاکر انھوں نے بولنے سے روک دیا، پوچھا، "بتا سکتی ہو تمھارے گھر میں کیا ردعمل ہوا؟"

"جو میرے لیے معنی رکھتے تھے، سب نے مجھے اپنے آنچل کی چھاؤں دی۔ عقیدت کا گھراپٹ تھا ان کی تحسین میں۔ جو دور تھے وہ یہی جان سکے کہ ہمارے اسکوٹر کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا، اسی میں میں چوٹ کھا گئی..."

"تو چھپانا پڑا...؟"

میں نے اپنی عصمت جو کھودی تھی، وہ آب دار موتی جو صرف میرے پتی کی امانت تھی اس پر دوسرے لوگوں نے ڈاکہ ڈالا تھا۔ کیوں اور کیسے ہوا یہ سب، سماج کے لوگ اس کی فکر نہیں کرتے۔ پھر بھی اجیت نے پولس میں رپورٹ کی تھی اسی رات اور سویرے میرے بکھرے جسم کو ایک نالے کے کنارے پایا تھا اسی نے۔ ایک بار اس ظلم اور تڑپ کے درمیان ہوش لوٹنے کو ہوا تھا جیسے کوئی پانی ڈال رہا تھا میرے منہ میں۔ تب سنا تھا میں نے جیسے ہزاروں ہزاروں میل سے آکر کچھ لفظ زخمی تن من کو چیر رہے ہیں...

گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے اب اس کا؟

ہنسی تھی وہ، کسی کی خوفناک ہنسی، "میں اسے مار کر شہید بنادوں؟ نہیں، نہیں، یہ زندہ رہے گی اور تڑپے گی، ریت پر پڑی مچھلی کی طرح۔ مجھے انتقام لینا ہے ان سفید پوشوں سے..."

"میں پھر ہوش کھو بیٹھی تھی پر یہ الفاظ... یہ تو میرے الفاظ ہیں آنٹی۔ اس نے کیا کہا تھا، وہ جانے دیجئے۔ بعد میں اجیت نے بتایا تھا کہ اماں پاگل سی ہوگئی تھیں۔ بار بار کہتی تھیں، "یہ کیا ہوا، میری سونے سی بہو کے ساتھ"۔ انھیں تسلی دیتے ہوئے دیدی نے کہا تھا "ماجی تمھاری سونے سی بہو کنچن بن گئی۔ شرم تو اس ملک کے بے شرم مردوں کو آنی چاہیے..."

دیدی مجھے اپنے فلیٹ پر لے گئیں کہ کچھ حوصلہ پا سکوں قسمت کو قبول کرنے کے لیے اور جب تک رہی انھوں نے ایک بار بھی اس حادثے کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ پر کیا یہ پرچھائیں سے بچنے کی کوشش نہیں تھی۔ دیدی کٹر نہیں تھیں، پھر بھی بغیر جانے بہت کچھ ایسا کر جاتیں جو کرنا نہیں چاہتی تھیں شاید اس لیے کہ میں زخمی تھی۔

میں گھائل تھی مگر زخموں نے مجھے ایک حوصلہ بھی دیا تھا۔ میں نے کہا، "دیدی میں اپنے گھر جاؤں گی۔"

وہ یکایک سہم گئیں، بولیں، "کیوں؟"

میں کیسے کہہ گئی، "یہاں مجھے ہر لمحے ان کے ہونے کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ بے شمار گھورتی نگاہیں جیسے مجھے گھیرتی آرہی ہیں۔" دیدی نے جامد نگاہ سے مجھے دیکھا، بولیں، "جہاں بھی رہوگی وہیں ایسا محسوس کروگی، کیوں کہ اس عمل کا تعلق دل سے ہے، جگہ سے نہیں۔"

"تب وہیں کیوں نہ رہوں جہاں سدا رہنا ہے مجھے۔" میں نے پورے حوصلے سے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

دیدی نے فوراً گھر جانے کا انتظام کر دیا...

میں پھر خاموش ہوگئی۔ جیسے سانس لینا چاہتی ہوں، نہ جانے کیسا کیسا ہو آیا تھا من۔ بولتے بولتے نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ انھوں نے ٹوکا تو نہ جانے کیا سے کیا بولتی چلی گئی، "فرد کے چاروں طرف جو اخلاقی اقدار اور سنسکار کے روپ میں غیر سائنسی جال سا بن دیا ہے سماج اور مذہب نے، اس میں پھنس کر ابھیمنیو مر ہی سکتا ہے۔ سنسکار خوف پیدا کرتے ہیں اور خوف کے دیواروں کے بیچ پنپتی ہے اندھی غیر انسانی عقیدت۔ اسی عقیدت کو ڈھال بنا کر سماجی ماہرین حملہ کرتے ہیں۔ میں اپنی قسمت کو ابھیمنیو نہیں بننے دوں گی۔ اخلاقیات کا تعلق من سے

ہے جسم سے نہیں۔۔۔"

انھوں نے مجھے کہنے دیا۔ صوفے پر ہاتھ ٹکائے دیکھتی رہیں میری طرف۔ ذرا پُرسکون ہوئی تو بولیں، "بہت سوچ لیتی ہو تم۔ صحیح ہے نا، لیکن مجھے لگتا ہے، خوف کی دیواریں تمھارے اندر بھی ہیں، تبھی تم پریشان ہو، تبھی تم یہاں ہو۔"

"وہی تو جاننا چاہتی ہوں۔ ظاہر میں میں اور اجیت ایک دوسرے سے مطمئن ہیں لیکن دونوں کے اندر ایک گہری کشمکش ہے۔ میں اجیت کو الزام نہیں دوں گی۔ میں خود نجات نہیں پا سکی تھی اُن شیطانوں سے۔ کبھی مجھے لگتا کہ وہ آسمان سے باز کے روپ میں جھپٹ رہے ہیں اور چنتھڑا چنتھڑا کر رہے ہیں میرے جسم کو۔ کبھی دور خوفناک جنگلوں کی دنیا میں بھٹک جاتی اور دیکھتی کہ چاروں طرف سے وہی درندے مجھ پر ٹوٹ پڑے ہیں بوٹی بوٹی نوچنے کے لیے۔ تن کا گھناؤنا پن من کو کتنا گھناؤنا کر دیتا ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ ہنسیں، "بار بار من اور تن کی بات کرتے ہیں ہم۔ بہت سوچا ہے میں نے بھی، لیکن کیا ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ہے؟"

میں نے چونددھیا کر ان کی طرف دیکھا۔ کہنا چاہا، لیکن وہ گھڑی دیکھ رہی تھیں۔ سچ پانچ بج چکے تھے۔ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی، "پھر آؤں گی ایک دن۔"

"میں آؤں تمھارے گھر۔"

"ہاں، ہاں، آئیے نا۔ میں نے بتایا نہیں۔ میں شری مہندر رہبنک کی بہو ہوں۔۔۔"

میری طرف دیکھتی رہ گئیں۔ ان لمحوں میں کتنے احساس گئے اور آئے۔ پھر پاس آ کر بولیں، "انھیں تو راشٹریہ ایکتا ایوارڈ ملا ہے، اس سال ہیں نے ان کا لکھا بہت پڑھا ہے۔ تمھارے مُنہ پر تعریف نہیں کروں گی۔ میرے پتی اور میں دونوں ان کے پابند قاری ہیں۔ ہاں ہماری بیٹی اور بیٹا دونوں ہی ان کے ناقد ہیں۔ کبھی کبھی بہت تیز بحث ہو جاتی ہے۔ آدرشواد سے جیسے چڑھ ہے دونوں کو۔"

میں ہنس دی تھی، "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے آنٹی کہ آدرشواد کا مطلب کہیں پیچھے لوٹنا تو نہیں ہے۔"

"نسلوں کا فرق"، کبھی کبھی وہ کھل کھلا پڑتی تھیں۔ جس کرب سے ہم گزر رہے تھے اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے کھل کھلانا ضروری تھا۔ مکھوٹوں کے بغیر نجات نہیں۔

اس رات اجیت سے کافی بحث ہوئی چاہا نہیں تھا۔ پھر بھی ہو گئی۔ کئی دن سے سب کچھ شانت تھا۔ اجیت اپنے پروجیکٹ میں مصروف تھے، لیکن ایک بات میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ مجھ سے اور انکت سے خاص طور سے بیزار ہو اُٹھے ہیں۔ زائد بیزاری میں شک کی گونجیں رہتی ہے۔ میں بظاہر پر سکون رہی لیکن باطن کی تکلیف بڑھتے بڑھتے ایک رات مجھے پریشان کر گئی...

اس رات انکت اپنے بابا کے پاس سو گیا تھا۔ اوپر میں اور اجیت، بس۔ وہ دیر تک پڑھنا چاہتے تھے۔ میں نے بانہوں کے گھیرے میں لے کر اپنی طرف پلٹ لیا۔ مجبوراً انھوں نے کتاب رکھ دی۔ مسکرائے "کیا بات ہے ممّی...؟"

"آؤ باتیں کریں۔"

"کس کی؟"

"من کی!"

"وہ کیا ہوتا ہے۔" اچانک بغیر سوچے وہ کہہ گئے اور ہنس پڑے۔

"وہی جسے ہم چھپاتے رہتے ہیں۔"

اجیت کہنی پر جسم کا سارا وزن ٹکا کر مجھے دیکھے جا رہے تھے ایسے جیسے میں نہ جانے کہاں سے بھٹک کر اُن سے آجڑی ہوں۔ اجنبی کا آملنا ہیجان برپا کر جاتا ہے نا، لیکن میرا یہ جملہ سُن کر ہیجان جیسے لوٹ آئی۔ وہ اُٹھ بیٹھے اور تن گئے حملہ جھیلنے کی پوزیشن میں۔ بولے، "تم آخر چاہتی کیا ہو؟ بار بار اس سوال کو اچھالنے کا مطلب کیا یہ نہیں ہے کہ تم نے بہت بڑا احسان کیا ہے ہم پر اور ہم تمھیں اذیت دے رہے ہیں؟ تم نے شہادت کا جام پیا ہے اور ہم تمھیں صلیب پر چڑھا رہے ہیں؟ بار بار تم نے..."

ایک پل کے لیے تو ایسا لگا جیسے سب کچھ جامد ہو گیا ہے میرے اندر، لیکن دوسرے ہی لمحے نہ جانے کس کس وقت کا جمع غصہ ضرب پاکر جیسے پھٹ پڑا۔ میں بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور رگ رگ

چیخ اٹھی، ایک ایک لفظ کو چباتی، "ہاں، میں نے شہادت کا جام پیا ہے اور بدلے میں پائی ہے نفرت اور رحم . . . تم خود کو کمتر سمجھنے لگے ہو اور تمھاری احساس کمتری ریت ریت کر کاٹ رہی ہے میرے وجود کو۔ تم میرا سامنا نہیں کر سکتے۔ تم مجھ سے نجات چاہتے ہو، اس لیے بھاگتے پھرتے ہو۔ تم بھی اور تمھاری وہ بہن بھی جس کے لیے میں نے قربانی دی . . . دنیا سمجھتی ہے کیسا آدرش خاندان ہے یہ۔ کیسی خوبصورت جوڑی ہے ہماری، ایک دوسرے کے لیے وقف، ایک دوسرے کے وجود میں پیوست . . . نہیں اوڑھ سکتی یہ چھلاوہ اب اور میں۔ نجات دو مجھے . . ."

"ٹھیک ہے، جیسا چاہو، ویسا کرو۔ میں دخل نہیں دوں گا۔"

میرے غصے کا یہ جواب اور ایک مرد کے ذریعہ! اجیت جانتے ہیں کہ مجھے انکار کرنے کا ایک واحد ذریعہ نثار ہو جانا ہی ہے۔ اس لیے دوسری طرف منہ کر کے وہ لیٹ گئے۔ لیٹتے لیٹتے جیسے خود سے کہتے ہوں، 'اب خاتمہ ہونا چاہیے اس دم گھونٹو تناؤ کا۔'

لیکن میں مسترد نہیں ہونا چاہتی تھی۔ میں ان کا فیصلہ چاہتی تھی۔ میں نے مانو جھپٹ کر ان کا منہ پھر اپنی طرف کیا اور خونخوار نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بول اٹھی۔ "میں تمھارا دو ٹوک فیصلہ چاہتی ہوں۔"

"کہہ تو دیا، تم آزاد ہو فیصلہ لینے کے لیے۔"

"نہیں، میں آزاد نہیں ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں، تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں . . . ؟"

"ہاں . . . !"

"یقین کرو گی ؟"

یہ کیسی آواز ہے ان کی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ پتھر کچھ پگھلنے لگا ہے، میں ان کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیتی ہوں، لیکن ان میں جو بے بسی ہے وہ میں برداشت نہیں کر پاتی۔ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہوں . . . چونکتی، ہانپتی ہوئی . . .

باہر تو اندھیرا ہے اور میں خواب دیکھ رہی ہوں . . .

بہت دیر تک اس خاموش تاریکی میں سہمی سہمی سی آنکھیں کھولے لیٹی رہی اور سوچتی رہی،

کیوں ہم الزام دیتے رہتے ہیں اپنے ہی من کو اپنے آپ پر، اپنوں پر، دوسروں پر بھی...؟

لیکن من کیا صرف اپنا ہی ہے؟ اس کی تشکیل میں کیا ماحول، رسم، روایت، ان سب کا تعاون نہیں ہے؟ کیا اس سے دوسرے نہیں جڑے ہیں۔

سوال کے ساتھ باطن میں ہی ایک اور سوال بھی اٹھا، لیکن ان سے الگ رہنا اپنے کرب کے ساتھ غیر شخصی طور پر جڑنا، انسان کی انسانیت کی کسوٹی نہیں ہے کیا؟ کہیں ٹھہر جانا جیسے زندگی کی علامت نہیں ہے، ویسے ہی اپنے دکھ سے اپنے آپ پر فخر کرتے رہنا شہادت نہیں ہے...

یہ میں ہی اپنے آپ سے کیا کیا کہہ گئی۔ نجات ہمیں کسی اور سے نہیں، نجات ہمیں اپنے آپ سے ہی پانا ہے۔ اپنے آپ سے یعنی اپنے اندر کی غلامی سے۔

اپنے اندر کی غلامی سے نجات، امر داور اس کی طاقت کے اثر سے نجات، مسلسل جدوجہد مسلسل آگے بڑھنا، مسلسل تکمیل، مسلسل سچ کی تلاش میں بڑھنا۔

یاد آیا، کہیں پڑھا تھا— سچ سے کہیں اہم ہے سچ کی تلاش۔

مجھے لگا میری نسوں سے ہوتی ہوئی ایک ناقابل بیان لرزش، ایک ناقابل بیان سکھ کا احساس میرے جسم کو پھول سا ہلکا کر گئی ہے۔

مڑ کر دیکھا بے سدھ بچے کی طرح اجیت سوئے تھے۔ کئی پل دیکھتی رہی... میری طرح اجیت بھی تکلیف زدہ ہے اپنے سے۔ تبھی تو بار بار بھاگتا ہے نہیں تو کتنا پیار ہے اسے مجھ سے۔ اس کی ڈائری کا وہ ورق...

اس تاریکی میں بھی وہ صفحہ میرے سامنے تھا۔ کتنے خوبصورت اور روشن تھے وہ حروف۔ پڑھتی چلی گئی میں تاریکی کے سینے پر درج برق کی زبان...

... کتنی خوش تھی وہ حرارت سے پُر، بغیر پہچانے فخر سے فخریہ انداز، سماجا نے کو ادرسما لینے کو بے چین و بے قرار، التجا کی شدت جیسے آنکھوں میں برسات کی پھوہار پڑ رہی تھی۔ تبھی کیا ہوا، میں نے اسے جھلملاتی آنکھوں میں گہرائی تک جھانکا۔ یہ کیا... وہاں کسی کی تصویر دیکھی میں نے؟ سہم گئی۔ بار بار آنکھیں جھپکیں لیکن وہ تصویر تو وہاں سے ہو کر میری آنکھوں میں پیوست ہو گئی

تھی اور میرے پورے وجود کو جکڑ لیا تھا۔ جدھر بھی نگاہ گھماتا وہی ڈراؤنی تصویر، وہی خوفناک ہنسی، وہی...

نہیں...!

میں نے تڑپ کر ادھر سے مُنہ موڑ لیا اور آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھ لیں، لیکن وہ خاکے تو سیکڑوں سیکڑوں حصوں میں بٹ کر میرے وجود کو ڈسنے لگے۔ تبھی خوشامد کے لہجے میں سمیتا نے کہا، ادھر دیکھو نہ میرے پران! آج میں کتنی خوش ہوں...

اور اس نے مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ کر اپنی طرف کر لیا۔ میں نے کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالا۔ ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ اسے سمیٹ لوں، لیکن ہوا یہ کہ میرا ہاتھ چھاتی پر سے ہو کر اس کے حلق پر پہنچ گیا۔ اسی لمحے وہ تصویریں پھر ابھریں اور اسی کے ساتھ کسی نے جیسے بہت آہستہ سے کہا ہو، "بس تھوڑا سا اور پھر سب ختم ہو جائے گا..."

نہیں...!

میں نے اندر سے امنڈتی چیخ کو روکنا چاہا جی جان سے اس کوشش میں سانس گھٹنے لگی۔ پسینے سے تربتر ہو اُٹھا تن بدن لیکن اس کی گرفت سخت سے سخت تر ہو رہی تھی۔ تناؤ کی وجہ سے سانسوں کی رفتار میں طوفان داخل ہو گیا تھا...

تناؤ سے نجات کے بعد جب وہ میری چھاتی پر ہاتھ رکھ کر شانت لیٹ گئی تھی تو میں پھر سے ایک دوسرے تناؤ میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا... کیا سچ مچ میرے اندر اس کے قتل کا خیال آیا تھا؟ کیا میں اس کا قتل کرنا چاہتا ہوں؟

کہیں سے بہت دھیمی دھیمی آواز چھنتی ہوئی میرے کانوں میں گونجی، "ہاں، تم قتل کر سکتے ہو۔ خودکشی بھی کر سکتے ہو..."

نہیں... نہیں... ایسا نہیں ہونا چاہیے... ایسا نہیں ہوگا۔

کسی نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا ہے اور مجھ سے کہہ رہی ہے 'میری شادی ہو چکی ہے، وبھا کا سروناش مت کرو!'

نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے... ایسا نہیں ہوگا۔

وبھا کا سروناش مت کرو... تم چلے جاؤ...

نہیں ... نہیں... ایسا نہیں ہونا چاہیے... ایسا نہیں ہوگا۔

وبھا کا سروناش مت کرو... تم چلے جاؤ۔

اس آوازادراس کی بازگشت سے میرا وجود تھرتھرا گیا اور میں چیخ اُٹھا — ایسا نہیں ہوگا...

ایسا نہیں ہوگا... ایسا نہیں ہوگا...

سمیتا چونک اُٹھی۔ میرے کانپتے بدن کو، بانہوں میں سمیٹ کر جھک گئی میری آنکھوں پر۔ "کیا ہوا اجیت، کیا ہوا، کیا نہیں ہوگا...؟"

میں ہانپ رہا تھا۔ کئی پل خاموش، سمٹا اس کی بانہوں میں پڑا رہا۔ پھر حواس قابو میں ہوئے تو اُسے اپنے سے لپٹا لیا۔ اور معصوم آواز میں کہا، "ایک ڈراؤنا خواب تھا سمی، تمھیں کینسر ہوگیا ہے اور ڈاکٹر کہتے ہیں بس دو سال کی زندگی باقی ہے۔ اور میں پاگل سا چیخ اُٹھا ہوں... ایسا نہیں ہوگا... ایسا نہیں ہوگا..."

اپنے جھوٹ گڑھنے کی صلاحیت پر میں خود حیران تھا۔ اتنا ہی جتنا اس خیال سے کہ میں قتل کرسکتا ہوں... کتنے انسان چھپے رہتے ہیں ایک انسان کے اندر...

ڈائری کا یہ صفحہ مجھ تک کیسے پہنچا، اس کی ایک تاریخ ہے۔ ایک دن پرانے کاغذات اجیت سمیٹ رہے تھے۔ اسی عمل میں اپنی ڈائری پڑھ کر کانپ اٹھے اور اس کے باوجود کو مٹانے کو یہ چین سب کچھ چندی چندی کر ڈالا۔ انھیں ٹکڑوں میں یہ صفحہ بچ گیا شاید میری قسمت سے کیونکہ بالآخر اس ڈھیر ساری ردی کو سمیٹنا ہٹانا مجھے ہی تو تھا۔

میں نے اس کے بارے میں اجیت کو کبھی نہیں بتایا۔ اس صفحہ کو محفوظ بھی نہیں رکھا۔ مجھے یقین تھا ان کے عہد پر "ایسا کبھی نہیں ہوگا"

"آج اتنے دنوں بعد میں اس کی زائد بیزاری کا راز ہی سمجھ سکی تھی۔

زیادہ کچھ بھی ہو، خوف پیدا کرتا ہے۔

ہم دونوں خوف زدہ تھے۔ کیا ہم ایک دوسرے سے نجات پالیں تو خوف سے نجات —

پالیں گے۔"

ایسے وقت میں نہ جانے کون آکر تیرے کان میں سرگوشی کرجاتا ہے، "تمھیں تب تک کوئی آزاد نہیں کرسکتا جب تک تم خود ہی آزاد نہ ہو جاؤ۔"

یہ خود آزاد ہونا کیا ہے؟

مرد کی طاقت کی کشش سے نجات۔ کسی بھی طرح کی کشش سے نجات۔

اگلے دن اچانک 'ناری من' کا پیغام ملا۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر شالنی شیوڑے بمبئی جارہی ہیں۔ آپ ساتھ جاسکیں تو بلات کارکی شکار ایک لڑکی سے انٹرویو کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ مقامی نمائندہ وجے بگارے مرد ہونے کی وجہ سے وہاں تک پہنچ نہیں پارہے ہیں۔ ان سے آپ خوب واقف ہیں۔ آپ کا یہ موضوع بھی ہے اور رسالے نے اس موضوع کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ آپ جائیں گی نا؟

میں تیار تھی لیکن اجیت کا سامنا کیسے کروں گی؟

وہ مسئلہ اپنے آپ ہی سلجھ گیا۔ اجیت سے کچھ کہہ پاتی کہ وہ آتے ہی بول اٹھے، "میں پرسوں رات ایک سمینار میں حصہ لینے جارہا ہوں بمبئی چلتی ہو؟"

یقین نہیں ہوا۔ جھجکتی سی بولی، "میں...؟"

"ہاں، کیوں، فرصت نہیں ہے...؟"

"ہاں، فرصت نہیں ہے، مجھے بھی بمبئی جانا ہے۔"

نہ جانے کتنے روپ بدلے ان کے مزاج نے ایک پل میں، "مذاق کررہی ہو؟"

"ارے نہیں بھئی!" میں ان کی قابل رحم صورت دیکھ کر کھل کھلا اٹھی۔ "ناری من' سے پیغام ملا تھا۔ ایک اسائنمنٹ ہے میرے لیے۔ کبھی کبھی ایسے عجیب اتفاق کیسے ہو جاتے ہیں۔ ایشور واقعی ہے کیا؟"

اب اجیت کے چونکنے کی باری تھی۔ ہنس دیا، "سوچا تھا، حیران کردوں گا تمھیں اپنی فراخ دلی سے لیکن تم تو ہارنا جانتی ہی نہیں..."

"ہرانا چاہتے ہو... مرد کہیں کے..."

اجیت ہنس تو نہیں سکے لیکن لاجواب ضرور تھے۔

پھر تین دن انتظام کرنے میں گزر گئے۔ سہولت ایک اور بھی تھی، پتا جی لمبے سفر پر چلے گئے تھے۔ ادبی سفر تھا اور وبھا کے پاس بھی رہنا تھا۔ بہت اصرار تھا اس کا۔ ماں کے جانے کے بعد باپ کو گھیرنے کا لالچ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ حق تھا اس کا بھی...

اسٹیشن پر پگارے موجود تھا۔ بولا، "میں جانتا تھا، آپ آئیں گی۔ میرے ساتھ چلوگی یا بس؟"

درمیان میں ہی اس کا جملہ کاٹ دیا، "ملو، میرے پتی سے، ڈاکٹر اجیت کمار۔ ہمارا بیٹا ہے انکت اور اجیت، یہ ہیں صحافی وجے پگارے۔ پہلے دلی میں تھے۔ انھیں کے ساتھ جانا ہے مجھے... وجے۔ ہم ٹھہریں گے تو ماما جی کے یہاں۔ اجیت کے ماما پروفیسر تریندر سنگھل؛

"ہاں... ہاں... ڈاکٹر سنگھل سوشیالوجی کے لکچرر ہیں۔ ویویکانند کالج میں۔ خوب واقف ہوں۔ ٹھیک ہے تو، میں وہیں آؤں گا۔ پرسوں کے لیے انتظام کیے لیتا ہوں۔ کوئی دشواری ہوئی تو فون کروں گا۔ نہیں تو سویرے ڈاکٹر سنگھل کے ڈرائنگ روم میں لمبی بحث کے لیے تیار ہوکر آؤں گا۔"

"اچھا ڈاکٹر اجیت کمار! اور انکت بیٹے، تمھیں ہم گھمائیں گے۔ ہے نا، آؤ شالینی دیدی، آج تو بہت مصروف رہنا ہے نا..."

"اور ہاں، سمیتا دیدی، ڈاکٹر اجیت اور ماسٹر انکت، آپ سب آج شام کو پوروہت' میں میرے ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

پگارے کا مزاج ہے کہ وہ کسی کو بولنے کا موقع بہت کم دیتا ہے۔ شک و شبہ، ممکنات ـــ ان الفاظ سے کم ہی لگاؤ ہے اسے۔ جو کرنا ہے اس کا پورا پروگرام وہ فوراً تیار کرلیتا ہے۔

شالینی کے ساتھ جانے سے پہلے اس نے ہماری ٹیکسی کا انتظام کیا، "دیدی، پرسوں یہی ٹیکسی ہمیں ہماری منزل پرلے جائے گی۔"

ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈاکٹر اجیت کو بولنے کا موقع ملا، "بڑا عجیب جاندار ہے، یہ تمھارا نمائندہ پگارے۔ اتنا مخلص کہ ڈر لگتا ہے۔"

میں ہنس پڑی۔ "کیوں۔۔۔؟"

"ارے بھائی! ایسے آدمی سے کوئی کیا بحث کرے گا؟"

"تم نہیں مانتے کہ اصولوں کا پابند ہونا کہیں پر کاہل ہو جانا نہیں ہوتا؟"

"لیکن اسی وجہ سے اصولی ذکر کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا۔"

"کرنا بھی تو نہیں چاہیے۔ مانتی ہوں پکارے جیسے شخص بھی انتہا کے دوسرے سرے کو پکڑ سکتے ہیں۔ یہی کشمکش ہمارا المیہ ہے۔ لفظ پر بھروسے کی انتہا ہمیں کاہل بنا سکتی ہے اور اس کو کلی طور پر نظر انداز کر دینا بد عنوانیوں کی ممکنات میں سے ہے۔ راستہ کہیں درمیان میں ہے۔ تبدیلی کے تسلسل کو قبول کرنے سے ہی جمود ٹوٹ سکتا ہے۔"

بول چکی تو پایا، اجیت میری طرف دیکھے جا رہے ہیں۔ چہرے پر حیرانی اور تحسین کے ملے جلے احساسات ہیں۔ لیکن آنکھوں کی چمک کے پیچھے خوف کی تاریکی بھی گہری لگتی ہے۔ میں نے دھیرے سے کہا، "ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"تم سے ڈر لگتا ہے۔"

"مجھ سے کیوں؟"

"پتہ نہیں۔" اجیت نے جواب دینا نہیں چاہا تو انکت کو پکڑ لیا۔ "دیکھو، دیکھو انکت وہ سمندر۔"

میں چپ ہو گئی تو منزل آنے تک کچھ نہ بول سکی۔ باپ بیٹے بولتے رہے۔ خوشی سے امنگ سے سمجھاتے رہے۔ سمندر کیا ہوتا ہے۔ کہاں سے آتا ہے اتنا پانی۔ کہیں کنارہ ہے اس کا۔ شنکھ سیپ اس کے پیٹ میں کیوں بھرے رہتے ہیں۔ موتی کیسے بنتا ہے۔ مچھلی پانی میں کیسے رہتی ہے۔ کیا کھاتی ہے۔

"اور وہ اتنے سارے بادل؟"

"یہاں سے پانی لے کر وہ سب جگہ برساتے ہیں۔"

"دہلی میں بھی؟"

"ہاں!"

"بادلوں پر بیٹھ کر ہم دہلی نہیں پہنچ سکتے پاپا؟"

انکت کو اپنے پاس کھینچ کر ایک بوسہ جڑ دیا ماتھے پر، یہ کہتے ہوئے "بیٹے، ہوائی جہاز بادل کی طرح اُڑتے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہوائی جہاز سے جا سکیں۔"

رات کا کھانا 'پروہت' میں ممکن نہ ہو سکا۔ ماماجی کے گھر پہنچتے ہی پگارے کا فون آگیا۔ "دیدی، معاف کرنا، کسی ضروری کام سے ابھی پونہ جا رہا ہوں۔ کل دوپہر تک لوٹوں گا، رات کا کھانا کل کے لیے ملتوی کر رہا ہوں۔ دوپہر کو شالنی جی آپ کی رہائش سے آپ کو لے لیں گی۔ میں تو ایک بار اور معافی مانگتا ہوں۔ ڈاکٹر اجیت اور انکت بیٹے سے بھی معافی مانگ لیجیے۔"

بار بار معافی کے لین دین کے بعد پتہ لگا، آج تو اجیت کو بھی فرصت نہیں تھی۔ پانچ بجے ساہتیہ اکادمی کے سیمینار کا افتتاح ہے۔ ڈنر بھی ان کی طرف سے ہے۔ اجیت کا اصرار ہے میں بھی صرف آج ساتھ چلوں۔

"لیکن شالنی؟"

"انھیں بھی بُلا لیتے ہیں۔"

فون پر طے ہوا کہ ایک بجے وہ مجھے لے لیں گی اور پانچ بجے اجیت ہمیں پگارے کے گھر سے پک اپ کر لیں گے۔

شالینی کے ساتھ دوپہر کا کھانا پگارے کے گھر کے پاس ایک چھوٹے سے ریستران میں ہوا۔ پگارے تو ابھی غیر شادی شدہ تھا۔ اس کے پاس وہیں انکت سو گیا۔ تب شالینی نے کہا "ایک بات بتانے کے لیے بلایا تھا تمھیں۔ کھانا تو بہانہ تھا۔ ابھی تم سے اتنا اپناپن کہاں تھا کہ اعتماد میں لیتی۔ لیکن جب آپ بلاتکار پر کام کر رہی ہیں تو ایک ایسے ہی حادثے کی بات بتاتی ہوں۔ آج سے تیس برس پہلے ایک سات سالہ بچی کے ساتھ ایک ستّر سال کے بوڑھے شخص نے مٹھائی کا لالچ دے کر بلاتکار کیا تھا۔"

میں اپنا ردِ عمل ظاہر کروں کہ وہی بول اُٹھی۔ "اور وہ لڑکی میں ہوں۔"

"کیا؟" اچانک گردن اٹھا کر میں نے اس کی طرف دیکھا "آپ کو یاد ہے؟"

ایک پل میں کتنا بوجھل ہو اُٹھا وہاں کا ماحول۔ وہ اطمینان سے بولیں، "بہت دھندلی یاد

ہے، جیسے کسی راکشس نے دبوچ لیا ہو اور میں خوف سے بے ہوش ہوتی جا رہی ہوں۔ ہسپتال میں آنکھ کھولی تھی تو پھر جو آہ و بکا اُٹھی، جو تکلیف ہوئی وہی کسک اُٹھتی ہے اب بھی کبھی کبھی سات پردوں کو چھید کر۔ پولس، عدالت، تنہا کمرے میں بہلا پھسلا کر پوچھے گئے سوال اور میرا بار بار رونا۔۔ پانچ سال کی سزا ہوئی تھی اُسے۔"

"اس کی یاد ہے؟"

"جب بھی کسی بوڑھے مرد کو دیکھتی ہوں تو میرا رواں رواں نفرت سے بھر اُٹھتا ہے۔ خوف سے چیخنے کو جی کرتا ہے۔ بچپن میں واقعی چیخ اُٹھی تھی۔ اب بھی کافی محنت کرنی پڑتی ہے چیخ کو اندر ہی اندر ضبط کرنے کے لیے۔۔۔"

میں نے دیکھا کہ شالنی دیدی کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک آئی ہیں۔ اندر کے درد کو اشکوں نے اندر ہی روک لیا تھا۔ کہتی رہیں، "اس حادثے کے بعد ماں نے مجھے ماما کے پاس بھیج دیا تھا۔ وہیں میری تعلیم و تربیت ہوئی۔ کسی نے کبھی اس حادثے کا ذکر نہیں کیا، لیکن ایک دن کیا ہوا کہ میرے بوڑھے نانا رات کو کہیں سے لوٹے۔ اندھیرا تھا، وہ ٹٹولتے ہوئے آ رہے تھے۔ جیسے ہی کسی نے بجلی جلائی اور سخت لہجے میں پوچھا، کون؟ میری آنکھ کھل گئی۔ پھر جو میں چیخی تو پڑوسی بھی جاگ گئے۔۔۔

"نانا نے مجھے بڑے پیار سے سینے سے لگا لیا۔ میں بار بار ان کا مُنہ دیکھتی اور پھر ان کے سینے سے لپٹ جاتی۔ بڑی محنت کرنی پڑتی تھی مجھے دو ہیولوں میں فرق کرتے میں، نانا کی وجہ سے ہی دھیرے دھیرے میں اس ڈر پر قابو پا سکی۔ سوچتی کبھی کبھی، جو بیتا بھگتا ہے وہ خواب کیوں نہیں رہتا لیکن شگاف تو صاف شفاف شیشے میں پڑی تھی۔ حقیقت بن رہا خواب نہ بن سکا۔ جنھیں ہم بھول جاتے ہیں۔"

"اور لوگ جان گئے آپ کی کہانی کو؟"

"بڑے شہروں میں اپنی ہی فکر سے فرصت نہیں، دوسرے کی کون سنے؛ لیکن سمبتا جی جبرچائیں تو ہوا پانی کی طرح ہوتی ہیں۔ راستہ ڈھونڈ ہی لیتی ہیں، کسی دراڑ میں سے۔ اینٹ خود ہی پانی کو اپنے میں نہیں سموتی، ساتھ والے کو بھی شرابور کر دیتی ہے اور اس طرح پوری

دیوار سہا اٹھتی ہے۔ قصبوں کے بارے میں یہ بات بہت صحیح رہتی ہے۔ کئی سال تو میں وہاں آئی ہی نہیں۔ جب آئی تو ہر کسی کی آنکھیں میرے اندر چبھ جاتی تھیں جیسے اندھیرے میں شیر کی آنکھیں۔۔۔"

میں نہیں چاہتی تھی کہ ان کی زخمی من کو کریدوں۔ جیسے ان کی آنکھوں میں بار بار وہ منظر جی اُٹھتا تھا۔ دھیرے دھیرے بولی، "بہت سہا آپ نے، لیکن شادی کے بعد تو۔۔۔؟"

وہ ہنس پڑیں۔ کیسی دردناک تھی وہ ہنسی جوان کے خوبصورت چہرے کو قابل رحم بنا گئی۔ بولیں، "ہاں شادی ہوئی۔ انھیں سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ لیکن میں اندر کی اس گھائل بچی کا کیا کرتی؟ ٹھیک وقت پر سُن پڑتی تھی وہ باطن کو چیر دینے والی تکلیف۔ بہت سمیٹا اپنے آپ کو۔ مکھوٹے لگاتی لیکن سرد من جسم کو اور سرد کر دیتا۔

عورت مرد کے دل کی ہر دھڑکن کو پہچانتی ہے تو مرد بھی عورت کے ہر فعل کا مطلب سمجھتا ہے۔ میں انھیں الزام نہیں دوں گی۔ انھوں نے کیا نہیں کیا مجھے لوٹا لانے کے لیے؟ میں بھی کیا نہیں کرتی تھی انھیں خوش رکھنے کے لیے؟ لیکن اس پل وہ سرد مہری۔۔۔ وہ سارے لباس کو چیر چیر جاتا اور اپنے قبیح صورت میں ظاہر ہو جاتا۔"

"آپ الگ ہو گئے؟"

"وہ تو تم جانتی ہی ہو۔ انھوں نے چاہا نہیں تھا۔ لیکن جسم کی مانگ بھی تو ہمارے وجود کی طرح ایک سچ ہے۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹکتے اور میں تڑپتی ۔۔ اس سے اچھا تو وہی ہو جانا تھا جو ہوا۔۔۔ میں نے منظوری دے دی تھی۔۔۔!"

پھر وہ چپ ہو گئیں۔ ان کی آنکھوں کے پردے پر اُبھر آئے درد کے دھند کو میں ایک ٹک دیکھتی رہی۔ انکت گنگنا رہا تھا۔ جاگ جانے پر کچھ نہ ہو سکے گا۔ بولی، "آپ نے کسی ماہر نفسیات سے صلاح نہیں لی۔۔۔؟"

اچانک جیسے چونک پڑیں، "ماہر نفسیات؟ اُس کے پاس تو تب جاتی جب میں اپنے آپ کو نہ جانتی ہوتی۔ اپنے دل سے بڑا معالج اور کون ہو سکتا ہے؟ کون نجات دے سکتا ہے ہمیں جب تک ہم خود اپنے آپ کو نجات نہ دیں؟"

پھر وہ بہت دھیرے دھیرے بولیں جیسے کوئی بہت ہی گہرا راز عیاں کر رہی ہوں،
"جو بات کہنا چاہتی تھی اور جو تمھارے لیے مفید ہو سکتی ہے وہ تو کبھی نہیں جا سکی . . ."
اب بھی میری نگاہ ان کے شانت ہوتے چہرے پر جمی تھی۔ وہ اسی طرح بولتی رہیں، "اُسے جان کر میں بھی ایک بار حیران ہو گئی تھی۔"
"کیا بات ہے وہ؟"
"اس کی بیٹی نے مجھے خط لکھا۔"
"کس کی بیٹی نے؟" انجان بنتی سی میں بول اٹھی۔
جواب میں انھوں نے سنبھال کر رکھا ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ "بارہا چاہا کہ اسے پھاڑ کر پھینک دوں لیکن نہیں پھینک سکی۔ اب تمہیں دے رہی ہوں تو لگتا ہے جیسے نجات مل گئی۔ فرصت میں پڑھ لینا۔ تمہارے مطالعہ میں اضافہ ہوگا۔ یکسوئی چاہیے نتیجے پر پہنچنے کے لیے۔ تم سنو گی تو ممکن ہے یقین نہ کر سکو۔ لیکن یہ خط پڑھنے کے بعد مجھے لگا تھا جیسے میرا خوف دور ہو رہا ہے میں اپنے کو کھوج پا رہی ہوں۔"
تب وہ خط نہیں پڑھ سکی تھی۔ انکت جاگ گیا تھا اور اجیت کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔
انکت نے پوچھا: "کب چلیں گے ہم پاپا کے پاس؟"
"بس اٹھو، تیار ہو جاؤ۔ پاپا آ ہی رہے ہیں۔"

رات کو جب سب سو گئے تو میں نے خط نکالا۔ تجسس شام سے ہی رینگ رینگ کر پریشان کر رہا تھا۔ بیڈ سائڈ لیمپ کے پاس کھسک کر انا ڈلے من سے لفافے کو تقریباً پھاڑ ہی دیا تھا۔ رولڈ بیڈ خوبصورت تحریر، جیسے بہت دھیرے دھیرے سوچ کر لکھی گئی ہو۔ ایک ایک لفظ کو میں توجہ سے پڑھنے لگی۔
. . . تمھیں کیا کہہ کر مخاطب کروں نہیں جانتی۔ اس ابھاگے باپ کی بیٹی ہوں، جس نے تیس برس پہلے تمھیں برباد کیا تھا۔ ویسے ظلم کے لیے کوئی معافی نہیں ہے، ہونی بھی نہیں چاہیے۔ کوئی بچاؤ نہیں کروں گی اپنے پتا کا۔ انھوں نے چاہا بھی نہیں تھا۔ وکیل ضد نہ کرتے تو انھوں نے پہلے پل ہی الزام قبول کر لیا ہوتا۔

لیکن تم جانتی ہو، وہ ایک متوسط طبقے کے باوقار خاندان کے رکن تھے۔ اپنی سادگی، شرافت اور ایمانداری کے لیے مشہور، سبکدوش ہونے کے بعد وہیں قصبے کی ایک فرم میں کام کرتے تھے میں ان کی بڑی بیٹی۔ کیا نہیں کیا انھوں نے میرے لیے؟ ریڈر کے عہدے سے سبکدوش ہوئی ہوں۔ بھائی کینڈا میں ڈاکٹر ہے۔ تب بھی وہاں تھا، پتاجی نے اُسے اطلاع نہیں دینے دی۔ مجھے لکھوایا ـــ میں نہیں سہہ سکوں گا تمھارا آنا۔

دو سال جی سکے جیل میں، لیکن ایک بار بھی نہیں ملے کسی سے کہہ دیا ـــ "جو تمھارا پتا تھا وہ مر چکا"

خوب محنت کرتے، پڑھتے پڑھاتے۔ کریمنالوجی، نفسیات، مذہبیات۔ افسران اتنے متاثر ہوئے کہ وقت سے بہت پہلے رہائی کی چرچا ہونے لگی۔ انھوں نے سنا اور تین دن بعد ان کے دل کی دھڑکن بند ہوگئی۔ ان کی لاش بھی ہم نہیں پا سکے۔ ان کا حکم تھا۔ میری لاش برقی شمشان میں جلادی جائے اور ہڈیاں ڈال دی جائیں کہیں بھی پیروں تلے روندے جانے کے لیے۔ ہاں، آنکھیں خیرات کردی تھیں۔

آج سوچتی ہوں، وہ یہی کر سکتے تھے۔ گھٹن سے آزاد کر گئے اپنے آپ کو۔ لیکن تمھارے ساتھ جو ہوا . . .

جانے دو، اس بات کو خط لکھنے کا مقصد وہ بھی نہیں ہے۔ میں تمھیں ان کی تحریر کردہ بیان کی نقل بھیج رہی۔ میں جانتی ہوں، تم ایک صحافی ہو۔ یہ بھی جانتی ہوں تمھاری ازدواجی زندگی سکھی نہ رہ سکی۔ کہیں نہ کہیں میں بھی قصوروار ہوں۔ کیوں ہوجاتا ہے یہ سب کچھ اچانک؟ کیوں وقوع ہوجاتا ہے جو زندگی کے سارے رنگوں کو بدرنگ کر جاتا ہے؟ کتنے ٹکڑے ہیں آدمی کے، ہر ٹکڑا، ہر دوسرے ٹکڑے کے لیے کتنا اجنبی۔ اس عمل اور ردعمل کے پیچھے کچھ تو مقصد ہوتا ہی ہے۔ اسی مقصد کی کھوج ہے اس بیان میں . . .

معاف لفظ کا استعمال کر کے تمھیں رسوا نہیں کروں گی۔ دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں تم سکھی رہو۔ خط پر آنسوؤں کے داغ اگر دکھ پڑیں تو آشیرواد کر کے لینا . . .

. . . . .

سُبھاشنی

میری چیتنا جیسے کسی بھونچال میں ڈوب گئی ہو۔ آنکھیں کہاں دیکھ رہی تھیں پتہ نہیں۔ بہت دھواں ہے نا اس خاموشی میں۔ ویسے ہی جیسے شہر کے ایک دوسرے سے سٹے مکانوں کے کمروں میں گھٹ جاتا ہے۔ دیر تک آنکھوں سے اُبل اُبل پڑتے کڑوے پانی کو پونچھتے رہو۔

کسی طرح سمیٹ کر بیان پڑھنا شروع کیا۔

... اقرار کر چکا ہوں۔ سخت سے سخت سزا کا مستحق ہوں۔ پھانسی نہیں مانگوں گا۔ وہ تو مجھ جیسے کے لیے ایک معافی ہے۔ میری سزا ہے کہ اس کلنک کا طوق پہنے جیتا رہوں... بہک گیا ہوں۔ جو کہنا چاہتا تھا وہ سزا کی نہیں، الزام کی بات تھی۔ کیوں کیا میں نے وہ جرم؟ بہت سوچا ہے حوالات کی خاموش تنہائی میں۔ پراگندہ ذہن اور نفسیاتی وجہ کی تلاش صرف بہانے ہیں۔ جنسی خواہش ہر شخص کے اندر ہے۔ وہی تو زندگی کو تحریک دینے والی توانائی ہے۔ جسم اور من دونوں کو سنبھالے رہتی ہے۔ بڑھاپے میں جسم چھوٹ جاتا ہے لیکن من پر اس کی جکڑ بنی رہتی ہے۔ یہی ہے نا ٹریجڈی۔ اس ٹریجڈی کی آگ میں گھی کا کام کرتا ہے آج کی کچی سوچ...

میری پتنی جب تک زندہ رہی مجھے سوچنا نہیں پڑا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے وقف تھے، ایک دوسرے کے دوست۔ تھوڑی بہت بھٹکن تو ہوتی ہے لیکن وہ سب سطحی۔ اتھلے پانی میں تیرنے جیسی۔ گہرا کچھ نہیں۔ اس لیے کبھی کسی طرح کی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ تعلقات گہرے ہوں تو کہاں گنجائش رہتی ہے غلط فہمی کی...

میں اڑسٹھ سال کا تھا جب اس کا انتقال ہوا۔ معمولی سی بیماری کے بعد اندر سب کچھ ٹوٹ گیا۔ کیسا بے بس ہو کر رویا اس عمر میں۔ رات کی خاموش تنہائی میں تب جان سکا، کیا تھی وہ میرے لیے...

بیٹے نے چاہا، اس کے پاس جا کر رہوں۔ بیٹی کے پیار کی انتہا نہیں، لیکن میرا من تو جڑا تھا اس سے اور وہ اس گھر میں تب بھی موجود تھی بے شمار خلوتوں کی یادوں میں۔ مانو کہتی ہوئی میں یہیں تو ہوں، کہاں جا سکتی ہوں یہاں سے؟ افق پر کچھ نہیں ہے پھر بھی وہ دھوکہ نہیں ہوتا۔ میں نے فیصلہ کیا، میں یہیں رہوں گا۔ ایک بزرگ خاتون تھی دیکھ بھال کے لیے۔ نوکری پر شام کو جاتا۔ چار سے نو تک بس بہانہ تھا جینے کا۔ دن میں بچوں کو بٹور لیتا۔ کچھ نہ کچھ ان کے لیے

رکھتا، پڑھا بھی دیتا۔ سب کے دلوں میں میرے لیے عزت و احترام تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کسی کے لیے ناقابل یقین بھی ہو سکتا ہوں ...

ان دنوں مجھے فراق کے درد بھرے سنگیت سننے میں دلچسپی رہتی تھی۔ ٹرانزسٹر کھولے رکھتا، پڑھتا رہتا۔ نہ جانے کب ہوا یہ سب درد کی جگہ محبت کے درد نے لے لی۔ پھر محبت کا لاوابلی پن مسرور کرنے لگا۔ مجھے لگنے لگا میرے اندر جنسی خواہش زندہ ہے۔ تبھی تو پنی کی یاد اتنا بے چین کرتی ہے۔ تبھی 'دودھ بھارتی' کا اشتہا انگیز سنگیت مدھم پڑتے سانسوں میں بھی طوفان بھر جاتا ہے...

اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی، لیکن ہر کوشش کے بعد ہوتا یہ تھا کہ رات کو جب لوٹتا تو کوئی نہ کوئی ننگی برہنہ عورتوں والی یا آدھی رات کے قصوں والا رسالہ لے آتا۔ مختلف روپ فلمی رسائل میں اور ان کے علاوہ بھی دیگر رسائل میں شہوت پرست ہیروئنوں اور ہیروؤں کے قابل اعتراض حالت میں لیے گئے اشتہا آمیز تصویریں کھلے طور پر چھپتی ہیں۔ معیاری رسائل میں عورت کے برہنہ جسم کے خوبصورت تصویروں کو فنکارانہ روپ دے کر پیش کرتی ہیں۔ ملکی، غیر ملکی فاحشاؤں کے ساتھ گزاری گئی راتوں کی خوبصورت اور حسین عکاسی بھی ہوتی ہے ان میں۔ ایسے سبھی مضامین کے لکھنے والے ہوتے ہیں اکثر جانے مانے معروف ادیب اور صحافی۔ ایسے سبھی رسائل میرے معمول کے ساتھی بن گئے تھے۔

اب سمجھا ہوں — یہ سب کچھ سرمایہ دارانہ ملکوں میں طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوتا ہے۔ ایسا ادب آدمی کو غذا، نیند، خوف کی خواہش کرنے والا جاندار بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔ تبھی تو وہ اس کی بیداری کو پامال کر اس پر اپنی مرضی کے مطابق حکومت کر سکتے ہیں۔ کہانیکار شرت نے اپنے مشہور سوانحی ناول "شری کانت" میں لکھا ہے کہ "مہذب سماج اس بات کو بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ انسان سے جانور کا کام لینے کے لیے پہلے اسے جانور بنانا پڑتا ہے۔"

... اس لیے عمر کی قید سے آزاد دلکش، کھلے زلفوں والی عورتیں مجھے مشتعل کرنے لگیں۔ لوگوں کی نگاہوں میں بس تپ کر رہا تھا اس عمر میں اکیلا رہ کر۔ لیکن خواہشوں کا طوفانی سمندر راہ دیکھتا رہتا کہ سورگ سے کوئی اُروشی یا مینکا اترے، میرا تپ بھنگ کرنے کے لیے ...

یہ بھی درد تھا، لیکن ایک جوہری کی طرح دھماکہ خیز، بے رحم۔ اس رات کچھ ایسا ہی شدید درد

میرے رگوں کو کاٹ رہا تھا کہ نہ جانے کب اور کیسے میری ہیئت بدل گئی اور میں... میں نہ رہا کیا ہو گیا، کوئی نہ بتا سکے گا۔

ٹھیک اسی وقت آ گئی وہ معصوم کلی...

آگے کیا ہوا، وہ نہ بتا سکوں گا... مناسب بھی نہیں ہے...

یہ کسی بھی زاویہ سے دفاع کے لیے نہیں ہے۔ جرم تک پہنچنے والی راہ کو ڈھونڈنے کی صرف ایک کوشش ہے۔ کوشش یہ بھی ہے کہ میں تو ڈوب گیا لیکن شاید کل کا انسان وقت رہتے اس درد کو پہچان سکے...

بے شمار دانشوروں نے دنیا کے رہنے والے عظیم انسان کلپنا کی ہے ان میں ایک تصور یہ بھی ہے "جیسے آج کے انسان میں بندر کی جسمانی قوت نہیں ہے اس طرح شاید عظیم انسان میں انسان کی جیسی ذہانت نہیں ہوگی، اس میں اپنے آپ کو اور اوروں کو دھوکہ دینے کی صلاحیت نہیں رہے گی۔"

اس سے مجھے نجات کی ایک راہ دکھائی دیتی ہے۔

پڑھ چکی تھی تو میں وہ نہیں رہ گئی تھی جو پہلے تھی۔ سر چکرا گیا تھا۔ جس سے نفرت کرنی چاہیے تھی، اس کے لیے کیسا رحم کا جذبہ جاگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ یم دوت جو مجھے ابھی بھی دہشت زدہ کر جاتے تھے کچھ کہنے سے جان پڑے۔

کیسی تبدیلی ہے یہ۔

تبدیلی تو حقیقت ہے۔ نہیں تو آدمی جیئے گا کیسے؟

لیکن...؟

اپنے آپ سے ہی باتیں کرنے لگی تھی میں، اتنی سنجیدگی ہے کہ اسی طرح خط لیے گہری نیند میں ڈوب گئی۔ ہاتھ سینے پر اور لیمپ جلتا ہوا۔ نہ جانے کب لگا کہ وہ خط مجھ سے کوئی چھین رہا ہے۔ چونکا پڑی، چیخ کر "نہیں دوں گی، یہ نہیں دوں گی۔"

"نمی، نمی...!"

"کون...؟"

آنکھیں کھل گئیں۔ تب بھی کانپ رہی تھی۔ دیکھا سامنے اجیت ہے، پیار سے پوچھتا ہوا "کیا ہوا

سُمی، خواب دیکھ رہی تھی؟ لیمپ بھی نہیں بجھایا...؟"

ہوش لوٹ رہا تھا۔ "تم نے میرے ہاتھ سے خط چھیننا چاہا تھا؟"

"نہیں تو..."

"تب وہ خواب ہی تھا۔ سو جاؤ اجیت، لیمپ بجھا دو۔"

میں نے وہ خط بلاؤز میں کھونس کر انگنت کی طرح منہ پھیر لیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ مڑی اجیت کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ جیسے اطمینان دلانا چاہتی ہوں۔ لیکن تب تک لیمپ بجھ چکا تھا۔ لیکن اندھیرے کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اجیت نے دیکھ لیا تھا۔ کافی دیر بعد وہ اپنے پلنگ پر گئے۔ انھیں میں نے سب کچھ بتا دیا۔

پگارے سے رات سے پہلے ملنا نہیں ہوا۔ دوپہر بعد وہ لوٹا تو میں سیمنار میں تھی۔ وہیں کھانا تھا لیکن پگارے کے ساتھ کھانا ہمیشہ ایک تجربہ ہی رہتا ہے۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں اس کے لیے لگاؤ بڑھتا ہی جاتا ہے، سیدھا سادا، ذہین بھی ہے۔ سویرے ٹیکسی میں کچھ دور میرے ساتھ گیا۔ تب بھی بولتا رہا: "دیکھو دیدی، اپنے کو اصول سے کوئی بیر نہیں، لیکن اسے اپنی انا سے کیوں جوڑا جائے؟"

"کیا نقصان ہے اُسے انا سے جوڑنے میں؟"

"جامد ہی رہتا ہے سب کچھ۔ تبدیلی کے امکان ہی نہیں رہتے اور تبدیلی نہ ہو تو زندگی کیسے پنپے گی۔ سامنت واد، پونجی واد، سامیہ واد، گاندھی واد، سب کے ساتھ یہی تو ہوا۔ دھرم، مذہب کے ساتھ بھی..."

میں نے کہا: "اتنے اصول، اتنے خیال ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ تبدیلی تو ہوتی ہے فتح پر..."

اس نے بیچ میں ہی ٹوک دیا: "جانتا ہوں دیدی، ہوتا ہے لیکن ایک اور نئے اصول کے طور پر۔ کچھ نیا کرنے کے زعم کے طور پر۔"

"کیا تم نہیں سوچتے کہ انا نہ ہو تو شخص کچھ کر ہی نہ سکے؟ گوشہ نشیں رہنا، خاموش رہنا، انا کے ہی متبادل ہیں، انا بھی ایک طرح کی توانائی ہے، کام کا ہی حصہ..."

"کیا کہا!" اس نے کچھ حیران ہونے کا ڈرامہ کیا۔ پھر جیسے سمجھ گیا ہو، "ہاں، میں نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ آدمی سب کچھ اپنے آپ ہی تو نہیں سوچ لیتا۔ دوسروں سے بھی سیکھتا ہے۔"

پھر باہر دیکھ کر ایک دم بولا، "رکو بھائی، مجھے یہیں اترنا ہے۔"

ٹیکسی تیزی سے آواز کرتی رک گئی۔ باہر نکل کر میرے پاس آیا، "دیکھو دیدی، آگے میں نہیں جاؤں گا۔ جتنا ہم جان سکے، وہ آپ کو پتہ ہے۔ وہ کہاں ہے، آپ ڈھونڈ سکتی ہیں۔ ٹیکسی برابر آپ کے پاس رہے گی۔ جہاں کہیں گی آپ کو چھوڑ دے گی۔ میرے گھر، ڈاکٹر سنگھل کے گھر..."

نام اس کا کیا تھا، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آسانی کے لیے اسے راجما یا راج کلی کچھ بھی کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ کمزور طبقے کے ایک خاندان کی یہ بیٹی پولس کی ہوس کا شکار ہوئی۔ بعد میں انھوں نے اس پر شراب کا دھندہ کرنے کا الزام لگا کر حوالات میں بند کردیا۔ وہاں پتہ لگا، وہ حاملہ ہے۔ وہ بلاتکار کا ثبوت ہوسکتا تھا، سو اسے اسقاطِ حمل کے لیے مجبور کیا گیا۔ لیکن یہ واقعہ چھپا نہ رہ سکا۔ یہ خبر جنگل کے آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ اخباروں میں اس کے فوٹو چھپے، سماجی تنظیموں نے اس غیر انسانی واقعہ کے خلاف جلوس نکالے، دھرنا دیا، اس کے ماں باپ سے انٹرویو کر کے انھیں شائع کیا گیا۔

اوپر کے دیوتا بھی جاگے۔ پولس کمشنر نے اس کے گاؤں کے تھانے کے سبھی افسروں کو گرفتار کرالیا اور راج کلی سے پوچھا، "پہچان سکتی ہو، ان میں کون ہے، جس نے تمھارے ساتھ بدفعلی کی؟"

اس نے پہچان لیا۔ وہ کمشنر کو اس اسپتال بھی لے گئی جہاں اس کا اسقاط حمل کرایا گیا تھا۔

لیکن اس کے بعد وہی ہوا جو ایسے حادثات کے ساتھ ہوتا ہے۔ نہ تو اخباروں نے کوئی دلچسپی لی۔ نہ بلاتکار مخالف تنظیموں نے۔ راج کلی اور اس کا خاندان کیا کر سکتا تھا؟ عنقریب اد پر سے سماجی بدنامی سہنے کا عذاب۔

اسی عذاب سے تو ملاقات کرنا چاہتی تھی میں۔ میرے پاس اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں تھا۔

بستی بھی چھوٹی نہیں تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا، رکشہ اسٹینڈ پر روکو۔ میں اس لڑکی کا پتہ معلوم کرتی ہوں۔"

میرا سوال سُن کر رکشے والے مسکرائے، مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر گردن ہلا کر چلے گئے۔ تیسرا رکشے والا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے پہچان رہا ہو، "بولا، آپ خفیہ پولس میں کام کرتی ہیں؟"

میں ہنس پڑی، "نہیں بھائی! راج کلی کبھی میرے پاس کام کرتی تھی۔ دیکھنے آئی ہوں وہ شاید بیمار ہے۔"

"آپ نہیں جانتی، پولس نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ وہ یہاں نہیں رہتی۔ ادھر پچھم میں ایک گاؤں ہے، وہاں جاکر پوچھیے۔"

میں کچھ پوچھتی، اس سے قبل ہی وہ جا چکا تھا۔ میں حیران نہیں ہوئی۔ وہ مجھے واقعی سی آئی ڈی سمجھ چکا تھا۔ اس گاؤں میں بھی ایسا ہی ہوا، لیکن وہاں اُسے سب جانتے تھے۔ میں نے پوچھا، "اس کے گھر مجھے لے جاسکتے ہو؟"

کچھ تو مُنہ بچکا کر آگے بڑھ گئے۔ ایک نے فلسفیانہ لہجے میں کہا، "نا بابا، وہاں کون جائے؟ پولس نے مُنہ کالا کیا ہے اس کے ساتھ۔"

پھر انھوں نے پوچھنا شروع کیا، "آپ بھی پولس میں ہیں کیا؟ اب کیا کریں گی اس کے ساتھ، پھر جیل میں رکھیں گی؟"

"نہیں بھائی، میں نہ تو پولس میں ہوں نہ کوئی دوسری سرکاری افسر۔ کبھی اس نے میرے ساتھ کام کیا تھا۔ بس ملنے آئی ہوں۔"

پاس کھڑے ایک نوجوان نے اشارہ کیا، "میرے ساتھ آئیے۔"

وہ مجھے اپنے گھر لے گیا، ماں سے بولا، "یہ راج کلی کا پتہ پوچھتی ہیں۔"

ایک نفرت بھری مسکان اس ضعیفہ کی جھرّیوں میں سے اُبھر کر چہرے پر پھیل گئی، دوسرے ہی لمحے بول اُٹھی، "جِھی! کس سے ملنے آئی ہیں آپ، جانتی ہیں پولس نے مُنہ کالا کیا اس کے ساتھ، پھر حمل گرایا۔ کئی مہینے جیل میں رکھا۔ کس کے کام کی رہی وہ اب؟"

جی میں آیا، ایک تھپڑ دے ماروں اس ڈوکری کے گال پر۔ لیکن میں تو راج کلی سے ملنے کا ارادہ کر کے آئی تھی۔ چپ چاپ باہر آ گئی۔ لیکن اب تک میں سمجھ گئی تھی کہ گھر یہاں سے بہت پاس ہے۔

اور واقعی پھر پوچھنا ہی نہیں پڑا۔ دور سے ہی دیکھ لیا، ایک گھر کے باہر چھوٹی سی بھیڑ لگی ہے۔ میرے آنے کی خبر اب تک پھیل چکی تھی۔ راج کلی کے ماں باپ گھر کے باہر کھڑے ہو گئے تھے۔ من میں طرح طرح کے شبہات سمیٹے میں اُدھر ہی بڑھ رہی تھی۔ ساتھ ہی مشتاق بھیڑ بھی شاید سوچ رہی تھی کہ کیا ہو گا اب۔ کیا یہ میم صاحب راج کلی کے ماں باپ کو بھی لے جائیں گی یا...

حیرانی سے راج کلی کے ماں باپ نے مجھے دیکھا۔ دو تین پل لگے انھیں مطمئن ہونے میں۔ پھر پتا نے بھیڑ کو بھگا دیا اور مجھے اندر آنے کو کہا۔

اندر آنے کے بعد دروازہ بند کرنا وہ نہیں بھولا۔ میں دیکھ رہی تھی ــ بس ایک کمرہ، مشکل سے تین کھاٹ آ سکیں۔ ایک طرف باورچی خانہ جیسا حصہ، لیکن سب کچھ قرینے سے رکھا تھا، انگیٹھی پانی، آٹے کا کنستر، برتن ایک دیوار پر جڑے تختے پر سجے تھے۔ گھر گرہستی کی کچھ معمولی چیزیں تھیں...

میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تب پتا نے پوچھا، "کہیے، کیا کام ہے آپ کو، کہاں سے آئی ہیں آپ، کیسے جانتی ہیں آپ ہمیں؟"

ایسے ہی بے شمار سوال اچھال دیئے کچھ مشتاق، کچھ ڈرے ہوئے پتا نے۔ ماں کی آنکھوں میں بھی سوال تھے اور بچوں کی آنکھوں میں بھی۔ ایک پل کے لیے میں کچھ سہمی تو، راج کلی اور میں کہیں نہ کہیں ایک سطح پر تھے، لیکن میں نے جلد ہی خود کو اُدھر سے توڑ لیا اور رشانت سنجیدہ آواز میں بولی، "آپ مطمئن رہیں۔ پولس اور سرکار سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ راج کلی کی کہانی میں نے پڑھی تھی۔ بعد میں کیا ہوا، پولس نے کیا کیا، اب وہ کہاں ہے؟"

ماں نے جواب دیا، "وہ یہاں نہیں ہے۔ پولس کے حکم سے ہمیں اُسے اپنے دیس بھیجنا پڑا۔ پولس نے کہا، تین سال تک اُسے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ آئی تو پھر..."

ماں اچانک خاموش ہو گئی۔ جو زبان پر آیا تھا وہ کہنے لائق نہیں تھا۔ پھر اس کے پتی نے اسے ٹوک بھی دیا تھا۔ بولا تو آواز میں تلخی، احتجاج اور بے بسی تھی، "آپ ہماری کہانی کیوں جاننا چاہتی ہیں، کیوں بڑھانا چاہتی ہیں ہماری مصیبتیں؟ کیا کیا ہے مہیلا منڈل نے؟ کیا وہ ہمیں انصاف دلا سکے؟ کیا راج کلی کی شادی کا انتظام کیا انھوں نے؟ کوئی نوکری دلوا سکے؟ وہ تو اس حوالدار کو معطل تک نہیں کرا سکے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتا وہ اب بھی غریبوں کی عزت لوٹتا پھرتا ہے۔ بس اپنا نام کرنے کے لیے جلوس نکالے، نعرے لگائے اخباروں میں فوٹو چھپوائے اور بس . . ."

میں اس کے درد کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ دھیرے سے بولی "میں مہیلا منڈل سے نہیں آئی ہوں۔"

"تو کسی اخبار سے آئی ہوں گی۔ انھوں نے ہی کیا کیا ہے؟ ہمارے فوٹو چھاپے۔ دنیا بھر کو بتا دیا کہ میری بیٹی کے ساتھ بلاتکار ہوا۔ اس کا حمل گرایا گیا۔ یہاں آپ نے دیکھ ہی لیا کہ لوگ ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ کیسی نفرت ہے، ان کی آنکھوں میں ہمارے لیے۔ سوچ سکتی ہو، کیسے رہتے ہیں ہم ان لوگوں کے بیچ۔"

وہ غصہ اور درد سے پھنکار رہا تھا الفاظ سے زیادہ اس کی آنکھیں بول رہی تھیں اور میں چپ چاپ ایک ملزم کی طرح سن رہی تھی۔ میں بھی ملزم ہوں۔ میں بھی تو اسی سماج کا حصہ ہوں۔ کیا کیا ہے میں نے۔ کیا کیا شالنی دیدی نے؟ کیا میں اُسے ایڈریس دوں کہ اپنے کو اپنے آپ آزاد کرو، اور کوئی نہیں دے گا نجات تمھیں؟"

کئی پل ہم سب خاموش ہی رہے۔ لیکن خاموشی تو ہزار زبانوں سے زیادہ پریشان کرتی ہے۔ اس درد سے نجات بھی دلائی اس کے بتانے۔ دیکھتی ہوں جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر اپنے چھ سات سال کے بیٹے کو دیتا ہوا کہہ رہا ہے، "بیٹے، ایک تھمس اپ کی بوتل تو لے آ، دیکھیو ٹھنڈی ہو۔"

بچہ اچھا کہتا ہوا باہر بھاگا اور وہ پھر میری طرف دیکھتا ہوا شانت آواز میں بولا جیسے معافی مانگ رہا ہو، "میں آپ کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔ معاف کر دیں۔

فکر کے مارے ساری ساری رات سو نہیں پاتا ہوں۔ کیا کروں راج کلی کا؟ کیا قصور ہے اس کا؟ کون کرے گا اس سے شادی؟ اُس کی ان درندوں نے عصمت ہی نہیں لوٹی بلکہ حمل بھی گروایا۔ بے چاری پندرہ برس کی تھی جب وہ جانور اُسے یہاں سے کھینچ لے گیا تھا۔ میں تب یہاں نہیں تھا۔۔۔"

"لیکن میں تو تھی۔ کیا کر سکی میں؟ رات کے دو بجے تھے جب وہ آئے۔ بولے "راج کلی سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"ان کے شور سے سب بچے جاگ چکے تھے۔ راج کلی کچھ نیند میں، کچھ اس بے وقت کے حملے سے ڈری سہمی دروازے پر آکر بولی، 'کیا بات ہے ماں؟'

"تب تک حولدار نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ایک دم آگے بڑھ کر اُس نے راج کلی کو دبوچ لیا اور کھینچتا ہوا باہر لے گیا، "کوئی بات نہیں ہے، بس دو تین سوال پوچھنے ہیں مجھے تم سے۔"

"اور جب تک ہم کچھ سمجھیں انھوں نے اُسے جیپ میں پٹکا اور لو دو گیارہ ہو گئے۔ میں بدحواس سی پیچھے بھاگی تو ایک نے زور سے میرے سر میں ڈنڈا دے مارا۔ میں گر پڑی۔۔۔"

میرے اندر باہر سب کچھ حیران تھا۔ سسکیوں کے درمیان اس کی ماں کہہ رہی تھی، "ظالموں نے اس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے، کپڑے پھاڑ ڈالے اور۔۔۔"

ایک پل کے لیے پھر سب کچھ شانت ہو گیا۔ بیچ بیچ میں میرے اندر تیز سیٹیاں بج اٹھتیں۔ میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ سب کچھ اپنے من کے پردے پر دیکھ رہی تھی۔ کئی پل کے بعد اس کے پتا نے کہا، "اب آپ ہی بتایئے، موتی کی سی آب جیسی لڑکی کی آبرو چلی گئی تو باقی رہ کیا گیا؟ لوگ یہ کب سوچتے ہیں کہ قصور کس کا ہے۔ ان کی نظروں میں تو لڑکی ناپاک ہو گئی۔ لیکن ہم تو ماں باپ ہیں۔ کیسے پھینک دیں اسے کوڑے پر؟ کیسے گھونٹ دیں اس کا گلا؟ کون کرے گا اس سے شادی؟ ہمیں ہی رکھنا ہوگا اسے اپنے پاس، لیکن کب تک۔۔۔ کب تک۔۔۔؟"

یہ کشمکش ہزار صورتوں میں میرے ذہن میں گونج رہی تھی، جیسے کائنات میں کہیں کچھ نہیں تھا۔ تھی تو بس راج کلی اور اس کے چاروں طرف امڈتا یہ زندہ جاوید قیامت سا سوال۔ پتا کہہ رہا تھا، "مصیبت اکیلے ہی تھوڑی نہ آتی ہے۔ دو سال پہلے اس کا بھائی ریل حادثے میں جان

کھو بیٹھا تھا۔ اس کا اچھا بھلا کام چل رہا تھا۔ ہم خوش تھے۔ اس کے جانے کے بعد مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کیا کرتے؟ راج کلی پھل سبزی بیچنے باہر جانے لگی۔ تبھی اس حوالدار کی نظر پڑی اس پر۔"

میں نے جیسے خود کو اس درد بھرے ماحول سے توڑ لینے کا ارادہ کر لیا تھا، بولی "کیا میں راج کلی سے مل سکتی ہوں؟"

"کہہ نہیں سکتا بہن جی! ہزاروں لڑکیوں کے ساتھ روز بلاتکار ہوتا ہے، لیکن وہ کسی سے کہتیں نہیں۔ میری بیٹی کی کہانی ہوا میں اڑ کر چاروں طرف پھیل گئی۔ غلطی ہماری تھی۔ ہم ہی بھگت رہے ہیں۔ آپ کیا کریں گی مل کر؟ بلاتکار کے نشان تو ملیں گے نہیں۔ وہ صحت مند ہے۔ جوان ہے۔ جسم ٹھیک ہو گیا، لیکن من ..."، وہ دو پل کے لیے خاموش رہا، پھر بولا "ایک اور دشواری ہے اس کے یہاں آنے میں۔ حوالدار نے کہا ہے، اگر وہ یہاں آئی تو... پہلے ہی کیا کم بیٹا ہے ظالموں نے اسے، جواب بلا کر..."

وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ الفاظ گلے میں ہی رندھ گئے تھے۔ کیسا بھی مرد ہو، تھا تو پتا ہی کتنا سمجھانا پڑا اسے۔ کتنا یقین دلایا کہ کہیں کچھ نہیں چھپے گا۔ تب کہیں اس نے کہا "اچھا آپ تین دن بعد آویں۔ دو دن تو آنے جانے میں ہی لگ جائیں گے۔"

ایک بار تو جی میں آیا کہ چپ چاپ اٹھ کر چل دوں اور پھر کبھی نہ لوٹوں۔ میں کون ہوتی ہوں ان کے درد کو کریدنے والی؟ لیکن میں، میں تھی ہی کہاں۔ وہاں تو نہ جانے کون اجنبی آبیٹھا تھا جو ہر اس عورت کے ضمیر کو جس کے ساتھ بلاتکار ہو چکا ہے، پرت در پرت اکھاڑ کر دیکھ لینا چاہتا تھا اور جان لینا چاہتا تھا کہ کیا اسے زندہ رہنے کا حق نہیں ہے؟ کیا اسے مرد ذات سے، جس نے اسے بھرشٹ کیا، تل تل کر کے جلتے رہنا پڑے گا؟ کیا کبھی اسے اس بےدردی مرد کے چھلاوے سے نجات ملے گی...؟

اس لیے تیسرے دن جب میں نے اپنے آپ کو اس اٹھارہ سالہ راج کلی کے سامنے پایا تو مجھے ذرا بھی حیرانی نہیں ہوئی۔ میں نہیں جانتی اسے پہلی نگاہ میں خوبصورت کہا جا سکتا ہے، لیکن جوانی یقیناً اس کے جسم میں ٹھہر گئی تھی۔ جب تک اس کی اداس آنکھوں میں گہرائی تک نہ جھانکا جائے، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی نہ صرف درندوں کی ہوس کا شکار ہوئی ہے۔

بلکہ اسقاط حمل کے عذاب سے بھی گزر چکی ہے . . .

ایک پل کو لگا جیسے میرے سامنے راج کلی نہیں ہے، خود میں ہوں۔ میں بھی تو اسی عذاب سے گزری ہوں۔ تبھی تو اس کے عذاب کی کہانی سننا چاہتی ہوں اور محسوس کرنا چاہتی ہوں کہ میں اکیلی نہیں ہوں۔ ایک پوری ذات ہے اور یہ خود کو کھو کر، خود کو پانا ہے۔ خود کو پانا کوئی مذاق نہیں۔ یہ احساس مجھے قدرِ مطمئن کر دیتا ہے، دوسرے کے عذاب سے کس قدر آسودہ۔ کتنی ظالم ہوں میں . . .

میں تیزی سے اپنی گردن کو جھٹکا دیتی ہوں اور اتنی ہی تیزی سے آگے بڑھ کر راج کلی کو اپنی باہوں میں لے کر کہتی ہوں، "میں تمھاری دوست ہوں۔ راج کلی کسی بھی طرح تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ تمھارے ساتھ جو کچھ ہوا اس وجہ سے تم میری نگاہ میں رزیل نہیں ہو گئی ہو۔"

راج کلی ہنس پڑی۔ وہ ہنسی کیسی زہریلی تھی۔ میرے باطن کو چیر گئی۔ بولی، "بہت سی عورتیں ہیں جو اپنے یاروں کے ساتھ منہ کالا کرتی ہیں یا ان کی زبان میں کہوں تو عیش کرتی ہیں۔ راز کھلنے پر ضرور وہ کچھ دن کے لیے بدنام ہو جاتی ہیں، لیکن پھر لوگ انھیں بھول جاتے ہیں۔ وہ میری طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے 'اچھوت' نہیں ہو جاتیں۔"

اس کی آواز میں نہ پشیمانی تھی نہ تلخی۔ اُسے گھر لوٹنے کی خوشی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس عذاب کا خاتمہ نہیں ہے۔ اس وقت بھی وہ کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ من کی اتنی نہیں جتنی تن کی۔ اس نے بتایا، "آپریشن کے بعد مجھے آرام کی ضرورت تھی، تانک بھی چاہیے تھے کچھ لیکن ہوا یہ کہ مجھے گھر سے باہر بھیج دیا گیا۔ تن اور من کی اتنی گہری مار کھا کر میری کیا حالت ہو سکتی تھی، وہ آپ سوچ سکتی ہیں۔

"ماں نے مجھے دیش بھیج دیا۔ وہاں کے لوگوں کو نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ کیا بیت چکا ہے۔ اس لیے وہاں رہ سکی۔ اور رہ سکوں گی اس کا مجھے خود یقین نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ بمبئی اور دیش کے گاؤں کی زندگی کیا ایک ہے؟ وہاں صبح سے شام تک کھیت میں کھٹنا پڑتا ہے۔ چاہے اندھا دھند بارش ہو یا دہکتا سورج۔ جی ٹھیک ہوتا تو میں وہ

کام کر بھی لیتی، لیکن سزا کیوں اور کس بات کے لیے؟ میں وہی جاننا چاہتی ہوں کہ قصور کیا میرا ہے؟ مجھ پر ہی ظلم ڈھایا گیا اور مجھے ہی سزا بھی ملے — یہ کیسا انصاف ہے؟"

یہی سوال تو میری رگ رگ میں پیوست ہو کر مجھے بے چین کیے ہے۔ کیا جواب دوں! بچنے کے لیے میں نے سیدھا سوال پوچھ لیا، "کیا تم اس حادثے کو بھول نہیں سکتیں؟"

"کیسے بھول سکتی ہوں؟ تن کا گھاؤ بھر سکتا ہے، لیکن من پر لگی چوٹ! اور میں بھولنا چاہوں تو کیا سماج بھولنے دے گا؟ ہزار ہزار نفرت سے بھری آنکھیں زندگی کی آخری سانس تک میرے وجود کو چیرتی رہیں گی۔ آپ تو دیکھ چکی ہیں ہمارے پڑوسیوں کو۔ جب وہ درندہ مجھے کھینچ کر لے جا رہے تھے تب پکارنے پر بھی کوئی نہیں آیا تھا اور اب... آپ تو جان ہی گئی ہیں!"

اور یہاں آ کر اس کا باندھ ٹوٹ گیا، سسکیوں کے بیچ اس نے رُک رُک کر کہا، "میں کچھ بھی نہیں بھولی۔ بڑے افسروں نے مجھ سے کہا تھا — اگر تم اُسے پہچان سکو تو ہم اُسے سزا دیں گے۔ چار حوالدار میرے سامنے تھے لیکن اُسے پہچاننے میں مجھے ذرا بھی تو دقت نہیں ہوئی۔ میں نے بتا دیا انھیں، 'یہ ہے وہ کتا!'

"لیکن انھوں نے کیا کیا اس کے ساتھ؟ اُسی تھانے میں مونچھوں پر تاؤ دیتا وہ آبرو لوٹتا ہے میرے جیسی بے بس عورتوں کی اور دھمکی دیتا ہے۔ اور مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑا جیسے میں ... جیسے میں ..."

وہ چیخ پڑی تھی اور مجھے لگا تھا کہ میں چیخی ہوں کیوں کہ میں پسینہ پسینہ ہو گئی تھی۔ راج کلی اُسی جوش میں کہہ رہی تھی، "لیکن میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ کیوں ڈروں، میں نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔ میرے ساتھ بُرا کام ہوا ہے۔ میں وہی ہوں جو پہلے تھی، وہ مانتے رہیں مجھے گنہگار میں تو کہتی ہوں، گنہگار وہ ہیں جو مجھے گنہگار کہتے ہیں۔ نہیں کیا؟ کیا کیا انھوں نے بھی جو آپ کی طرح ہمدردی جتانے آئے؟ مہیلا منڈل اور نہ جانے کون کون؟ میں نے انھیں سب کچھ بتایا۔ ہسپتال بھی لے گئے لیکن کسی نے کچھ نہیں کیا۔ آپ بھی کچھ نہیں کریں گی، لیکن میں کروں گی۔ بمبئی لوٹ آنے دو، پھر بتاؤں گی اس کتے کو..."

آگ کی چنگاریوں کی طرح الفاظ بکھر رہے تھے راج کلی کے مُنہ سے اور اس کے ماں باپ ڈر سے کانپ رہے تھے۔ ماں نے کہا، "نہیں بیٹی! ایسا نہیں بولتے۔ وہ سُن لیں گے تو..."

"انھیں سنانے کے لیے ہی تو بول رہی ہوں۔"

پِتا نے لمبا سانس کھینچا، "کاش! میں کسی طرح اس کی شادی کر پاتا اور یہ یہاں سے چلی جاتی۔"

راج کلی تڑپ اُٹھی، "ٹھیک ہے، شادی کر دیں گے آپ لیکن میرے ہونے والے پتی نے بار بار کرید کر اس حادثے کے بارے میں پوچھا تو کیا ہوگا؟ کیا ہوگا اگر اس نے اسی وجہ سے میرے ساتھ بُرا سلوک کیا؟ وہ سب میں نہیں سہ سکوں گی۔ اور اگر آپ نے بغیر سب کچھ بتائے شادی کر دی، اور اس نے بعد میں سُن لیا، کیوں کہ بری بات سات پردوں میں چھپانے پر بھی نہیں چھپتی، تب وہ مجھے نکال دے گا اور میں راہ کی بھکارن بن کر بھٹکا کروں گی..."

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، گلا رندھ گیا تھا۔ "تب ابھی کیوں نہیں مجھے گھر سے نکال دیتے؟"

اس کا ہی گلا نہیں رندھا تھا، سارا ماحول رندھ گیا تھا۔ اس کے ماں باپ چپ چاپ آنسو بہاتے رہے۔ میں نہ جانے کہاں پہنچ گئی تھی۔ پژمردہ، شرمسار، ہاری ہوئی اس پسماندہ طبقے کی لڑکی کے سامنے۔ کاش! میں بھی پکار پکار کر کہہ سکتی کہ میں نے اپنے ساتھ بلاتکار ہونے دیا، میں نے... لیکن نہیں کہہ سکی۔ کیوں کہ میں اونچے متوسط طبقے کی عورت تھی اور وہ...

میں نے سنا، راج کلی آہستہ آہستہ لیکن نفرت بھری آواز میں کہہ رہی تھی، "میں آدمیوں سے نفرت کرتی ہوں۔ وہ سب وحشی جانور ہیں۔ ان میں کوئی جذبہ نہیں ہے۔ ہم عورتیں صرف ان کے من کی بھوک مٹانے کے لیے ہیں۔

"اور وہ کام،" اس نے بہت دھیرے سے کہا، کہیں ماں باپ سُن نہ لیں، "وہ کام بہت گندا ہے۔ کتنا درد ہوا تھا دیدی۔ مجھے لگا تھا جیسے میں مر جاؤں گی... عورت ہونا کتنا بڑا گناہ ہے دیدی۔ جنم پیچھے ہوتا ہے، بددعائیں پہلے سے ملنے لگتی ہیں۔ میں نہیں جانتی، میری شادی ہوگی یا نہیں لیکن اگر ہوئی تو میں یہی چاہوں گی کہ مجھے بیٹی کبھی نہ ہو..."

وہ نہ جانے کہاں سے بول رہی تھی۔ میں تو بس اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ میرے سامنے یہ کوئی معمولی لڑکی ہے یا ممتا کی دعاؤں سے مظلوم خود اعورت!؟ اچانک ہی پوچھ بیٹھی، ''کبھی خودکشی کا خیال آیا دل میں؟''

وہ تڑپ اُٹھی، ''میں کیوں کرتی خودکشی؟ مجھے بھی جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کو۔ کبھی کبھی رات کو سوتے سوتے جاگ پڑتی ہوں۔ پسینے سے تر۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرے ساتھ بلاتکار کیا جا رہا ہے، لیکن تبھی دیکھتی ہوں، میرے ہاتھ کھلے ہیں۔ اسی لمحے میرا ڈر دور ہو جاتا ہے۔ اگر تب بھی میرے ہاتھ کھلے ہوتے تو مجال تھی وہ کچھ کر پاتا۔ ان حرامیوں نے میرے ہاتھ باندھ دیئے تھے، منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔۔!''

وہ پھر سسکنے لگی۔ اس بار میں نے اُسے خوب رو لینے دیا۔ میرے دل میں اس وقت بے پناہ پیار امنڈ آیا۔ بھلے ہی ہمارے مزاج اور فکر میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو، ایک سطح پر ہم دونوں ایک تھے۔ جب اس کی سسکیاں کم ہوئیں تب بہت دور آسمان میں جھانکتے، مانو وہیں سے، اس نے کہا، ''اور کیا بتاؤں دیدی! شاید موت کے بعد کی زندگی بلاتکار کے بعد کی زندگی سے کہیں اچھی ہوتی ہوگی، لیکن ہمیں اس بارے میں انتخاب کرنے کی آزادی کہاں ہے!''

یہ الفاظ وہی کہہ سکتا تھا جو درد کے پورے عمل کو جینے کے لیے مجبور ہوا ہو۔ یہی عمل تو تجربہ کو احساس میں بدلتا ہے۔ اس لیے مجھے ذرا بھی حیرانی نہیں ہوئی۔ اب اس سے رخصت ہوتے وقت میرا گلا رندھ گیا۔ اُسے اپنی باہوں میں لے کر میں نے پورے یقین سے کہا، ''تو نہیں جانتی، میں بھی اسی عذاب سے گزر چکی ہوں۔ تو نے مجھے دیدی کہا ہے تو دیدی ہی سمجھنا۔ اپنا پتا دے رہی ہوں، جب جی کرے تو آنا۔ خط بھی لکھنا۔۔۔''

تب استعجاب، اور حیرانی کے احساس کے پیچھے اس کی آنکھوں میں اطمینان کا جو جذبہ اُبھرا اس نے اس کے چہرے کو ایک حیرت انگیز چمک سے منور کر دیا۔ جیسے کہہ رہی ہو، ''تو دیدی جی، تم بھی ہم جیسی ہو!''

کتنا سکھ دے جاتا ہے یہ 'ہم جیسا' ہونا۔

ٹیکسی میں بیٹھی تب بھی وہ اپنی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی مجھے عجیب تجسس بھری نظروں

سے دیکھے جارہی تھی۔ اس کی پتلیاں آنسوؤں میں تیر رہی تھیں اور چہرے پر مسکان بکھر آئی تھی۔ ایک انجانے یقین نے اس کے وجود کو با معنی بنا دیا تھا شاید۔ ہم دونوں نے مشینی انداز میں ہاتھ ہلائے۔ نظریں ملیں تب مجھے لگا یہ جو جھونپڑی کے دروازے پر ٹھگتی سی لڑکی کھڑی ہے یہ میں ہی تو ہوں...

اور میں یقین سے کہتی ہوں، راج کلی بھی تب مجھ میں اپنا روپ دیکھ رہی تھی۔ کہیں پڑھا تھا کہ زیادہ تر عورتیں ہلکی یا اوچھی ہوتی ہیں لیکن بہت بار اس ہلکے پن کے پیچھے بڑا دل چھپا ہوتا ہے، جیسے یہ اوچھا پن تشنہ زندگی کو ڈھکے رکھنے کے لیے ایک پردہ ہوتا ہے۔ راج کلی انھیں خواتین میں سے تھی۔ چھوٹ تھا کہ جس کا دل اپنی پوری طاقت کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔ اُسے اب اپنے نجات کے لیے کسی رام کے انتظار کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

میرے ذہن میں رات بھر گھنٹیاں بجتی رہیں۔ نہ جانے کس کس نے دستک دی میرے حواس کے در پر...

سب سے پہلے مجھے مارتھا کی کہانی یاد آئی جس نے بلاتکار کے عمل کے بارے میں سوچا تھا، "تم میرے جسم کے اُن حصوں کو چھو رہے ہو، جنھیں صرف میرے پتی ہی چھو سکتے ہیں۔"

میں مانتی رہی تھی کہ ایسا سوچنے کی ذہنیت صرف ہندوستانی عورت میں ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن اُس دن میرا وہم دور ہو گیا۔ مارتھا تب بچے کے ساتھ گھر میں اکیلی تھی۔ بلاتکار کرنے والے نے اچانک چھرا ہوا میں لہرایا اور بچے کو مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ اُس نے اُس کے ہاتھ باندھ دیئے، آنکھوں کو سفید پٹی سے کس کر ڈھک دیا۔ وہ برابر بولتا رہا، "میں تمھیں ذرا بھی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔ لیکن مداخلت کی تو سچ مچ مار ڈالوں گا۔"

پھر بھی مداخلت اس نے کی، لیکن بے معنی۔ جاتے وقت اس نے اُسے آزاد کر دیا تھا لیکن تب تو وہ ایک زندہ لاش کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی۔ اس حالت کو سمجھنے میں اُسے کتنی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اس نے سب سے پہلے پولس کو فون کیا۔ خوش قسمتی سے وہ مہذب لوگ تھے۔ انھوں نے اپنے اٹ پٹے سوالات سے اس کی تکلیف بڑھانے کی

کوشش نہیں کی۔ شوہر سے فون پر باتیں کرتے ہوئے اس نے پہلا جملہ یہی کہا تھا "تم مجھ سے ناراض ہو گیا؟"

"نہیں تو" بڑے پیار اور یقین سے بولا تھا وہ، "فوراً گھر آ رہا ہوں۔"

وہ پولس سے سب کچھ سُن چکا تھا۔ ہسپتال میں ڈاکٹر بھی کچھ زیادہ ہی جذباتی تھی۔ اس نے کہا "فکر مت کرو۔ ہمارا سنٹر آپ کو صلاح دے گا اور رہنمائی کرے گا۔۔!"

یہ سوچتے ہوئے تڑپ اٹھی ہیں ۔ کیوں چاہیئے اُسے رہنمائی؟ کیوں اُٹھا شوہر کی ناراضگی کا سوال اپنے ذہن میں؟ کیوں چار سال بعد بھی وہ خود اُس حادثے کو نہیں بھول پا رہی؟ کیوں الجھ رہی ہے وہ بلاتکار کے معاملوں میں؟ کیوں شک ہے اسے اپنے شوہر پر؟ کیا اسی لیے نہیں کہ بلاتکار کا سوال عورت پر مرد کے حقوق سے جڑا ہے، جو عورت کو انسان نہیں 'جنس' مانتا ہے؛ جنسی پاکیزگی اُسی حق کا ٹریڈ مارک ہے۔ اسی لیے تو کنوارا پن زندگی سے زیادہ قیمتی ہو گیا ہے۔۔۔

مارتھا نے بتایا تھا کہ جب کئی دن ہم دونوں ہم بستر ہوئے تب دونوں کے من میں ایک خاموش سوال امنڈ رہا تھا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ میرا شوہر مجھے 'ناپاک' تو نہیں سمجھتا؟ میرا شوہر جاننا چاہتا تھا کہ کیا جسمانی طور پر میں اب بھی محبت کر سکتی ہوں۔۔۔؟

ہمارے تعلقات کو معمول پر آنے میں واقعی کافی وقت لگا تھا۔ ہم بات بات میں جھگڑ پڑتے۔ میرے شوہر چاہتے تھے کہ ہم ہر کسی سے بلاتکار کی چرچا نہ کریں اور میں ہر کسی کو وہ کہانی سنانے کو تیار رہتی تھی۔ جب میرا قصور نہیں ہے تو کیوں ڈروں میں تہمت سے؟ سب کچھ کہہ کر میں نارمل ہونا چاہتی تھی لیکن ہو نہیں پا رہی تھی۔ اکیلے رہتے مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔ بار بار بلاتکار حفاظتی مرکز پر فون کرتی۔ مجھے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو مجھے سمجھ سکے۔ جو مجھ سے کہہ سکے کہ میں جو کچھ محسوس کرتی ہوں اور جو کچھ کر رہی ہوں وہ ٹھیک اور معمول کے مطابق ہے۔

مجھے بار بار اپنے شوہر پر شک ہوتا تھا کہ وہ اپنے من میں کہیں نہ کہیں مجھے قصوروار سمجھتے ہیں، تبھی مجھے چھوڑ کر دور کام پر چلے جاتے ہیں۔۔۔

میں دھیرے دھیرے اپنے آپ پر قابو پا رہی ہوں، لیکن اب بھی میں اپنے آنگن میں بیٹھ کر اکیلے چاندنی کا لطف نہیں اٹھا سکتی۔ مجھے ایسا لگنے لگتا ہے کہ کوئی جھاڑیوں میں چھپا ہے۔۔۔

ایسے حادثات کے بارے میں سوچتے سوچتے جیسے ہمیشہ لگتا ہے، ویسے ہی آج بھی لگا کہ مارتھا کا ردعمل ٹھیک ویسی ہی ہے جیسی میری تھی۔ اب بھی وہ بدنما، بدصورت شبیہیں اچانک کہیں سے آکر میری آنکھوں میں اُبھر آتی ہیں۔ اب بھی مجھے اجیت پر شک ہے اور شک کے کئی اسباب ہیں...

کیوں ہے یہ سب؟ کیوں وہی جس کے ساتھ وحشیانہ جرم ہوا ہے، مجرم بن جاتی ہے اور جو مجرم ہے وہ اُسی طرح پاک صاف بنا رہتا ہے؟

تب اُس کے اندر بیٹھا ان دیکھا جیسے اسے سمجھاتا ''یہ قانون کا نہیں، رسوم اور اس سے جڑے سماجی قدروں کا سوال ہے۔ یُگ یُگ سے جن رسوم نے قدروں کی تشکیل کی ہے، انھیں سے خوف زدہ ہے ہمارا مَن، ہماری فکر۔ ویسا ہی بن گیا ہے ہمارا نفسیات... مرد شکاری ہے، عورت شکار، مرد مالک ہے، عورت جھکتی خادمہ، مرد زمین کا مالک، عورت زمین۔ اسی سے پیدا ہوا ہے ذاتی جاگیر اور ملکیت کا احساس۔ زمین کی ملکیت عورت کی ملکیت کی ہی شکل ہے۔

لیکن کیا یہ اتنا ہی آسان ہے؟ کیا بلاتکار کی نفسیات نجات نہیں دے گی عورت کو...؟

اسی وقت اچانک نہ جانے کہاں سے آکر احمد آباد کی وہ مزدور عورت میرے سامنے کھڑی ہو گئی تھی، بولی تھی ''ہاں، ہاں، ہوا تھا میرے ساتھ بلاتکار۔ ہوش آنے پر میں نے فوراً اپنے مالک کو بلایا۔ اُس نے ساتھیوں کو جمع کیا۔ میرے ساتھ کام کرنے والی عورتیں بھی آ گئیں۔ سب اکٹھا ہو کر نکلنے پہنچے۔ جس آدمی نے بلاتکار کیا تھا وہ وہاں بیٹھا تھا۔ بس ہم نے اُسے اتنا پیٹا، اتنا پیٹا کہ اگر پولس اُسے اٹھا نہ لے جاتی تو وہ مر گیا ہوتا۔''

''نا نا، میرے مالک نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ ہم ہمیشہ کی طرح ہیں... اب مَن کی بات میں کیا جانوں اور جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے... مجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔''

جو سماج تو ہم پرستیوں سے جتنا آزاد ہوتا ہے اسی کے مطابق بنتے ہیں اس کے رسوم۔ متوسط طبقہ تو ہم پرستیوں کو سب سے زیادہ جھیلتا ہے، اسی لیے سب زیادہ وہی ڈرپوک ہے۔ جہاں ڈر ہے وہیں پاپ ہے۔ یاد آ گیا وہ حادثہ جس کے مطابق کچھ نوجوانوں نے پلنک پر گئی کچھ طالبات کو جسمانی طور پر ذلیل کیا تھا، لیکن پرنسپل کو ان کے مستقبل کی اتنی فکر تھی کہ اپنے

عوامی بیانوں میں وہ گندے جملوں اور ان کی ادائیگی کے انداز کے ذکر تک محدود رہیں. جنسی پاکیزگی کا احساس ان کے سنسکاروں میں اس حد تک رچ بس گیا تھا کہ اسے شرمناک ہی کہا جا سکتا ہے۔ وہ لڑکیاں مزدور طبقے کی ہوتیں تو کیا وہ لڑکے آزاد گھوم سکتے تھے ...؟

کتنا مشکل، کس قدر پیچیدہ ہے یہ سوال ؟ کتنی پرتیں ہیں اس کی، کتنے نسلی تفرقات۔ دیکھنے میں اس کا مطلب کتنا آسان ہے۔ ایک عورت کے ساتھ اس کی مرضی کے خلاف ایک مرد کے ذریعہ (جو اس کا شوہر نہیں ہے) غیر قانونی ڈھنگ سے اور جبریہ مباشرت کرنا بلاتکار ہے...

لیکن بلاتکار کی خواہش کیوں ہوتی ہے ؟ خواہش کیا اپنے میں صرف ایک اکائی ہے ؟ کیا یہ بہت سے احساسات کی مشترکہ شکل نہیں ہے ؟ تبھی میرے ذہن میں گونج گئے یہ الفاظ ایک بار پھر ــــ " ایسی تعلقات میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے پوری طرح بے لگام مستقل اور ساتھ ہی کچھ قابل رحم غلام بھی ہیں کیونکہ انسان میں جب تک خواہشیں ہیں، دلچسپیاں، اور لگن ہے تب تک وہ ان چیزوں کا اور ان اشخاص کا بھی غلام ہے جن پر اس کی ان خواہشوں کی تکمیل کا انحصار رہتا ہے..."

تو کیا نجات کا راستہ ان خواہشوں، دلچسپیوں اور لگن سے آزاد ہونا چاہیے۔

"نہیں،" میرے اندر سے ہی آواز آئی، "خواہشوں سے نجات نہیں، خواہشوں کی غلامی سے نجات۔ عورت کا مرد کی طاقت کی کشش سے آزاد ہونے کا مطلب بھی یہی ہے۔ طاقت نہیں طاقت کی درندگی کی کشش سے نجات ..."

صرف طاقت کیوں، دلچسپی، مزاج، داخلی میل بھی شرائط ہیں عورت مرد کے ملن کی۔

آج تک میں عورت کو ہی غلام سمجھتی آئی تھی۔ اب سمجھی ہوں کہ غلام مرد بھی ہے۔ آپس کی اس غلامی سے نجات ہی عورت مرد کے تعلقات کا محور ہے۔

میں اپنی رپورٹ کے لیے نوٹس تیار کر رہی تھی اور اسی عمل میں یہ سب میرے اپنے ذہن میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اور میں خود اپنے آپ سے مسحور ہو رہی تھی کہ میں اتنا کچھ سوچ سکتی ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی، دو بج چکے تھے۔ سب سو رہے تھے۔ میں اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔

کیونکہ انکت ضد کر کے اپنے پتا کے پاس سویا تھا۔ بچے کے لیے ہوائی جہاز سے لوٹنے کا لالچ کم نہیں ہوتا اور پھر میں بھی چاہتی تھی کہ انکت زیادہ سے زیادہ اپنے پتا کے پاس رہے۔

اس خیال سے ہی جیسے میں سہم گئی۔ میں نے قلم رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ خلا میں پھینک کر جماہی لی۔ چاہا کہ لیمپ بند کر کے لیٹ جاؤں کہ اچانک یاد آ گئی کماری سوہیلا کولالی کی۔ بنگال میں ہوئے بے شمار وحشیانہ بلاتکاروں میں ایک کا شکار وہ بھی ہوئی تھی۔ اس کا بیان پڑھ کر مجھے لگا تھا کہ نامہ نگار نے جو کچھ لکھا جیسے وہ میرے اپنے جذبات کا لفظی ترجمہ ہے۔ کوئی تو ہے، جس کے لیے عورت ہونے کا مطلب صرف جسم نہیں ہے۔ کوئی تو ہے جو بلاتکار کے لیے خود سپردگی سے ناپاک نہیں ہوتی، جو گناہ کے احساس سے، اہلیا کی طرح پتھر کی مانند کسی رام کی راہ نہیں دیکھتی۔ اس کے یہ الفاظ بار بار میرے ذہن میں گونجنے لگے: ”بار بار لوگوں نے کہا، اچھا ہوتا کہ اس قیمتی کنوارے پن کو کھو دینے کے بجائے شاید میرا مر جانا بہتر رہتا۔ یہ بات میں کبھی قبول نہیں کر سکتی۔ میری زندگی میرے لیے کنوارے پن سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

”قریب تین سال ہو گئے اس دن کو۔ لیکن کوئی ایسا دن نہیں گزرا جب اس حادثے کے آسیب نے میرا پیچھا چھوڑا ہو۔ عدم تحفظ، خوف، غصہ، بے بسی، مسلسل ان سب کا مقابلہ کرتی رہی ہوں۔ اس بیچ کبھی سڑک پر چلتے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے تو پسینہ آنے لگتا ہے اور ہونٹ دبا کر چیخ روکنی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی کسی کا دوستی سے چھونا بھی ڈرا دیتا ہے۔ گلے پر کوئی کپڑا کس کر نہیں باندھ سکتی کیونکہ تب ایسا لگنے لگتا ہے جیسے کوئی گلا دبا رہا ہے...“

”لیکن کئی معنی میں کہیں خود کو زیادہ طاقت ور پاتی ہوں۔ اپنی زندگی کی قیمت کو زیادہ سمجھتی ہوں۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے جدوجہد کی اور جیت گئی۔ یہ جیت مجھے ہمیشہ تعمیری [illegible] ہر منفی [illegible] یاد دلاتی ہے۔“

میں مردوں سے نفرت نہیں کرتی۔ نفرت کرنا بہت آسان ہے۔ بہت سے مرد بھی تو مختلف قسم کے استحصال کا شکار ہیں۔ میں مردوں سے نہیں، مردانہ اقتدار سے نفرت کرتی ہوں، اُن جھوٹی قدروں سے نفرت کرتی ہوں جن کے مطابق عورت مرد سے کمتر ہے۔ مرد کے کچھ خاص حقوق ہیں جن سے عورت محروم ہے۔ مرد عورت کا مالک ہے۔

"بلاتکار برداشت کرنا کتنا خوفناک ہے، اسے الفاظ میں نہیں بیان کیا جا سکتا۔ لیکن زندہ رہنا میں اس سے زیادہ اہم سمجھتی ہوں۔ عورت کو ایسا سوچنے کی اجازت نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ ہماری قدریں اور پیمانے بہت غلط ہیں۔۔۔"

میں نے اب لکھنا بند کر دیا اور آنکھیں بند کر کے اطمینان کی سانس لی۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں جیسے ایک نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ نتیجے پر پہنچنے کا بھی ایک سکھ ہوتا ہے۔ غلط قدروں کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں اپنی ذہنیت کو بدلنا ہوگا۔ اس ذہنیت کو جو عورت کو جائداد سمجھے جانے کی وجہ ہے اور جو وجہ ہے جنسی پاکیزگی کو زندگی سے بڑا مانے جانے کا۔

پوری طرح سے نیند کے بس میں ہونے سے قبل میں نے محسوس کیا جیسے کوئی میرے کانوں میں سرگوشی کر رہا ہے: ہمارے من میں آدم کے وقت کے جانداروں کی ذلیل ہوس اور خواہش چھپی ہے۔ ذلیل شکل دیکھ بھلے ہی نہ پائیں، لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ آدم کی پسلی سے خالق نے حوّا کو گڑھا۔ حوّا نے آدم کو جنّت سے بے دخل کرایا۔ حوّا آدم کی جاگیر ہے۔ وہ آدم کی ملکیت سے آزاد ہونے کے لیے بے چین ہے لیکن آدم پر منحصر رہنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں ہے:

اس روایت کو ہی ہمیں توڑنا ہے۔

شالنی نے میرے نوٹس کو بڑے غور سے پڑھا۔ بیچ بیچ میں وہ نہ جانے کہاں کھو جاتی تھیں۔ پڑھ چکیں تو اُن کی آنکھوں میں ایک پل کے لیے ایک تیز چمک ابھری، پھر بڑی شائستگی سے انھوں نے میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ دھیرے دھیرے لیکن مستحکم آواز میں بولیں، "بہت گہرائی میں ڈوبی ہو تم، تبھی تو منفی نظریہ نہیں اپنا سکیں۔ مسئلے کے تشکیلی حل تک پہنچنے کی تمھاری کوشش مدلل ہے، اس لیے اور بھی قابل تحسین ہے۔ لیکن ایک بات ابھی ابھی میرے ذہن میں اُبھری ہے۔ عورت ہوں اور بلاتکار کی اذیت کو جی رہی ہوں۔ لیکن وہ نکتہ بھی نظر انداز کرنے لائق نہیں، تب اور بھی جب تم نے پوری نگاہ سے مسئلے پر غور کرنا چاہا ہے اور کیا بھی ہے۔ میرا کہنا ہے کہ عورت بھی بلاتکار کرتی ہے۔ بے شک مرد کی ملکیت

سے خوف زدہ سماج میں اسے ایسے مواقع کم ملتے ہیں۔ جب ملتے ہیں تو مرد کی طرح عورت کو باندھنے جڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مرد کا تعلق بہت جلد ختم ہو جاتا ہے لیکن بار ایک نگاہ سے دیکھیں تو لالچ دے کر راضی کرنا بھی تو ایک طرح کا بلاتکار ہی ہے چاہے وہ عورت کے ضمن میں ہو یا مرد کے۔"

میں واقعی حیران تھی، بولی، "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ تعجب ہے مجھے یہ بات کیوں نہیں سوجھی، لیکن جس نتیجہ پر میں نے پہنچنا چاہا ہے، اس میں مَیں سمجھتی ہوں، اس نکتہ کے آجانے پر بھی کوئی تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت مرد کو نہ تو ایک دوسرے کی غلامی کرنی ہے، نہ ایک دوسرے میں کھو جانا ہے اور نہ ایک دوسرے پر اپنے کو مسلّط کرنا ہے۔ بس اپنی اپنی آزاد شخصیت بنائے رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے جڑنا ہے، 'اردھ ناریشور' کی طرح۔"

ان الفاظ پر شالنی مسکرانے لگیں۔ بولیں، "صحیح علامت کا انتخاب کیا ہے تم نے اپنی بات کہنے کے لیے۔"

یہ باتیں لوٹتے وقت ٹرین میں ہوئی تھیں۔ اجیت انکت کے ساتھ کل ہی ہوائی جہاز سے چلے گئے تھے۔ میں شالنی اور وجے پگارے تینوں ٹرین سے لوٹ رہے تھے۔ پگارے کو میں نے اپنے نوٹس اگلے دن سویرے دکھائے۔ راج کلی کے پاس سے لوٹنے کے بعد بس فون پر بات ہوئی تھی، لوٹنے کے انتظام کے سلسلے میں۔ اُس نے اتنا ہی پوچھا تھا، "ان لوگوں سے ملاقات ہوئی؟"

"ہاں، ہوئی۔ جو جاننے لائق تھا وہ جان لیا ہے۔"

"بہت اچھا، تو اب دہلی پہنچ کر رپورٹ لکھ ڈالیے۔"

"کوشش کروں گی۔" میں نے اتنا ہی کہا، یہ نہیں بتایا کہ اتنی خوش ہوں کہ اگر آج رات کو ہی نہیں لکھ سکی تو میرا ذہن پھٹ سکتا ہے۔ تب واقعی میری یہی حالت تھی۔ لکھنے کے لیے مجبور ہو جانا تخلیقی عمل کا بہترین لمحہ ہے۔ اس لیے جب میں نے تفصیلی نوٹس اسے پڑھنے کے لیے دیئے تو وہ حیران ہو گیا، "لکھ بھی ڈالی رپورٹ۔"

"رپورٹ نہیں، ابھی نوٹس ہے، پڑھ کر دیکھو کیسے ہیں۔"

اُسے پڑھنے میں ایک گھنٹہ لگا۔ پورے وقت اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، پڑھ چکا تو

میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں میں چنگاریاں چمک رہی ہیں۔ بولا — "کیسے بدلیں گی قدریں، کیسے تشکیل ہوگا اردھ ناریشور کا تصور؟ مجھے تو یقین نہیں ہوتا۔ ہاں عورت مرد کو ایک دم رد کر دے تو شاید قدریں بدل سکتی ہیں۔ لیکن کیا عورت ایسا کر سکے گی؟ کیا یہ کرنا ممکن ہے دیدی؟ اپنی سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے کہ ساری دنیا ختم ہو جائے، قیامت آجائے اور اس کے بعد جو کائنات ہو اس میں عورت مرد اردھ ناریشور کے مطابق ہوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا، "اس کی کیا گارنٹی ہے کہ ایسا ہو سکے گا؟"

"ہاں، گارنٹی تو نہیں ہے، لیکن کیا ہم ایسا نہیں مانتے کہ انسان سچے دل سے جس چیز کی خواہش کرتا ہے وہ پوری ہو جاتی ہے؟"

"ہو جاتی ہے تب، جب خواہش کے ساتھ کوشش بھی ہو۔ تو ہم ابھی سے کوشش کیوں نہ کریں؟ قیامت کی فکر کیوں کریں؟"

"آپ سمجھتی ہیں ایسا ہو سکتا ہے؟"

"اُمید اور آرزو پر یہ دنیا قائم ہے، ہم تو کوشش بھی کریں گے۔"

"اور کوشش کرتے کرتے صدیاں بیت جائیں گی۔"

"گنگا کو میدان میں لانے کے لیے سوریہ ونشیوں کی چار نسلیں کھپ گئی تھیں۔"

"دیدی!" وجے نے زور دے کر کہا "وہ طبیعیات کو زمین پر اتارتے جیسا تھا۔ یہ تو دل کا سودا ہے۔ صدیوں کے سنسکاروں میں جکڑا ہے وہ۔ تمہاری رپورٹ کے لفظ لفظ میں کس قدر درد ہے۔ کہتے ہیں درد سے اوپر والا بھی پگھل جاتا ہے۔ لیکن وہ تو نیل کنٹھ شنکر کی طرح سارے درد کو کنٹھ میں روکے بیٹھے ہیں۔"

گلا رندھ گیا ہو جیسے، کئی پل خاموش رہا وہ۔ میری طرف دیکھ کر پھر بولا، "سچ دیدی، کتنا سہا ہے، تم لوگوں نے اچھوتوں نے، قبائلیوں نے کہیں کچھ ہوا؟ ترقی، بیداری، عروج کا کتنا دعوا ہے ہمارا۔ انسان کے کامیابی کے جھنڈے خلا میں لہرا رہے ہیں لیکن زمین پر انسانیت اسی طرح پیروں سے روندی جا رہی ہے۔۔۔"

بہت جذباتی ہے وجے پگلا رے۔ کئی پل کھویا کھویا بیٹھا رہا۔ میں بولی، "وجے، سب کچھ

سہہ کر میں نے تو یہی سیکھا ہے کہ جینا ہے تو جدو جہد کرتے رہو۔ اس جمود سے نجات کا دعوا لے کر کئی گروہ اس دنیا میں آئے ہیں۔ دل کا ملن ہو تو ان سے جڑتے میں کوئی نقصان نہیں۔ آخر تنہا انسان کب تک لڑ سکتا ہے۔۔۔؟"

ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا، "گروہ اور اصول کی بات ہم سبھی جانتے ہیں۔ معاشی نظریہ سے ہر شخص کو آزاد ہونا ہی ہوگا، اس زمانے میں لیکن اتنا ہی تو بس نہیں ہے۔ سوچو تو، جب انسان اپنے میں اتنا سمٹ جائے گا اور اس کی ساری زندگی مشین پر منحصر رہے گی، جیسا کہ امکان ہے، تو پھر جینے کا مطلب ہی کیا رہے گا؟ مطلب نہیں رہے گا تو یہ قدریں بھی نہیں رہیں گی۔ بالآخر خود ایک قدر بن جائے گا۔۔۔"

میں سمجھ رہی تھی اس کی دلیلوں کو اور اس کے کرب کو بھی۔ آدمی جب بہت پریشان ہو اٹھتا ہے تو فکر بھی جذباتی ہو جاتا ہے۔ اقدار کی تشکیل صدیوں کے تجربے کے بعد انسان نے ہی تو کی ہے۔ ان کی حفاظت بھی وہی کر سکتا ہے۔

اس کے بعد سارے راستے ہم نے اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کی۔ گھر جاتے وقت ٹیکسی میں اس نے اتنا ہی کہا تھا، "دیدی، نہیں جانتا تھا تمھارے ساتھ اتنا واقع ہو چکا ہے۔ تم تو قابل تعظیم ہو، میری تعظیم قبول کرو۔"

اور اس نے میرے پیر چھو لیے۔

دروازے پر اگر اجیت اور انکت نہ کھڑے ہوتے تو میں اس پل واقعی رو پڑتی۔ دکھ سے کہیں زیادہ تکلیف دیتا ہے سکھ۔

اجیت

سمیتا کی رپورٹ میں نے پڑھ لی ہے۔ خوش نہیں ہوں، کیونکہ اسے جانتا ہوں۔ اس حادثے کے بعد جیسے اس کے فکر کا سرچشمہ کھل گیا ہے۔ ہارے بغیر وہ حالات سے جوجھی ہے۔ بغیر رکے اس نے ایک لمبا سفر طے کر لیا ہے۔

اس بات سے مجھے خاص سکون ملا ہے کہ اس نے عورت مرد کے آپسی انحصار کی ضرورت پر حملہ کیا ہے۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ آج سماج کا ہر طبقہ عورت کو باندی ماننے کو تیار نہیں ہے؟ ایک طبقہ اُسے معاشی طور پر خود کفیل کر کے محبت اور پاکدامنی کی نئے سرے سے تشریح کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا طبقہ عورت کو ہی نہیں، مرد کو بھی ایک دوسرے کی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا کہ میں مایوس نہیں ہوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں کہیں نہ کہیں مایوس ہوں۔ بالخصوص ان الفاظ سے "خواہشوں سے نجات نہیں، خواہشوں کی غلامی سے نجات، مرد کی طاقت کی کشش سے نجات نہیں، طاقت کی درندگی کی کشش سے نجات، انحصار سے نہیں، انحصار کی ضرورت سے نجات۔"

اور ان الفاظ نے تو مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔" "ہمارے دل میں آدم کے زمانے کے جانداروں کی وحشیانہ ہوس اور خواہش چھپی ہے۔ وحشیانہ روپ ہم دیکھ بھلے ہی نہ سکیں لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے۔"

پڑھتے پڑھتے نہ جانے کیا ہوا، میں جگہ، وقت سب کچھ بھول کر ان الفاظ کو بار بار دہرانے لگا کہ تبھی سمینا نے آکر کہا، "تمھاری ڈاک، اجیت!"

اس نے ڈاک رکھ کر جانا چاہا لیکن میں نے اُسے اپنے پاس کھینچ لیا اور باہوں کے آغوش میں باندھ کر تین چار بوسے اس کے گالوں پر جڑ دیئے۔ اس نے چھڑانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ مسکرا کر میری آنکھوں میں جھانکا اور بولی، "واقعی تمھیں میری رپورٹ سے اتفاق ہے؟"

"صد فی صد!"

"جھوٹے کہیں کے!" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، "کیا تم یہ قبول نہیں کرو گے کہ کبھی کبھی ہم جس سے متفق ہونا کہتے ہیں وہ مایوس ہونا ہوتا ہے۔ تم متفق نہیں مایوس ہو!"

وہ چلی گئی اور میں اسے حیران دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیسا تلخ سچ کہہ گئی سمینا۔ لیکن تلخ ہو یا میٹھا سچ یہی ہے۔ اور سچ یہ بھی تو ہے کہ وہ خود بھی نارمل نہیں ہے۔ وہ حادثہ اس کی رگ رگ میں کھولتے خون کی طرح بہتا رہتا ہے مشتعل کیے رہتا ہے وہ سب کرنے کو جو معمولی

نہیں ہے۔ وہی تو مجبور کرتی ہے اُسے ان عورتوں سے ملاقات کرنے کو جن کے ساتھ بلا انکار ہوا۔ حیثیت کی چاہ ہی اس دشوار گزار مطالعہ کی جڑ میں ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں خود کو مظلوم اور شہید سمجھتی ہے۔

یہی بات اُس رات میں نے سمیتا سے کہی۔

وہ بولی، "تمھارا یہ الزام کتنی بار ہوا۔"

"جب تک ہم نارمل نہیں ہوتے تب تک الزام در الزام کا یہ سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے۔"

"شکر ہے، تم نے اپنے آپ کو الگ نہیں کیا۔"

"کبھی کیا ہے، بولو۔"

سمیتا خاموش چھت پر اپنی نگاہیں جمائے رہی۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے ہی کئی پل بعد پھر پوچھا، "جواب نہیں دو گی؟"

"آج جو چٹھی کیرل سے شیا ملا کی آئی ہے وہ پڑھ لی تم نے؟"

میں حیران رہ گیا، "شیا ملا کی چٹھی پڑھی ہے تم نے؟"

"ایک ہی پڑھ سکی۔"

اس بار میرے خاموش ہونے کی باری تھی۔ اُسی نے پھر پوچھا، "یہی لڑکی ہے نا، جو تمھارے کیرل میں لمبے قیام کی وجہ بن جاتی ہے؟"

"ہاں، لیکن...؟"

"لیکن کیا...؟"

"وہ لڑکی نہیں ہے، مطلقہ ہے۔"

"تب تو اور سہولت ہے تمھارے لیے۔ کتنے روپے دیتے ہیں اُسے اب تک؟"

میں سمجھ گیا۔ جو خط سمیتا پڑھ سکی تھی اس میں شیا ملا نے تین سو روپے مانگے تھے۔ میں نے جواب دیا، "کئی بار میں کل ملا کر پندرہ سو، لیکن سمی۔ سچ مانو یہ جسم کا سودا نہیں ہے۔ بہت دکھی ہے وہ۔ باپ نہیں ہیں۔ بھائی دور دبئی میں ہے۔ خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اکیلی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ بی اے کر پاتی اس سے قبل شادی ہو گئی۔ تب جان

سکی کہ اس کے شوہر کی کوئی ایک معشوقہ اور بھی ہے۔ شیاملا سے اس نے اسی لیے شادی کی تھی کہ اس کا بھائی اُسے دبئی کا ویزا دلوا سکے گا۔ ایسا نہیں ہو سکا اس لیے اس نے شیاملا کو طلاق دے دیا۔"

"تم سے کیسے ملاقات ہوئی؟"

"دو سال قبل ترویندرم گیا تھا، تب وہ ہندی تربیت سنٹر میں پڑھتی تھی۔ میری تقریر سُن کر متاثر ہوئی۔ مجھ سے ملی، لیکن میں تب اُسے نہیں پہچانتا تھا۔ بعد میں اُس نے خط لکھا۔ اس خط میں نہ جانے کیا تھا کہ تب سے اب تک لگ بھگ ستر بہتر خطوط کے جواب دے چکا ہوں۔"

"خطوط کے جواب ہی کیوں، دو بار جا بھی چکے ہو۔ اُسی وجہ سے ملیالم اور ہندی کہانیوں کا سماجی نقطۂ نظر سے تقابلی مطالعہ کر رہے ہو۔ تین سال کی چھٹی اس لیے لی ہے کہ لمبے لمبے عرصہ تک وہاں رہ سکو، نہیں؟" اس نے کہنی پر گال ٹکا کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا،" اور ایک بات کا جواب دو گے؟ میرے ساتھ وہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو کیا تم شیاملا کے اتنے قریب جا پاتے؟"

میں کانپ گیا ـــ یہ کیا کہہ دیا سمیتا نے۔ کیا جواب دوں؟ کیا میں خود جانتا ہوں کہ شیاملا کے پاس پہنچنے کی وجہ سمیتا ہے؟

طوفان کی طرح میرا وجود چکر کاٹتا رہا۔ وہاں نہ میں تھا، نہ سمیتا تھی۔ ایک عظیم الشان خلا تھا جہاں بے شمار دائرہ کا رشتے ایک دوسرے سے ٹکراتے، کائنات کو چیرتی آوازیں، قیامت کی رفتار سے گھوم رہی تھیں۔

"جواب نہیں دے سکتے نا؟"

'نہیں دے سکتا' یہی کہنا اُس پل دل کو زخمی کرتی نگاہ سے بچنے کا واحد طریقہ تھا۔ میں نے کہا،" ہاں، سمیتا، میں جواب نہیں دے سکتا۔ یہ کہنا سچ کے زیادہ قریب ہوگا کہ میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔"

سمیتا نے اس بار میری طرف نہیں دیکھا لیکن میں نے دیکھا، اُس پل نہ جانے کتنے رنگ

اس کے چہرے پر ابھرے اور غائب ہو گئے۔ کتنے احساسات آنکھوں کی پتلیوں پر تیرے اور ڈوب گئے۔ کہیں بہت دور سے اس نے کہا، "لیکن مجھے جواب مل گیا۔"

میں اچانک چیخ پڑا، "نہیں، تمہیں جواب نہیں ملا۔ تم نے جو نتیجہ نکالا وہ غلط ہے۔"

وہ اُسی تیزی سے تڑپ کر میری طرف مڑی لیکن تعجب دوسرے ہی پل وہ اتنی ہی شانت تھی۔ اُسی حالت میں اُس نے دھیرے دھیرے کہا، "تم نے بار بار جاننا چاہا ہے، میں نارمل کیوں نہیں ہو سکتی۔ کیا یہی سوال میں تم سے نہیں کر سکتی، اجیت؟ تم نارمل کیوں نہیں ہو سکتے؟"

تبھی طوفان اٹھاتا آ گیا انکت، "پاپا، پاپا! دیکھو ہم کیا لائے ہیں۔ ممی، ہماری ناچنے والی گڑیا دیکھو۔ یہ بلاک ہیں جن سے ہم تمہارے لیے، پاپا کے لیے بابا جی کے لیے مکان بنائیں گے۔ اپنے لیے بھی۔"

"سب کے لیے الگ الگ؟"

"ہاں!"

"سب کے لیے ایک کیوں نہیں؟"

"یہ بلاک بہت چھوٹے ہیں، پاپا! اس مکان میں ایک ہی رہ سکتا ہے۔"

سُمیتا اور میری نگاہ ایک ساتھ اٹھی اور مل گئی۔ میں نے فوراً اُدھر سے آنکھیں ہٹا کر کہا، "ہم تمہیں ایسے بلاک دلوائیں گے جن سے بہت بڑا مکان بن سکے گا اور ہم سب ساتھ ساتھ رہیں گے۔"

"انکت نے سنجیدہ آواز میں کہا،" ارے پاپا، یہ گھر تو کھیلنے کے لیے ہے۔ سچ مچ ہم ان میں کہیں رہ سکتے ہیں؟"

میں نے سُمیتا کی طرف بھرپور نگاہ سے دیکھا اور کہا، "دیکھ لیا ہمارے بیٹے کو۔ کھیلنے اور سچ مچ رہنے کے گھر میں کیا فرق ہے، یہ وہ جانتا ہے . . ."

لیکن میں اپنا جملہ پورا کر سکوں، سُمیتا انکت کی انگلی پکڑ کر کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔

میں بھی اب نجات چاہتا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی نیچے پہنچ گیا۔

سنتیا ملا سے ملاقات بڑی عجیب و غریب صورت حال میں ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے ڈھونڈ لیا

تھا اور اپنا سارا بوجھ مجھ انجان پر ڈال کر جیسے مطمئن ہو گئی تھی۔ مطمئن ہونے کی ایک وجہ میرے خط بھی ہو سکتے ہیں جو اس کے لیے زیادہ احساس سے پُر رہتے تھے۔ میں اپنی ساری محبت ان میں انڈیل دیتا تھا۔ میں ایک پل کو بھی یہ قبول کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ مجھے بلیک میل کر سکتی ہے یا میری محبت شکاری مرد کی محبت ہے۔

میں بخار میں تھا جب ترویندرم ریجنل انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج ٹریننگ میں میری تقریر کے بعد مجھ سے ملنے کیرل ہندی پرچار سبھا میں آئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے تک مجھ سے بات کرتی رہی تھی۔ میں تب تک اُسے نہیں پہچانتا تھا لیکن دلّی لوٹنے پر جب اس کا خط مجھے ملا تو میں حیران رہ گیا۔ اُس نے لکھا تھا ''اُس دن شام کو آپ کے ساتھ زیادہ بات چیت کرنے کی اُمید سے میں آپ کے پاس آئی۔ بخار بھول کر آپ نے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت تک مجھ سے بات چیت کی۔ میں کیا کہوں، آپ دیوتا ہیں۔ ایشور تو ارادے میں ہے لیکن آپ تو واضح طور پر ایشور ہیں۔ پیار سے بھرا ہوا عظیم دل، علم سے بھرا ہوا ذہن، آپ نے گفتگو کی۔ میں خوش قسمت ہوں، ممنون ہوں...''

کسی جوان خاتون سے ایسا خط پا کر کوئی بھی مرد پاگل ہو سکتا ہے، اسی لیے میں نے بھی اس خط کا ویسی ہی زبان میں جواب دیا۔ اُس کے بعد خطوط کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اب تک ختم نہیں ہوا۔ ان خطوط کے حوالے سے ہی وہ عزیز اور عزیز تر ہوتی چلی گئی۔ جیسے ہم صدیوں سے شناسا رہے ہوں یا پھر کسی پہلے جنم میں ہمارے درمیان محبت کا رشتہ رہا ہو۔ تین مہینے بعد اس نے اپنی درد بھری کہانی سُنائی۔ ''پتا نہیں ہیں، ماں ہیں۔ دو بھائی ہیں لیکن اپنے اپنے گھر کے ہیں۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں شادی ہوئی تھی۔ بڑے بھائی تب دبئی میں تھے۔ شوہر چاہتے تھے کہ انھیں بھی دبئی کا ویزا ملے لیکن بھائی ایسا نہیں کر سکے۔ صرف دس ہزار روپے ملے مجھے۔ ان روپیوں کے لیے شوہر نے مجھے بہت مارا۔ انھیں لینے کے بعد مجھے بے سہارا چھوڑ کر چلے گئے۔ تب ہم دہلی میں تھے۔ اتنے بڑے شہر میں میں اکیلی کہاں جاتی؟ خوش قسمتی سے پڑوس میں ماں جیسی ایک عورت تھی۔ اُس نے میری مدد کی۔ کچھ دن نوکری بھی کی۔ آخر میں دکھی مَن لے کر ماں کے پاس لوٹ آئی۔ شوہر کو طلاق دے دیا۔ وہ تو تیار

بیٹھا تھا۔ فوراً اپنی معشوقہ سے شادی کرلی۔ یہ سب اس کی طے شدہ سازش تھی۔ اس نے صرف دبئی کا ویزا پانے کے لیے مجھ سے شادی کی تھی۔ میں اکیلی رہ گئی۔ بے سہارا۔ میری زندگی، میرا پیسہ، سب چھن گئے مجھ سے۔

"میرے پاس دس تولہ سونا بچا تھا۔ اُسے بینک میں رکھ کر روپیہ لیا، تروندرم آکر اس انسٹی ٹیوٹ میں پڑھنے لگی۔ پڑھ رہی ہوں ابھی۔ چار سال ہو گئے، یہ آخری سال ہے۔ لیکن بینک کا قرض نہیں چکا سکی۔ کسی نے میری مدد نہیں کی۔ شادی کے بعد بھائی اور رشتہ دار سبھی نے مجھے بُھلا دیا۔ میں کسی کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ گئی۔

"اس دنیا میں سب کچھ پیسہ ہے۔ پیسہ ہے تو پیار ہے، دوست ہیں۔ نہیں تو آدمی لاش کی مانند ہے۔ اکیلی ماں ہے۔ اُسے چھوڑ کر کہیں جاؤں، ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ رونے لگتی ہے۔

"ابھی دانت میں بہت تیز درد تھا۔ ڈاکٹر نے کہا نکالنا ہوگا، لیکن اتنا پیسہ بھی میرے پاس نہیں تھا۔ میری قسمت اچھی تھی۔ میری ایک سہیلی آ گئی۔ وہ نوکری کرتی ہے۔ وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی اور دانت نکل گیا۔

"ایسی ہے میری زندگی۔ میں کیا کروں، آپ سوچیے۔ میں لکھتی ہوں۔ میری زبان میں ایک ناول چھپا ہے۔ ریڈیو کے لیے کہانی ڈرامہ لکھتی ہوں، لیکن ایک ڈرامے کے لئے پچیس روپے ملتے ہیں۔۔۔"

مختصراً یہ ہے اس کی درد بھری کہانی اور ظاہر ہے اسی کہانی کی وجہ سے خاص طور سے میں اس کی جانب متوجہ ہوا۔ لیکن باطن میں اور بھی وجوہات ہو سکتی ہیں جیسے کہ وہ نوجوان ہے اور پریشانی میں ہے۔ یا پھر سُمیتا کو لے کر میرے دل میں اُٹھنے والی کشمکش۔

آج مجھے لگتا ہے کہ سچ یہی تیسرا ہے، باقی سب فضول ہے۔

تعجب، اس فیصلے پر پہنچ کر مجھے ایک پل کے لیے اطمینان کا احساس ہوا لیکن دوسرے ہی پل دل گہری افسردگی میں ڈوب گیا۔ سُمیتا نے جو کچھ کیا اُس پر مجھے فخر ہونا چاہیے اور ہے بھی، لیکن ایک کانٹا ہے جو رہ رہ کر چبھنے لگتا ہے میرے تن میں اور من میں بھی۔۔۔ میں مرد تھا۔ اس

کی حفاظت کرنے کے لیے مجھے اپنے جان کی قربانی دے دینی چاہیے تھی۔ وہ عورت ہو کر جیت گئی مجھ سے یعنی مرد سے۔ اس نے میری بہن کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیا اور میں...
مرد کی مردانگی پر اس سے بڑی اور چوٹ ہو سکتی ہے کیا؟ یہ خیال مجھے مسلسل احساس کمتری میں مبتلا کرتا چلا گیا اور تب میرے باطن میں ایسی ایسی دلیلیں پیدا ہوئیں کہ مجھے خود اپنے آپ پر پشیمانی ہونے لگی...

... عورت کسی کے لیے اتنی آسانی سے اپنی عصمت داؤں پر نہیں لگا سکتی۔ اس کی ذی حس پر بے شک وِبھا کی حفاظت کا جذبہ تھا، لیکن اس کے لاشعور میں یقیناً کچھ اور وجوہات تھے۔ عورت کا کردار ہمیشہ ناقابل عبور رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مباشرت میں وہ مجھ سے مطمئن نہیں ہو سکی، لیکن روایتی قدروں کی وجہ سے ایک ہندو عورت ہونے کے ناطے اُس نے اس بات کی کبھی شکایت نہیں کی۔ نہیں کرنی چاہی، لیکن انجانے اور ان چاہے بھی وہ غیر اطمینانی دھیرے دھیرے اس کے لاشعور میں جمع ہوتی رہی اور اُس دن اچانک وہی وجہ بن گیا ہو اپنی مرضی سے ان کے ساتھ جانے کا۔ مصنف کہانی کا آدمی گر تھا، بہت کتھا، ایسی تشریحات سے بھرا پڑا ہے...

... ایسا نہ ہوتا تو اس کی لاش ملتی، وہ نہ ملتی۔ وہ یقیناً ہی آسودہ ہوئی اُن درندوں کے جماع میں۔ حالانکہ اوپر سے سماجی قدروں نے اُسے اپنے آپ کو ناپاک سمجھنے پر مجبور کر دیا اور اس سے پیدا شدہ پشیمانی سے وہ واقعی ٹوٹ گئی۔

... اور اپنے باطن میں میں بھی تو اُسے ناپاک سمجھتا ہوں۔ میں بھی تو سنسکاروں کا غلام ہوں، اُن سنسکاروں کا جو دوشیزگی کو پاک اور خداداد مانتے ہیں...

اور کیا انھیں وجوہات سے میں شیاملا کی طرف نہیں جھکا تھا؟ اس کے خطوط سے بکھرتے کرب یقیناً حساس انسان کو جھنجھوڑ سکتے تھے، لیکن میں تو اپنے داخل میں اندر رہے کشمکش سے بری طرح پریشان تھا۔ مجھے کسی نازک لمس کی ضرورت تھی۔ اور اب وہ لمس خود ہی مجھ تک چل کر آ گیا تھا۔ میں نے اس کے سیدھے سادے اپنے پن سے پُر خطوط کے جواب اُس زبان میں دینے شروع کر دیئے جو محبت سے سرابور تھی۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں...

"... تم کہاں سے آگئیں میری زندگی میں؟ خالص شمال کا خالص جنوب سے کیسا ملن، انوکھا، بے نام، ناقابل تشریح: تمھارا خط آتا ہے تو میرے رگ رگ میں امنگیں ترنگیں مارنے لگتی ہیں، خط نہیں آتا ہے تو میں چاتک جیسا سواتی کی بوند کے لیے تڑپتا ہوں ویسے ہی بے چین ہو اٹھتا ہوں..."

وہ جلد ہی مجھے میرے پیارے دوست، کہہ کر مخاطب کرنے لگی، "آپ میرے دوست ہیں کیونکہ میں آپ کے سامنے اپنے آپ کو کھول سکتی ہوں۔ یہ کھول سکنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ نہیں تو دل سنسان ہے اس رات کی طرح۔ ایک بج چکا ہے۔ آکاش کالے بادلوں سے بھرا ہے۔ بیچ بیچ میں رو پڑتا ہے۔ بارش ہونے لگتی ہے۔ تارے نہیں، چاند نہیں، چاروں طرف گھنا اندھیرا ہے۔ دور کہیں ٹرک کے جانے کی آواز گونجتی ہے۔ کتنا بوجھ اٹھاتے ہیں یہ ٹرک، لیکن انھیں آرام بھی ملتا ہے۔ منزل پر پہنچ کر بوجھ اتار دیتے ہیں اور ہلکے ہو جاتے ہیں، لیکن میرے دل کی نہ منزل ہے نہ بوجھ اترنے کا امکان۔ موت کے بعد ہو شاید..."

اس نے اول درجے میں امتحان پاس کیا لیکن اس کے لیے وہ خوشی وقتی ثابت ہوئی کیونکہ سرکاری اسکولوں میں ہندی معلم کی تقرری کی قیمت بیس ہزار روپے ہے اور اس کے پاس بیس روپے بھی نہیں ہیں۔ اس کے خطوط کا یہی کرب مجھے بار بار جھنجھوڑتا ہے۔ بار بار وہ لکھتی ہے درد بھری آواز میں "آج اونم ہے، کیرل کا سب سے بڑا تیوہار۔ رات کے دس بجے ہیں۔ آنگن میں عورت، مرد، بچے — سب امنگوں سے بھرے بھرے ناچ گا رہے ہیں۔ میں انھیں کھڑکی سے دیکھتی ہوں۔ برسوں پہلے میں بھی ایسے ہی ناچتی تھی۔ یہ سب اسی لیے میرے آنگن میں آئے ہیں۔ میری راہ دیکھ رہے ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں یہ مجھے۔ میں کبھی کرتی ہوں، لیکن میں ان سے کہتی ہوں "آپ کھیلو، میرے سر میں درد ہے" وہ میرا دکھ سمجھتے ہیں۔ جانتے ہیں میرا درد سر میں نہیں ہے، دل میں ہے..."

"آپ میرے دل کا حال سمجھتے ہیں۔ دوسروں کے آگے اسے کھولنے کو تیار نہیں ہوں۔ ان کی ہمدردی سے میری تکلیف ختم نہیں ہوگی۔ لیکن آپ نے مجھے سمجھ لیا ہے۔ میں نے آپ کا من پڑھا ہے۔ آپ مجھ سے دور نہیں ہیں۔ آج کے دن میں نے کسی کو خط نہیں بھیجا۔ آپ کے

سوا اور کون ہے خط بھیجنے کو۔۔۔!!

اتنا گہرا یقین ایک انجان، بیگانے سے۔ خطوط کے ذریعہ کچھ دنوں کا ہی تعارف تو ہے۔ کیسے ہو جاتا ہے یہ سب، سازش بھی ہو سکتی ہے اور سیدھے سادے من کا ایک یقین بھی اس کا ہی سیدھا سادہ یقین مجھے مطمئن کر دیتا ہے کہ یقین کر کے ٹھگے جانا یقین نہ کرنے سے اچھا ہے۔ وہ اپنی ہی شکل دیکھتی ہے شاید میرے دل میں۔ لیکن کیا میں واقعی اتنا عظیم ہوں؟ ہوتا تو کیوں اپنی بیوی سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا، کیوں نقاب اوڑھتا اپنی گندگی کو چھپانے کے لیے، کیوں دلیلیں گڑھتا اپنے آپ کو سچ ثابت کرنے کے لیے۔۔۔؟

اسی درمیان اُسے مشن اسکول میں نوکری مل گئی۔ بلا جھجک اُس نے مجھے لکھا پانچ سو روپے بھیجنے کو، "آپ سے مانگتے ہوئے مجھے ڈر نہیں لگتا، جھجک بھی نہیں ہوتی۔ ہوسٹل میں رہنے کے لیے ضمانت اور ایک ماہ کے خرچ کے لیے پانچ سو پچھتر روپے دینے ہوں گے۔ تنخواہ تین مہینے سے نہیں ملی۔ شاید دو ماہ بعد ملے گی۔ تب آپ کے روپے لوٹا دوں گی۔۔۔!"

تعجب، میں نے اُسے فوراً پانچ سو روپے بھیج دیئے۔ اس کا فوراً جواب آیا، "آپ کیوں مجھے اتنا پیار کرتے ہیں، اتنی مدد کرتے ہیں؟ آپ کو دیکھنے کی بڑی خواہش ہے۔ کب ملے گا وہ موقع۔۔۔؟"

وہ موقع آنے میں دیر نہیں لگا۔

اپنے کام کے سلسلے میں کالی کٹ، ترچور اور کوچی ہوتا ہوا ترویندرم پہنچا تو وہ اسٹیشن پر آئی ہوئی تھی، اپنی روم میٹ کے ساتھ۔ میرے آنے کی خبر پا کر اس نے لکھا، "آج سچ مچ میں زمین پر نہیں، جیسے تتلی بن گئی ہوں۔!"

اور جب میری نگاہ اس پر پڑی تو فوراً پہچان لیا میں نے اپنی شیاملا کو۔ اس کے چہرے پر جوش اور امنگ کی دبی دبی لکیریں مجھ سے چھپی نہیں رہ سکیں۔ اس کی آنکھیں خوشی اور پیار سے چھلک رہی تھیں۔ وہ واقعی خوشی سے شرابور تھی بھولے بھالے بچوں کی طرح۔ سازش اُس کے آس پاس بھی نہ تھی۔ میں اپنے دوست کے ساتھ تھا، اس لیے وہ ایک لفظ بھی نہ بولی۔ چپ چاپ میرے پاس آئی اور چوری چوری میرے ہاتھ میں ایک پرچہ تھما دیا۔

تب اُس کی آنکھوں سے پیار چھلکا پڑتا تھا۔ میں نے پوچھا، "کیا تم ہمارے ساتھ نہیں چلوگی؟"

اُس نے اُسی امنگ سے مجھے دیکھتے ہوئے گردن ہلادی — نہیں۔

"کیوں؟"

اب وہ بولی، "مجھے آکا شوانی جانا ہے۔ آپ فون کیجیے ہوسٹل میں، نمبر لکھا ہے۔"

میں نے فون کیا۔ وہی بول رہی تھی۔ میں نے کہا، "تم آئی نہیں؟"

"آکاشوانی میں ریہرسل تھی۔ پھر ریکارڈنگ ہوئی، تھک گئی۔"

"اب آؤ نہ۔ تب سے اکیلے بور ہو رہا ہوں۔"

"اب بھی اکیلے ہیں؟"

"ہاں؟"

. . . . .

"آرہی ہو نا؟"

"آرہی ہوں، لیکن آپ اکیلے جو ہیں۔" اور وہ ہنس پڑی، ایک معنی خیز ہنسی۔ دیر تک وہ میرے سینے میں بجتی رہی اور میں اس معمّہ میں ڈوبتا رہا۔

بعد میں اُس نے ہوٹل میں بتایا، "میں اکیلے کمرے میں آپ کے ساتھ رہوں تو یہ آپ کے دوست مجھے بدنام کردیں گے۔"

تین دن میں اس کے ساتھ رہا۔ اس کے خلوص و محبت کی کوئی حد نہیں تھی، لیکن ہم دونوں کمرے میں اکیلے نہ رہیں، اس بات کا دھیان اُس نے برابر رکھا۔ کیا وہ سمجھتی تھی کہ میں مرد ہوں اور مرد عورت کو دیکھتے ہی دبوچنا چاہتا ہے؟ پھر وہ میرے اتنے پاس کیوں آرہی ہے؟ اس نے مجھے دوست کیوں مانا، باپ یا بڑا بھائی کیوں نہیں مانا؟

مجھے اس کے گاؤں جانا تھا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ کوئی تیسرا شخص ساتھ چلے لیکن کوئی تیار نہیں ہوا۔ ہم دونوں اکیلے ہی روانہ ہوئے۔ بس میں بیٹھتے ہی وہ بدل گئی۔ برابر مجھے آس پاس کی بستیوں، راہوں، جنگلوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ اپریل کا چوتھا ہفتہ تھا۔

آسمان بادلوں سے بھرا تھا۔ چاروں طرف کیرل کی پہچان ہریالی، نیچے سرخ زمین، اوپر نیلا آکاش، بیچ بیچ میں بارش کے پانی سے بھرے کھیت، ربڑ، تاڑ، ناریل، کیلے کے پیڑ، بیچ بیچ میں یوکلپٹس بھی، ندی نالے، دھوپ نکلتی تو پسینہ آجاتا۔ کھپریل کی ڈھلواں چھتوں والے چھوٹے چھوٹے مکان، صاف ستھری بستیاں، اخبار پڑھتے مرد، تہمد اٹھائے تیزی سے جاتے مرد، سنگھار کیے عورتیں، ہاتھ ہلاتے بچے، دور پہاڑیاں، کہیں کہیں جدید طرز کے مکان بھی۔ مزدور ویسے ہی بھوت جیسے، مزدورنیاں سر پر لال رومال باندھے ہیں۔ ناریل کے جھنڈ کے درمیان تالاب کتنا اچھا لگتا ہے۔ پہاڑی علاقہ ہے یہ...

کوئی چھوٹا سا قصبہ، ۲۰ ہزار کار۔ اس دن بیٹھ تھی اس لیے گھما گھی تھی۔ موسم خوبصورت سہانا تھا اور پہاڑی کے قریب ایک اونچائی پر کھیتوں کے درمیان سبزہ سے ڈھکا اس کا مکان ہے۔ سامنے کھلا میدان، چھوٹی سی بیٹھک، وہی کرشن کی مورتی، پتا کی بڑی تصویر، اندر ایک بڑا کمرہ، اس کے داہنے طرف باورچی خانہ، بائیں طرف ایک چھوٹا کمرہ، پسماندہ متوسط طبقے کے خاندان کی حالت۔ زبان نہیں لیکن محبت چھلکی پڑ رہی تھی چاروں طرف۔ ماں سے بھابھیوں سے بچوں سے خوب باتیں ہوئیں۔ وہ برابر مترجم بنی رہی۔

جنگل کی طرف گھومنے گئے، بچے بھابھی سب ساتھ تھے۔ کتنا اچھا لگا۔ کھیتوں کے بیچ اونچے نیچے راستے، راستوں پر کیچڑ، بولی، "کبھی یہ سارا علاقہ ہمارا تھا لیکن بٹتے، بکتے بکتے بس میرے پاس دو کھیت ہیں۔ انھیں بھی بیچ دوں تو ماں کہاں جائے گی...؟"

بہت خوش ہے۔ مجھے خوب کھلانا چاہتی ہے۔ کیسی فریفتگی، کیسا پیار، رات میں پاس میں بیٹھ کر خوب باتیں کیں، گھر کی، ادب کی۔ اپنے ناول کی کہانی سنائی، میری کہانی سنی۔ اس میں ذہانت ہے لیکن اس کا اظہار اتنا موثر و منظم نہیں، جوش و بیقراری زیادہ ہے۔

تب من میں اٹھا تھا۔ کاش، یہ میری بیوی ہوتی، کاش...!

میں کانپ اٹھا تھا۔ سمیتا کو اتنا پیار کرتا ہوں، اتنا احسان مند ہوں۔ پھر یہ خیال کیوں... کیوں... کیوں؟

"کیوں کہ تم مرد ہو،" کسی نے میرے اندر سے کہا، "اجارہ داری کے بھوکے، دوشیزگی

کے پجاری، نشکاری...،

میں پھر کانپ گیا کہ وہ دوڑی ہوئی آئی، "کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

"ارے، اتنا تو کھا چکا، پھر بھی پیار سے کھلا رہی ہو تو کھلا دو۔"

فوراً ترجمہ کر کے ماں اور بھابھی کو سنا دیا۔ سب ہنس پڑے۔ جتنا کر سکتے تھے اتنا انھوں نے کہا۔ پاس پڑوس کے بچے عورتیں سب گھر میں تھے۔ اُس نے بتایا، "آج ہمارے بھگوان آئے ہیں نا۔ سب درشن کریں گے۔"

ایک مرد کے کتنے روپ، کتنے مختلف...

گڈ نائٹ کرنے سے پہلے میرا سارا انتظام کیا۔ سب سمجھا گئی۔ سویرے اُٹھتے ہی میرے پاس آئی۔ خوشی سے میری باہوں میں جھول گئی، لیکن میں نے کھینچا تو بھاگ گئی۔ میں برابر دیکھ رہا تھا۔ اس نے شائستگی کی ایک حد مقرر کر لی تھی۔ اُسے کبھی پار نہیں کیا۔ ہوٹل میں لوٹ کر بھی مچل گئی، "مجھے تو بھوک لگی ہے۔"

سامنے کیلے رکھے تھے۔ اٹھا کر کیلا کھانے لگی۔ بولی، "آپ نہیں کھائیں گے؟"

میں نے کہا، "کھلاؤ۔"

اور اُس نے وہی کیلا میری طرف بڑھا دیا۔ وہی جوٹھا کیلا میں کھا گیا۔ شرارت سے کھل کھلا پڑی...

مجھے اُسی دن دہلی لوٹنا تھا۔ اس نے کہا، "مجھے ابھی جانے دو۔ آپ کو اسٹیشن پر وداع دینے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔"

میں نے دھیرے سے کہا، "جاؤ۔"

اُس نے میری طرف دیکھا۔ کیسی نم نگاہیں تھیں، کہیں اندر تک زخمی کر گئیں۔ بولی، "ہفتے میں دو خط لکھنا، اچھا بھولنا نہیں۔ نہیں تو..."

درد اور کرب سے اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ میں نے اب اور کچھ کہا تو رو پڑے گی۔

اس کے بعد ہم دونوں کے پہلے خط ہمارے جذبات کو واضح کرتے ہیں۔

میرا خط شیا ملا کے نام

میری بہت بہت پیاری شیا ملی!

سویرے کے پانچ بجے ہیں۔ تمھارے بارے میں ساری رات سوچتا رہا۔ تم کیوں آئی میرے پاس؟ اتنا پیار بھرا تھا تمھارے خطوط میں۔ وہی تو کھینچ لایا تھا یہاں۔ پھر تم کتنی دور رہیں۔ تمھیں میں نے اپنے پاس چاہا تھا۔ تمھیں بدنام یا ذلیل کرنے کے لیے نہیں۔ میں تمھیں ایک مصنفہ کے طور پر دیکھتا ہوں۔ مصنف جذباتی ہوتا ہے۔ حساس شخص نہ کسی کا برا چاہ سکتا ہے، نہ دھوکہ دے سکتا ہے۔ تم جانتی ہو میں شادی شدہ ہوں اس لیے تم نے ہمارے رشتوں کے درمیان ایک لکیر کھینچ لی تھی۔ تمھارے لیے سرِ خم تسلیم ہے...

میں امیر ہوتا تو تمھارا سارا قرض چکا دیتا، پھر بھی جو دیا ہے اس کی یاد نہیں دلاؤں گا۔ تم خوش رہو، یہی کوشش کروں گا۔ کہاں تم، کہاں میں۔ کیسے ملے ہم۔ یہ صرف اتفاق ہے کیا؟ اتفاق کبھی بلاوجہ نہیں ہوتے...

میرے دوست احباب ہیں امیر اخاندان ہے۔ پھر بھی میں اکیلا ہوں۔ اس تنہائی کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں۔ اپنے لیے میں خود قصوروار ہوں۔ کبھی سناؤں گا وہ عجیب وغریب کہانی۔ مجھے ڈر ہے، اب کہیں تم مجھ سے دور نہ ہو جاؤ...

تمھارے دل میں میں نے کھوٹ نہیں دیکھا۔ تم نے دوست بنایا۔ میں حیران تھا لیکن خوش بھی۔ تمھاری قربت ملی، بہت کچھ ملا۔ یہ مجھے جینے کا حوصلہ دے گا۔ ایک بات بار بار کہوں گا۔ مجھ سے کبھی کچھ چھپانا مت۔ میری کسی بات کو جبر کے طور پر مت لینا۔ تمھیں جس بات سے سکھ پہنچے وہی میں چاہوں گا...

شیا ملی میں سچ مچ سمجھ نہیں پا رہا، تم میری کون ہو؟ تم سچ مچ کوئی ہو یا چھلاوہ؟ تم سے کتنی باتیں کرنی تھیں، نہیں کر سکا۔ اکیلے رہے کہاں، تم نے چاہا ہی نہیں۔ تم ہو کر بھی میرے پاس نہیں ہوتی تھیں... ایک تجربہ ہے یہ بھی...

گھر میں سب کو میرا نمسکار۔ بچوں کو بہت پیار۔ بغیر زبان کے بھی وہ مجھ سے کس قدر جڑے رہے۔ تمھارا کرشن تمھیں ہمت دے۔ تم سارے مشکلات پار کر کے کامیاب ہو جاؤ۔ میرے لیے اتنا

ہی ہاتی ہے کہ کوئی اتنی دور بیٹھا مجھے پیار کرتا ہے۔

اچھا، وداع لوں۔

تمھارا پیارا دوست

. . .

شیاملا کا خط میرے نام

پیارے دوست

میرا دل تڑپ رہا ہے۔ کل اسس وقت آپ ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ اب تک میرے گھر والے آپ کی بات چیت، آپ کے خلوص، سب کے بارے میں ذکر کرتے ہیں۔ اتنا گہرا پیار میں نے کسی کو نہیں کیا... میرا پیار، میں الفاظ میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔ میرے دل میں آپ اور آپ کا دل بھرا ہوا ہے۔ آج سے میں بہت خوشی سے اپنی زندگی بتاؤں گی۔ آپ نے ایسی ہی صلاح دی ہے مجھے۔ میرے بارے میں سوچ کر آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھ پر بھروسہ کرنا۔

آپ کو اسٹیشن پر رخصت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی۔ اسس لیے میں آج ہی گھر لوٹ آئی۔ میں ستمبر میں دہلی ضرور آؤں گی۔ پھر آپ ایک ہفتہ کے لیے ہمارے گھر آکر رہیے۔ خوب کھائیے، خوب سوئیے، خوب لکھئے۔ میرا من ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے۔ فکر مت کیجیے۔ میں آپ کے لیے ہمیشہ پرارتھنا کرتی ہوں۔ میرا من شانت ہے۔ آپ کا بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

آپ کی پیاری

شیاملی

اگلے خط میں وہ اور بھی کھل گئی۔ وہ بخار کی وجہ سے ہسپتال میں رہی۔ وہاں ڈاکٹروں سے باتیں کرنے میں اسے بڑا لطف آیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا ''جب دکھ ہوتا ہے تبھی مجھے بخار آتا ہے۔ آپ کی جدائی نے سچ مچ دل پر چوٹ کی۔ اب ٹھیک ہوں۔ میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے، آپ کے سوا۔ میں کسی پر بھروسہ نہیں کرتی۔ لیکن پتا نہیں، میں ڈاکٹروں کو کیوں اتنا پیار کرتی ہوں؟ میرے سبھی ناول کے ہیرو ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے

شادی کے بارے میں پوچھا ہے۔ میرا دل آپ سمجھتے ہیں۔ آپ لڑکا چُن کر مجھے دیجئے، گجراتی، پنجابی جو بھی ہو۔ جو شخص مجھے پیار کرے گا میں اُس کی غلام بننا چاہتی ہوں۔ شادی کے بغیر مجھے کون دیکھے گا؟ ماں ہے، تو رشتہ دار ہیں۔ اس کے بعد میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ میری ذمہ داری میں آپ کو سونپتی ہوں۔ آپ کی پسند کے مطابق میں اپنا مستقبل طے کروں گی۔ شادی، شوہر اور بچے — یہ میری بھی امیدیں ہیں۔ میں اپنے سپنے دل کی گہرائیوں میں رکھتی ہوں، کسی کو معلوم نہیں، آپ کو معلوم ہے۔

"سب دھن کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ ان کے درمیان آپ کا دل پرشانت ساگر کی طرح عظیم اور خوبصورت ہے۔ آپ کے پاس ہوتی ہوں تو اتنی دکھی نہیں ہوتی۔

"کیا آپ سو گئے، جاگیے، آپ نے میرے اندر زندگی کے لیے ممتا پیدا کر دی ہے...

"... میں روز پوسٹ مین کا انتظار کرتی ہوں۔ میں دل کی باتیں کرتی ہوں، مجھ پر بھروسہ کیجیے۔ آپ جو کہیں گے چھوٹی بچّی کی طرح مانوں گی۔ رات کے بارہ بج چکے ہیں، سب سو رہے ہیں، ٹھنڈی ہوا بہہ رہی ہے۔ بند کروں، سو جاؤں۔ آپ بھی سو جائیے۔ گڈ نائٹ"

ایک اور خط شیاملا کا

... پیارے دوست، اب ہمارے درمیان دوری نہیں۔ آپ کا من دیکھ رہی ہوں۔ الفاظ اور پوسٹ آفس بھی کیوں آئے ہمارے درمیان؟ دانشور کہتے ہیں — پیار آخر کام (موضوع ہوس) ہے، لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔ ایسا پیار مجھے پسند نہیں۔ جو مجھے پیارا لگتا ہے، اُسے میں بہت پسند کرتی ہوں۔ اُسے آغوش میں لینے کی، کھانا کھلانے کی، نہلانے کی، سوتے وقت سامنے بیٹھنے کی آرزو ہوتی ہے، لیکن اپنے کو دے کر میں پیار نہیں کرنا چاہتی۔ اس کی نفسیات کیا ہے، مجھے پتہ نہیں، لیکن میرے دل میں ایک شخص ہے، ایک مرد ہے، اس کا نام میں نہیں جانتی، روپ بھی نہیں دیکھا، میرے ارادے میں ایک شوہر اب بھی رہتا ہے۔ ہر رات میں روتی ہوں، تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا ہے...

میں نے آپ سے ایک بات چھپائی تھی، وہ بھی کہتی ہوں۔ جب میں انسٹی ٹیوٹ میں پڑھتی

تھی تو بیمار ہوتے پر ڈاکٹر کو دکھانے جاتی تھی۔ وہیں میڈیکل کالج میں پڑھنے والا ایک لڑکا میرے پاس آتا تھا۔ باتیں کرتا تھا۔ ایک دن اس نے کہا، "میں تمھیں پیار کرتا ہوں۔"

میں نے اس سے دور ہونے کی کوشش کی، کیونکہ مجھے اپنی قسمت پر بھروسہ نہیں تھا، لیکن وہ میرا نام پوچھ کر کئی بار ہوسٹل میں آیا۔ وہ ہاؤس سرجن تھا۔ اپنی ایک فوٹو بھی مجھے دی۔ میں نے ظاہری طور پر کچھ نہیں کہا، لیکن میں دل سے اُسے چاہنے لگی تھی۔ میں نے اپنی ساری باتیں اُسے بتا دیں، وہ پھر بھی آتا رہا۔ فون بھی کیا۔ تب میرے دل میں اُس کے لیے بہت پیار جگا۔ وہ ڈاکٹر بھی تھا اور میں ڈاکٹر کو بہت پیار کرتی ہوں۔ پھر بھی ابھی میں نے ظاہری طور پر اُسے منظوری نہیں دی۔ ہاں، دل میں چاہتی رہی، وہ میرا شوہر بنے لیکن شادی کے بغیر میں اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں تھی۔ ایک دن اس نے کہا، "آج ہمیں کوبلم پیچ جانا چاہیے۔ چلیے نا۔ دو تین دن رہیں گے وہاں موسم بہت پیارا ہے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس تھی۔ میں نے دھیرے سے کہا، "ایسی حالت میں میں اکیلی نہیں جا سکتی۔"

وہ چپ چاپ چلا گیا اور پھر کبھی نہیں آیا۔ میرا ایک اور سپنا ٹوٹ گیا۔ میں کسی کو شوہر بنانا چاہتی ہوں لیکن وہ کبھی نہیں ہوگا۔ آپ ہی بتائیے، کیسا ہے میرا من، میں خوبصورتی نہیں چاہتی ہوں۔ دولت نہیں چاہتی، بس بے غرض خدمت کرنے والا ڈاکٹر چاہتی ہوں۔ کیا وہ مجھے ملے گا کبھی؟ نہیں ملے گا۔ وہ ڈاکٹر واقعی پیار کرتا ہوتا تو پھر آتا۔ نہیں آتا گیا... اُسے جسم چاہیے تھا، پیار نہیں۔

آپ مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ پیار آپ دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ مدد آپ کرتے ہیں میرے لیے آپ میرے ایشور ہیں... کہانی یا تنخواہ کا پیسہ ہے تو مجھے یہاں پیار ملتا ہے... جب بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے تو آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں... واقعی پچھلے جنم میں ہم ایک ہی گھر میں رہے ہوں گے...

اس سے زیادہ کوئی اور کیا کھل سکتا ہے؟ اس کے بعد میرے اس کے تعلقات کے بارے میں

کچھ جاننے کو کیا رہ جاتا ہے؟ مان لوں گا، یہ خط پڑھنے کے بعد میرا دل کچھ افسردگی میں ڈوب رہا۔
اس کی وجہ کیا آدم کے زمانے کے جانداروں کی وحشیانہ ہوس اور خواہش نہیں ہے؟ سارے مردوں کے اندر وہ کہیں نہ کہیں نہ چھپائے پڑی رہتی ہے۔ میں اس ڈاکٹر سے بہت مختلف کہاں ہوں؟ میرے دل میں ایک پل کو یہ سوال ابھرا تھا ـــ مجھے اس کے خط کا جواب نہیں دینا چاہیے۔ مجھے اس سے تعلقات ختم کر لینے چاہیے۔ میں کیوں کروں اس کی مدد؟ کون ہے وہ میری۔۔۔؟

سوچتے سوچتے میں نہ جانے کس خلا میں ڈوب گیا۔ لیکن وہ خلا لفظ کے بغیر نہیں تھا۔ بار بار ایک پریشان کن آواز ابھرتی اور مٹتی۔ ایک مقررہ میعاد کے بعد وہ پھر ابھرتی۔ پھر پھر ابھرتی: 'تم بھی انھیں میں سے ایک نکلے، تم بھی۔۔۔'

پہلے پل میں سمجھا نہیں۔ دوسرے پل سمجھا تو کانپ گیا۔ تیسرے لمحے اور زیادہ نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے چیخ اٹھا، "نہیں، نہیں، نہیں۔۔۔"

اسی وقت کھلکھلاتا ہوا انکت وہاں آکھڑا ہوا، لیکن مجھے چیختا دیکھ کر وہ اُٹھ گیا اور روتے روتے بولا، "پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔"

وہ آواز مٹ چکی تھی۔ میں نے انکت کو بانہوں میں لے کر کہا، "کچھ نہیں بیٹے، کچھ نہیں ہے یہاں۔"

"آپ زور سے کیوں چیخے تھے؟"

"وہ ایسے ہی۔۔۔ ایسا تھا بیٹے، ہم سو گئے تھے۔ سپنے میں ایک راکشس آگیا۔ وہ تمھیں کھینچنے لگا۔ اُسے ہی ہم ڈانٹ رہے تھے۔"

انکت نے مجھے دیکھا۔ وہ اب شانت تھا، بولا، "راکشس مجھے لے گیا؟"

"لے کہاں گیا؟ تم تو ہماری گود میں ہو۔ ہماری ڈانٹ سن کر راکشس بھاگ گیا۔"

"پاپا، اس راکشس کے سر پر سینگ تھے؟"

"ہاں!"

"آنکھیں بڑی بڑی تھیں؟"

"ہاں!"

"ناخن لمبے لمبے تھے؟"

"ہاں!"

"دانت بڑے بڑے تھے؟"

"ہاں!"

تب بڑی معصومیت سے اُس نے کہا، "پاپا! یہ راکشس ہمارے شہر میں تو ہے نہیں۔ یہ رہتے کہاں ہیں؟"

کیسے کہہ دوں، یہ ہم سب کے اندر رہتے ہیں۔ تم بھی نوجوان ہوجاؤ گے اور اپنے آپ پر سے قابو کھو بیٹھو گے تو وہ تمھارے اندر بھی گھر بنالیں گے۔ آدم ہوس اور خواہش، ملکیت، درندہ طاقت، طاقت کی کشش، یہ ہی تو اس راکشس کے سینگ دانت اور ناخن ہیں، لیکن صرف اتنا کہا، "بیٹے اُن کا گھر بہت دور اندھیرے گھنے جنگلوں میں ہے۔"

وہ آگے اور سوال نہ کرسکے، ہم نے اُسے گود میں اُٹھا یا اور کھٹ کھٹ نیچے اتر گئے۔ وہاں سمیتا چائے لیے بیٹھی تھی۔ اُسی کے لیے تو انکت مجھے بلانے آیا تھا۔ گرم گرم حلوہ بنایا تھا اس نے۔ پنتاجی کے ایک ملاح دوست آئے تھے، کیرل سے۔ میرا نام سُن کر حیرانی سے بولے "تو تم ہو اجیت!"

میں حیران، "آپ کیسے جانتے ہیں مجھے؟"

"میں نہیں، سشیلا جانتی ہے۔ آپ کا منی آرڈر گیا تھا، نہ اس کے پاس، پانچ سو روپے کا۔" پانچ سو روپے، ان الفاظ کو انھوں نے کچھ اضافی وضاحت کے ساتھ کہا تھا، "جس اسکول میں پڑھاتی ہے اُس کے آفس میں بڑا بابو ہوں۔ ہندی میں کچھ لکھنے کا شوق ہے۔ وہ بھی تو لکھتی ہے۔ تبھی اس سے میرا تعارف ہوا۔ آپ کو تو وہ بھگوان مانتی ہے۔۔۔!"

انھوں نے آگے کیا کیا کہا، مجھے پتہ نہیں۔ میری نگاہ کبھی پنتاجی کے چہرے پر جاتی کبھی سمیتا کے۔ پنتاجی حیران تھے اور کچھ خوف زدہ بھی، لیکن سمیتا کی آنکھوں میں اچانک تشدد کے تاثرات ابھرے اور وہ اُٹھ کر چلی گئی۔

وہ صاحب بغیر جھجک کے کھاتے رہے اور بولتے رہے تعریفی کلمات لیکن آخر میں انھوں نے کہا، "بہت اچھا کیا آپ نے ایک بے سہارا لڑکی کی مدد کی، لیکن بھائی صاحب! لڑکیوں

کے معاملے میں محافظ بننے کا مطلب لوگ کچھ دوسرا ہی لگانے لگتے ہیں۔ ہمیں بچنا چاہیے۔"
اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ مجھے لگا، ساری کائنات میرے ذہن میں داخل ہو گئی ہے اور اس کے پر نچے اُڑتے جا رہے ہیں۔

پتا جی نے اتنا ہی پوچھا، "سمیتا جانتی ہے سب کچھ؟"
"کچھ کچھ جانتی ہے۔"
"سب کچھ کیوں نہیں؟"
"ایسے ہی۔"
ایک پل خاموش رہ کر پتا جی بولے۔ "یہ اچھا نہیں ہوا۔ سمیتا کو اعتماد میں لے کر ہی تمھیں کچھ کرنا چاہیے تھا۔"
کئی پل ہم دونوں چپ بیٹھے رہے۔ پھر میں اُٹھا اور شیاملا کا آخری خط لا کر پتا جی کو دے دیا۔ ایک ایک لفظ بغور پڑھا انھوں نے پڑھ چکے تو چہرے پر عجیب روشنی ابھر آئی بولے "عجیب عورت ہے۔ ادیب ہوں، بہروپی انسانی کردار کو پہچاننے کا دعوا بھی کچھ کچھ کر سکتا ہوں۔ تمھاری جگہ میں ہوتا تو اس کا غیر یقین کبھی نہیں کرتا۔ تمھیں یہ خط سمیتا کو دکھا دینا چاہیے۔"
"وہ یقین کر لے گی؟"
"اس کی نفسیات تم زیادہ جانتے ہو۔ لیکن میں بہت دنوں سے محسوس کر رہا ہوں، تم دونوں کے درمیان ایک دیوار اُٹھتی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے وہ دیوار . . ."
انھوں نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا۔ ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ سب کچھ جانتے تھے، پھر بھی ہم دونوں کو لے کر اتنے فکرمند ہیں، یہ میں نہیں جانتا تھا۔ میں نے اسی رات وہ خط سمیتا کو دے دیا۔ اُس نے پڑھ لیا۔ پھر مجھے لوٹاتے ہوئے بولی، "سوال شیاملی کے اخلاق کا اتنا نہیں ہے جتنا تمھارے۔ میں جانتی ہوں، من چاہا شوہر پانا اُس کے لیے بہت مشکل ہے۔ ایک مطلقہ، پرائمری اسکول کی معلّمہ کو آج کے ہندو سماج میں کون ڈاکٹر اپنانے آئے گا؟"
مان لوں گا سمیتا کی دلیل عملی طور پر غلط نہیں تھی لیکن . . .
سمیتا نے پھر پوچھا، "خوبصورت ہے؟"

"بدصورت بھی نہیں کہا جاسکتا۔"

"باتونی ہے؟"

"وقت کے تھپیڑے نے دروں رُو بنا دیا ہے اُسے۔"

"تب تو کوئی اُمید نہیں۔ لیکن ہے وہ پیار کرنے لائق۔ دادی نانی کا زمانہ رہا ہوتا تو شاید سات سمندر پار سے کوئی راجکمار اُسے لینے آ بھی سکتا تھا۔"

"لیکن وہ راجکماری تو بے حد حسین ہوتی تھی۔"

"تبھی تو میں نے 'شاید' اور 'بھی' کا استعمال کیا ہے۔ اب تو تمھارے جیسا ہی کوئی اُسے نکال سکتا ہے۔"

"کیا؟" میں بے ساختہ کانپ اُٹھا۔ دوسرے ہی پل میں غصّے سے بھر اُٹھا۔ تقریباً چیختے ہوئے میں نے کہا "تم مجھ پر تہمت لگا رہی ہو۔ تم کہنا چاہتی ہو..."

وہ ذرا بھی تو بے چین نہیں ہوئی۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "تمھیں غصّہ آگیا۔ آنا بھی چاہیے۔ غصّہ قبولیت کی ہی ایک شکل ہے۔ اس کا خط اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ تم نے اس سے کچھ چاہا ہے..."

یہ کیا کہہ گئی شمیتا! مجھے ایک دم بے نقاب کر دیا۔ مرد کی رگ رگ کو عورت پہچانتی ہے۔ میں اُسے کیا جواب دوں؟ غصّے سے کانپتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکا "تم سے بحث میں جیت پانا بہت مشکل ہے۔ معنی کے اندر سے معنی ڈھونڈ لیتی ہو تم۔"

شمیتا ہنس پڑی اور وہاں سے اُٹھ گئی۔

ذلالت اور اہانت کے درد سے سلگتا میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ بیچ بیچ میں عہد کرتا اور چیخ اُٹھتا "میں اب کیرل کبھی نہیں جاؤں گا۔ میں اب کبھی شمیتا سے... میں اب کبھی شمیتا سے..."

میرے پاس انکت گہری نیند میں سویا تھا۔ اس طرف لیٹی تھی شمیتا شاید اتنے ہی گہرے زیرِ دم میں ڈوبتی ابھرتی، سوچتی ___ سمندر سطح پر بیقرار اور بے چین ہے لیکن گہرائی میں کسی قدر شانت، کتنا متمول اور ہم سطح پر کتنے شانت اندر کتنے بے چین اور بے قرار۔ فطرت اور مرد کے مزاج کا یہ فرق کتنا معنی خیز ہے۔

میں حیران تھا کہ شمیتا کے بہانے میں یہ کیا سوچ گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیران ہونے کا موقع تو اگلے دن دوپہر ڈاک آنے کے بعد ملا۔ شمیتا نے سوشل ورک میں ایم۔ اے کیا تھا۔ دہلی اسکول آف سوشل ورک میں وہ کام کرتی تھی۔ اُسی کام کے لیے اُسے امریکہ میں نو مہینے کی ٹریننگ کے لیے چُنا گیا تھا۔ اس بارے میں میں اب تک کچھ نہیں جانتا تھا۔ آج کی ڈاک میں ایک مقررہ تاریخ پر نیویارک پہنچنے کا آرڈر تھا۔ ساتھ میں پورا پروگرام بھی تھا۔

سب کچھ پڑھ کر میں عجیب سے احساس کمتری سے بھر اُٹھا۔ بولا۔ "یہ تو بہت اچھا ہوا لیکن تم نے پہلے نہیں بتایا۔"

"تم نے بتایا تھا شیاملا کے بارے میں؟"

میں ایک بار پھر اندر ہی اندر غصے سے بھُن بھُنایا لیکن پھر ایک گھونٹ لگا کر بولا مسکراتے ہوئے "ہمیشہ لڑتی ہی رہو گی؟"

"نہیں، لڑ نہیں رہی، تمھیں آزاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اور اپنے آپ کو بھی۔"

ہم دونوں ہی آزاد نہیں ہیں۔ دونوں نجات چاہتے ہیں۔ . . میں نہ جانے کس پاتال میں ڈوبتا جارہا تھا۔ سوچنے کی طاقت تک کو جیسے لقوہ مار گیا ہو۔ بہت دیر تک ایسے ہی خلاء میں ڈوبا رہا پھر کسی طرح خود کو مجتمع کر کے میں نے کہا، "میں سمجھتا ہوں، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ لیکن میں تمھیں یقین دلاسکتا ہوں، مجھے تمھارے اس ٹریننگ کے لیے چُنے جانے کی واقعی خوشی ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"پھر بھی اس طرح ستاتی رہتی ہو۔"

"اجیت! کیا تم نہیں جانتے کہ سچ کیا ہے؟ تم بھٹک رہے ہو اور میں بھی بھٹک رہی ہوں۔ اور یہ بھٹکاؤ صرف ہم دونوں کا نہیں ہے۔"

چپ رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ جو سچ ہے اُسے کیسے جھٹلاتا میں؟ اُسی نے کہا، "میں جانتی ہوں، تم لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ لیکن اُسی تکلیف سے نجات پانا ہے۔ تم تو نو مہینے میں چھ ماہ گھومتے رہو گے۔ کیا اس بار چھ مہینے اپنے گھر میں پتاجی کے پاس نہیں رہ لوگے؟ بِندا کو سمجھا دوں گی۔ اب بھی سب کام کرنی ہے۔ جب تم باہر رہو گے تب پتاجی کچھ وقت دبھا کے

پاس رہ لیں گے۔ اس کا بڑا اصرار ہے۔ انکت اُسی کے پاس رہے گا۔ کچھ وقت کے لیے ورنکا جی جی یہاں آجائیں گی۔ میں نے سب سے باتیں کرلی ہیں۔ وِبھا یہاں بھی آتی رہے گی جب بھی انکت کی چھٹیاں ہوں گی۔ تم بھی تو انکت کے پاس آؤ گے ہی۔"

سُمیتا کی ایسی خصوصیات سے میں ہمیشہ متاثر رہا ہوں۔ تمہیں کچھ اپنے آپ ہونے کو چھوڑتی ہی نہیں۔ اس کا ماننا ہے کہ اپنے آپ جو ہونا ہے وہ تو ہوگا ہی، لیکن ہم آنکھیں کھلی رکھ کر اگلا قدم نہیں اٹھائیں گے تو بھیڑوں میں اور ہم میں فرق ہی کہاں رہے گا۔

اور سب کچھ اسی طرح ہوا۔ جانے کے دن جیسے جیسے پاس آتے گئے، گھر میں گہما گہمی بڑھتی گئی۔ جو آسکتے تھے سبھی آئے۔ سُمیتا میرے لیے نایاب ہو رہی لیکن آخری رات میں نے اُسے گھیر ہی لیا۔ وہ نارمل تھی۔ اس نے میرے آغوش میں آنے کو آزاد چھوڑ دیا اور نشیلی سریلی آواز میں بولی: "تمھیں پانے کے لیے ہی تو یہ سب کچھ کر رہی ہوں۔ اور اب تم کچھ نہیں کہو گے۔ لوٹنے تک سب کچھ ملتوی۔"

کچھ پل کے لیے ہی سہی، میں نے سچ مچ محسوس کیا تھا، کچھ نہیں سوچ رہا۔ میں واقعی آزاد ہوں۔

کتنا مشکل ہے آزاد ہونا اور کسی کو آزاد ہونے دینا۔ کتنا مشکل ہے یہ پتہ لگا لینا کہ شمع جلنے کے لیے ہے یا جلانے کے لیے۔

میں پھر کیرل میں ہوں۔ اتنا صبر مجھ میں ہے کہ میں سیدھا شیاملا کے پاس نہیں گیا۔ بہت دن تک کالیکٹ ترنچور، کوچی، کودلم، الیپی وغیرہ مقامات پر گھومتا رہا۔ ترویندرم پہنچ کر میں نے پایا کہ وہ اب ہری پاد کے مشن اسکول میں تھی۔ وہ فوراً مجھ سے ملنے آئی۔ وہ بے حد خوش تھی اور پریشان بھی ــــ اس کی ماں بیمار تھی اور اُسے ابھی تین ماہ کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ اس نے مجھے کئی خط لکھے تھے۔ باہر رہنے کی وجہ سے میں انھیں نہیں پاسکا تھا۔ اب مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اُس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ ہنس بھی رہی تھی اور روبھی رہی تھی۔ مسکرا کر بولی، "کیسے ہیں آپ؟"

"دیکھ رہی ہو، ٹھیک لگتا ہوں نا! تم کیسی ہو؟"

"اس پل بہت خوش قسمت ہوں۔ آپ سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتی۔ ایک دوست کے گھر میں رہ رہی ہوں۔ چھ بچے، ماں باپ، ایک بیوہ بہن، صرف دو کمرے۔ سکون سے بیٹھنے کو بھی جگہ نہیں۔ ہوسٹل میں ضمانت کے لیے ۲۰۰ روپے اور ۲۷۵ روپے ایک ماہ کے لیے چاہیے۔"

"روپے چاہیے۔"

"جی! اسی لیے خط لکھا تھا۔"

"تب میں گھر نہیں تھا۔ شیتا گئی ہے نا، لو ہینے کے لیے۔"

"وہ تو آپ نے لکھا تھا۔ کیا واقعی انھیں شک ہے؟"

"ہاں شیاملا، اُسے یقین ہے کہ میں اُس سے دور ہونا چاہتا ہوں۔ اس لیے تمھارے پاس آرہا ہوں۔ نہیں تو کوئی کسی انجان کو اس طرح پیسے دیتا ہے؟"

"ہاں، دیتا تو نہیں، لیکن آپ کیا ان 'کوئی' میں سے ہیں؟ آپ کا دل تو سمندر ہے اتھاہ نہیں جس کی۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے اُس کی پیار سے جھلملاتی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر کہا، "کیا تم میری تعریف اس لیے کر رہی ہو کہ تمھیں پیسے دینا ہوں؟"

اس نے سہم کر میری طرف دیکھا، "کیا آپ کو ایسا لگتا ہے؟"

"کبھی کبھی تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

اسی پل اس کا چہرہ سانولا ہو گیا، بولی، "پیسہ آپ نے دیا، بہت اچھا لگا۔ لیکن میرا یقین کیجیے، میں آپ کو پیسے کی وجہ سے پیار نہیں کرتی۔ میرے من کی نفسیات میں خود نہیں جانتی۔ میں نے سب کچھ آپ کو بتا دیا۔ کچھ نہیں چھپایا۔ یہ بھی کہہ دیا، اپنے آپ کو سونپ کر میں پیار کرنا نہیں چاہتی۔ میرے کرشن نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ مجھے بہت پیار کرتے ہیں، بس یہی میں نے مان لیا۔ اور دیکھ بھی لیا۔"

وہ رکی، سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا، "کیا آپ واقعی مجھے پانا چاہتے ہیں؟"

"میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ کبھی چاہتا تھا کہ تم میری ہوتی۔"

"میں بھی جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میری بھی خواہش تھی کہ مجھے آپ جیسا شوہر ملے۔ آپ

جیسے ہیں آپ، تو رہتا ہی ہے، لیکن میں جانتی ہوں آپ کی پتنی ہیں۔ ان کے اور آپ کے درمیان میں آؤں گی۔ ایسی احسان فراموش تو میں نہیں ہوں، صرف دوستی چاہوں گی۔ دوست ہوں صرف دوستی چاہوں گی۔ دوست کے ناطے آپ سے مدد مانگتے ہوئے میں کبھی جھجکتی نہیں۔ آپ سے ایک شوہر ڈھونڈنے کے لیے بھی کہا۔ کبھی آپ کی پتنی کو سب کچھ لکھ دوں گی۔"

اُس دن پہلی بار میں نے شیاملا کو اپنی اور سُمیتا کی کہانی شروع سے آخر تک سنا دی... وہ حیران تھی، افسردہ بھی۔ کئی پل خاموش خلا میں دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے بولی "میں تو اس حالت کے بارے میں سوچ کر ہی کانپ اُٹھتی ہوں۔ کتنا عظیم دل ہے آپ کی پتنی کا۔ کیسی بے مثال سمجھ۔ وہ تو پیر دھوکر پینے کے لائق ہیں۔ کسی کے لیے اپنے کو مٹا دیا۔ اس مٹانے نے ہی تو انھیں ہمالیہ سے بھی اُونچا اٹھا دیا۔ آپ کو تو ایسی پتنی پر فخر ہونا چاہیے۔"

"یہی تو شیاملا، یہی تو نہیں ہوا۔ دونوں ایک دوسرے سے نجات چاہتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ دونوں احساس جرم کے شکار ہیں۔ سُمیتا کے احساس جرم کے ساتھ جڑا ہے شہادت کا جذبہ اور میرے احساس جرم میں پیوست ہے مرد کی انا اور اس سے پیدا شدہ احساس کمتری۔ ہماری نفسیات..."

"اُف، یہ دانشوروں اور ماہرین نفسیات نے زندگی کو کس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے!"

"دانشوروں اور ماہرین نفسیات سے کہیں زیادہ قصوروار ہیں ہمارے سنسکار۔"

"لیکن کیا سنسکار اپنے آپ میں کچھ ہے؟ دانشوروں نے ہی تو انھیں انسان کے ذہن پر تھوپا ہے۔ میں تو بہت پڑھی لکھی نہیں ہوں، لیکن ان پانچ سالوں میں جو میں نے برداشت کیا ہے اس نے مجھے بار بار سوچنے کی عادت ڈال دی ہے۔ آج آپ سے دل کی بات کہتی ہوں۔ آپ کی کہانی سُن کر بہت حوصلہ ملا ہے مجھے۔ میرے شوہر نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا، آپ جانتے ہیں۔ پھر بھی میں مانتی ہوں، شوہر ہی میری نجات ہے۔ مجھے ایک عدد شوہر چاہیے ہی اور آپ کو اپنا قریبی دوست مانتی ہوں۔ آپ سے کچھ نہیں چھپاتی، لیکن آپ کا پیار میں اپنے آپ کو دے کر نہیں پانا چاہتی، جسم شوہر کا ہے، دل آپ کا یہ کیسا سنسکار ہے، سمجھ نہیں پا رہی ہوں صرف

چھلاوہ ہی تو ہے، اپنے کو چھلتا۔ پھر بھی انھیں سنسکاروں میں جکڑی ہوں اور تڑپ رہی ہوں۔"

شیاملا بول رہی تھی اور میں حیران لیے دیکھے جا رہا تھا۔ اس سیدھی سادی، بھولی بھالی عورت کے اندر بھی اتنی کرید ہے۔ اتنا ہی کہہ سکا، "سمیتا انھیں سنسکاروں سے نجات پانا چاہتی ہے۔"

"پا سکے گی!"

"تم نہیں پانا چاہتی؟"

"پتہ نہیں، لیکن ایک بے چینی، ایک چھٹ پٹاہٹ میرے اندر ضرور ہے۔ کسی کو پانے کی ہے یا کسی سے چھٹی پانے کی۔"

"یہ بے چینی، یہ چھٹ پٹاہٹ ابھی تو نجات کی راہ کی پہلی صورت ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو ہو سکتی ہے۔"

"کئی پل ہم پھر اندر ہی اندر امنڈتے رہے۔ پھر مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے کہا، "آؤ شیامل، کووِلم بیچ چلیں۔"

"چلو، میں آپ سے نہیں ڈرتی۔"

"اس ڈاکٹر سے کیوں ڈری تھیں؟"

"وہ جسم چاہتا تھا۔"

"میں چاہوں تو؟"

"پہلے تو آپ ایسا چاہیں گے ہی نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ مجھے پیار کرتے ہیں۔ میری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر پائیں گے۔ چاہیں گے بھی تو، آپ میرا من جیت چکے ہیں۔ ڈاکٹر نے دل سے پہلے جسم چاہا تھا۔ عورت کے بغیر عورت کے جسم کی خواہش ہی تو بلاتکار ہے۔"

یکبارگی میں کانپ اٹھا۔ شیاملا نے مجھے پھر شکست دے دی لیکن ... لیکن سمیتا اُن غنڈوں کے ساتھ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اُسے بلاتکار کہیں گے کیا؟ میرے اندر سے ہی کسی نے کہا، 'ہاں' وہ بلاتکار تھا۔ کیونکہ وہ مجبور تھی اپنی مرضی سے جانے کے لیے۔ مجبور وہ اپنی تشنہ خواہش کے لیے بھی

تو ہو سکتی ہے۔ ہو سکتی ہے، لیکن اُس میں بھی قصور اس کا نہیں، تمھارا ہے...'

تبھی شیاملا نے انگلی سے مجھے چھوتے ہوئے کہا، ''یہ کیا سوچنے لگے پھر چلو اٹھو، کو ولم چلیں۔''

''چلو!'' میں نجات پانے کے لیے کہہ اُٹھا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بیٹھا ہی رہ گیا۔ وہی بولی، ''اٹھو نہ اب!''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ سہم گیا۔ بولا، ''نہیں شیاملا جاکر بھی پچھتانا ہوگا، نہ جاکر بھی۔ آسودگی اور ناآسودگی — دونوں ہی عذاب ہیں ہمارے لیے۔''

شیاملا کھل کھلا پڑی، ''میں کہتی تھی نا، آپ مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی دن آپ کا من پڑھ لیا تھا۔ تبھی آزاد ہو سکی آپ کے سامنے، اچھا چلو، میرے گھر چلو۔ بھابھی آپ کو بہت یاد کرتی ہے اور کبھون تو برابر آپ کی بات کرتا رہتا ہے۔ پیار کے لیے زبان کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ محبت میں آواز نہیں، پکار ہوتی ہے۔ میرے گھر میں آپ آسن مار کر جم گئے ہیں۔ بھلے ہی یہاں رہیں یا دہلی۔''

شیاملا کسی یونی ورسٹی کی ڈاکٹر نہیں ہے، لیکن تجربے کی یونی ورسٹی کی ڈگری اُس نے ضرور حاصل کر لی ہے۔ تبھی تو اس کی زبان کئی معنی دے جاتی ہے۔ ابھی اس نے کہا بھلے ہی یہاں رہو یا دہلی۔ میرے گھر میں آپ آسن مار کر جم گئے ہیں۔ میرے گھر کو کیوں، میرا دل، نہیں مانا جا سکتا؟ شاید اُس نے سادہ دلی سے ایسا کہا ہو، لیکن زبان صرف ترسیل کا ذریعہ نہیں ہے، وہ شخص کے کردار کی پہچان بھی تو ہے۔

سارے راستے کھلے کنول سی شیاملا کھلی رہی اور اپنے ناول کی کہانی سناتی رہی۔ میں نے محسوس کیا اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن پلاٹ نہ کے برابر رہتا ہے۔ بس ایک نکتے پر اس کی ساری کہانی ٹھہر جاتی ہے۔ اس لیے میری کوشش کے باوجود اس کی کہانی کسی ہندی رسالے میں جگہ نہ پا سکی۔ مایوسی سے تب اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ کسی حوالے سے ابھی اُس نے کہا، ''آپ کے ساتھ ہوتی ہوں، کتنا کھل کھلاتی ہوں، نہیں تو رو رو کر تکیہ بھگوتی رہتی ہوں۔''

''پھر بولی، ''ایک بات بتائیے۔''

''کیا؟''

"مان لیجیے، میں صرف مان لینے کو کہتی ہوں، مان لیجیے میری شادی آپ کے ساتھ ہو جاتی تو کیا میں ہمیشہ کھِل کھِلاتی رہ سکتی تھی؟"

"جو ممکن نہیں، اُس کے بارے میں کیا کہا جائے؟"

"پھر بھی۔"

"شاید نہیں۔"

"اسی لیے تو!"

"اسی لیے تو کیا؟"

ہنس پڑی، ہلکے ہلکے کرب سے پُر وہ ہنسی۔ بولی "آپ جانتے تو ہیں، پھر کرب کا ترجمہ کیوں کیا جائے۔"

اُس بار بھی صرف ایک دن کوئی رہ سکا۔ سنیچر کو دوپہر بعد پہنچے تھے اور سوموار کو اس کا اسکول تھا۔ اس لیے اتوار کی شام کو چل دینا تھا۔ مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ دھواں دھار بارش اور کیرل کی سرخ زمین کی لال تاج پوشی۔ سارا دن گھر میں بیٹھا بچوں سے کھیلتا رہا۔ کبھی ٹافی کبھی چاکلیٹ، کبھی پیپر منٹ کی گولیاں بانٹتا، کبھی لٹو گھما کر رجھاتا، کبھی ہتھیلی کو پیڑ اُڑاتا۔ میں ہندی میں بولتا، وہ ملیالم میں۔ شیاملا کبھی کبھی ترجمہ کر کے مجھے بتاتی تو میں حیران رہ جاتا، وہ میری بات کا جواب دے رہے ہوتے۔ میں نے پوچھا "یہ ہندی سمجھتے ہیں؟"

شیاملا بولی "یہ احساسات کی زبان سمجھتے ہیں۔ ملیالم، ہندی، بنگلا، تمل — یہ سہولتوں کے نام ہیں۔ انسان کی زبان پیار کی ہو چاہے نفرت کی، ایک ہی ہے۔"

اس پر اچانک مجھے کچھ یاد آگیا۔ میں نے کہا "جانتی ہو شیاملا، چینی زبان میں حروف نہیں ہوتے تصویریں ہوتی ہیں، وہی الفاظ کے اشارے ہوتے ہیں۔ جیسے ایک عورت کی تصویر کا مطلب ہے محبت۔"

شیاملا مسکرائی "عورت محبت کی علامت ہوتی ہی ہے۔ مرد تو ..."

میں نے کہا "رکو، رکو، بات پوری کر لینے دو۔ جانتی ہو، جھگڑے کی علامت کیا ہے، دو عورتیں۔"

شیاملا قہقہہ مار کر ہنس پڑی، ''ہے تو وہ بھی ٹھیک۔''

اُسی طرح ہنستے ہوئے اس نے اپنی بھابھی کو بلایا اور اپنی زبان میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ بھی خوب ہنسی۔ صرف اُس کمرے میں ہی نہیں، دور دور تک پڑوس میں وہ کہانی اور وہ ہنسی دیر تک گونجتی رہی۔

لیکن رات کی نشست اتنی ہی سنجیدہ ہو گئی، بولی ــ ''آپ نے کہا تھا عورت مرد دونوں کو ایک دوسرے کی غلامی سے آزاد ہونا ہوگا، یہ کیا ممکن ہے؟''

ہینڈک نے بھی کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ ترقی کرتے کرتے وہ ایک دن سوچنے والا جاندار بن جائے گا۔ فکر کی راہ پر بھی کیا آج وہ وہیں ہے جہاں سو سال قبل تھا۔ اس لیے مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک دوسرے کی غلامی سے نجات پانا ضرور ممکن ہوگا۔ تبھی وہ سہی معنی میں ایک دوسرے کی پاس آسکیں گے۔ وہ پاس آنا سچ مچ کا پاس آنا ہوگا۔ خواہش کی ممانعت نہیں ہے، خواہشوں کی غلامی کی ممانعت ہے، یعنی ذلیل شہوت کی ممانعت۔

غلامی سے نجات کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرد کی طرح عورت بھی معاشی نظریہ سے آزاد ہو۔ یقیناً یہ معنی بھی ہے۔ معاشی آزادی ضروری ہے۔ لیکن وہی اختتام نہیں ہے۔ ان بے معنی سنسکاروں سے نجات پانا ہوگا جو انسان کو کمزور اور سماج کو اپاہج بناتے ہیں اور ان وجوہات اور اس نظام سے بھی نجات پانا ہوگا جو غلط سنسکاروں کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہر زمانے کا اپنا نظام ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔

اگر عورت چاہے کہ اُسے کسی بھی مرد سے اولاد پانے کا حق ہو تو کیا وہ آزادی اُسے دی جا سکے گی؟

مرد کے کھلے پن کی مخالفت عورت کو وہی کھلا پن دے کر نہیں ہو سکتی۔ کھلا پن غلامی سے نجات نہیں ہے، وہ حق کے خواہش کی مسخ شدہ شکل ہے اور آزادی خود کو پہچاننے کی۔

شیاملا کی طرف دیکھ کر لگا کہ وہ مطمئن ہوئی ہے۔ معاشی آزادی کی وہ زبردست حمایتی ہے۔ ''پیسہ نہ ہو تو کیا جینا؟'' اس نے مجھے لکھا تھا، لیکن مرد کے بغیر عورت کیسے جی سکتی ہے؟ یہ سنسکار ابھی اُسے پریشان کرتا رہتا ہے۔ یہ اُس کی جسمانی مانگ بھی ہو سکتی ہے۔ اسی جسمانی مانگ

کو سمیتا پاس ولحاظ دینا چاہتی ہے۔

سویرے اُس نے اعلان کیا کہ وہ مجھے ترویندرم چھوڑ کر ہی ہری پاد جائے گی۔ ایک دن کی چھٹی لے لے گی۔ "آوارہ" کا خطاب پا کر بھی سفر میں ایک انجانا خوف مجھے ہمیشہ جکڑے رہتا ہے۔ اس کا یہ اعلان سُن کر میں نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔ ہوٹل پہنچ کر شرارت سے میں نے کہا، "کمرے میں اکیلا ہوں۔"

کِھل کھلا کر ہنس پڑی، بولی، "اب میں آپ سے نہیں ڈرتی۔"

"کیوں؟"

"آپ کی رگ رگ کو پہچان گئی ہوں۔ خوف ہمیشہ اجنبی سے ہوتا ہے۔"

تعجب ہے۔ اُس پل مجھے لگا تھا کہ یہ عورت جو میرے سامنے ہے اسے آغوش میں لے کر بھینچ ڈالوں، لیکن دوسرے ہی پل کانپ کانپ اٹھا تھا۔ وہ تب تک ناشتے کا انتظام کرتے چلی گئی تھی۔ یہاں آ کر وہ بہت خوش تھی اور نارمل بھی۔ سارا وقت تتلی کی طرح اڑتی رہی۔ کب ناشتہ ہوا اور کب ہم پھر بحث میں اُلجھ گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ ایک نکتے پر آ کر میں نے کچھ جوش میں آ کر کہا، "شیامل، تمھیں اُس سنسکار سے نجات پانا ہوگا۔"

"کس سنسکار سے؟"

"کل تم نے کہا تھا نا — میرے شوہر نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا، آپ جانتے ہیں، پھر بھی میں مانتی ہوں، شوہر ہی میرا نجات ہے۔ جیسے ایک عدد شوہر چاہیے ہی۔ ... اس شوہر نام کے جانور سے تمھیں نجات پانی ہوگی نہیں تو..."

وہ بولی، "تو آپ نے مان لیا کہ آپ جانور ہیں۔ سُمیتا جی یہ خوش خبری سُن کر بہت خوش ہوں گی۔"

اور وہ ہنس پڑی۔ میں کچھ ٹھگا سا کچھ افسردہ سا دیکھتا ہی رہ گیا، لیکن چوکنے والا نہیں تھا۔ ظاہری طور پر تیز ہو کر کہا، "دیکھو شیامل! موضوع مت بدلو۔"

یکا یک سنجیدہ ہو کر شیاملا بول اُٹھی، "آپ سچ کہتے ہیں۔ کتنا لڑتی ہوں اپنے آپ سے۔ لہولہان ہو جاتی ہوں لیکن مطمئن نہیں ہو پاتی۔ ابھی تو ماں ہے جو میری دیکھ بھال کر سکتی ہے، لیکن وہ

ہمیشہ تھوڑی رہے گی۔ اس کے بعد درندوں کی اس دنیا میں اکیلی رہ جاؤں گی۔"

"اکیلا سب سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ تمھیں اکیلے رہنا سیکھنا ہوگا۔ کیا ہوا جو شوہر نہیں ملا، کیا ہوا جو شادی نہیں ہوئی۔ کیا ہوا جو بچوں کی کلکاریوں سے آنگن نہیں گونجا، کیا ہوا جو..."

"بس... بس" اُس نے عجیب طرح سے مجھے دیکھتے ہوئے روک دیا" کیا ہوا اگر دوست بھی نہیں ہوا تو...؟"

"ہاں، وہ تو سوچا ہی نہیں۔ ایک عدد دوست تو چاہیے ہی۔"

"تو...؟" وہ اب بھی نہ جانے کیسے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اُس کی زخمی کرنے والی نگاہ کو برداشت نہیں کر سکا۔ اپنے آپ ہی میری نظر جھک گئی۔

"اکیلا کوئی نہیں رہ سکتا، میرے دوست۔ میں پاگل نہیں ہونا چاہتی۔ میں جینا چاہتی ہوں۔"

"جینا ضروری ہے تمھاری رائے میں؟"

"یہ ہماری قسمت ہے، کیوں نہ پھر سچ مچ جئیں؟" ایک پل کے لیے رکی، میری طرف دیکھا، بولی، "اکیلے رہ سکتی ہوں اگر کوئی مشن ہو، کوئی خاص مقصد ہو۔ اتنی ذہانت کہاں ہے مجھ میں؟ اس لیے پیار کرتے ہوئے، پیار پاتے ہوئے، جینا چاہتی ہوں۔ کچھ ناممکن تو نہیں مانگ رہی۔"

"ناممکن نہیں ہے، لیکن میں سوچ رہا تھا مرد کی وحشیانہ طاقت کی کشش سے نجات کی بات..."

اچانک نہ جانے وہ کہاں کھو گئی۔ کئی پل کے لیے اس کمرے میں سب کچھ خاموش ہو گیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے وہ بولی "اُس کشش سے نجات...؟"

"کشش کی ضرورت سے نجات۔"

"سمجھتی ہوں اور چاہتی بھی ہوں لیکن اتنی ہمت ابھی مجھ میں نہیں ہے۔"

"نہیں ہے، کا مطلب کیا نہیں ہوگا، کبھی ہے؟"

"نہیں، نہیں، وہ نہیں، وہ نہیں، میں چاہتی ہوں نجات ملے لیکن... کوشش کروں گی۔"

وہ رک رک کر بول رہی تھی اور میں اُسے ایک دم دیکھے جا رہا تھا اور خود پر سے قابو بھی کھو رہا تھا۔ آخر وہ لمحہ آ گیا جب کہیں کچھ نہیں تھا۔ میں تھا اور میرے سامنے اُس کا چہرہ تھا ایک ساتھ سنجیدہ اور ملائم ایک ساتھ سانولا اور خوبصورت وہ پلنگ کے کنارے میرے پاس ہی بیٹھی

تھی۔ میں نے اچانک اُسے اپنی باہوں میں لپیٹ کر بھیں ڈالا اور تابڑ توڑ چومنے لگا، یہاں، وہاں ہر کہیں۔

پلک جھپکتے جتنے وقت میں یہ سب واقع ہو گیا۔ اس اچانک نے اُسے حیران تو کیا لیکن اُس نے کسی سطح پر ذرا بھی دفاع نہیں کی، لیکن جیسے ہی میں نے گرم ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھنا چاہا وہ تڑپ اُٹھی اور ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا کر دور کھڑی ہو گئی۔ میں جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔ تیزی سے اُدھر ہی بڑھا۔ وہ چیخی نہیں، لیکن بے حد ارادے سے بولی "اب ایک قدم نہیں۔۔۔"

میں ٹھٹھک گیا، لیکن نشہ ابھی نہیں اترا تھا، بولا، "پلیز شیامل، میں تمھیں بے حد پیار کرتا ہوں۔"

"لیکن آپ شمیتاجی کو بھی اُتنا ہی پیار کرتے ہیں۔"

"تن کے بچانے کے لیے بحث مت کرو، شیامل۔"

وہ دھیمی آواز میں بولی، کیسا کرب تھا، "بچانے کو میرے پاس کیا ہے؟ میرا رواں رواں مقروض ہے آپ کا۔ خود کو سونپ کر بھی کیا قرض چکا سکوں گی؟ لیکن سوچتی تھی شمیتاجی جی کی بات۔ آپ کے لیے جس نے اپنی انمول عصمت کو داؤں پر لگا دیا، اس کے لیے ابھی تک آپ مشکوک ہیں۔ وہ اگر جان سکیں کہ آپ نے میرے ساتھ۔۔۔"

ایک ایک لفظ پر زور دیتی وہ بول رہی تھی اور ہر لفظ کا ضرب میرے ذہن پر چوٹ کر رہا تھا۔ میں جب برداشت نہ کر سکا تو چیخ پڑا، "شیامل، بس کرو۔"

تعجب، وہ اب پاس آگئی تھی۔ بولی، "یہ ہوں میں۔ بولو، کیا چاہتے ہو؟"

اس پل لگا جیسے ساری کائنات گھوم رہی ہو، زمین اپنی کشش سے نجات پا رہی ہے۔ شیامل مجھے سنبھال نہ لیتی تو میں گر پڑتا۔ پیار سے سمیٹ کر اُس نے مجھے بٹھایا۔ بولی "چائے منگاؤں؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پوری طاقت سے اُسے سنبھالا، بولا، "تم پیو گی؟"

"ہاں!"

"منگالو۔"

گھنٹی بجا کر اُس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا "میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اتنی دور مت جاؤ۔"

"پاس بٹھانے کی خواہش سے آزاد نہیں ہو پا رہے اور بات کرتے ہو۔ ۔ ۔"

میں ہنس پڑا۔ "ٹھیک ہے تم وہیں بیٹھو۔"

"ہاں، یہی ٹھیک ہے۔" وہ بھی ہنس پڑی۔

چائے پیتے ہوئے ہم اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے جو کچھ واقع ہوا تھا وہ صرف ایک خواب تھا۔ دوپہر کو ساتھ ساتھ کھانا کھایا۔ پھر ہندی پرچار سبھا میں ٹیلی فون کیا۔ بولی "اب میں جاتی ہوں۔ اسٹیشن پر رخصت کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔ ہندی پرچار سبھا سے وہ لوگ آرہے ہیں۔"

اس کی آواز بھیگ گئی تھی، بولی "ہفتے میں دو خط لکھنا، اچھا۔ آپ کی بہت یاد آئے گی، رلانا مت۔"

اور ایک جھٹکے میں اُس ماحول سے خود کو الگ کر وہ باہر چلی گئی۔

دس منٹ بعد ہی ہندی پرچار سبھا سے ایک صاحب آگئے۔ ڈھیر سارا سامان لائے تھے۔ الائچی، لونگ، کاجو، گولے، ناریل اور دو خط بھی تھے۔ ایک پتاجی کا دوسرا شمیتا کا۔ اُسے گئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ پہلے مہینے چار خط لکھے۔ دوسرے مہینے دو، اور تیسرے میں صرف ایک۔

من ہی من مسکرایا اور سوچا، نجات کا مشق کر رہی ہے۔

فرسٹ کلاس کے کوپے میں اکیلے بیٹھے ہوئے میں نے وہ دونوں خط پڑھے۔

پتا کا خط بیٹے کے نام

پیارے اجیت،

ایک ہفتہ قبل ہی میں یہاں لوٹا ہوں۔ یندا کی وجہ سے مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم جانتے ہی ہو دن بھر کام کرتا ہوں۔ ٹھیک وقت پر چائے، ناشتہ، حجامت کے لیے پانی رکھ جاتی ہے جیسے شمیتا رکھتی تھی۔ شام میری کافی ہاؤس میں گزرتی ہے۔ رات کو چھینا بنا ملتا ہے۔ سب کچھ منظم ہے۔ لیکن دنیا میں انتظام ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ ایسا بھی کچھ ہوتا ہے جو بہت ہی ذاتی ہوتا ہے۔ اس

کی جتنی کمی اس بار محسوس ہوئی، کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی...

پڑھتے پڑھتے میں نہ جانے کہاں پہنچ گیا، بے حد ذاتی۔ کیا ہے وہ بے حد ذاتی؟ کیوں دنیا پاگل ہے اس نہایت ذاتی کے لیے؟ شیامل ماں کو نہایت ذاتی مانتی ہے۔ نہایت ذاتی کی تلاش اسے شوہر کے پاس لے جاتی ہے۔ ماں کی ذاتیت اور شوہر کی ذاتیت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ شوہر بیوی میں تعلقات منقطع ہو سکتے ہیں لیکن ماں اور اُس کی اولاد میں تعلقات کا انقطاع ناممکن نہیں تو عنقا ضرور ہے۔ کیا اس ذاتیت سے نجات پائی جا سکتی ہے؟ شوہر کی طاقت کی درندگی سے نجات کیا ذاتیت سے نجات کی خواہش نہیں ہے؟ نہیں، نہیں ذاتیت کی ضرورت سے نجات۔ کیا یہ نجات ممکن ہے...؟

اُس نے پھر خط پڑھنا شروع کیا۔۔۔

تم کب آ رہے ہو؟ سُمیتا کا خط ایک مہینہ قبل آیا تھا۔ اُس کا دل نہیں لگ رہا۔ سب بھاگ رہے ہیں وہاں، ذاتیت کا بوجھ کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ لمحوں میں جیتے ہیں سب، اپنے چہروں پر جھوٹے مسکان چپکائے۔

انکت وِبھا کے پاس خوب خوش ہے۔ میرے رہنے پر تم لوگوں کو اتنا یاد نہیں کرتا، لیکن وِبھا کہتی تھی جب وہ اکیلا تھا تو رات کو اکثر اٹھتا اور ممی کو ڈھونڈنے چل دیتا۔ اب تم آ جاؤ تو انھیں بھی بلا لوں۔

یہاں اور سب ٹھیک ہیں۔ وہاں سارے احباب کو میرا پیار۔

فکر مند

مہندر

اُسے ایک طرف رکھ کر سُمیتا کا خط اٹھایا۔ ٹرین تیز رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اتنی ہی تیز رفتار سے میرا دل دھک دھک کرنے لگا، لیکن تبھی اس میں خلل پڑ گیا۔ ایک نوجوان اوپر کی برتھ پر آ گیا تھا۔ میں نے پوچھا، "کہاں تک جا رہے ہیں؟"

"دہلی!"

"نیچے بیٹھیں گے کہ۔۔۔؟"

"نا نا، آپ لیٹے رہیے۔ میں کچھ دیر اوپر لیٹوں گا۔ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ چل رہی ہے۔"

میں نے خط کھولا، ایک جانی پہچانی مہک میرے ناک میں داخل ہوگئی۔ وہی جانے پہچانے خوبصورت حروف تھے، وہی شناسا طرز تخاطب — میری جان!

جمعہ رات نو بجے۔۔۔

۔۔۔ بہت دن بعد خط لکھ رہی ہوں۔ ضرورت سے نجات کی مشق کرنی ہے نا۔ سچ جتنی دیر کرتی ہوں، اتنا ہی اچھا لگتا ہے۔ کیوں لگتا ہے، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ یہاں آئی یہ اور بھی اچھا لگا۔ سچ ضروری ہے ہی نہیں یہاں۔ سب اکیلے بھاگ رہے ہیں۔ راہ میں ملے، ٹکرا گئے، الگ ہوئے اور پھر اپنی راہ پر بدستور ہے سب کچھ، ندی میں بہتے لکڑی کے تختوں کی طرح۔ لیکن میں کبھی کبھی گھبرا جاتی ہوں۔ ابھی عادی نہیں ہوں نا۔ تب تمھاری بہت یاد آتی ہے۔ لیکن خود سے سوال کرتی ہوں — یاد تمھاری ہی کیوں؟ کیوں یہ ضرورت؟ بتاؤ کیوں ہے یہ ضرورت؟ زیادہ دن ساتھ رہنے کی وجہ سے شوہر اور بیوی ہونے کی ضرورت کی وجہ سے؟

سنو گے۔ میرے گروپ میں ایک ڈینش لڑکی ہے۔ کل پوچھ رہی تھی — "تمھارے من میں چاہ نہیں پیدا ہوتی؟"

"کیسی چاہ؟" میں نے پوچھ لیا۔

"مرد کی۔"

میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ کتنی آسانی سے وہ کہہ گئی۔ جی میں آیا سچ کہہ دوں۔ جانتے ہو، سچ کیا ہے؟ سچ یہی ہے — جیسے تمھارے دل میں عورت کی خواہش پیدا ہوتی ہے ویسے ہی عورت کے دل میں مرد کی اور میں عورت ہوں، لیکن ہمیں سچ بولنے کا مشق نہیں کرایا جاتا۔ ہمارا سچ تو ستیہ میو جیتے، کے نعرے میں سمٹ گیا ہے۔ میں نے کہہ دیا، "ہم خواہش کے غلام نہیں ہیں۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی، "نفس کشی غیر فطری ہے۔ وہ تن اور من دونوں کو بیمار بنا دیتا ہے۔ تم لوگ ڈھونگی ہو۔ بُرا مت ماننا۔ تم سے پیار ہوگیا ہے تبھی کہہ رہی ہوں — میں آج رات اپنے ایک دوست کے ساتھ جا رہی ہوں۔ تم چاہو تو۔۔"

جی میں آیا کہہ دوں ــــ ہاں، میں بھی چاہتی ہوں۔ میں بھی چلوں گی۔ لیکن سنسکار تو کھلی بیداری کے ریشے ریشے کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ اتنا ہی کہہ سکی، "شکریہ، تمھیں مبارک ہو، تمھارا مرد۔"

اجیت! سچ کہنا، ان دنوں تم شیاملا کے پاس نہیں ہو گیا؟ تمھارا تذبذب کا شکار من وہیں سکون ڈھونڈتا ہے تم بھٹک رہے ہو اور یہ بھی سچ ہے کہ میرے ساتھ گزرا حادثہ تو صرف ایک بہانہ ہے۔ اُس کے بغیر بھی تم وہی کرتے جو اب کر رہے ہو۔ مرد تو شکاری ہے نا شکاری ہونے کی اس لازمیت سے نجات پانے کی بات آئی ہے کبھی تمھارے من میں؟

میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں کہ تمھیں نجات دے دوں جڑے رہنے کی لازمیت کیوں؟ اور سنو ــــ میں تمھیں پریشانی میں نہیں ڈالوں گی۔ تم پر الزام تو لگانے پڑیں گے لیکن طلاق میں مانگوں گی۔ تم بس دفاع نہ کرنا۔ انکِت کو میں رکھوں گی ...

اتوار ــــ رات کے دس بجے۔

پرسوں اتنا لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔ آگے لکھ نہیں پائی تھی۔ نہ جانے کہاں سے آکر انکِت میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے جو طوفان مچایا تو بس روتے روتے نہ جانے کب نیند کے آغوش میں چلی گئی۔ پتہ ہی نہیں لگا۔ پھر سنیچر اتوار پکنک کی گہما گہمی میں بیت گئے۔ ایک نیگرو نوجوان ہے۔ اُسے میری قربت کی بڑی چاہ رہتی ہے۔ مختلف طریقوں سے رجھاتا ہے۔ آواز بہت سریلی ہے۔ بہت خوبصورت گاتا ہے۔ آج کیا ہوا، گٹار لے کر میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ پھر ایک گھنٹے تک مجھے گھیر کر اُنھوں نے جو موسیقی کی محفل جمائی اُس میں میں بھی ڈوب گئی اور سادگی سے غالب کی وہ غزل گا اُٹھی۔

"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ــــ آخر اس درد کی دوا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں ــــ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

میری سہیلی نمیتا انگریزی میں اس کا مطلب سمجھا رہی تھی۔ اُس کے بعد کیا ہوا، جانتے ہو، وہ نیگرو نوجوان میرے پاس آیا۔ بڑے پیار سے بولا، "مجھے خوشی ہے آپ نے میری دعوت قبول کر لی۔ آج رات میں ہوٹل ... میں کمرہ لے رہا ہوں۔"

دوسرے ہی پل میں زور سے چیخ اُٹھی، "نہیں، نہیں، یہ نہیں ہوگا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"
اگر نمیتا وہاں نہ ہوتی تو میں بے ہوش ہوگئی ہوتی۔ وہ کسی طرح مجھے وہاں سے کھینچ لے گئی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں بے حد انجانی دنیا میں بھٹک گئی ہوں۔ اس دنیا میں جس کے ماحول میں شعلے بھڑک رہے ہوں۔

اس حادثہ کو ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے ہیں۔ میں پُرسکون ہوں اور تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔ سوچتی ہوں لکھنا ضروری کیوں ہوا؟ کیوں اس حادثہ کو اتنی اہمیت دی؟

ہمارے سنسکاروں نے ساری ترجیحات گڈمڈ کر دی ہیں۔ بلاتکار کے لیے عورت قصوروار نہیں ہے، لیکن سزا وہی برداشت کرتی ہے۔ ہم اُسے ایک حادثہ نہیں مان پاتے۔ کیوں، آخر کیوں؟ یہ کیسے سنسکار ہیں، یہ کیسا قانون ہے کہ میری رگ رگ میں بچھو سے سارینگ رہا ہے وہ بلاتکار۔

کیا میں عہد نہیں کر سکتی کہ میں اب کبھی اُس کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچوں گی ... نہیں سوچوں گی ... نہیں سوچوں گی؟

لیکن اجیت! سوچنے والی میں تھوڑے ہی نہ ہوں۔ میرا میں، تو میری پیدائش کے وقت نال کے ساتھ کاٹ دیا گیا تھا جیسے ہر عورت کا کاٹ دیا جاتا ہے اور ناب میں پنہاں کر دیئے جاتے ہیں جنم جنم کے وراثت کے طور پر سنجوئے کچھ عدد حیوانی سنسکار۔ وہ مندر کی گھنٹیوں کی طرح ٹھیک وقت پر بج اُٹھتے ہیں سنگیت کے دُھن سے تن من کو سرشار کر دیتے ہیں۔

اُنھیں سنسکاروں نے میری حفاظت کی، اُس نیگرو نوجوان سے۔

وہ حفاظت نہ کرتے تو کیا ہو جاتا؟ بتاؤ اجیت، کیا ہو جاتا؟ کیا قلبی تعلقات پنپ سکتے ہیں ایسے اتفاقات میں ... کیا قلبی تعلقات ضروری ہے؟

اجیت، آج تم سے بہت سی باتیں کرنے کو جی کر رہا ہے۔ یہ بہت ساری باتیں کہاں چھپی پڑی تھیں، میرے دل میں، کہاں سے واضح ہوگئیں۔ کیا بھارت میں رہ کر ایسا کر سکتی تھی؟ وہاں تو ہم ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لیے مجبور تھے۔ میں اُسی مجبوری سے نجات چاہتی ہوں۔

دو گے مجھے نجات؟

اچھا، ایک کہانی سنو۔ تلخ حقیقت۔ ایک معزز خاتون، شوہر، خاندان سب سے مطمئن خوشحال زندگی جی رہی تھی کہ دس برس بعد ایک دن اپنی پرانی ہم جماعت سے ملاقات ہوگئی۔ اسکول میں بڑی قربت تھی۔ بہت محبت سے ملی۔ سکھی نے اتنے ہی پیار سے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ وہ گئی لیکن وہ تو ایک نئی دنیا تھی، بہت ہی جدید، آزاد۔ معزز خاتون بہت گھبرائی، لیکن تھی صحت مند خوبصورت۔ اس کی جانب ایک صاحب خاص طور سے متوجہ ہوئے۔ کسی طرح جان بچا کر اس دن وہ لوٹ آئی۔ شوہر لمبے سفر پر تھے۔ اگلے دن پھر سہیلی اُسے لینے آگئی۔ بہت بہانے بنائے، آخر جانا ہی پڑا۔ سہیلی کے اصرار پر کچھ پی بھی۔ میٹھا میٹھا، پھر تیکھا کڑوا۔ ہیجان انگیز موسیقی، تھرکتے بدن، وہ بھی بالآخر ڈوب گئی۔ اس میٹھے کڑوے مشروب نے سنسکاروں کو سلا دیا تھا۔

ہوش آیا تو تن اور من میں جدوجہد جاری تھی۔ دل احساس گناہ سے ہراساں تھا اور جسم کی پنکھڑیاں کھل اُٹھی تھیں۔ دس سال میں شوہر سے وہ آسودگی نہ پا سکی تھی جو ان لمحوں میں اس نوجوان سے پا گئی تھی، لیکن احساس جرم اور آسودگی کی خوشی نے اُسے پاگل کر دیا۔ وہ پھر وہاں نہیں گئی۔ شوہر کے آنے پر مزید پیار، جوش سے انھیں سمیٹا، لیکن جسم کی پنکھڑیاں نہیں کھلیں۔ ایک دن اُس نوجوان نے فون کیا۔ کئی پل مدہوش اور رومانی باتیں سنتی رہی۔ پھر حواس پر قابو پا لیا اور ساری، رونگ نمبر، کہہ کر فون رکھ دیا۔ لیکن رانگ نمبر کہنے سے نجات تھوڑی نہ مل سکتی تھی۔ اس کی کشمکش پاگل پن میں تبدیل ہونے لگی۔ خود سے جوجھتے ہوئے جب لہولہان ہوگئی تو ایک دن اس نے خواتین کے مسائل کا حل ڈھونڈنے والے رسالہ کے مدیر کو خط لکھا۔ ساری کہانی بتا کر لکھا''' میں وہی مسرت اپنے شوہر سے کیسے حاصل کر سکتی ہوں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس کی کوئی دوا ہے؟ اگر آپ نے کوئی حل نہیں بتایا تو میرے پاس خودکشی کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں بچے گا۔ جسم اور جاں کی جدوجہد کو برداشت کرنے کی قوت مجھ میں باقی نہیں ہے۔۔۔''

تم اُسے کوئی ترکیب بتا سکتے؟

آج کیا کیا لکھ گئی۔ بند کروں اب دل کے اس درد کو۔ لیکن ایک بات قبول کروں گی کہ لکھ کر

بہت سکون ملا۔ یوں سکون کوئی اچھی چیز نہیں ہے کیوں کہ اُس میں غرض ہے۔

مجھے اُمید ہے تم سکون کے حصول کے جذبہ سے آزاد ہوکر جواب دوگے، جیسے میں نے اپنا من کھولا ہے۔ لیکن یہ سب میرے تمھارے درمیان رہے۔ ابھی باہر نہ جائے۔

اچھا میری جان! مجھے بہت زور کی نیند آرہی ہے۔ جانتے ہونا، زور کی نیند کب آتی ہے۔ تو سوجاؤں...

تمھاری اپنی

شمی

خط پڑھ چکا تو شمیتا میرے سامنے کھڑی تھی، بیباک انداز میں بے نقاب۔ پہلے اسے بے نقاب نہ دیکھا ہو، ایسا نہیں تھا۔ لیکن یہ تو نہ جانے کون سی شمیتا تھی، پرت در پرت کھلی۔ لیکن کتنی شاندار۔ ایک بار تو میں ڈر گیا، لیکن وہ تو میری جان، والی تمھاری اپنی شمی تھی۔ اس شمی کو مجھے پھر سے جاننا ہوگا، شروع سے آخر تک۔

نہ جانے کیا ہوا۔ میں نے خط چوم لیا۔ بار بار چوما۔ پھر اس نئی شمیتا کی تلاش میں نکل پڑا۔ تلاش باہر نہیں ہوتی، اندر ہوتی ہے۔

لیکن یہ تو کوئی اسٹیشن آرہا ہے۔ شاید بھوپال ہے۔ سویرا ہو گیا۔ رات بھر سوتا رہا تھا۔ بھٹکتا رہا شمیتا کے پیچھے۔ بیرا چائے رکھ گیا تھا اور سامنے بک اسٹال تھا۔ لڑکا پاس آکر رسائل دکھا رہا ہے۔ ساکشا نکار کا سالنامہ ہے شاید" دیکھوں بھئی"۔

صفحات پلٹتا ہوں ــــ ارے! اس میں پتاجی کی کہانی ہے 'تلاش'۔ عجیب اتفاق ہے۔ اور اتفاق بلاوجہ نہیں ہوتا۔ پتاجی کو بھی تلاش ہے کس کی؟

دوہرے رفتار سے تجسس بڑھ گیا۔ رسالہ خرید لیا اور پڑھنے لگا۔ لفظ لفظ پڑھتا گیا اور ڈوبتا گیا۔ جتنا ڈوبتا اتنا ہی ابھرتا ہندی شاعر بہاری کی زبان میں "ترے جے بوڑے سب انگ"۔

تلاش

دُھند، دھند اور دُھند!

کچھ بھی تو نہیں سوچھ رہا۔ پربھات نے پیڈ اُٹھاکر رکھ دیا۔ اب تین چار دن تک اُس کہانی کو وہ اندر امنڈنے دے گا۔

یہ ارادہ کرکے اُسے بڑا سکون ملا۔ اُس نے پیروں میں چپل ڈالی اور زینہ اتر کر گلی پار کرتا ہوا سامنے کی گلی میں داخل ہوگیا۔ اس بار فروری گزر جانے پر بھی سرد لہر کا اثر تیز رہا۔ دن بھر تیز برفیلی ہوائیں چلتی رہیں۔ کبھی کبھی گرج کے ساتھ اولے بھی پڑے۔ اب مارچ کے دوسرے ہفتے میں جاکر کہیں دھوپ میں حرارت کا احساس ہوا ہے۔ کبھی کبھی قدرت بھی کتنی غیر قدرتی ہوجاتی ہے۔ تبھی تو گورا نے ابھی تک کھلونے بنانے کا کام پورے زور و شور سے شروع نہیں کیا تھا۔ پھر بھی کاغذ کی لگدی تیار کی۔ سانچے بھرے۔ اس کے بعد لڑکیوں کو بلایا۔ جب پربھات وہاں پہنچا تو گورا منہمک ہوکر سانچوں سے بابوؤں کو نکال رہی تھی۔ ایک لڑکی جسم کے حصّوں کو جوڑ جوڑ کر سوکھنے کے لیے رکھ رہی تھی۔ دوسری کل کے دھوپ میں رکھے کھلونوں کے کوتے کھرچ رہی تھی۔ تیسری کھڑیا مٹی کا گھول تیار کر رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر گورا نے کہا، "آؤ، بابو جی بیٹھو۔"

پھر اوپر دیکھ کر ہنسی، بولی، "آپ بار بار کھلونے بنتے دیکھنے آتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر بنایئے نا۔ دے ناو ملا، بابو جی کو مٹی۔ دیکھیں، کیسے جوڑتے ہیں بابو۔"

پربھات بھی ہنس پڑا، "بنانا تو میں بھی چاہتا ہوں، لیکن تم میں مجھ میں ایک فرق ہے۔ میں سانچوں والے کھلونے نہیں بنانا چاہتا۔"

"تو؟"

"اپنے ہاتھوں سے من چاہی مورت بنانا چاہتا ہوں۔"

یہ کیا کہہ دیا پربھات نے؟ تینوں لڑکیاں ایک ٹک اسے دیکھنے لگیں۔

"بھلا بنا سانچے کے مورت بنی ہے کبھی؟" گورا نے پربھات کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا "ایک تھا ہم لوگن میں بھی ایسا ہی پگلا، دُھن سوار ہوگئی کہ اپنے ہاتھن سے بناؤں گا۔"

"بنائے پھر؟"

"دس دن میں کہیں جاکر ایک بن پایا تھا، من کے ما پھک۔"

"سچ ؟ بنا پایا من کے موافق، خوبصورت؟"

"ہائے بابوجی! کیا بتاؤں خوبصورت سا خوبصورت، بس جان پڑنے کی دیر تھی۔"

"میں بھی ایسا ہی بناؤں گا۔"

"بھوکوں مرو گے۔"

پربھات دھک سے رہ گیا۔ یہ بھید کہاں سے آگئی اس میں؛ لیکن گورا سچ کہہ رہی تھی۔ ہر چیز کا اپنا ایک معاشی نظام ہوتا ہے اور اکثر وہی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ پھر بھی اُس نے جواب نہیں دیا۔ وہاں بیٹھ گیا۔ اچھا لگتا ہے اُسے بیٹھنا۔ دیکھنا تخلیق کے اس عمل کو۔ پھر اُس نے ایک ہوا اٹھا کر اُسے غور سے دیکھا، دوسرا اٹھا کر دیکھا، تیسرا اُٹھایا، چوتھا اُٹھایا... پندرہواں بھی اُٹھایا۔ سب ایک جیسے۔ اُس نے چھری اٹھا کر انھیں ٹھیک کرنا چاہا۔ کسی میں کہیں کچھ الگ کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہی آنکھ، کان، ناک، وہی گھنگھرالے بال، وہی مسکان، بیٹھے تو ایک طرح سے بیٹھے، کھڑے تو سب ایک طرح سے کھڑے...

پوچھا "رنگ کب کرو گی؟"

"ابھی تو یہ سوکھے نہیں ہیں۔ کل سب کو کھڑیا مٹی میں ڈبونا ہے۔ پھر سوکھ گے۔ اُس کے بعد ہوگا رنگ۔"

"تبھی آؤں گا۔"

پربھات کئی دن سے ایک کہانی لکھ رہا تھا، اس کا آغاز اُس نے کچھ اس طرح سے کیا تھا۔

واسنتی سنگھار میز کے سامنے کھڑی آئینہ میں خود کو دیکھ رہی ہے۔ وہ خوبصورت ہے معمولی سے کچھ زیادہ خوبصورت... اس لیے اپنے روپ پر خود ہی فریفتہ ہو رہی ہے۔ وہ اپنے بالوں کو دھیرے دھیرے سہلاتی ہے اور وہیں سینے پر بکھرے رہنے دیتی ہے۔ پھر گالوں پر ہلکا پاؤڈر لگا کر، ہونٹوں پر لپ اسٹک کی آخری پرت جماتی ہے۔ ماتھے کی بندیا کو ایک بار پھر سنوارتی ہے گردن کو ادھر ادھر کر کے اپنے کو بار بار دیکھتی ہے۔ سینے پر لاکٹ کو گھماتی ہے اور پھر اچانک چونک پڑتی ہے۔ آئینے میں سے ہی دیکھتی ہے کہ پیچھے کے دروازے سے آکر اس کا شوہر پرشانت وہاں کھڑا ہو گیا ہے — سانولا رنگ، غیر متوازن ناک نقش، شراب میں دُھت...

دو پل دونوں آئینے میں ہی ایک دوسرے کو پرکھتے ہیں۔ صدیاں گزر جاتی ہیں۔ واسنتی دیکھے کو اَن دیکھا کرنا چاہتی ہے لیکن کر نہیں پاتی۔ وہاں سب کچھ بے نقاب ہے۔ اس لیے وہ اسے مسکراتے دیکھتی ہے۔ سانولے رنگ میں دھنسی سرخ آنکھیں اور موٹی ناک اور ان پر پھسلتی زہریلی مسکان۔ دوسرے ہی پل سب کچھ بدشکل نفرت میں بدل جاتا ہے۔ وہ تیزی سے جھپٹتا ہے، وہ تیزی سے مڑتی ہے۔ کانچ کی دیوار چور چور ہو کر بکھر جاتی ہے . . .

پرشانت جھپٹ کر واسنتی کو کندھوں سے پکڑ لیتا ہے اور چارپائی پر پٹک دیتا ہے —

"دیکھتا ہوں حرامزادی، ہر وقت یاروں کو رجھانے کے لیے سنگھار کرتی رہتی ہے۔ ہر وقت شیشے کے سامنے کھڑی رہتی ہے . . ."

اس اچانک وار سے چونک کر ایک بار تو واسنتی تڑپ اُٹھتی ہے لیکن دوسرے ہی پل اپنے آپ کو پرشانت کے چنگل میں سے چھڑانے کی کوشش میں چیخ اُٹھتی ہے، "تو پھر شراب پی کر آیا۔ تو ہوش میں نہیں ہے . . . مجھے چھوڑ دے، چھوڑ دے . . . ورنہ . . ."

وہ جتنا چھٹپٹاتی ہے، گرفت اتنی ہی مضبوط ہوتی جاتی ہے — "میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ میں تجھے بتاؤں گا، مجھ میں کتنی طاقت ہے۔ میں جانتا ہوں، تیری جیسی ہرجائی عورتیں وحشیوں کو پسند کرتی ہیں . . ."

سینے سے نکل کر سب کچھ باہر آنے کو ہوتا ہے۔ وہ چیخ اٹھتی ہے۔ "تیری طاقت شراب کی طاقت ہے، بزدل! تو جانتا ہے، تو مجھ سے ڈرتا ہے۔ تو شراب پینا چھوڑ دے۔"

"حرامزادی نصیحت کرتی ہے . . ." پرشانت تڑاخ سے اس کے گال پر تھپڑ دے مارتا ہے مارتا رہتا ہے ایک دو پانچ دس، پتہ نہیں کتنے، پھر . . .

پھر اُسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ وحشیانہ بلاتکار کے بعد پرشانت مجروح حواس باختہ واسنتی پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دیتا ہے۔ تب کہیں واسنتی کے حواس لوٹتے ہیں۔ درد اور خوف سے وہ چیخ اٹھتی ہے . . .

"چیخ چیخ کر یاروں کو کتنا ہی اکٹھا کر لے، تو بچ نہیں سکتی، اور سن لے، میرا نام لیا تو تیرے بیٹے کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

اور وہ پیچھے کے زینے سے غائب ہوجاتا ہے اور واسنتی کی چیخ پکار سُن کر جب تک پڑوسی وہاں پہنچتے ہیں، وہ سارے دکھوں کے پار پہنچ چکی ہوتی ہے۔

گورا کے پاس سے لوٹا تو دُھند اور بھی گہری ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار ابھرتے سانچوں میں ڈھلے ہوے اور سینے میں بج اُٹھتے اس کے اپنے الفاظ "اپنے ہاتھوں سے من چاہی مورت بنانا چاہتا ہوں۔"

اندر بیٹھے خالق نے سمجھایا، "اس واقعہ کے ساتھ کوئی سماجی مقصد نہیں جوڑ سکتے کیا؟

وہ بھی کیا ایک سانچہ ہی نہیں بن گیا ہے؟ سب واسنتیاں جہیز نہ دے سکنے والے باپ کی بیٹیاں بن جاتی ہیں یا زمینداروں کے ذریعہ ستائی جانے والی پس ماندہ طبقے کی بہو بیٹیاں۔ یا۔۔۔

رکو، رکو۔ واسنتی آزادی نسواں کی زبردست حمایتی ہوسکتی ہے۔ آزاد خیال واسنتی کسی غیر ذات کے شخص سے واقعی محبت کرسکتی ہے۔ ذہین واسنتی مسلسل ترقی کی راہ پر بڑھتی ہوئی شوہر کی احساس کمتری کا شکار ہوسکتی ہے۔۔۔

کتنی بار، کتنے ادیب ان کا استعمال کر چکے ہیں۔

اندر کے خالق نے اس بار کچھ مشتعل ہوکر کہا، "کہانی صرف پلاٹ نہیں ہے۔ اسلوب و زبان بھی شامل ہیں ان کے ساتھ۔ نئے اسلوب اور نئی زبان میں آزادیٔ نسواں کو نیا معنی دے سکتے ہو۔ عورت مرد کے صحیح رشتوں کی تلاش کر سکتے ہو۔۔۔"

اپنے اندر ابھرے اس کشمکش پر پربھات کو حیرانی نہیں ہوئی۔ یہیں تو وہ گورا سے الگ ہے۔ گورا کے باطن میں تخلیق کی آگ نہیں ہے۔ وہ آگ پیدا نہیں کی جاسکتی۔ وہ رگ رگ میں پیوست رہتی ہے۔ اس لیے تو وہ کچھ نئے کی تلاش میں ہے۔ کچھ لکیر سے ہٹ کر کچھ پُر جوش، گورا سے اُس نے یہی تو کہا تھا۔۔۔ لیکن گورا کے پاس تخلیق کی وہ نظر کہاں ہے؟ ایک روٹین ہے بس، معاش سے جڑی کاری گری، بنا بنایا سانچہ، اُسی کو سنوار کر وہ گزر بسر کا ذریعہ بناتی ہے۔ اُس کا مقصد تخلیق نہیں ہے۔ تخلیق کی قدر ہے۔ اُس نے کہا تھا: "سانچے سے الگ اپنے ہاتھ سے بناؤ گے تو بھوکوں مرو گے۔۔۔"

سب کچھ گڈمڈ ہوگیا۔ سوال ہی سوال لٹک گئے ہوا میں۔ تخلیق کی آگ، پیٹ کی آگ جیومیٹری کی کون سی تھیورم انھیں ایک زاویے پر لاسکتی ہے؟ کون سی . . .

تبھی کسی نے دروازے پر آہٹ کی۔ نجات ملی۔ خوشی سے پکار اُٹھا۔ "دروازہ کھلا ہے آجاؤ۔"

وہ ایک لڑکی تھی ــــ سلونا رنگ، ناک نقش سانچے میں ڈھلے، چہرے پر اعتماد اور آزادی کے ملے جلے تاثرات۔ نمسکار کے بعد بولی "میں اوشا ہوں۔ آپ کے مکان سے چار مکان چھوڑ کر رہتی ہوں۔ اندرپرستھ کالج میں پڑھاتی ہوں۔"

"جانتا ہوں، تمھارے پتا ٹھیکیدار ہیں نا . . ."

"آپ جانتے ہیں انھیں؟"

"جانتا ہوں، بس پہچان نہیں ہے۔ آپ سے بھی نہیں ہے۔"

اوشا مسکرائی۔ "لیکن میں آپ کو کچھ کچھ پہچانتی ہوں۔ بی۔ اے میں آپ کا ناٹک پڑھا تھا، چار پانچ سال پہلے بہت متاثر ہوئی تھی۔ نئی کرن کے ساتھ نئے زمانے کے آنے کے اشارے پر وہ ناٹک ختم ہوتا ہے۔ آپ کی کچھ تصانیف ملیں، پڑھیں، لگا آپ میرے ذہن کے بہت قریب ہیں۔"

"کیا اور پہچان کی ضرورت ہے ابھی؟" وہ زور سے ہنس پڑا، اس لیے کہ ہنسنا چاہتا تھا۔ اوشا بھی ہنستے ہوئے بولی،

"پہچان کی ضرورت کیا کبھی ختم ہوتی ہے؟ میں نے ایک کہانی لکھی ہے۔ عورت مرد کے رشتوں کی پہچان کو لے کر۔ میرے تحقیق کا موضوع بھی یہی ہے ــــ جدید ادب میں عورت مرد کے رشتوں کی پہچان۔"

حیرانی اور تحسین کے ملے جلے تاثرات پربھات کے چہرے پر ابھر آئے۔ بولا، "اس موضوع پر میں کام کر رہا ہوں۔"

اوشا نے جیسے سنا نہیں، کہتی رہی "آج آپ گورا بھابھی کے گھر گئے تھے نا؟ اور کچھ نیا کچھ سانچوں سے باہر کرنے کی بات کر رہے تھے۔ اُس سے میں بہت متاثر ہوئی۔"

پربھات پھر حیران ہوا "آپ سے کس نے کہا؟"

"وہاں میری بہن تھی، وملا۔ چھٹی ہوتے پر وہاں کام کرتی ہے۔ خود اعتمادی جگانے کے لیے

کچھ مل جاتا ہے۔ پتاجی کی ٹھیکیداری تو ہر وقت چلتی نہیں۔"

پربھات نے گہرے اپنے پن سے اوشا کی طرف دیکھا اور بیگانگی کو بُو سے آزاد آواز میں بولا، دھیرے دھیرے ۔"کیا یہ صرف اتفاق ہے کہ تم نے اُسی موضوع پر کہانی لکھی جس پر میں لکھنا چاہ رہا ہوں؟"

"اتفاق کبھی بلا وجہ نہیں ہوتے، اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہوتا ہے، جسے ہم پہچان نہیں پاتے۔"

"سچ!" خوشی سے اُچھل پڑا وہ۔

"مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

پربھات کا سر جھکا گیا۔ اُس نے نگاہ اُٹھائی۔ اوشا اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا روشنی کی ایک کرن ٹھہر گئی ہے ان دونوں کی آنکھوں کے درمیان ماورائی پل کی طرح۔

اوشا پھر کئی بار آئی۔ ہر بار لگتا جیسے صاف ہوا کا ایک تازہ جھونکا اس کے ساتھ چلا آیا ہے۔ دین دنیا سے بے خبر اس دن بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، ایک دوسرے میں کھوئے ہر طرف سے بے خبر کہ اچانک پربھات نے اوشا کو آغوش میں لے لیا۔ اس پل اوشا کا سلونا چہرہ جیسے کسی ماورائی نور سے چمک اُٹھا ہو۔ اس کی پلکیں جھپکنے لگیں . . .

تبھی جس تیزی سے آغوش میں لیا تھا اُسی تیزی سے اُسے آزاد کر دیا۔ لیکن اُس خاموش لمحے میں خاموشی نے کتنا کچھ کہا۔ بہت دیر بعد پربھات نے اُس سحر کو توڑا، "میں اپنے آپ کو روک نہیں سکا، اوشا۔"

"نہیں، تم اپنے آپ کو روک نہیں سکے یہ مجھے اچھا لگا۔ جب تم نے مجھے باہوں میں لیا تو مجھے لگا جیسے یہ لمس میرا پہچانا ہوا ہے۔ جیسے یہ آغوش میری اپنی ہے۔ یہاں کا ماحول، یہاں کا ہوا . . سچ مجھے نیند آنے لگی تھی۔"

"تمہاری پلکیں جھپکنے لگی تھیں۔"

"اور تم نے مجھے چھوڑ دیا۔"

"تب مجھے ایسا ہی لگا تھا۔"

"اور میں نے ایسا ہی چاہا تھا۔"

"اتفاق کہیں گے اسے؟"

"اتفاق کبھی بلا وجہ نہیں ہوتے۔ آپ نے کہا تھا نا کہ کہانی پھر سے لکھوں۔ ابھی نہیں لکھ سکی تھی۔ آج لکھنے کی کوشش کروں گی۔"

اچانک پربھات نے پوچھا، "سنا ہے کہ تم نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا ہے۔"

اوشا شاید اس سوال کا تصور نہ کر سکی تھی۔ دو پل کے لیے حیران رہ گئی۔

پربھات نے جیسے اُس کے کرب کو محسوس کیا ہو۔ بولا، "جواب نہ دینا چاہو تو۔۔۔"

اوشا اُسی پل سادگی سے بول اٹھی، "چھوڑا نہیں ہے، آزاد کیا ہے۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں، سائنس کے پجاری۔ بڑا پیار تھا ہم دونوں میں۔ وہ اونچی ذات کے ہیں۔ شادی کی تجویز انھوں نے ہی رکھی تھی۔ پتا کی مخالفت سہ کر بھی میں اُن کی بیوی بنی۔ لیکن نہ جانے کیا تھا کہ ہم ساتھی نہیں ہو سکے۔ دونوں ہی ہمیشہ اکیلاپن محسوس کرتے رہے۔ اُس سے بچنے کے لیے وہ اپنے تجربوں میں ڈوبے رہتے، میں ادب میں۔ تبھی میں نے پایا کہ سائنس کی ایک طالبہ اُن کے نزدیک آ رہی ہے۔ اپنے تجربوں میں ڈوبے یا اصلاح مشورہ کرتے انھیں گھنٹوں بیت جاتے اور اسی عمل میں وہ کبھی کبھی ایک دوسرے کی باہوں میں کھو جاتے، کھوئے رہتے۔ میری بیداری نے مجھ سے کہا ــــ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہیں۔"

"ایسا لگا تمھیں، سچ!"

"ہاں!"

"پھر؟"

اوشا ہنس پڑی، "آپ جانتے تو ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور ہیں الگ۔"

"وہ شادی کر لیں گے؟"

"شادی صرف ایک سماجی عمل ہے۔ باندھتی محبت ہے اور۔۔۔"

"رکو اوشا!" پربھات نے اچانک موضوع بدل دیا، "گورا کو میں نے کئی بار کھلونے بناتے دیکھا ہے۔ سارے عمل کا گواہ ہوں۔ اور میں کہانی لکھتا ہوں۔ ہر عمل کا شاہد ہوں میں۔ دونوں تخلیق

کرتے ہیں لیکن ...“

اوشا بیچ میں بول اُٹھی،” میں نے بھی کھلونے بنائے ہیں۔“

” تم نے کھلونے بنائے ہیں؟“

” ہاں، وہی تو ہمارا موروثی پیشہ رہا ہے۔ بڑے شوق سے ان میں ڈوب کر بنائے ہیں میں نے کھلونے، خوبصورت، لیکن میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ میرے چاروں طرف ایک لکشمن ریکھا کھینچی ہے۔ سانچوں کی لکشمن ریکھا۔ اُس ریکھا کو پار کرنے کا مطلب تھا سانچے توڑنا۔ میں نہیں توڑ سکی۔ تبھی کہانی لکھنے لگی۔ شاید یہی میرا فطری رجحان ہے۔ یہاں سانچے نہیں ہیں۔ ہیں بھی تو ان سے آزاد ہوا جاسکتا ہے۔“

” آزادی کی خواہش تمھارے اندر شروع سے ہی رہی ہے؟“

” اس کی تشریح ٹھیک ٹھیک نہیں کرسکتی۔ ہر کھلونا بنانے کے بعد مجھے لگتا تھا کہ اس میں میں نہیں ہوں۔ لیکن اب کہانی لکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ میرا مکمل وجود اس سے جڑا ہے میں ہوں اس میں۔“

” یعنی تم کہنا چاہتی ہو کہ تخلیق کی عمل کا لطف ”میں“ کا اظہار ہے؟“

” اظہار نہ کہہ کر، میں کا تخلیق سے اخراج، کہنا زیادہ مناسب نہیں ہوگا کیا؟“

” اخراج یا اتصال؟ ایک صورت ہونے کے لیے کیا دونوں کا آزاد وجود ضروری نہیں ہے؟“

حیران سی اوشا بول اُٹھی،” اسی لفظ کی تلاش تھی مجھے۔ یہی تو عورت مرد کے رشتوں کی کنجی ہے، یہی کہنا چاہا تھا میں نے اپنی کہانی میں۔ ادویت کی حالت میں پہنچ جانے پر تو محبت اور سکھ کا سوال غیر متعلق ہو جاتا ہے۔ اچھا اُٹھو میرے ساتھ چلو۔“

” کہاں؟“

” جہاں میں لے چلوں۔“

اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بھی جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی پیچھے پیچھے اتر گیا۔ دروازے پر آتے ہی گوراجی جی دکھائی پڑ گئی۔ اپنی سدا بہار مسکان کو تھوڑا گہرا کر کے بولی،” آپ کی ایک چوری پکڑ لی ہے ہم نے۔“

” میری چوری؟ میں نے کس کا کیا چرایا ہے؟“

"کیوں، اس دن مجھ سے کیا کیا نہیں پوچھا تھا۔ منّو جل کر مر گئی تھی، آپ نے اس کی کہانی نہیں لکھی؟"

پربھات حیران رہ گیا۔ پھر بھی ہنس کر بولا، "وہ کہانی کسی ایک منّو کی نہیں ہے۔ وہ عورت پر ہونے والے ظلم کی کہانی ہے۔"

"بابو جی، وہ کہانی سُن کر لگا کہ جو آپ نے لکھا وہ سب سچ ہے۔ اس سچ کو ہم بھی بھگتتے ہیں، لیکن کہہ نہیں پاتے۔ آپ نے ہمارے دل کی آواز کو دور دور تک پہنچا دیا۔"

پربھات اندر سے کھِل اُٹھا۔ اس نے اوشا کی طرف دیکھا۔ اسی پل اُس کی نگاہ اُٹھی، فخریہ، تحسین آمیز۔ گورا اسی طرح کہتی رہی، "پتہ نہیں منّو کیسے اُس ظالم سے چپکی رہی۔ میں ہوتی تو کبھی کا چھوڑ دیتی۔ ہم لوگن میں ایسی بندش نہیں ہے۔ میں تو اپنے گھر والے کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔"

"کیوں؟"

"شراب پی کر مار پیٹ کرے تھا۔ ہاتھ پاؤں جوڑ کر اور پنچایت میں وچن دے کر دوبارہ لایا۔ ہم برابر کھٹے ہیں۔ برابر کا کماوے ہیں۔ ہم پے نہیں چلے گی دھونس پٹّی۔ ہم نا سہتے کسی کی چودھراہٹ۔"

پھر ایک دم بولی، "آؤ میرے ساتھ جگ رانی سے ملواؤں۔ اس کی کہانی لکھنا، پڑھنے والوں کو کچھ اکل بھی آوے۔"

اور وہ آگے بڑھ گئی۔ حیران پریشان اوشا پربھات کی طرف دیکھ کر بولی، "ایک اور اتفاق۔ میں بھی آپ کو اسی کے پاس لے جا رہی تھی۔ وہ دیکھو اس کا گھر۔"

جگ رانی کا گھر کیا، بس ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ اوروں سے ان معنوں میں الگ کہ پکّا تھا۔ اسی میں کھانا پینا، سونا رہنا، اسی میں کھلونے بنانا۔ سامان کم، لیکن سب قرینے سے لگا سجا۔ ہر بات میں ایک سلیقہ تھا۔ آگے گلی تھی۔ اُس کے دوسری طرف بڑے مارکیٹ کی اونچی دیوار تھی۔ اُسی کے سہارے ٹین ڈال کر اور تختے جوڑ کر دکان بنالی تھی۔ ہر طرف سے بے خبر خود بھی رنگی پتی، وہیں بیٹھی، برش سے دھیرے دھیرے کھلونوں کے ناک نقش ٹھیک کر رہی تھی۔ اُس کے کھلونے بہ نسبت خوبصورت اور ذوق کے غماز تھے۔ گورا نے پکارا، "اے جگ رانی، کیا حال ہیں تیرے؟"

جگ رانی نے چونک کر سر اٹھایا، "ارے جی جی آؤ۔"

"بڑے سندر کھلونے ہیں ری تیرے تو. تیرے ہاتھ میں بڑی سُگھڑائی ہے۔"

"بس جی جی! تم تو جانتی ہو اُن کو. کیسے مدد کرے ہیں میری. اسکول سے پڑھا کے آوے اور ان میں لگ جاوے ہیں۔ مجھے رنگ کرنا سکھادیں، دکان میں جاکر بھاؤ تاؤ کریں. ایک دن ٹیلی ویژن والوں کو لے آئے. فلم بنا کے لے گئے. خود بھی رنگ کریں ڈرائنگ جانے ہیں. یہ دیکھو رادھا کرشن انھوں نے ہی رنگے ہیں۔"

دو پل کے لیے سب اس مورت کو دیکھتے رہے. رسا پنہ وہی تھا لیکن کچھ نیا، کچھ اور سا کرنے کی خواہش نے اُس کا روپ ہی بدل دیا تھا. باطن ابھر آیا تھا باہری روپ میں. گوراننے ہی اُس جادو کو توڑا، بولی، "دورے دورے تو نہیں پڑتے اب تجھے؟"

"اب کیوں پڑیں گے جی جی!" کہتے کہتے فخر اور شرم کے ملے جلے احساس اس کی آنکھوں میں اُبھر آئے. پربھات کو اُس پل لگا کہ جگ رانی خود ایک کھلونا ہے. باطن کی روشنی سے جگ مگ کرتا ہچے جیسا اس کا روپ۔

"اچھا جگ رانی! جیسا تجھے ملا سب کو ملے. یہ بابو جی ہمارے پڑوسی ہیں. کھلونا بنانا سیکھ رہے ہیں اور یہ اوشا ان سے کہانی لکھنا سیکھ رہی ہے. میری کہانی لکھے گی۔"

اور کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی. جگ رانی اوشا کی طرف دیکھ کر طنز سے مسکرائی، "بی بی رانی! کہیں ایسا نہ ہو کہ میری کہانی لکھتے لکھتے خود کہانی بن جاؤ۔"

اوشا بولی، "میں کہانی بنوں یا نہ بنوں لیکن بھابھی، تمھاری کہانی میں لکھ چکی ہوں۔"

اور وہ کھِل کھِلاتی ہوئی آگے بڑھنے ہی والی تھی کہ جگ رانی نے پکار لیا، "رکو بی بی رانی میرے ساتھ آؤ، آپ بھی بابو جی۔"

اُس کے پیچھے اس کے فقط ایک کمرے میں جاکر اُن دونوں نے جو کچھ دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے ۔۔ ایک کونے میں پردے کے پیچھے اسٹینڈ پر ایک نامکمل مورت، ادھوری، لیکن آنکھوں سے امنڈتی سیدھی سادی امنگ پورے وجود کو روشنی سے بھرتی داخلی احساسات کو ظاہر کرتی بے مثال ادا، نایاب... اوشا پھسپھسائی، "تمھاری انگلیوں نے بے جان مٹی میں بھی جان ڈال دی بھابھی۔"

"تم نے بنایا ہے اِسے؟" پربھات نے خوش دلی سے پوچھا۔

"انگلیاں تو اسی کی ہیں، لیکن مدد میری بھی ہے۔"

اوشا نے اب جگ رانی کی آنکھوں میں جھانکا، بولی "بھابھی میری! اب تک جو لکھا تھا وہ سب چھوٹا پڑ گیا۔ پھر سے لکھنا ہوگا۔"

راستے میں اس نے پربھات سے اتنا ہی کہا "سانچے توڑنے کی چاہ ہر کسی کے دل میں ہوتی ہے یہی تو تلاش ہے۔"

پربھات تب سوچ رہا تھا۔ سانچے کھلونوں ہی کے نہیں ہوتے، رشتوں کے بھی ہوتے ہیں۔

اگلے دن اوشا نے بتایا۔ "جگ رانی ایک غریب گدھے والے کمہار کی بیٹی ہے۔ بچپن میں اپنے پڑوسی بابو لال کے گھر جاکر کھلونے بنانے میں مدد کرتی تھی۔ بابو لال اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اکثر وہ بہتر اس کے پاس جا بیٹھتی اور سنتی رہتی۔ دونوں انجانے میں ایک دوسرے کی طرف کھینچنے لگے۔ ایک دن بتا رہی تھی، جب میں اس کے پاس بیٹھتی تھی تو مجھے لگتا تھا، چاروں طرف پیاری پیاری ہوا بہہ رہی ہے۔"

پربھات نے پوچھا، "دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی تھی؟"

"کیسے ہوتی؟ بابو لال پرجاپتیوں کا بیٹا، پڑھ کر مدرس ہو گیا۔ جگ رانی گدھے والوں کی بیٹی۔ بے حد غریب۔ چپ چاپ ایک مکان مزدور کے گھر اس کے باپو نے بٹھا دیا۔ وہ شرابی چاہتا تھا کہ یہ بھی مزدوری کرے۔ یہ چاہتی تھی کھلونے بنانا۔ اس بات پر وہ اسے خوب مارتا۔ یہ اندر ہی اندر سلگتی رہتی۔ دھیرے دھیرے دورے پڑنے لگے۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے۔ اس پر ایک دن اس نے اسے مارا ہی نہیں گھر سے بھی نکال دیا۔"

"بابو لال نے اُس کی مدد نہیں کی؟"

"کرتا تھا تو وہ اور بھی پٹتی تھی۔ لیکن اس دن لہولہان وہ بابو لال کے گھر جاکر بولی، "اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"بابو لال نے ایک پل اُسے دیکھا اور مضبوط آواز میں کہا، "نہیں، اب تجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔"

"پہلے شوہر نے سمجھا تھا۔ کہاں جائے گی؟ دو چار دن میں جھک مار کر لوٹ آئے گی جب

ایک مہینہ بیت گیا تو اُس نے پنچایت میں فریاد کی۔ کئی دن تک بیان ہوتے رہے۔ آخر میں پنچوں نے فیصلہ دیا۔ جگ رانی کو پورا حق ہے کہ پہلے مالک کے گھر جائے یا نہ جائے۔ لیکن اگر وہ نہیں جاتی تو اُسے جرمانہ دینا ہوگا۔"

پربھات یکبارگی بول اٹھا۔ "اور بابولال نے جرمانہ بھر دیا۔"

اس کے بعد اوشا کئی پل خاموش بیٹھی پربھات کی طرف دیکھتی رہی۔ متاثر ہوتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے سنجیدہ آواز میں اس نے کہا۔ "من کا سُر ملنا کیا یہی نہیں ہے؟"

"من کا سُر، پربھات نے جیسے سرگوشی کی، یہی تو وہ پارس پتھر ہے جو لوہے کو سونا بنا دیتا ہے۔ جب خالق کے من کا سُر لفظ کے سُر سے مل جاتا ہے تو تخلیق بے مثال ہو جاتی ہے اور جب عورت کے من کا سُر مرد کے من کے سُر سے مل جاتا ہے تو ملن لائق ستائش ہو جاتی ہے۔ اسی جذبہ کو کسی ماہر لسانیات نے کبھی محبّت کا لفظ دیا ہوگا۔

کیا سب کچھ اتنا آسان ہے، اس حد تک آسان ۔۔ سانچے تلاش، من کا سُر؟ آسان ہے تو زندگی بھر ساتھ رہنے پر بھی ایک دوسرے کو کیوں نہیں جانتے؟ اور کیوں دو پل میں سب جانا پہچانا لگنے لگتا ہے؟

نہ جانے کب، کس پل دفعتاً یا جان بوجھ کر اوشا نے اپنا ہاتھ پربھات کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ اسی حالت میں پربھات نے اُسے دبا دیا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ دوسرے ہی لمحے اوشا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "بس چلتی ہوں پربھات۔"

پربھات اس اچانک کے لیے تیار نہیں تھا۔ جھجک کر بولا "نہیں، نہیں، رکو، مجھے تم سے۔۔۔"

"پھر کبھی۔" اوشا کی آواز سنائی دی۔ وہ زینہ اتر چکی تھی۔

اوشا کئی دن تک نہیں آئی۔ پربھات ان دنوں کئی اہم میٹنگوں میں مصروف رہا۔ پھر بھی صحیح رشتوں کی تلاش انجانے میں، اس کے ذہن میں چلتی رہی۔ مصروفیات سے نجات پاتے ہی اُسے اوشا کی یاد آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ جب بھی وہ آتی ہے، سارا ماحول ایک عجیب سی روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔ روشنی جو اس کے خارج و باطن دونوں کو اجالوں سے بھر دیتی ہے۔ وہ نہیں آئی تو لگا کہ کچھ ہے، جس کا نہ

ہونا معنی رکھتا ہے۔

ایک دن وہ پھر گورا کے پاس پہنچا۔ وہ اکیلی بیٹھی چھوٹے چھوٹے کھلونوں پر شیشے جڑ رہی تھی۔ کئی پل انھیں دیکھتا پرکھتا رہا، تصور کرتا رہا کہ کسی ماہر فنکار کے ہاتھوں میں ان کی کیا شکل ہوتی ہے۔ حدود میں رہ کر بھی جگ رانی کتنا روپ دے پاتی ہے، سانچوں میں نکلے کھلونوں کو بھی . . .

میں بھی کہانی پر ایسے ہی محنت کرتا ہوں۔ جب تک من کا سُر نہیں ملتا لفظ کے سُر سے تب تک کاٹتا رہتا ہوں، لیکن یکبارگی وہ چونک پڑا۔ میں بھی تو لکھتا ہوں، آکاشوانی یا ایسے ہی ذرائع کے لیے۔ تب کیا سُر کی فکر کرتا ہوں؟ معاشں جڑا ہے نہ میرے اُس عمل سے . . .؟

گورا بول اُٹھی، "کس سوچ میں پڑ گئے بابوجی؟"

جواب میں پربھات نے پوچھ لیا، "شیشے جڑنے پر کھلونوں کی قیمت بڑھ جاتی ہے؟"

"کیوں نہیں بڑھے گی، زیادہ محنت، زیادہ مال، زیادہ قیمت۔ کیا یہ آپ کو زیادہ خوبصورت نہیں لگتے؟"

"لگتے ہیں، لیکن . . ."

"آپ ہر بار ایک ہی بات کرتے ہیں، لیکن . . . جو فن پیٹ نہیں بھر سکتا اُس کا ہم کیا کریں؟ ایک بار وہ سر پھرا ہمیں ایک نمائش دکھانے لے گیا تھا۔ مٹی کے برتن تھے لیکن کیسے خوبصورت چھوتے ڈر لگتا تھا۔ کھلونے تو بس بات کرتے تھے۔ لیکن بابوجی ایسی چیزیں بڑے لوگن کے ڈرائنگ روم میں سجائی جا سکے ہیں۔ ہمیں تو وہ آرٹ چاہیے جو روز پیاس بجھا سکے . . ."

محسوس ہوا کہ زینے سے کوئی آ رہا ہے۔ مڑتا، تب تک گورا نے سر کا پلّو آگے سرکا کر کہا، "آؤ، آؤ، ٹھیکیدار جی۔ اوپر چلیں، بیٹھک میں۔"

پھر پکارا، "اے کسنی! ذرا چائے تو بنا۔ ٹھیکیدار آئے ہیں۔"

پھر پربھات کی طرف مڑی، "آپ جانتے ہیں نہ انھیں، اوشا کے پتا ہیں ٹھیکیدار نرنجن سنگھ۔"

پربھات نے انھیں نمسکار کیا، "آپ کو بہت بار دیکھا ہے لیکن کبھی بات نہیں کر سکا۔"

اتنا کہتے ہوئے تین سیڑھیاں چڑھ کر جس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا، پربھات اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کبھی یہاں لکڑی کا کھوکھا تھا، اب وہ پکا ہے۔ ایک الماری میں چمچماتے برتن سجے ہیں۔ دوسری

طرف ویسی ہی الماری میں اپنے بنائے کھلونے ہیں اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ ٹیلی ویژن بھی ہے۔ دیوان تو ہے ہی، چھوٹا سا صوفہ بھی ہے۔ گورا نے کہا، "بیٹھو۔"

پربھات بولا، "اس کے آگے کبھی نیم کا پیڑ تھا؟"

"تھا بابوجی، لیکن اب دنیا ہی بدل گئی ہے۔ نیم نہیں ٹیلی ویژن چاہیے ہمارے بچوں کو۔"

نرنجن ٹھیکیدار بوڑھے ہو چلے تھے۔ چہرے پر گہری اداسی تھی۔ ایسی کی سامنے والے کے وجود کو نگل لے۔ بولے، "سب کچھ بدل گیا، بدلتا ہے زمانے کے ساتھ، لیکن سالے یہ ہمارے بچے، یہ کہاں جا رہے ہیں۔۔۔"

گورا ہنس پڑی، "آسمان میں جا رہے ہیں۔ آدمی چاند پر گھوم آیا ہے۔"

ٹھیکیدار کی زبان میں تلخی بھر آئی، "دیکھو جی، ہم تو ایک بات جانتے ہیں، جس دھرتی ماں کی گود میں ہم لوٹ نہ سکے، جس کی دھول ہمارے ماتھے کی شوبھا نہ بنے وہ کیسے ہماری؟ وہاں تو وہ اُڑے پھرے تھے۔ وہاں کی دھرتی اور اُن کے بدن کے بیچ میں نہ جانے کتنے پردے ہیں، اُس زمین سے ہمارا کیا ناتہ؟"

"وہی تو کہہ رہی تھی۔ ہمارے بچے دھرتی پر ٹکتے ہی نہیں۔ اور آپ بھی تو بابوجی ہمیشہ وہ کیا آرٹ، آرٹ، کی بات کرد ہو۔"

پربھات بول اُٹھا، "تمھارے اس چھوٹے سے کمرے میں بڑا آرٹ ہے، گورا جی۔"

گورا کھل کھلا پڑی، "بابوجی! بات بدلنا کوئی آپ سے سیکھے۔ ابھی نیم کے پیڑ کی بات کر رہے تھے۔ اس کے آس پاس کا رنگ دیکھا ہے آپ نے؟ آرٹ وہاں تھا۔ ریڈیو والے کئی بار آئے۔ ایک بار تو ڈرامہ بنا دیا۔ سنا تو بڑا اچھا لگا۔ اپنے پر گرب ہوا۔"

ٹھیکیدار نے کچھ سنا، بولا، "میں تو اپنی دھرتی کی بات کر رہا تھا۔ ہماری اوشا کو دیکھو۔ آپ کو تو سب بتایا ہوگا۔ میں تو کچھ سمجھ نہیں پاتا۔ طلاق کا مقدمہ کر دیا ہے۔ پہلے تو جی کورٹ کچہری کون جانے تھا۔ پنچایت میں فیصلہ کر لیتے تھے، لیکن اب ہم نے تہذیب سیکھ لی ہے۔ آسمان پر نظر ہے۔ ایک یہ گورا ہے اور ایک ہماری اوشا۔۔۔"

پربھات نے دھیرے سے کہا، "آپ کی بیٹی اوشا بہت سمجھدار ہے۔ وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی

ہے۔ آپ اُس کی طرف سے بے فکر رہیں۔ وہ کبھی کوئی بُرا کام نہیں کرے گی۔"

"وہ تو سمجھوں ہوں۔" ٹھیکیدار نے کہا، "لیکن مجھ سے اس کی یہ اداسی نہیں دیکھی جاتی۔ سب کرتی ہے لیکن بے دلی سے کبھی کبھی تو مجھے بڑی اجنبی، بڑی پرائی سی لگتی ہے۔ کبھی لگے ہے، کوئی دیوی اتر آئی ہے میرے گھر میں۔ مجھے تو دونوں سے ہی ڈر لگے ہے۔ آپ سمجھاؤ نا اُسے۔ آپ کے پاس ہی آئی ہے بس۔ اور جب لوٹتی ہے تو بڑی خوش نظر آتی ہے۔"

پربھات نہ جانے کہاں پہنچ گیا تھا۔ اچانک جواب نہ دے سکا، لیکن آخری جملہ سن کر وہ حال میں لوٹا، بولا، "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں اُس سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔"

گورا ہنس پڑی، "بابو جی، آپ خوشامد کرنا بھی جانتے ہیں، لیکن آپ نے اس بار، لیکن نہیں لگایا۔"

پربھات کھل کھلا پڑا، "لگانے والا ہی تھا کہ تم نے ٹوک دیا۔"

"میں نے یا اوشا نے؟"

"سچ تو یہی ہے، گورا جی۔ میں نے اوشا سے یہی سیکھا ہے کہ لیکن کا استعمال بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہیئے۔"

گورا بولی، "تب تو وہ ضرور جادو جانتی ہے۔"

ٹھیکیدار کے چہرے کی گہری اداسی ہلکے فخر میں بدل چکی تھی۔ چائے کی آخری گھونٹ بھرتے ہوئے وہ بولے، "ٹھیک ہے، میں چلا۔ آپ اتنا جانتے ہیں تو مجھے کوئی ڈر نہیں۔ کوئی تو ہے اس کا۔"

اور وہ چلے گئے۔ گورا اور پربھات ایک پل خاموش بیٹھے رہے۔ پھر گورا بولی۔ "بابو جی، سنا ہے آپ کی شادی ہوئی تھی؟"

ایک پل خاموش رہ کر اُس نے جواب دیا "ہوئی تھی، لیکن پھیرے لینے کے بعد میں فوراً کسان تحریک سے جڑ گیا۔ جڑا تو پہلے ہی تھا۔ اب تو جیل جانا پڑا۔ ڈیڑھ برس بعد لوٹا تو وہ ایک حادثہ میں بری طرح گھائل ہو گئی۔ صرف دو ہفتے۔ اس کی خدمت کر سکا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے جب اُس نے آخری سانس لی تو میں سمجھ نہیں سکا کہ اس کی نگاہ میں کیا تھا۔ پیار، حسرت یا...؟"

"یا...؟"

"پتہ نہیں گورا جی، لیکن وہ نگاہ میری رگ رگ میں پیوست ہوگئی ہے؟"

کئی پل خاموشی چھائی رہی، پھر گورا نے پوچھا، "دوسری شادی نہیں کی؟"

"جی نہیں ہوا۔"

"اب کروگے؟"

"کیوں؟ کوئی لڑکی سانچے میں ڈھلی ہے کیا؟"

"ڈھالنا چاہا تھا، لیکن اس نے سانچہ توڑ دیا۔"

سر سے پاؤں تک پربھات کانپ اٹھا۔ کیا کہہ گئی گورا جی۔ خالق کردار کو سانچے میں ڈھالنا چاہے اور کردار اُسے توڑ دے تبھی تو تخلیق زندہ جاوید ہوتی ہے...

"میری بات کا جواب نہیں دیا، بابو جی۔"

پربھات اٹھ کھڑا ہوا، بولا، "تم نے مجھے اپنا سمجھا تبھی دل کی بات کہی۔ بہت اچھا لگا، لیکن..."

پھر خود ہی کھل کھلا پڑا، "لو پھر، لیکن، آگیا۔ اوشا کی تعلیم ادھوری ہے۔"

گورا بھی کھل کھلائی، "سمجھ گئی، سب سمجھ گئی۔ لیکن جانے سے پہلے ایک چیز دیکھتے جاؤ۔"

"کیا؟" پربھات نے حیران کن لہجے میں پوچھا۔

"ادھر چھت پر طوطے دیکھے تھے نہ تم نے؟ ہرا رنگ ہوتا ہے اُن کا۔ لیکن میں نے کیا کیا ہے دیکھو۔"

اندر جاکر وہ ایک طوطا اٹھا لائی۔ تعجب! اس کا رنگ سرخ تھا۔ چونچ اور منہ سفید۔ بولی، "میں نے سوچا، آپ سانچے توڑنے کی بہت بات کرتے ہیں، لیکن سانچے میں ڈھلے کھلونے میں بھی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ آپ نے جگ رانی کے کھلونے دیکھے ہیں۔ میں نے بھی رنگ بدل دیا ہے۔ اچھا لگتا ہے نا؟"

پربھات نے دیکھا، گورا کی آنکھوں میں چمک ہے، بولا، "گورا جی، شاید تمھیں معلوم نہیں طوطے سرخ رنگ کے بھی ہوتے ہیں۔ کم ہوتے ہیں، لیکن ہوتے ہیں۔"

اس شام پربھات کے داخل میں سانچے اور فن کو لے کر ایک کشمکش تھی۔ رات میں سوچتے ہوئے پتہ نہیں کب پلکیں جھپک گئیں۔ خواب میں سامنے اوشا تھی۔ وہ اس سے بحث کر رہا تھا، "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہر سانچہ کبھی فن کی شکل میں رہا ہوگا اور کہ ہر فن ایک دن سانچہ بن کر رہ جاتا ہے؟"

اوشا نے جیسے فیصلہ دے دیا ہو، میں آج کی بات کہتی ہوں ۔ ہمیں سانچے توڑنے ہی ہوں گے۔ توڑنے ہی ہوں گے۔ تم میری مدد نہیں کرو گے کیا، تمہارے ساتھ ہوتی ہوں تو میں بے خوف ہوجاتی ہوں۔ کتنی طاقت دیتا ہے یہ بے خوف ہونا!

اُسی پل آنکھ کھل گئی ۔ دودھ والا دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ کانپ اُٹھا ۔ کیا یہ اُس کی اپنی آواز نہیں تھی؟

تیسرے دن اوشا آئی ۔ پربھات نے اُس سے کچھ نہیں چھپایا۔ اوشا مسکرائی " مجھے آپ سے زیادہ معلوم ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ طلاق ہوتے ہی ہم دونوں شادی کرلیں گے ۔"

"سچ ؟"

"میں سنی ہوئی کہہ رہی ہوں۔ سچ یا جھوٹ مجھے کیا معلوم ؟"

"سچ ..." اس بار پربھات کچھ جذباتی ہوگیا جیسے دل دھڑکنے لگا ہو۔ یہ بھی کیسا وہم ہے ۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، دل صرف خون سپلائی کرنے والا مشین ہے۔ لیکن شاعر نے اُسے انسان کے سارے جذبات کا مرکز بنا دیا ...

پوچھا " اُس خواب کے بارے میں کیا کہتی ہو؟"

اوشا تب تک اس کے پاس آگئی ۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی " پربھات، میرے دوست بنو گے؟"

پربھات اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جواب نہ دے سکا۔ اوشا اُسی سادگی سے کہتی رہی " بہت دنوں سے میں ایک دوست کی تلاش میں تھی ۔ ایسا دوست جو ایک دوسرے کے لیے صاف شفاف ہوکر بھی ایک دوسرے کے لیے لازمی نہ ہو۔ جو اپنے اپنے سماجی وجود کو ثابت رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے ہوں۔ پھر بھی ایک دوسرے پر منحصر نہ ہوں۔ ایک دن تم نے ہی کہا تھا نا ___ 'اخراج، نہیں انفصال'۔"

جواب میں پربھات نے اوشا کو باہوں میں سمیٹ لیا اور ہلکے سے اس کے ماتھے کو چوم لیا۔ دونوں کی نگاہیں مل گئیں اور ملی ہی رہیں جیسے اس لمحے کائنات میں ہر طرف صرف وہ آنکھیں ہیں۔ خود میں پورے عالم کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ سیّال ہوکر بھی شعلہ انگیز، خاموش رہ کر بھی کشادہ ذہن، بے شمار ہوکر بھی ایک۔

نہ جانے وہ لمحہ کب تک منقضی بنا رہتا کہ کہیں سے ایک بیباک اور خوشنما ہنسی کی آواز وہاں بکھر گئی۔ ایک ساتھ انھیں پاک اور مسحور کرتی۔ دونوں ایک ساتھ مشینی انداز میں مڑے۔ آواز کی طرف کھڑکی کے اس پار دیکھا۔ سامنے کی چھت پر ایک سانولی نیم برہنہ مزدور عورت ویسے ہی سانولے ویسے ہی نیم برہنہ بچے کو ہاتھ میں لیے اچھال رہی ہے۔ بار بار اچھالتی ہے۔ بار بار منہ سے پیٹ میں گدگداتی ہے اور بچہ بار بار کھل کھلا اٹھتا ہے — بے ساختہ، خوش ذوق۔ ماں بھی اتنی ہی خوشی سے کھِل کھِلاتی ہے اور پھر اچھالتی ہے۔ پھر اُن دونوں کی مشترکہ کھِل کھِلاہٹ سب کچھ اعادہ کرلیتی ہے...

اُس جھلملاتے نقاب میں کتنے خوشنما، کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں ماں اور بیٹے، ایک دوسرے کے پاس آتے ہوئے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے... گونگے...

اپنی کامیابی سے سرشار پربھات لگ بھگ چیخ اُٹھا۔ ''یہی ہے وہ خوشی، اوشا جس کی تلاش میں میں بھٹک رہا تھا۔''

اوشا چونک اُٹھی۔ ''تم نے کیا کہا، خوشی؟ اس دن تم نے سکھ کہا تھا۔ میں مطمئن نہیں ہوسکی تھی کیونکہ سکھ، پانے سے جڑا ہے۔ محویت ہے اس میں۔ خوشی دینے سے جڑی ہے۔ لطف ہے اُس میں۔ وہی تو کنجی ہے تکوین اور ساتھ ہونے کے احساس کی۔ مجھے منتر مل گیا۔ اب میں اپنی کہانی پوری کرسکوں گی۔''

اور بچوں کی طرح کھل کھلاتی وہ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ کہتی ہوئی ''پوری ہوجانے پر تمہیں سنانے لاؤں گی۔''

پربھات نے اُسی انداز میں کہا۔ ''کیوں، دونوں مل کر اُسے پورا نہیں کرسکتے؟''

اوشا ٹھٹھکی، مڑی، پربھات کی آنکھوں میں جھانکتی اُسی انداز میں بولی۔ ''نہیں، ٹھیک مل کر نہیں، ایک دوسرے کی سالمیت کو قبول کرکے، ایک دوسرے کی غلامی سے آزاد ہوکر...''

اُسی طرح آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پربھات نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اُسے لگا جیسے ایک بے کیف سی مسرت اسے شرابور کررہی ہے لیکن جب وہ کہانی لکھنے بیٹھا تو واسنتی اور پرشانت دونوں نے اس کی راہ چلنے سے انکار کردیا۔

متوسط طبقے کے کردار اتنی آسانی سے اپنے سانچے نہیں توڑ پاتے۔

پڑھ چکا تو سحر زدہ سا بہت دیر تک نہ جانے کس ماورائی دنیا میں بھٹکتا رہا میں۔ ادیب کیسے جان لیتا ہے، بھٹکتے دلوں کی بات پتا جی بہت کم بولتے ہیں۔ ہم لوگوں سے کبھی صلاح مشورہ بھی نہیں کرتے۔ پھر بھی کیسا اتفاق ہے کہ ہم لوگوں کے کرب اور درد کو، انھوں نے آواز دی۔ کیسے اوشا کے ذریعہ ہمیں انھوں نے بے نقاب کر دیا۔ شمیتا نے علاحدگی کے امکان کی طرف اپنے خط میں واضح طور پر اشارہ کیا ہے اور بغیر کسی غصّے اور احتجاج کے کیا ہے۔ اوشا بھی تو آسانی سے کچھ کرتی، سہتی چلتی ہے۔ میں کیا اوشا کا سائنسداں شوہر نہیں ہوں جو کسی شیا ملا سے جڑنے کو بے چین ہے اور شمیتا کو کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن شمیتا کا پربھات کون ہے؟ کوئی مل گیا ہے کیا اُسے اسٹیٹس میں...

پھر میں کانپ گیا ــــ کیوں فکر ہوئی مجھے شمیتا کے پربھات کی؟ یہ لازم کیوں ہو کہ اس کا پربھات ہوگا ہی؟ اس کے بغیر کیوں نہیں رہ سکتی وہ؟ کیوں نہیں رہ سکتا میں کسی شیا ملا کے بغیر...؟

بار بار یہ لازمیت سات پردوں کو چیر کر کیسے آسانی سے ہمارے سامنے ظاہر ہو جاتی ہے؟ تلاش، کی اوشا بھی تو پربھات کے پاس آتی ہے تو ہوا کا تازہ جھونکا چلا آتا ہے اس کے پاس۔

پربھات کہتا ہے،" جب عورت کے من کا سُر مرد کے مَن کے سُر سے مل جاتا ہے تو وہ ملن لائق ستائش ہو جاتی ہے۔ اُسی احساس کو کسی ماہر لسانیات نے' محبت' کا لفظ دیا ہوگا... '

اچانک ایک سوال اس کے ذہن میں کوندھ گیا ــــ ایک عورت کے مَن کا سُر دو مردوں کے من کے سُروں سے نہیں مل سکتا کیا، ویسے ہی ایک مرد کے مَن کا سُر دو عورتوں کے مَن کے سُروں سے نہیں مل سکتا۔

اندر بیٹھے کسی اجنبی نے جواب دیا ــــ مَن کا سُر ملنا کیا اتنا آسان ہے؟ ملنے دو پہلے ایک سُر تو۔ اور مَن کا سُر کیا اپنے میں ایک اکائی ہی ہے کیا؟

پھر میں خود سے پیدا کیے ہوئے بھول بھلیے میں اُلجھ گیا۔ پھر یاد آ گیا مجھے کہانی کا وہ اختتام۔ نہ جانے کیا ہوا میں نے بھی میکانکی انداز میں گردن ہلا دی اور پُھس پُھسا اُٹھا،" میں شمیتا کو اپنی غلامی سے آزاد کر دوں گا۔ میں اس کی غلامی سے آزاد ہو جاؤں گا۔ تبھی ہم واقعی شوہر بیوی ہو سکیں گے۔ بلاشبہ ہو سکیں گے...؛

اور دوسرے ہی پل ذہن کے پردے پر خلیل جبران کی مورتی ابھر آئی اور میرے کانوں میں اُن

کی سُریلی آواز گونج اُٹھی ایک دوسرے سے محبت کرو لیکن محبت کو بندھن نہ بننے دو۔ ایک دوسرے کا پیالہ بھرو لیکن ایک ہی پیالے سے مت پیو۔ ساتھ ساتھ گاؤ، ناچو۔ خوشیاں مناؤ، پھر بھی ایک دوسرے کو تنہائی پانے دو۔ جس طرح وینا کے تار ایک راگ میں جھنجھناتے ہوئے بھی الگ الگ ہیں، دلوں کو شامل کرو۔ لیکن ایک دوسرے کی پناہ میں مت رہو۔ کیونکہ صرف زندگی کی مٹھی میں ہی تمہارے دل سما سکتے ہیں اور تم ساتھ ساتھ کھڑے ہوؤ، لیکن ایک دوسرے کے بہت قریب نہیں کیونکہ مندر کے پائے الگ الگ کھڑے ہیں۔

اور بلوط و سرو ایک دوسرے کے سائے میں نہیں بڑھتے۔'

اور اس کے بعد سُشری ماں کے یہ الفاظ میرے ذہن کے پردے پر درج ہو گئے۔

'تمہارا ملن وحشیانہ اشتہا یا حسوں کی خواہشوں کی آسودگی کے لیے بہانہ نہ ہو۔ اس کے برعکس وہ ملن آپس میں ایک دوسرے کے تعاون سے خود کامرانی حاصل کرنے کا ذریعہ بنے:

اور

'سچے ملن کا واحد حقیقی بندھن ہے محبت:

'ساکشی دکار' کو چھاتی پر سمیٹے خلا میں بھٹکتا بھٹکتا میں نہ جانے کیا کیا سوچ گیا۔ وقت کا پتہ ہی نہ رہا۔ تبھی حواس لوٹے جب احساس ہوا کہ گاڑی دھیمی ہوتی ہوتی پھر رفتار پکڑ رہی ہے۔ اُٹھ کر دیکھتا ہوں کہ متھرا اسٹیشن گزر گیا ہے۔ دو بج رہے ہیں۔ بس دو گھنٹے اور، چار بجے میں دہلی میں ہوں گا۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک تازہ جھونکا مانو دل کو مسحور کر گیا۔

گھر پہنچ کر دیکھتا ہوں، ورتیکا دیدی موجود ہیں۔ تیسرے دن انکت کو لے کر دیبھا بھی آ گئی۔ پیار کی پنکھڑیاں پھر مہک اُٹھیں۔ پتاجی بہت خوش ہیں۔ سارا دن انکت کو لے کر مصروف رہتے ہیں یا اپنے نئے ڈرامے کے سلسلے میں ورتیکا سے بحث میں الجھے رہتے ہیں۔ دیبھا ایک ہفتہ رہ کر لوٹ جاتی ہے اس وعدے کے ساتھ کہ میں کیرل جانے سے پہلے ایک مہینہ اس کے پاس رہوں گا۔

میں نے بتایا، "میں چھ مہینے ابھی یہیں رہنے والا ہوں۔"

"کیا شیاملا یہاں آ رہی ہے؟"

اچانک میں پوچھتا ہوں "تم شیاملا کو کیسے جانتی ہو؟"

"پتاجی سے سب جان چکی ہوں۔ اُس کے آنے پر مجھے خبر دینا۔ دیکھنا چاہتی ہوں تمہاری دوست کو۔"

خوش قسمتی سے اس پل وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستہ سے صرف اتنا ہی کہا "ضرور خبر دوں گا اور مجھے یقین ہے۔ تم اُسے دوست ہی سمجھوگی اور کچھ نہیں۔"

وِبھا نے میری آنکھوں میں جھانکا، بولی "یہ ملنے پر بتاؤں گی۔"

اور وہ چلی گئی۔ شاید اُس کے اندر شک کا بیج پنپ گیا ہے۔ پھر بھی اس بار اس کے مزاج میں ایک تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔ شمیتا کے لیے وہ ایک انوکھی ممتا سے بھرا اٹھی ہے۔ اس کے اخلاق میں بے رخی اور بے عزتی کی رتی بھر بھی گنجائش نہیں تھی۔ اچھا لگا سب کچھ، لیکن یہ . . .

جانے دیں شک و شبہ کی باتیں۔ میرا وہم بھی تو ہو سکتا ہے۔ پتاجی پکار رہے ہیں۔ ورتیکا وِبھا کو چھوڑنے اسٹیشن گئی ہے۔ انکت کو لے کر کئی پل خاموش بیٹھا رہا، پھر بولا "آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"ورتیکا کہہ رہی تھی "تلاش" کہانی پڑھ لی ہے اور مانتے ہو کہ وہ تم لوگوں کے کردار کو اجاگر کرتی ہے۔"

"جی، مجھے ایسا ہی لگا . . . کہہ کر ایک پل میں رکا۔ پتاجی کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ کچھ نہیں بولے تو میں نے کہا۔ "سمیتا کا خط آیا ہے۔ اس نے طلاق کی تجویز رکھی ہے۔"

"کیا؟" پتاجی یکبارگی کانپ گئے "کیا کیا ہے اُس نے؟"

"لکھا ہے کہ میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں، تمہیں نجات دینے کے بارے میں۔"

"شیاملا کی وجہ سے؟"

"شیاملا کی وجہ سے نہیں، وہ تو بہانہ ہو سکتی ہے۔ وجہ تو آپ کی کہانی میں ہے۔"

"من کا ملن نہیں ہے؟"

"ہوتا تو وہ لکھ پاتی؟"

پتاجی ہنس پڑے "نہیں تم بھولتے ہو۔"

میں واقعی گھبرایا۔ "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں بیٹے، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ تم سے یہ سب کبھی کہنا پڑے گا۔ شمیتا تمھیں پیار کرتی

ہے۔ پیار کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتی۔ اسی لیے تمھیں نجات دینا چاہتی ہے۔ تم چاہتے ہو نجات؟"

"مجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔"

پھر ہنس پڑے پتاجی۔ مجھ نادان کو سمجھاتے ہوئے بولے "بیٹے! نجات نہیں، غلامی کی لازمیت سے اُسے نجات چاہیے۔ اُسے یقین دلا سکو کہ وہ تمھاری جاگیر نہیں ہے تو وہ سب سے بڑی نجات ہوگی، پھر تم شبہ نہیں کرو گے۔ تم بھٹک رہے ہو کیونکہ وہم پلے او روہم ہے کیونکہ تم اُسے جاگیر سمجھتے ہو۔ تلاش میں اوشا جب ایک دوسرے کی سالمیت کو قبول کرنے کی بات کرتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی غلامی سے نجات کی ہی بات تو کہتی ہے۔ ایک اور بات کہتا ہوں۔ تمھارے باطن میں پھنسا دوشیزگی کا جذبہ اسی جاگیر کی ملکیت کی وجہ سے ہے۔ یہ جذبہ نہ ہو تو بلاتکار صرف ایک حادثہ ہو کر رہ جائے گا۔ تمیتا سے الگ ہو سکتے ہو لیکن اس جذبہ سے بھی نجات پالو گے اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تب شیاملا کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ بھی تم سکھی نہیں ہو سکو گے۔ سوال کسی تمیتا، شیاملا یا وملا کا نہیں ہے، سوال مرد کی ذہنیت کا ہے۔ سچی محبت میں ہمیشہ ایک دوسرے کے تعاون سے کامرانی حاصل کرنے کی شرط ہے، کسی کو جاگیر یا مالک نہیں سمجھنے کی۔ تم نے محسوس کیا ہوگا کہ عورت مرد کے رشتوں کو لے کر جدید روحانیت کے پیروکار اور سامراجی مفکر ایک دوسرے سے بہت مختلف نہیں ہیں۔

"لیکن تمھارا مسئلہ اتنا ہی نہیں ہے۔ وہ سنسکار کا مسئلہ ہے جو وائرس کی طرح خون میں گھل مل جاتے ہیں۔ وائرس کیا ہے، اب تک کوئی اسے جان نہیں پایا، اسی لیے اس کی کاٹ بھی نہیں ہے۔ لیکن سنسکار کی پہچان کرنے میں ہم کافی کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ تم چاہو تو وائرس جیسے سنسکاروں سے نجات پا سکتے ہو۔ لیکن تم تو برابر بھاگتے رہے ہو اور اسی لیے شیاملا کے پاس پہنچ گئے ہو۔"

وہ ایک پل کے لیے رُکے۔ میں نے محسوس کیا وہ جھجھک رہے تھے، لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ بول پڑے۔ "تم شیاملا کی ٹریجڈی کی وجہ سے اس کی جانب متوجہ نہیں ہوئے بلکہ اس لیے ہوئے کہ اس ٹریجڈی نے اُسے تمھارے لیے آسان بنا دیا تھا۔ مقروض بنا کر اُسے آسانی سے پالو گے۔"

میں کانپ کانپ گیا۔ پتاجی من کے سات پردوں کو چیر کر اتنے بے رحم ہو سکتے ہیں۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن یہ میرے پتا ہی ہیں نا جو مجھے بے نقاب کر رہے ہیں۔ میں احمقوں جیسا ان کی طرف دیکھے جا رہا ہوں اور وہ نہ جانے کہاں سے بول رہے ہیں۔ "دوسروں کی طرف انگلی اٹھانے سے قبل

خود تجزیہ کر سکتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ بھٹکنا نہ پڑتا، وجوہات کا سہارا لے کر۔۔۔"

سب کچھ صفر ہو رہا تھا۔ اور اس صفر میں، بجتی گھنٹیاں موت کی موسیقی کا احساس دے رہی تھیں۔

تبھی دیکھتا ہوں، انکت بھاگتا ہوا آکر بابا کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے، "باباجی، بوا آگئی۔ کل ہم پاپا کے ساتھ جائیں گے۔"

"تمھاری بڑی بوا کہاں ہے؟"

"قلفی لا رہی ہیں ہمارے لیے، آپ کے لیے بھی، پاپا کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ وہاں سے جہاں سے اماں لاتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں۔۔۔"

وہ مڑا کہ سب کو حیران کرتے نارائن ہاتھ میں سوٹ کیس لیے وہاں آکھڑے ہوئے۔

انکت نے انھیں دیکھا، بول اُٹھا "ارے، اب تو ایک اور قلفی لانی ہوگی۔ پھوپھاجی بھی آگئے۔"

پلک جھپکتے یہ سب ناقابل یقین واقع ہو گیا۔ اس خوشی سے میں مسحور ہوا اٹھوں کہ ورتیکا آگئی، کہتی ہوئی، "ارے بیٹا ہم نے دیکھ لیا تھا، پانچ قلفی لائی ہوں۔"

کیسے بدل جاتا ہے پل بھر میں سب کچھ۔ بے شمار کنول کی پنکھڑیوں سا کمرہ روشنی اور خوشی سے بھر گیا۔

میں نے نجات کی گہری سانس لی۔

ہمیشہ کی طرح سویرے اُٹھتے ہی نارائن نے یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا، "میں آج رات تین بجے کی فلائٹ سے لندن ہوتا ہوا امریکہ جا رہا ہوں۔ مجھے تین مہینے واشنگٹن میں رہنا ہے۔"

پتاجی نے پوچھا، "کوئی خاص کام ہے؟"

"ماما! ہم صحافیوں کو کب کیا خاص کام کرنا ہوگا، یہ ہم خود بھی نہیں جانتے۔ راشٹرپتی کا چناؤ آگیا ہے۔ پاکستان اور افغانستان کی سیاست کب کیسا موڑ لیتی ہے، یہی ہمیں جاننا ہے۔ اسی پر بھارت اور امریکہ کے تعلقات منحصر کریں گے۔۔۔"

پھر ایک دم اپنے دونوں کان پکڑ لیے، "کوئی اور تو نہیں سن رہا؟ ہمیں سوچ سمجھ کر بولنا پڑتا ہے۔ اقوام متحدہ کے لیے نیویارک بھی جانا ہوتا رہے گا۔ بھابھی کا پتہ لے لیا ہے۔"

اور اس کے بعد انگت کو کھینچتا ہوا اوپر لے گیا۔ ورتیکا ایک پاٹ چائے لے آئی۔ جیسے سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہو۔ تین پیالے بنا کر بولی،" اب بتاؤ اجیت! یہ شیاملا کون ہے؟"

نارائن نے کہا،" تمھارے مَن کا سُر اس کے مَن کے سُر سے مِل گیا ہے ؟"

ورتیکا بولی،" بھابھی بہت سنجیدہ ہیں کیا؟"

نارائن نے کہا،" تم طلاق کے لیے تیار ہو؟ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

ورتیکا بولی،" اعتراض مجھے بھی نہیں ہو سکتا، لیکن . . ."

ایک کے بعد ایک ان سوالوں کے بوچھار سے میں گھبرایا تو نہیں، لیکن بار بار خود کو قصوروار ثابت کیے جانے کے ردِعمل نے میرے اندر ایک تلخی ضرور پیدا کر دی تھی۔ ہاتھ اٹھا کر دونوں کو روکتے ہوئے میں نے پوچھا،" کیا سُمیتا نے آپ سب کو طلاق دینے کی اطلاع دے دی ہے؟"

دونوں ایک ساتھ بولے،" ہمیں تو ماماجی نے بتایا تھا، وہ بڑے فکر مند ہیں۔"

ایک بار پھر راحت کی سانس لی میں نے، بولا—" تب ٹھیک ہے۔ آپ شوہر بیوی کے درمیان آنے کی کوشش نہ کریں۔"

" ٹھیک ہے، لیکن شیاملا . . ."

" وہ ایک دکھی مطلقہ خاتون ہے۔ اُس نے دوستی چاہی ہے، لیکن جسم کی قیمت پر نہیں۔ سُمیتا کی کہانی سُن کر اُس کے لیے بہت ہی عقیدت ہے۔ کہتی ہے ایسی بیوی کی تو تمھیں پوجا کرنی چاہیے۔"

" لیکن تم . . ."

" کہا نا، مجھے تنہا لڑنے دو اپنی انا سے۔"

" میں بھابھی سے باتیں کر سکتا ہوں؟"

" وہ تم دونوں کے بیچ کا مسئلہ ہے۔ تم جانو، تمھاری بھابھی جانے۔"

یہ سن کر ورتیکا اور نارائن دونوں نے زور سے تالی بجائی،" تب کوئی فکر نہیں۔ چلو اسی نام پر آج ناشتہ ' الکا ' میں کیا جائے۔"

لیکن دوسرے ہی پل جبران سا بول اُٹھا،" لو، مجھے تو پریس کلب جانا ہے۔ پھر وزارت خارجہ

ہیں پریس کانفرنس ہے، اس کے بعد...''

''یس، یس،'' ورتیکا بولی، ''یو آر ان کوریجبل۔ تم اب رات کے دس بجے ہی جاؤ گے نا؟''

''ہاں، اُسی کے آس پاس سمجھو۔ ایک بجے ہوائی اڈے پہنچنا ہے۔ تم تیار رہنا۔''

''رہوں گی۔''

''سو، تب تک کے لیے نمستے۔''

اور یہ کہتے ہوئے وہ نیچے اُتر گیا۔ رات کو لوٹا تو گیارہ بج چکے تھے۔ آتے ہی مصروف لہجے نے پوچھا۔ ''ایوری تھنگ ریڈی وتی؟''

''ہاں۔''

''تو چلیں؟''

''ہاں...''

نارائن کا آنا ہمیشہ ناٹک کے فیڈ آؤٹ کی طرح ہوتا ہے۔ مشہور روزنامہ کا معروف نامہ نگار ہے۔ بڑی دلچسپی سے اس کی کھوجی خبریں پڑھی جاتی ہیں۔ نہ جانے کہاں سے، نہ جانے کیسے وہ سات پردوں میں چھپے حقیقت کے پیچھے کے سچ کو ڈھونڈ لاتا ہے، لیکن رہن سہن، اخلاق مزاج میں مجذوب۔ نہ کھانے کی فرصت، نہ نہانے کا شعور۔ دیدی نہ ہو تو کمرہ گرد و غبار کی خلعت سے مالامال رہے۔ کیرل کی نرس کے پیٹ سے پاپ کی راہ جنم لیا۔ ناجائز باپ ملا ایک برسراقتدار وزیر، جس نے کبھی آنکھ اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ یتیم خانہ میں پلا بڑھا۔ ساری محرومیوں کے بیچ ذہانت نہ جانے کیسے اُس پر مہربان ہو گئی۔ یتیم خانہ کے وزیر کے دل میں نہ جانے السھڑپن کی وجہ سے یا ذہانت کی وجہ سے عجیب سی محبت اس کے لیے جاگ گئی۔ اس کی تعلیم کا سارا خرچ برداشت کیا، اسے وظیفہ ملا، اُس کے بعد بھی۔ جب اُس نے ایم اے کر لیا تب اسے ایک دن اپنے پاس بُلایا۔ بولے، ''نارائن! اب تم یہاں سے آزاد ہوئے۔ روزنامہ 'روپ وانی' سے تمھاری تقرری کا خط آ گیا ہے۔ دفتر سے لے لینا۔''

پھر ایک لمحے کے لیے وہ رُکے، ''لیکن بیٹے، آج تو میں نے تمھیں ایک خاص بات بتانے کے لیے بلایا ہے۔ تم جب اس یتیم خانہ میں لائے گئے تھے۔ تب مشکل سے دو سال کے تھے۔ تمھیں

ایک بہت بڑے نیتا نے بھیجا تھا۔ لیکن اس کے دس دن بعد مقامی ہسپتال کی ایک نرس میرے پاس آئی۔ بڑی بڑی بھولی آنکھوں والی وہ نرس کیرل کی رہنے والی تھی۔ اُس نے بڑے اعتماد سے روتے روتے مجھے بتایا کہ تم اس کے بیٹے ہو۔ وہ اُس نیتا کی ہوس کا شکار ہوئی تھی اور اسی نے تمھیں اُس سے چھین لیا تھا۔ وہ غریب تھی۔ کسی طرح نرس بن کر اپنے خاندان کی پرورش کر رہی تھی۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہاری خاص دیکھ بھال کروں۔ وہ مجھے ہر ماہ پچاس روپے بھیجتی رہے گی۔ اُس نے مجھے ایک خط بھی دیا تھا۔ وہ ایک تعویز میں بند تھا۔ اس نے کہا تھا کہ بڑے ہونے پر یہ خط میں تمھیں دے دوں۔"

نارائن نے پوچھا تھا "کیا وہ روپے بھیجتی رہی تھیں؟"

"ہاں بیٹے! پانچ سال تک بھیجتی رہی۔"

"پھر؟"

"پھر دوسرے بچے کو جنم دینے کے بعد زچگی میں اُس کی موت ہوگئی۔"

"وہ بچہ کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا، وہ کہاں ہے؟ یہ اطلاع اس کے ساتھ کام کرنے والی نرس نے دی تھی۔ مجھے انھیں کے اصرار پر۔ جان گئی تھی کہ موت یقینی ہے تبھی سب کچھ اُس نے بتا دیا تھا۔ میں نے تمھیں وہی خط اور روپے دینے کو بلایا ہے۔"

"روپے کیسے؟"

"تمھاری ماں نے پانچ سال میں تین ہزار بھیجے تھے۔ وہ اب پانچ ہزار ہو گئے ہیں۔"

نارائن نے کہا "میرے پتا تو آپ ہیں۔ ماں بھی آپ ہیں۔ یہ روپے میرے جیسے کسی بدقسمت کو خوش قسمت بننے کے لیے دے دیجیے۔ ماں کی آتما کو سکون ملے گا۔"

"تمھارا یہی فیصلہ ہے؟"

"جی ہاں۔"

"خط سنو گے؟"

"سنا دیجیے۔"

منتری جی نے تعویذ سے نکال کر وہ خط پڑھا۔

بیٹے!

تمھیں میں نے نارائن نام دیا ہے۔ تم میرے نارائن ہو۔ یہ نام کبھی بدلنا مت۔ تمھاری ماں تو میں نہیں بن سکی، جننی بن کر رہ گئی، میری پھوٹی قسمت۔ کسے قصور دوں۔ لیکن میں تمھیں آشیرواد دیتی ہوں کہ تم بھلے ہی پاپ کے راہ آئے ہو لیکن تم نارائن نام کو سچ کرو گے کیونکہ اس پاپ کے لیے تم ذمہ دار نہیں ہو۔ یتیم خانہ کے منتری جی سے میں نے گزارش کی ہے تمھاری دیکھ بھال کرنے کی۔ مجھے وہ بھلے مانس جان پڑتے ہیں۔ آگے تمھاری قسمت۔

تمھارے پتا کے بارے میں میں کچھ نہیں کہوں گی۔ قصور میرا بھی ہے انھوں نے وہی کیا جو شکاری مرد کرتا ہے۔ لیکن تم کبھی ویسے نہ بننا میرے بچے۔ میری اتنی ہی گزارش ہے۔ میری جیسی کوئی اور ابھاگن برباد نہ ہو۔

اچھا بیٹے! ایک بار ماں کہہ لینے دو نا۔۔۔

تمھاری ابھاگن ماں

وہ خط آج بھی تعویذ میں بند اس بائیں بازو والے نارائن کے گلے میں لٹکا ہے۔ محبت کی نہ تو کوئی حد ہے، نہ کوئی تعریف۔

یہ سب کہانی ورتیکا دیدی نے تب سنائی تھی جب میں نے اُن سے کہا تھا، "تم نے بھی کس مجذوب شنکر کو چُنا، دیدی!"

دیدی بولی تھی، "اجیت، اُس مجذوب شنکر کو پانے کے لیے پاروتی کو برسوں تپ کرنا پڑا تھا۔ مجھے تو سرِراہ چلتے چلتے مل گئے تھے بھولے شنکر!"

میں نے پوچھا، "کیا نارائن یتیم خانہ کے اُن منتری جی سے ملتے ہیں؟"

باقاعدگی سے سال میں پانچ چھ بار جاتے رہے جب تک وہ زندہ تھے۔ اب اُن کے بیٹے نکنج کو بھائی کی طرح مانتے ہیں۔ میرا بیٹا نکنج اتنا مان کرتا ہے کہ کس کی تشبیہ دوں۔ بے چارے کو ماں کی تو یاد ہی نہیں۔ پتا اُسے لے کر یتیموں کے بیچ ہی رہتے تھے اور اسے ایسے ہی پالتے تھے جیسے وہ بھی یتیم ہو۔"

میرے اندر بجلی سی کوندھ گئی۔ پوچھ بیٹھا، "دیدی! نارائن تمھارا دستِ نگر رہتا ہے، لیکن تمھیں..."

دیدی نے بیچ میں ٹوک دیا، "نا نا میرا دست نگر ذرا بھی نہیں ہے وہ۔ اُس کا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے۔ اُسے سمجھنے کے لیے اس کے پاس جانا ہوگا۔"

"دیدی، کیا ایسا نہیں ہے کہ جھوٹے بہتان سے تم پریشان تھیں، باپ کی راہ سے پیدا نارائن کے لیے تمھارا یہ احساس فطری تھا۔"

"ہو بھی سکتا ہے، لیکن ہم اس بارے میں بہت دماغ خراب نہیں کرتے۔ ہاں، اتنا کہہ سکتی ہوں، جب ہم ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، پورا ماحول ایک پیاری خوشبو سے مہکتا رہتا ہے۔"

"اچھا دیدی، اُس نرس کے ساتھ بیناجی جو کچھ کرتے تھے وہ بھی کیا بلاتکار نہیں ہے؟"

"یقیناً ہے۔ وہ تو قبیح قسم کا بلاتکار ہے۔ کسی کی مجبوری کا فائدہ اُٹھا کر اسے اپنی ہوس کا شکار بنانا انسانیت کے لیے سب سے بڑا جرم ہے۔"

"اور یہ اس لیے ہے کہ مرد عورت کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ باپ، شوہر، بیٹا کے بغیر اسی لیے تو اس کی نجات نہیں۔ اسی لیے وہ قلم اور کتاب کے ساتھ پڑھتے گنتا گنتا ہے۔ اس لیے اس کی تشبیہ دھرتی سے دی جاتی ہے۔ دھرتی کی جملہ خصوصیات اس پر درج کر دیے جاتے ہیں، لیکن ایک زمانہ تھا جب دھرتی پر کسی کی حکومت نہیں تھی۔"

ورتیکا ہنس پڑی، بولی، "اتنی بار اتنے لوگوں نے اور تم نے بھی یہ بات کہی ہے لیکن لفظ کو جب تک جیا نہیں جائے گا تو وہ ہمیشہ بے معنی ہی رہے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ گئی لیکن نہ جانے کیا یاد آیا، مڑی اور بولی، "سنو اجیت! سُمیتا اگر نجات چاہے تو تم مانع نہ ہونا۔"

اور وہ چلی گئی تھی۔ اور میں احمقوں سا تب تک وہیں بیٹھا رہا تھا، جب تک اُس نے پکار نہیں لیا، "ارے اجیت کھانا تیار ہے، ماما کو بلا لو، ادھر ہی آجائیں۔ انکت انھیں کے پاس ہے۔ آج سب مل بیٹھ کر کھائیں گے۔ ماجی کو سب کو ایک ساتھ بٹھا کر کھلانا کتنا اچھا لگتا تھا۔ سُمیتا بھی بالکل ویسی ہی ہے، لیکن نارائن کہتا ہے، وقت پر جیسی سہولت ہو ویسا ہی کرنا عقلمندی ہے۔ عادت کی

غلامی بدیشی کی غلامی سے کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔"

مجھے نہ جانے کیوں تب ایسا لگا تھا الفاظ کا کثرت سے استعمال انسان اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے کرتا ہے۔

پورے ایک ماہ بعد میں نے سُمیتا کو خط لکھا ــــ

سُمی ڈیئر!

تمھارا خط ترویندرم میں تب ملا جب میں دہلی کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ سُپر فاسٹ ٹرین کے ایر کنڈیشن ڈبّے میں ہی میں اُسے پڑھ سکا۔ تعجب کیا یہ وہی سُمی ہے جسے میں پہچانتا تھا۔ کسی اجنبی کے خط کی طرح، تمھارا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بدیش میں جا کر تم اپنے کو پہچان سکیں، جانا کتنا کامیاب رہا۔

مان لوں گا، میرے دل میں وہم تو ہے۔ غرض ہے نا۔ گھر خاندان پر منحصر رہنے کے حق کی غرض۔ لیکن اب مجھے بھی لگنے لگا ہے کہ اس حق سے نجات پانی ہوگی۔ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی آخری نہیں۔ تب یادیں اور مذہبی کتابیں ہی آخری کیوں رہیں؟

ہمیں نئی کتابیں لکھنی ہوں گی۔

تم نے تین کہانیاں سنائی ہیں ــــ ڈینش دوشیزہ کی، حبشی نوجوان کی اور من و تن کے جدوجہد میں لہولہان ہوتی اُس عورت کی۔ کیا تم یقین کروگی، اس ڈینش دوشیزہ کے اپنے لوگ اب سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ جو اتنا ذاتی، اتنا پاک ہے اُسے اس طرح عوامی بنانا کہاں تک مناسب ہے۔ آزادی لامحدود نہیں ہوتی۔ بہت سی باتوں سے جڑی ہے وہ۔ اتنا ہی مناسب ہے کہ کہیں کچھ بھی آخری نہ ہو۔ تجربہ کرنے کی چھوٹ رہے، تم نجات چاہتی ہو مجھ سے یا مجھ پر منحصر رہنے کی لازمیت سے، محبّت سے نجات چاہتی ہو یا محبّت کو بندھن بننے دینے کی لازمیت سے؟ ہم رہیں، لیکن ایک دوسرے کے لیے لازم نہ رہیں، یہی چاہتی ہو تو میں تمھارا ہمراہی ہوں۔

شیاملا نے مجھ سے کہا تھا ــــ 'میں دوستی چاہتی ہوں، لیکن تن کی قیمت پر نہیں۔'

میں نے کہا تھا، 'دوستی کے معنی کیا مَن کا جڑنا نہیں ہے؟'

اس کا جواب یہ تھا، وہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے اقتصادی فائدے کے لیے دوستی کا مکھوٹا لگایا ہو اور آپ نے ایک بے بس عورت کو مقروض بنا کر اُسے پانے کی لالچ میں اُس کی دوستی کو قبول کر لیا ہے یا قبول کرنے کا ڈرامہ کیا ہے۔

'ہو سکتا ہے' میں نے دھیرے سے کہا تھا۔

وہ ہنس پڑی تھی، "من ملنے کی بات جتنی سادگی سے کہہ جاتے ہیں اتنا ہی وہ نایاب ہے۔ من کے سُر جب سچ مچ مل جائیں گے تو تن کوئی مسئلہ نہیں رہ جائے گا۔ نہ پانے کی اضافی محویت رہے گی۔ نہ بچانے کی زائد ہوشیاری۔ اخلاق اور غیر اخلاقی سے جوڑ کی طرف کا وہ سفر ہوگا۔

تمہارے اور حبشی نوجوان کے متعلق سوچتے ہوئے مجھے لگا کہ اُس میں تمہارے جسم کے لیے زیادہ لگاؤ تھا اور تمہارے من میں تن کو بچانے کی زیادہ ہوشیاری۔ من کا سُر مل جانے پر ہی زائد سے لگاؤ چھوٹ جاتا ہے۔ لگاؤ ہے تو من کا سُر نہیں ملتا۔ ایسی صورت میں جسم کی خواہش مکمل طور پر بلا اتکار ہے۔

اس مسئلے کو لے کر تم تو بہت گہرائی میں اتری ہو۔ مجھے یقین ہے مجھ سے اتفاق کرو گی۔ اور اس تن من کے بیچ تو تنی عورت کا مسئلہ کلی طور پر جسم کا مسئلہ ہے، لیکن غیر معمولی ہے۔ شوہر کو اس نے لازم مان کر قبول کیا تھا۔ دل سے صاف ہے تبھی تو وہ لازمیت کے لگاؤ سے نجات نہیں پا رہی۔ اُس نوجوان میں کچھ اضافی سیکس ہے جو وہ عورت اپنے شوہر میں نہیں پاتی۔ وہ اضافی لالچ ہے۔ لیکن اُس نوجوان کا مقصد کسی کو اپنا بنانا نہیں ہے، اضافی کا فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اپنے جال میں پھنساتا ہے جس سے وہ کہہ سکے کہ میں زیادہ عورتوں کا مرد ہوں۔

کیا یہ بھی بلا اتکار کی ہی ایک قسم نہیں ہے؟

تم نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ سُمی؟ میں بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میں شیاملا کے ساتھ تھا میرے اور اُس کے درمیان جو ہوا وہ حرف بہ حرف بتا رہا ہوں۔ اس حادثے کے سلسلے میں جب میں نے کہا، "تن کو بچانے کے لیے دلیل مت کرو، شیاملی!"

کیسا کرب تھا تب اُس کی آواز میں، "بچانے کو میرے پاس کیا ہے؟ میرا رواں رواں مقروض

ہے آپ کا! اپنے آپ کو دے کر بھی کیا قرض چکا سکوں گی لیکن سوچتی تھی، سمیتا جی کی بات۔ آپ کے لیے جس نے اپنی قیمتی عصمت کو داؤں پر لگا دیا اُس کے لیے بھی آپ کا دل ابھی تک مشکوک ہے؛ وہ اگر جان گئیں کہ آپ نے میرے ساتھ...!"

ایک لفظ پر حملہ کرتی بول رہی تھی وہ اور ہر حملہ میری بیداری پر چوٹ کر رہا تھا۔ جب نہ سہ سکا تو چیخ پڑا "بس کرو! شیامل!"

تعجب، اب وہ پاس آگئی تھی، بولی "بہ ہوں میں، بولو کیا کہتے ہو؟"

تب ایسا لگا جیسے زمین اپنی کشش سے آزاد ہو رہی ہے۔ وہ مجھے سنبھال نہ لیتی تو میں گر پڑتا۔ پیار سے سمیٹ کر اس نے مجھے بٹھایا۔ بولی "چائے منگواؤں؟"

میں نے کہا "تم پیوگی؟"

بولی "ہاں!"

"تو منگالو!"

گھنٹی بجا کر اُس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور دور جا بیٹھی۔

میں نے کہا "میں کچھ نہیں کہوں گا، اتنی دور مت جاؤ!"

وہ ہنس پڑی اور بولی "پاس بٹھانے کی لالچ سے آزاد نہیں ہو پا رہے ہو اور بات کرتے...!"

لفظ لفظ لکھ دیا ہے میں نے اس دن کی ہماری گفتگو کا۔ تم اب بھی شیاملا کے بارے میں کچھ کہوگی کیا؟

تم نے میری یاد آنے کی لازمیت کا سوال اُٹھاتے ہوئے زیادہ دن تک ساتھ رہنے کی بات بھی کہی ہے۔ سُمی! صرف ساتھ رہنا اس یاد کا سبب نہیں ہے۔ بچے کے جسم پر پیار سے لوگ ہاتھ پھیرتے ہیں، لیکن جب ماں ہاتھ پھیرتی ہے تو اس لمس کے ساتھ کچھ اور بھی بچے کے رواں رواں میں جاری وساری ہو جاتا ہے۔ اہمیت لمس کی نہیں ہے، کچھ اور کی ہے۔ اسی طرح یاد تو تمھیں اور کی بھی آتی ہوگی لیکن میری یاد، صرف یاد نہیں ہے اُس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے۔ اسی کچھ اور کی لازمیت سے نجات چاہتی ہو تم۔

تم نے انکیت کی یاد آنے کی بات بھی تو لکھی ہے۔ اتنا طوفان اُٹھایا اُس یاد نے کہ تم رو پڑیں، سُمی! عورت کی چھاتی تو رہتی ہے۔ لیکن اولاد کی یاد آتے ہی اُس سے دودھ بہنے لگتا ہے اور محبوب

کے آنے پر اس میں ہزاروں طوفان مچل اُٹھتے ہیں۔ جونک کو گائے کے تھن پر بٹھانے پر بھی وہ خون ہی پیئے گی، دودھ نہیں۔

تمھاری طرح میرا بھی تم سے بہت سی باتیں کرنے کا جی کر رہا ہے۔ اُسی رَو میں جانے کیا کیا لکھ گیا۔ لکھ کر میں نے بھی سکون پایا۔ متفق ہوں، سکھ پایا جاتا ہے۔ اس میں غرض شامل ہے۔ خوشی دینے میں ہے۔ تم نے نجات چاہی ہے، وہی میں تمھیں دیتا ہوں۔ میں نے تم کو بے لباس جانے کتنی بار دیکھا ہے لیکن اس خط میں جس شان سے تم نے خود کو بپرت در بپرت کھولا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، تم انکت کو لے کر جانا چاہتی ہو تو لے کر جا سکتی ہو۔

لیکن شمی: میں ایک غلطی کر بیٹھا۔ نئے ساکشاتکار، میں پناجی کی کہانی 'تلاش' چھپی ہے۔ انھوں نے سانچے اور مَن کے سلسلے میں تخلیق کا خاکہ کھینچنا چاہا ہے۔ ساتھ ساتھ عورت مرد کے سہی رشتوں کی تلاش بھی کی ہے اس میں — 'ایک دوسرے کا پیالہ بھرو لیکن ایک ہی پیالہ سے مت پیو، ایک دوسرے سے محبت کرو لیکن محبت کو بندھن نہ بننے دو، یعنی ایک دوسرے کی آزادانہ اقتدار پر آنچ نہ آنے دو۔ تم تم رہوگے، وہ وہ رہے گا، تبھی ایک دوسرے کو سچ مچ پیار کر سکوگے۔

اس کہانی کے ضمن میں میں کہہ بیٹھا کہ شمی نے طلاق کی تجویز رکھی ہے۔ سُن کر انھوں نے ایسا ناٹک کیا جیسے یقین نہ آ رہا ہو، لیکن دو پل بعد میری رائے کو کاٹتے ہوئے بولے 'یہیں تم بھولتے ہو۔ شمینا تمھیں واقعی پیار کرتی ہے۔ تبھی وہ نجات چاہتی ہے، لیکن غلامی کی لازمیت سے نجات۔ انحصار کی لازمیت سے نجات:

شمی، مجھے کوئی اعتراض نہیں، اس نجات پر۔ وہ کیسے ممکن ہوگا، میں ابھی نہیں جانتا۔ تم جانتی ہو۔ اور شمی! تم نجات پا سکیں بلاتکار کے مظاہرے سے یا ابھی بھی ملاقات کرتی رہی ہو...

دِکھائی تھی۔ تمھارے لیے اس کی رائے لگتا ہے بہت بدل گئی ہے۔ تمھارے لیے ایک عجیب سی عقیدت اُس میں جاگ گئی ہے۔ کیوں، ابھی جان نہیں پایا۔

ورتیکا دیدی یہیں رہے گی، میں بھی یہیں رہوں گا، انکت بھی یہیں رہے گا۔ بس تمھیں نہیں ہوگی۔ غلط کہہ گیا، تم تو یہاں سب سے زیادہ کشادہ ذہن ہوگی اور وسیع بھی۔

ہاں، نارائن اسٹیٹس آرہا ہے، کسی اہم اسائنمنٹ پر۔ کچھ دن نیویارک بھی رہے گا۔ تمھیں تنگ کرے گا، ہو لینا ہمیشہ کی طرح۔

ایک اور خبر تمھیں دوں جو ابھی کسی کو نہیں دی۔ پروگرام ایکسچینج کے تحت میں جاپان جا سکتا ہوں۔ لیکن آخری فیصلہ میں ابھی تین چار ماہ لگ سکتے ہیں۔ تب تک تو تم آجاؤ گی...

سُمی! تم نے سب کچھ کہہ کر آخر میں ہمیشہ کی طرح وہی لکھا ہے 'تمھاری اپنی' مزاج کی غلامی ہے نا یہ، لیکن آج تو میرا دل بھی تمھیں یہی یقین دلانا چاہتا ہے کہ میں ہوں ـــ

تمھارا اپنا

اجیت

لکھ چکا تو لگا جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا ہے۔ بڑا اچھا لگا۔ اب میں سُمیتا سے ڈروں گا نہیں، بھاگوں گا بھی نہیں۔

وِبھا

اوپر سے سنجیدہ، لطیف اور اندر دہکتی بھٹی، یہی مقدر ہے انسان کا۔ اس خوفناک، دل دہلا دینے والے حادثے کے بعد بھابھی کے لیے ظاہری طور پر میں ہمیشہ احسان سے دبی دبی رہتی تھی۔ اندر ایک ان بوجھ پہیلی سی گھمڑتی رہتی۔ کچھ بھی سمجھ نہیں پاتی۔ جو ہوا وہ سب ناقابل یقین سا لگتا۔ کوئی کہہ جاتا۔ نہیں، نہیں کچھ نہیں ہوا۔ وہ وہم ہے، صرف وہم۔

لیکن آنکھوں دیکھا بھی کبھی وہم ہوا ہے؟

وہی آواز پھر گونجتی ـــ ہاں، ہوا ہے کیونکہ آنکھیں کہاں دیکھتی ہیں، دیکھتا تو ذہن ہے۔ وہ جو چاہتا ہے وہی آنکھیں دیکھتی ہیں:

میں کانپ کانپ جاتی۔ جسم سے پسینہ چھوٹنے لگتا، لیکن میرا ذہن ویسا کیوں چاہے گا... کیوں، کیوں...؟ تب میں بے بس، لاچار خود کو ہی جھنجھوڑنے لگتی۔ ایک ظالمانہ غصہ مجھے نگل لیتا۔ میں اس حادثے کو بھول جانا چاہتی، لیکن میری وہ ہر کوشش اس حادثے کے ہر پرت کو اور بھی اجاگر

کر جانا اور میں چیخ اُٹھتی، خود پر ہی یقین نہ کرتی ۔۔ اس عورت نے اپنی قربانی دے کر مجھے کتنا چھوٹا بنا دیا ہے۔ اس سے زندگی بھر آنکھ نہیں ملا سکوں گی ...

سب سے پریشان کرنے والی بات تو یہ تھی کہ میں اس حادثے کے بارے میں کسی سے بھی اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتی تھی اور خود میں بھی تو یہ نہیں جانتی تھی کہ میں کیسے گھر پہنچی۔ کیسے بھابھی اُن درندوں کے چنگل سے نکلی۔ ایک غیر تحریری سمجھوتہ ہم سب کے درمیان ہو گیا تھا۔ اُس حادثے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہنے کا۔

اور یہی سبب بنتا جا رہا تھا میرے اندر ایک دوسرے کو کاٹتی دلیلوں کے جنم لینے کا۔ وہ دلیلیں میرے اندر امنڈتے آتشِ صحرائی کو اور بھی بھڑکا دیتے تھے۔ دھیرے دھیرے یہ ہونے لگا کہ جب بھی میری آنکھیں بھابھی کی آنکھوں سے ملتیں تو میری نگاہیں خود بخود جھک جاتیں اور میں وہاں سے کوئی بہانہ بنا کر ہٹ جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ہونے لگا کہ میں اُن کے سامنے آنے سے خود کو بچانے لگی۔ اور ایک دن نہ جانے کس راستے سے آکر ایک خوفناک خیال میرے ذہن میں کوندھ گیا۔ کچھ عورتیں ہوتی ہیں، جنھیں بلاتکار سے سکھ ملتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ بھابھی نے اُس اتفاق کا فائدہ اُٹھایا ہو اور بعد میں ڈرامہ رچ ڈالا، دل پر پڑے گہرے زخم کا؟

نہیں... نہیں... میں اپنے ہی خیال پر عدم اعتماد سے کانپ اُٹھی، 'میری بھولی بھالی بھابھی ایسا نہیں کر سکتی۔'

'کیوں نہیں کر سکتی؟ شہوت پرست کو خوف نہ شرم!' مَن کے اندر کہیں سے یہ گونج اُٹھتی۔

مجھے لگا کہ اب میری شادی ہو جائے تو میں یہاں سے ہٹ جاؤں۔ بھابھی کی وہ خلوص بھری نگاہیں میرے باطن کو چیر چیر کر مجھے بے لباس تو نہ کرے گی۔

تعجب! میرے لیے لڑکا بھی انھوں نے ہی ڈھونڈ دیا اور بڑے چاؤ سے میری شادی کی۔ ماں تو تب تک جنت جا چکی تھی۔ پتا جی بڑے ادیب تھے، باطن کو بھید جانے والے لیکن ویسے ایک دم معصوم بھولے۔ ماں نہ ہوتی تو نہ جانے ان کا کیا ہوا ہوتا۔

سب کچھ کے باوجود رخصت کے پل کتنے پریشان ہو جاتے ہیں۔ چھاتی سے چپک میں کیسی روئی تھی، رک رک کر سسکتے سسکتے، میں یہ الفاظ کیسے کہہ گئی تھی ۔۔ " بھابھی، تم میری پیدا کرنے والی

سے بھی بہت بڑی ہو۔ تم سچ مچ ماں ہو۔ تم نے میرے لیے جو کچھ کیا وہ اَن کہا ہی رہے تو اچھّا ہے۔ اُسے کوئی کیسے کہہ سکے گا...."

اچانک میرا مُنہ بند کر کے کانپتی آواز میں بھابھی نے اتنا ہی کہا تھا۔ "اَنیتہ کو میں جانتی ہوں۔ تو دو دن میں ہم سب کو بھول جائے گی، اور میں چاہتی بھی یہی ہوں۔"

سسکیاں اچانک تھم گئیں۔ اُس پل آنکھیں اُٹھا کر بھابھی کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ بھابھی مجھے خود اپنے سے دور کرنا چاہتی ہے۔ اُس حادثے کی یاد نہ آئے اس لیے، یا... یا... نہیں... نہیں۔ اندر کیسی کشمکش تھی اور باہر میں اتنا ہی روئے جا رہی تھی۔ بابُل کا گھر چھوڑتے ہوئے کچھ پل کے لیے تو چھاتی پھٹتی ہی ہے۔ اُس کے بعد تو انیتہ نے نہ جانے کیا جادو کیا، میں سب کچھ بھول گئی اور ان میں بے آواز ڈوب گئی، لیکن کبھی کبھی اس سب کچھ کے بیچ میں آنکھ کی کرکری، کی طرح بھابھی ہم دونوں کے درمیان آکھڑی ہوتی ہیں، بے باک ادا میں آشیرواد دیتی دیوی کی طرح۔ تب کتنا غصّہ آتا مجھے اُن پر...

میں جانتی ہوں، میں بھابھی کو نظر انداز کرنے لگی تھی۔ ماں کے گھر بہت کم آتی۔ جب آتی تو اکثر سارا وقت پتاجی کے پاس بیٹھی رہتی۔ یوں پیاری بھابھی کے لیے محبّت جتانے میں میں بخیل نہیں ہوتی تھی، لیکن وہ ایسے ہی تھا۔ جیسے ماڈرن حسینائیں چہرے پر مسکان چپکائے رہتی ہیں۔ بھیّا خاص طور سے اس بات کو پہچانتے تھے۔ جب تب اشارہ بھی کر دیتے تھے۔ اور بھابھی محسوس نہ کرتی ہوں ایسا بھی نہیں ہے۔ ایک دن نہ جانے کس جھونک میں انھوں نے بھیّا سے واضح طور پر کہا تھا، "جانتے ہو اجیت جس کے لیے میں نے اپنے کو داؤں پر لگایا وہ تمھاری بہن من ہی من مجھ سے نفرت کرتی ہے۔"

کتنی لڑتی تب میں اپنے آپ سے، لیکن بھابھی اُن اجڈ، گنوار لوگوں کے ساتھ سوئیں اور زندہ رہیں اس خیال سے میرا رواں رواں نفرت سے بھر جاتا اور میری نسوں میں نالی کے کیڑے گجگجانے لگتے۔

ایک بار بھیّا نے بے حد سنجیدہ آواز میں مجھ سے کہا، "وبھا! میں دیکھتا ہوں کہ ادھر سُمیتا کے لیے تمھاری بے رُخی بڑھتی جا رہی ہے۔"

میں کانپ گئی، "نہیں تو، بھیّا..."

ہاتھ سے روک کر انھوں نے بہت دھیرے سے لیکن اتنے ہی پیار سے کہا، "میں جانتا ہوں۔ تو چاہتی نہیں لیکن سنسکار تو ہمارے ساتھ ماں کے پیٹ سے ہماری چیتنا میں پیوست ہو کر آتے ہیں۔ سیمتا بھی تو انھیں سنسکاروں سے پریشان ہے۔ ہر اُس عورت سے ملتی ہے جس کے ساتھ بلاتکار ہو چکا ہے۔ 'ناری من' میں تم نے اس کی رپورٹ پڑھی؟"

"نہیں تو!"

"پڑھنا، حیران ہو اٹھوگی۔ بہت گہری ڈوبی ہے سیمتا۔"

تب میں کیسی کیسی ہو گئی۔ ڈھونڈ کر رپورٹ پڑھی۔ حیران رہ گئی۔ پہلی بار بھابھی کے لیے سچ مچ پیار امڈا، لیکن تب تک وہ امریکہ جا چکی تھی۔ انھیں دنوں بے حد ذاتی لمحوں میں انیتہ کو میں نے وہ ساری کہانی لفظ بہ لفظ سنادی۔ ہوا ایسے کہ وہ رپورٹ پڑھ کر انیتہ کچھ زیادہ ہی حیران ہو اُٹھے، بولے، "عورت کا ایسے پیچیدہ، ایسے نفرت انگیز موضوع میں اس حد تک دلچسپی لینا بلاوجہ نہیں ہوسکتا۔"

میں نے مسکرا کر پوچھا، "کیا دنیا میں کوئی کام بلا سبب نہیں ہوسکتا؟"

"شاید نہیں۔"

"شاید کیوں؟"

"کیونکہ اس دنیا میں آخری کہیں کچھ نہیں ہے۔"

تب پختہ اور سنجیدہ آواز میں ایک ایک لفظ کو تول کر میں نے کہا، "تم ٹھیک کہتے ہو۔ بھابھی کی دلچسپی بلا سبب نہیں ہے۔ اُن کے ساتھ بھی یہ حادثہ ہو چکا ہے۔"

"کیا سچ؟" وہ ایک لمحے کے لیے جیسے خوشی سے چیخ اُٹھنے کو ہوئے لیکن دوسرے ہی پل اتنے ہی افسردگی سے بھر اُٹھے۔ "بھابھی تو مجسم جگدمبا کا روپ ہیں۔ اُن کے ساتھ بھی ایسا ہوا؟"

"ہوا ہی نہیں، انھوں نے ہونے دیا۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

جب تک میں اُس ناقابل یقین حادثے کا ذکر کرتی رہی، تب تک وہ پاگل سے مجھے دیکھتے رہے۔ کبھی میں محسوس کرتی کہ میرے جسم کے حصوں پر اُن کی گرفت بھیانک روپ سے تیز ہو رہی ہے، کبھی حیرت انگیز طور پر لطیف۔ پورے وقت وہ ایک لفظ بھی نہیں بولے۔ سُن چکے تو اتنا ہی کہا، "دنیا میں اس سے

بڑی نیکی اور ہو سکتی ہے کیا؟"

"پھر بھی بھابھی کے لیے میں دل ہی دل میں بے رخی کا احساس پالتی رہی۔"

"تم!! بھابھی کے لیے بے رخی کا احساس پالتی رہیں، کیوں؟"

"عورت اپنی مرضی کے خلاف، خود سے کسی کے ساتھ سو سکتی ہے، یہ میرا دل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوا۔ دل کی دنیا بڑی پر اسرار ہے۔ بھابھی کے دل میں کہیں نہ کہیں نا آسودہ شہوت پرستی پنپ رہی تھی...."

انیتہ جیسے چیخ پڑنے کو ہوئے، "دِبھا! اتنی بے رحم، اتنی ظالم ہو سکتی ہو تم! تم... یقیناً احساس کمتری میں مبتلا ہو، اس احساس سے کہ تمھاری بھابھی نے تمھیں 'چھوٹا' کر دیا۔"

نہ جانے کیوں میں خوف سے کانپ اٹھی۔ میں نے انیتہ کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا، "نہیں انیتہ ایسے مت چیخو مجھے ڈر لگتا ہے۔ لیکن تب مجھے ایسا ہی لگا تھا۔ جو سنکار زمانوں سے ہمیں ہماری گھٹی کے ساتھ پلائے جاتے ہیں، اس کا یہی انجام ہو سکتا تھا۔ یہ سب میں بھابھی کی رپورٹ پڑھ کر سمجھ پائی۔"

تعجب، انیتہ ایک ہی پل میں کچھ اور ہو گئے تھے۔ پیار سے میرا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولے "نہیں دِبھا! میں ظالم نہیں ہوں۔ قصور کسی ایک دبھا یا انشا کا تھوڑے ہی ہے۔ پوری ذات کٹگھرے میں کھڑی ہے۔ مرد بھی، عورت بھی۔"

میرے اندر پیار امڈ آیا۔ دو پل انھیں چھلکتی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی، "تم مرد خوش قسمت ہو۔ بلاتکار کا کرب تمھاری ذات کو نہیں بھوگنا پڑتا۔"

اس بار انیتہ کے سرخ چہرے کو جیسے دو کالے بادلوں نے گھیرے میں لے لیا ہو۔ پلک جھپکتے میں یہ سب کچھ ہو گیا۔ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولے۔ "بھولتی ہو دِبھا! مرد کے ساتھ بھی بلاتکار ہوتا ہے۔ شہوت پرست عورت جب مرد کو چاہتی ہے تو اُسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب تک خاص صورت نہ ہو مرد بالآخر اس بلاتکار میں دلچسپی لینے لگتا ہے..."

"شاید!"

"شاید نہیں، یقیناً!"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے بھگتا ہوا سچ ہو۔"

ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں کیسی معصوم نگاہ تھی وہ ... میں کانپ اُٹھی۔ انیتہ کہہ رہے تھے، جھلکتا ہوا سچ نہیں، بھگتی ہوئی صداقت۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میری آواز اچانک انجانے، اپنجانے سخت ہو گئی تھی۔

انیتہ نے نظریں گھما لیں۔ جیسے خلا میں کچھ ڈھونڈ رہے ہوں، پھر وہیں سے بولے "وبھا، میرے ساتھ بلاتکار ہو چکا ہے۔"

"تمھارے ساتھ؟" میرے رواں رواں سے پسینہ چھوٹنے لگا تھا "کس نے کیا تمھارے ساتھ بلاتکار؟"

"بھابھی نے۔"

"ہوں ... ل ... بھابھی جی نے ..." میں جیسے تب تھی ہی نہیں۔ بس ایک سرگوشی ماحول میں گونج رہی تھی — "بھابھی جی نے تمھارے ساتھ بلاتکار کیا ... نہیں ... نہیں ..."

انیتہ نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا "میں تمھیں پوری کہانی سناتا ہوں۔"

وہ دو پل کے لیے خاموش رہے، دو یُگ جتنے وہ دو پل۔ جیسے خوفناک زلزلہ آگیا تھا اور سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ کر گر رہا تھا لیکن جب انھوں نے بولنا شروع کیا تو سب کچھ پس پردہ چلا گیا۔ صرف ان کے الفاظ ہی میرے ذہن پر چسپاں ہونے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

بات تب کی ہے جب بھائی صاحب کی شادی ہوئی تھی۔ تب وہ لندن میں تھے۔ شادی کرنے کے لیے آئے تھے اور ایک ہفتہ میں چلے بھی گئے تھے۔ بھابھی کو ایک ماہ بعد جانا تھا کیونکہ ویزا ملنے میں کوئی تکنیکی دشواری ہو گئی تھی۔ بھابھی کو رُکنا پڑا۔ وہ بہت دکھی ہوئیں۔ وہ پرانی نئی نویلیوں کی طرح چھوئی موئی نہیں تھیں۔ اچھی خاصی ماڈرن تھیں۔ بھائی صاحب کے جانے کے تیسرے دن اچانک انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں انھیں پریشان کرتا ہی رہتا تھا جیسے دیور بھابھی کے بیچ ہوتا ہے۔ اُس دن ماں کتھا سننے چلی گئی تھی۔ بس ہم دونوں ہی اُس پل گھر میں تھے۔ اُن کے بلانے پر میں بلا جھجک اندر چلا گیا۔ اندر پہنچتے ہی انھوں نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر مجھے کھینچتی ہوئی اپنے پلنگ پر لے گئیں۔ "انیتہ، میرے اندر جنگل کی آگ دہک رہی ہے، تم اُسے بجھا دو ..."

میں کچھ سمجھوں تب تک سب کچھ واقع ہو چکا تھا۔ میرا دم جیسے کسی نے گھونٹ دیا ہو۔ میں نے سانس

لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "یہ کیا بھابھی جی، یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟"

"جو مجھے اِس وقت کرنا چاہیے۔"

"آپ جانتی ہیں، آپ میرے بڑے بھائی کی بیوی ہیں، میری قابلِ تعظیم بھابھی جی۔"

"یہ اصول اخلاقیات کی باتیں اپنے بھائی صاحب سے کہنی چاہیے۔ وہ مجھے بیاہ کر لائے تھے۔ انھوں نے میرے جسم میں آگ لگائی اور چلے گئے۔"

میرا ذہن چکرا رہا تھا۔ میں نے کسی طرح کہا، "بھابھی جی، آپ جانتی ہیں، آپ کیوں رکی ہیں۔ آپ ایک ماہ بعد انھیں کے پاس چلی جائیں گی۔"

"میں جانتی ہوں لیکن یہ بھی جانتی ہوں، میں ایک ماہ تک اس آگ میں دہکتی نہیں رہ سکتی۔ کوئی عورت نہیں رہ سکتی۔ اس لیے تمھیں . . ."

"بھیا جائیں گے . . ."

وہ ایک دم تڑپ اٹھیں، "بھیا کے جاننے کی تمھیں اتنی فکر ہے۔ کیا میں اُن کے تعلقات کو جان سکتی ہوں؟ کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ وہ اِن دنوں . . ."

وہ سچ مچ پاگل ہو رہی تھیں۔ ماحول نے انھیں بے حد دلکش بنا دیا تھا۔ وہ جتنی مشتعل ہوتیں اتنی ہی دلکشی بڑھتی۔ مرد کا شکاری روپ ایسی حالت میں شدید ہو جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے بھائی کے لیے پیار، رشتوں کی اخلاقیات، سب کچھ اس شدت میں پگھل گئے۔ میں اُن کے جال سے نہیں نکل سکا۔ تم کچھ بھی سزا دے سکتی ہو لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے انھیں مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی . . .

انیتہ نہ جانے کہاں سے بول رہے تھے۔ میرے کانوں میں کچھ آوازیں گونج رہی تھیں اور میرے سامنے ابھر رہی تھیں دو عورت کی مورتیاں — میری جیٹھانی اور میری بھابھی۔ ایک جس نے جسم کی آگ کے سامنے سارے رشتوں کو طاق پر رکھ کر دیا تھا، دوسری جس نے رشتوں کو نبھانے کے لیے جسم کی فکر ہی نہیں کی تھی۔

اچانک مجھے لگا جیسے کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا ہے، "تم کہاں چلی گئی وِبھا؟ تم . . ."

میں سچ مچ چونک پڑی، "ہاں، بھابھی تم . . ."

انیتہ ڈر گئے۔ انھوں نے مجھے باہنوں میں بھر کر اپنے سے چمٹا لیا ''وبھا، وبھا...''
میں ہوش میں آتی جا رہی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے کو چھڑا لیا۔
وہ بولے، ''بہت ناراض ہو۔''

''بیوی کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ شوہر کے کسی فعل، غیر فعل سے ناراض ہو۔''

''وبھا! میں قصوروار ہوں لیکن...''

''بحث مت کرو۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں ٹوک دیا۔ پھر کئی پل گھمڑتی رہی جاتی تھی، انیتہ بہت پریشان ہیں۔ دھیرے دھیرے بولی، ''میں تمھاری بات نہیں سوچ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی اپنی بھابھی کی بات میں نے ان پر کتنا ظلم کیا ہے۔ ناآسودہ شہوت میری بھابھی کے اندر نہیں، تمھاری بھابھی کے اندر دہک رہی تھی، لیکن انیتہ! قصور تو ان کا بھی اتنا نہیں ہے۔ جو تہذیب ہماری سانسوں میں لسی ہے وہاں یہ احتیاط غیر فطری ہے۔ جس ماحول میں ہم سانس لیں گے وہی تو منعکس ہوگا ہمارے باطن اور خارج پر بھی۔ تمھاری بھابھی نے پل میں جینا سیکھا تھا۔ اُسی میں وہ جی سکتی تھیں۔ آج بھی اُسی میں جیتی ہوں گی۔''

انیتہ کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ ان میں کیسی ممنونیت اور ستائش کے احساس تھے۔ میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکے، ''واقعی میرا بوجھ ہلکا ہوا۔''

''لیکن میں نہیں ہو سکتی تھی، جیسے بھابھی نہیں ہوئیں۔ تبھی تو وہ بلا تکار کی شکار عورتوں کی تلاش میں بھٹکتی رہیں۔ تبھی وہ امریکہ چلی گئیں۔''

''وبھا! تم اتنا جانتی تھیں۔''

''جانتی تھی نہیں، آج کچھ کچھ جان سکی ہوں۔''

اس دن کے بعد انیتہ کی محبت میرے لیے شدید تر ہوتی گئی۔ مجھے بھی لگا جیسے میں خود بدلتی جا رہی ہوں۔ ایک دن نہ جانے کس سلسلے میں انیتہ نے کہا، ''مجھ پر یقین رکھو، وبھا۔''

میں نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے مُنہ پر رکھ دیا، بولی — ''یقین کی بات مت کرو، انیتہ! وہی تو وجہ ہے غداری کی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلنے دو۔ تم، تم رہو، میں، میں رہوں، اتنی ہی محبت میرے لیے کافی ہے۔ یقین کا وعدہ محبت کو بندھن بنا دے گا۔''

انیتہ پھر نہ جانے میری طرف کیسے دیکھ رہے تھے کہ میری ہنسی چھوٹ گئی۔ انیتہ نے بھوکے بھیڑیے کی سی بے صبری سے مجھے چومنا شروع کر دیا۔ میں اُسی آزادی سے ہنستی رہی۔

لیکن اندر ابھی بھی پھانس تھی کہیں۔

پتاجی کے پاس لوٹنے پر بھابھی کا ایک لمبا خط میرے نام آیا۔ اُسی ڈاک سے میری جیٹھانی کا بھی ایک چھوٹا سا خط تھا۔ لکھا تھا —

ڈیبرو بھا!

اچھی ہو نہ تم! تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہم اس ماہ کے آخر تک وہاں آنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ایک ماہ رہیں گے۔ تم سارا انتظام کر ہی دوگی۔

تمہارے بھائی صاحب بہت خوش ہیں۔ پر تم بھی بڑے مزے میں ہیں۔ اب بولنے لگا ہے۔ شرارت تو بہت ہی کرتا ہے۔ میں تو اُسے پا کر نازاں ہوں۔

انیتہ کیسے ہیں؟ بہت چھوٹ نہ دینا باندھ کر رکھنا۔ شیر کی طرح مُنہ سے خون لگ جانے پر انسان بھی درندہ ہو جاتا ہے۔ کچھ خاص چاہیے تو لکھنا۔

تمہاری بھابھی
اپرنا

ہنس پڑی وہ جملہ پڑھ کر۔ اُسے سُرخ پنسل سے نشان لگا کر انیتہ کی میز پر رکھ آئی۔

پھر لوٹ کر سمیتا بھابھی کا خط کھولا۔

تخاطب پڑھ کر ہی دل پر چھائے بادل چھنٹ گئے۔ لکھا تھا —

میری پیاری پیاری نندیا،

بہت پیار تم دونوں کو کیسے ہو؟ بہت خوش، ایک دوسرے میں کھوئے۔ نا ... نا ... ایک دوسرے میں کھونا مت، ایک دوسرے کو جاننا، سہارا دینا۔ برابر رائی رتی جتنا بھی فرق نہیں۔

میں جانتی ہوں، تو بار بار ہنس رہی ہوگی۔ اسی لیے تو لکھا ہے کہ تو ہنسے اور اس کی چھوت مجھے لگے۔ یہاں تو ایسا موقع آتا ہی نہیں کہ ہم دل میں ہنسیں۔ سب کی ہنسی گلے میں رہتی ہے۔ فرصت

کسے ہے گہرائی میں ڈوبنے کی؟ ہاں، کبھی کبھی جھوٹی محبت میں ڈوبتے ہیں، لیکن وہ ڈوبنا کتنے دن چلے گا، کوئی نہیں بتا سکتا۔ جتنی جلدی پروان چڑھتا ہے۔ اتنی جلدی غائب ہو جاتا ہے۔ لمحوں میں جیتے ہیں یہاں کے آزاد لوگ۔ راہ چلتے پیار کرنے سے بھی انھیں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ میں نے انھیں بے تحاشہ بھیڑ میں پگڈنڈی پر لیٹے پیار کرتے دیکھا ہے۔ ہاں، پانچ دن اپنا کام خوب کھٹا کر کرتے ہیں۔ پھر دو دن اتنے ہی گل چھرے اڑاتے ہیں، آزاد، بے فکر، بے روک ٹوک۔

میں نے لکھا نا کہ جہاں میں رہتی ہوں وہاں کالے لوگ بہت رہتے ہیں۔ بہت کم ملنا ہو پاتا ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ ایک دن کیا ہوا، مجھ سے کچھ آگے میری ڈینش دوست جا رہی تھی کہ پیچھے سے ایک نیگرو نوجوان آیا اور میرے دیکھتے دیکھتے اُس کے ہاتھ سے بٹوہ چھین کر لے گیا۔ کوئی کچھ نہ کر سکا۔ وقتی ہلچل، پھر سب کچھ شانت۔

ہمارے ملک سے جو نوجوان لڑکے لڑکیاں یہاں آتے ہیں وہ بھی کچھ دن بعد ویسے ہی حقیقت پسند ہو جاتے ہیں۔ فون پر ہیلو ہیلو ہو جائے بس اتنا ہی مقصد ہے ان کے لیے دوستی اور ساتھ اور محبت کا۔ تو جانتی ہے نا۔ پتاجی کے ایک دوست ہوتے تھے۔ ایک بار گھر بھی آئے۔ اُن کے کسی ڈرامے کو کسی گوری لڑکی نے پڑھا اور فریفتہ ہو اُٹھی تھی۔ تعجب وہ ڈرامہ مشترکہ خاندان کے بکھرنے اور رشتوں کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا۔ پڑھ کر اس لڑکی کو لگا کہ مشترکہ خاندان کے روایت کی بھی کوئی اہمیت ہو سکتی ہے۔ وہ دوست پتاجی کی اور بھی کتابیں لے گئے تھے۔

تو یہ بھی جانتی ہوگی کہ پتاجی کا اسی موضوع پر ایک مکمل ڈرامہ گذشتہ سال جاپان میں کھیلا گیا تھا۔ ان کے یہاں تو مشترکہ خاندان کی روایت رہی ہے۔ اُسی سے ان کا تجسّس بڑھ گیا تھا۔

مجھے ایسا لگتا ہے جی جی کہ جو ہمارے پاس نہیں ہے اُسی کے لیے لالچ پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا آدرش /خاندان کا بکھراؤ ہے اور انھیں لگتا ہے کہ کوئی ایسا ذریعہ ہو جہاں سے حیثیت مل سکے، اپنا پن مل سکے۔ یہ اپنا پن، یہ حیثیت، محبت، پیار، خلوص ۔۔ یہ سب جینے کے لیے کتنے ضروری ہیں، یہ گھر سے باہر نکل کر ہی پتہ چلتا ہے۔ بے شک معاشی اور سماجی آزادی بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ ان کے بغیر ہم باہر نکلیں گے کیسے؟ خاندان کا تعاون چاہنے کا مطلب ہے خاندان کی غلامی۔ اپنے کو پانے

کے لیے کم سے کم معاشی کفالت تو چاہیے ہی چاہیے۔

لو بھئی، میں پھر نقاد بن گئی۔ اس بیماری سے نجات تو معاشی نجات سے بھی مشکل ہے۔ اپنے آپ کو کسی پر نصب کرنا انسانی مزاج کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اسی جھونک میں میں نہ جانے کیا کیا لکھ گئی۔ لیکن تم آزاد من سے پڑھنا اور اپنا معنی لگانا۔ انیتہ کو بھی دکھا دینا، اگر چاہو تو۔

ہاں، تیرے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ بھیج رہی ہوں۔ اجیت، انکت، پتاجی، انیتہ سبھی کے لیے کچھ نہ کچھ لے آئی ہوں۔ اُسے دیکھ کر میری یاد تو آتی رہے گی۔ ایک خاندان بھارت لوٹ رہا ہے، انھیں کے ہاتھ بھیج رہی ہوں۔ اپنی کمائی میں سے کسی کو کچھ تحفہ دینا کتنا اچھا لگتا ہے۔ انا کی تسکین ہوتی ہے۔ ہونی چاہیے نا۔

اچھا اب بتاؤ، اجیت کیسے ہیں؟ شیاملا کے پاس گئے ہوں گے؟ شیاملا دہلی آئی؟ اس کا ایک بہت پیارا پیارا خط مجھے ملا ہے۔ بہت جذباتی ہے وہ۔ مجھے لگتا ہے اس کا دل صاف شفاف ہے۔ کسی کو دھوکہ نہیں دے گی، لیکن کھائے گی ضرور۔ ایسے لوگوں کا یہی مقدر ہوتا ہے...

اب بند کروں۔ ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں سارے ٹرینیز کو کہیں دور جانا ہے۔ چار دن میں لوٹیں گے۔

تم سب کو بہت بہت پیار۔ پتاجی وہاں ہوں تو میرا پرنام کہنا۔ انکت کو گود میں بھر کر خوب چومنا۔ وہی تو میرا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اور ہاں، تم اپنا سہارا کب ڈھونڈو گی؟ کب سناؤ گی خوشخبری...؟

تمھاری اپنی
سُمیتا بھابھی

اس خط کو نہ جانے میں نے کتنی بار پڑھا۔ جس دن چھوئی موئی سی شرمیلی نئی بہو کے روپ میں اس نے ہماری دہلیز پر قدم رکھا تھا، تب سے آج تک کے لمبے سفر کی میں گواہ رہی۔ ایک نازک پودا کیسے بڑا درخت بن گیا، میں سوچ کر خود حیران رہ جاتی ہوں۔ ایسی تن من کی پاک بھابھی کے لیے میں کتنی ظالم بن گئی تھی۔ لیکن کیا یہ بھی بے رحم حقیقت نہیں ہے کہ وہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو کیا اتنا

سفر کر پائی بھابھی...؟

تبھی اچانک دروازے کی گھنٹی گھن گھنا اٹھی۔ انیتہ آ گئے تھے، دیکھتی ہوں۔ ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ ہے۔

"یہ کیا ہے؟"

"بوجھو تو جانیں۔"

"بھابھی نے تحفہ بھیجا ہے۔"

"ارے باپ رے! تمھیں کیسے پتہ لگا؟ کیا تم ترکال درشی ہو؟" انیتہ نے پاس آکر مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔

"میں نے بھی ویسے ہی کہا" "جی ہاں، ہم ترکال درشی ہیں۔" پھر اُن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی ـــ "ارے بھائی، بھابھی کا خط آیا ہے۔ اُس میں سب لکھا ہے۔"

"ہم یہاں بھی ہار گئے، سوچا تھا تمھیں حیران کر دیں گے۔"

"یہ ہار جیت کی بات مردوں کے دل میں جیسے کنڈلی مار کر بیٹھ گئی ہے۔ سر بل..."

تبھی گھنٹی پھر گھن گھنا اٹھی۔ "اب کون آیا؟" کہتے ہوئے انیتہ نے دروازہ کھولا اور چلّا اٹھا، "ارے اجیت تم! کیا سرپرائز دیا ہے۔ نہ خط نہ تار... اور تم انکت مہاشے! تم بابا جی کو کہاں چھوڑ آئے؟"

انکت تب تک مجھے دیکھ چکا تھا۔ دوڑ کر میری گود میں چپک گیا۔ میں نے بھی اُسے چھاتی میں بھینچ لیا اور تابڑ توڑ چومنے لگی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہتی جاتی تھی ـــ "تیری ماں کی چٹھی آئی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ میرے بیٹے کو چھاتی سے چپکا کر خوب چومنا۔"

انکت نے کسی طرح اپنے کو چھڑا کر کہا، "دکھاؤ وہ چٹھی۔"

اور وہ چٹھی، وہ تحفے ـــ یہ سب دیکھنے سننے میں رات کب کافی گزر گئی، پتہ ہی نہیں لگا۔ اگلے دن سویرے اجیت بھیا نے بتایا کہ اُسے ایک ریسرچ اسکالر کا واٗوا لینے گوہاٹی جانا ہے۔ دس بارہ دن لگ سکتے ہیں۔ تب تک انکت بوا کے پاس ہی رہے گا۔ پتا جی ایک ماہ کے لیے روس جاتے والے ہیں۔ کچھ ترجمہ کا کام جا پچنا ہے۔

میں تھوڑی جھلاتی سی بولی، "یہ سب آپ نے کل ہی کیوں نہیں بتایا؟"

"آج بنانے میں کچھ فرق پڑ گیا کیا؟"

"کیوں نہیں پڑ گیا، ساری رات میں آپ کے بارے میں سوچتی رہی؛ کہاں بیٹھ کر کام کریں گے، کس کس سے ملنے جائیں گے، وغیرہ وغیرہ..."

"ارے، وہ بس روٹین ہو گیا ہے میرا۔ اور اب میں جا رہا ہوں تو تمھیں کچھ فرصت ملے گی۔ انکت کا ہوم ورک کروا دینا۔ ضرورت اُسے ہے..."

"تمھیں نہیں ہے جیسے،" میں اُن کا مُنہ چڑھا کر بھاگ آئی جیسے بچپن میں کرتی تھی۔ اجیت بھیا زور سے ہنس پڑے۔ پھر ہنستے ہنستے اسٹیشن چلے گئے۔ پندرہ دن بعد لوٹے تو سمینا کا ایک طویل خط اُن کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کافی وزنی تھا۔ اُسے پڑھنے سے قبل انھیں انکت کو منانا پڑا۔

"پاپا، تم اتنی دیر سے کیوں آئے؟ ممی بھی ابھی تک نہیں آئی۔ باباجی بھی چلے گئے۔ سب ہمیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ بُوا کہہ رہی تھی ہمارے اسکول کھلنے والے ہیں۔ کب چلوگے اس گھر؟"

"جب کہو، کل ہی چل سکتے ہیں۔ تمھارے باباجی کا خط آیا ہے وہ پرسوں دہلی پہنچیں گے۔ تم نے ہوم ورک کر لیا نا؟"

"ہاں پاپا، سب کر لیا! بُوا کہتی تھی کہ ہمیں ویری گڈ ملے گا، پاپا! ممی کی چٹھی بھی تو آئی ہے۔ کب آ رہی ہے میری ممی؟"

"وہ چٹھی ابھی ہم نے پڑھی نہیں۔ پڑھ کر بتائیں گے۔"

میں نہ جانے کب آ کر وہاں کھڑی ہو گئی تھی اور ان کی باتیں سُن رہی تھی — بولی، "بھیا، لو چائے پی لو۔ انیتہ تو چلے گئے، ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں۔ انکت بیٹے، تمھارا دودھ بھی ہے۔ اور بھیا، کیا سویرے ہی چلے جاؤ گے؟"

"پتا جی آ رہے ہیں پرسوں۔ جانا ہی ہوگا۔"

"ہاں، تب تو جانا ہی ہوگا۔ میں اگلے ماہ آؤں گی۔ ابھی اِن کے بھائی بھابھی آ رہے ہیں۔ ایک مہینہ رہیں گے... ہاں، بھابھی نے کیا لکھا ہے؟"

"ابھی پڑھا ہی نہیں۔ رات میں پڑھوں گا۔ کچھ زیادہ ہی بھاری ہے۔"

میں ہنس پڑی "فراق کا بوجھ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔"

بھیّا نے میری طرف دیکھا اور مسکرا پڑے۔ پندرہ دن انکت میرے پاس رہا۔ وقت بس ہوا کی ترنگوں پر بہتا چلا گیا۔ ایک دن اُس کے جانے کے بعد انھوں نے کہا بھی، "وِبھا! تمھیں انکت سے بہت پیار ہے؟"

"ہونا ہی چاہیے، میرے بھیّا کا بیٹا ہے۔"

"اور جو تمھارا ہوتا؟"

میں نے ان کی آنکھوں میں شرارت سے جھانکا، "اُسے تم پیار کرنا۔"

"ہا... ہا... ہا... جیسے تم تو ہنہ بچکا کر چلی جاؤ گی۔ دیوی جی! تب تو تم میری بھی فکر نہیں کرو گی۔ جیسے میں ہوں ہی نہیں۔"

میں نے کھل کھلا کر ان کے کندھے پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے کہا، "تو یہ بات ہے، ابھی تو وجود بھی نہیں، ابھی سے حسد ہونے لگا۔"

پھر نہ جانے کیا ہوا، میں اچانک گمبھیر ہو گئی۔ "سنو انیتہ! بھابھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی، لیکن انکت کے لیے جان تڑپتی ہے۔ اور جانتے ہو، مجھے کیا لکھا ہے؟"

"پڑھ چکا ہوں، یہی تو لکھا ہے — تم اپنا سہارا کب ڈھونڈو گی؟ کب سناؤ گی خوشخبری؟ کوئی کتنی بھی ترقی کرے، لیکن سنسکاروں کی گرفت آسانی سے ڈھیلی نہیں ہوتی۔ سخت سے سخت ناستک بھی مندر کے پاس سے گزرتے ہوئے سر جھکا دیتا ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اعلانیہ ناستک تھے۔ لیکن ایک دن کسی تقریب میں گڑبڑی ہوتے دیکھ کر بھیڑ کے بیچ میں کود پڑے اور عوام کو بٹھانے لگے۔ تبھی ان کی نگاہ ایک سنیاسی پر گئی۔ بے ساختہ ہاتھ جڑ گئے بولے — سوامی جی، آپ بھی بیٹھ جائیے۔"

میں سن بھی رہی تھی اور نہیں بھی، کیونکہ تب میں بھابھی کے امریکہ پہنچ گئی تھی اور دیکھ رہی تھی انھیں سنسکاروں کے دُھند میں ڈوبتے ابھرتے۔ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ان کا چہرہ بھی کبھی بے حد اپنا اور کبھی بے حد اجنبی لگتا تھا۔ پھر وہ بھی غائب ہو گیا۔ رہ گیا صرف دھند۔ یہ دُھند ہمارا پیچھا کب چھوڑے گی؟

دو دن میں بہت اکیلی رہی۔ کم از کم ہر پل لگتا رہا کہ میں بے حد اکیلی ہوں۔ انیتہ پاس ہوتے تو بھی سب کچھ اجنبی اجنبی سا لگتا، لیکن یہ سب اندر کے سفر کی بات ہے۔ باہر سب وہی دنیاداری جو ہے نہیں، وہی دِکھنے کی مجبوری۔

ان کے بھائی بھابھی کسی بھی دن آ سکتے تھے، کیونکہ دہلی رکنے کا کچھ طے نہیں تھا۔ اچانک تار آیا کہ وہ ۲۰ جولائی کو دہلی پہنچ رہے ہیں اور وہاں سے پہلی فلائٹ لے کر پٹنہ پہنچیں گے۔ اور وہ بیس جولائی آج ہی ہے۔ میں تب گھر پر اکیلی تھی۔ کیا کروں؟ انیتہ کا پتہ نہیں تھا۔ کہاں ہوگا اور فلائٹ شاید آ بھی چکی ہو... تو میں چلوں ہوائی اڈّے، لیکن وہ تو دور ہے۔

اسی ادھیڑ بن میں پریشان تھی کہ گھنٹی گھن گھنا اٹھی۔ دوڑ کر دروازہ کھولا۔ یہ کیا؟ میرے سامنے ان کے بڑے بھائی مکرند اور اپرنا بھابھی اور ان کی گود میں سوتا ہوا پرتھم۔

میں نے خوشی سے جھوم کر پہلے بھائی صاحب کے پیر چھوئے، پھر بھابھی کے اور پھر دھیرے سے پرتھم کو سمیٹ لیا ـــ کہیں جاگ نہ جائے۔

بھابھی بولی ـــ "ہمارا تار نہیں ملا؟"

"بس ابھی دس منٹ پہلے ملا ہے۔ مل گیا، یہ کیا کم حیرانی ہے اس ملک میں۔"

بڑے بھیا بولے، "اور انیتہ کہاں ہے؟"

"اُن کے ہونے کی کوئی ایک جگہ نہیں ہے۔ اس لیے فون بھی نہیں کر سکی، لیکن ویسے اُن کے آنے کا وقت ہو ہی رہا ہے۔"

میں اپنا جملہ پورا کر پائی کہ گھنٹی پھر گھن گھنائی۔ فوراً آگے بڑھ کر بھابھی نے دروازہ کھول دیا، "آئیے دیور جی، کہاں رہے اب تک؟"

انیتہ تھے، کبھی بھابھی کو دیکھتے کبھی بھیا کو، کبھی مجھے، لیکن میں دیکھ رہی تھی انیتہ اور اپرنا بھابھی کو، جن کی لگا ہیں مل مل کر الگ ہوتی تھیں اور الگ ہو ہو کر ملتی تھیں۔ ایک بار تو دونوں کے درمیان روشنی کا ایک ایسا پُل بن گیا جس پر سے ہو کر آسانی سے ایک دوسرے کے پاس جایا جا سکتا ہے۔ میرے دل میں دُھند کا جوار امنڈا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ گھمڑتا انیتہ سادگی سے بول اُٹھے "آپ آ رہے ہیں یہ تو پتہ تھا لیکن ..."

"آج کل ہمارا محکمہ ڈاک بہت چست ہوگیا ہے۔ [..] تار اُسی ہوائی جہاز سے آیا جس سے ہم آئے۔"

"ارے بھابھی جی، آگیا یہ کیا کم ہے، نہیں تو یہاں یہ کہاوت [..] ہے کہ چھٹی چل پڑی تو کسی نہ کسی دن پہنچ جائے گی، تار تو اڑتا ہے۔ نہ جانے ہوا کدھر اڑا لے جائے۔"

ہنسی کا قہقہہ لگا ہی تھا کہ بجلی غائب ہوگئی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا، "اب دوسرے شعبہ کی مہارت کا ثبوت لیجیے، پتہ نہیں ایک گھنٹے میں آئے گی یا تین میں۔"

انیتہ تب تک موم بتی اٹھا لائے تھے۔ میں نے انھیں فوراً جلا کر کئی جگہوں پر رکھا۔ ایک لالٹین تھی اور ایک لیمپ بھی۔

اپرنا بھابھی نے گہری سانس لے کر کہا، "پندرہویں صدی میں دعوتیں ایسے ہی رومانی فضا میں ہوتی تھیں۔ کتنا اچھا لگتا ہے دھندلی روشنی میں کسی کو دیکھنا۔"

"جی بھابھی جی! تبھی تو ہم اکیسویں صدی کا نعرہ لگا کر پندرہویں صدی میں لوٹ رہے ہیں۔"

"مجھے تو روشنی کا یہ انتظام بہت اچھا لگتا ہے۔ سب خوبصورت ہی خوبصورت دکھتا ہے۔ ہے نا رومانی۔"

میں نے اچانک ہی انیتہ پر ایک تیکھی نگاہ ڈالتے ہوئے بھابھی جی سے کہا، "لیکن بھابھی جی، مجھے تو تیز روشنی ہی اچھی لگتی ہے۔"

"اپنی اپنی پسند ہے۔" انیتہ بولے۔

"آپ کی کیا پسند ہے؟" بھابھی نے انیتہ سے پوچھا۔

"میری پسند، وہ میری کہاں ہے، وہ تو پہلے سے طے ہے وبھا کی پسند کے مطابق۔"

بھابھی نے قہقہہ لگایا، بولیں، "ارے وبھا، تم سچ مچ جادو جانتی ہو کیا، بھیڑ بنا رکھا ہے ہمارے دیور جی کو۔"

میں نے خود کو ہی چونکاتے ہوئے واضح اور پر اعتماد لہجے میں کہا، "بھابھی جی، میرے پاس تو ایک ہی جادو ہے، پیار۔ وہی میرے اعتماد کی بنیاد ہے۔۔۔"

یہ کیا کہہ گئی میں۔ اتنا ظالم ہونے کی کیا ضرورت تھی لیکن کبھی کبھی ہم وہ کہاں رہ جاتے ہیں جو ہیں، وہ ہو جاتے ہیں جو ہمارا باطن چاہتا ہے کہ ہم ہوں۔

دو پل کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر اچانک مجھے ہی ہوش آیا۔ میں نے آزاد خیالی سے کہا "بھابھی جی، آپ اُٹھیے نا۔ اُدھر آپ کا کمرہ ہے۔ کپڑے بدلیے، پھر ہم مل کر کھانا بنائیں گے۔ ان دونوں کو باتیں کرنے دیجیے۔"

"نہیں نہیں،" بھابھی جی بھی اتنی ہی شانت تھیں۔ "یہ لوگ برتن صاف کریں گے۔ وہاں تو سبھی کرتے ہیں یہ بھی۔"

"ارے تو بھابھی جی، ذرا انیتہ جی کو بھی بتادیجیے۔ مجھے کالج بھی جانا ہوتا ہے اور یہ گھر بھی سنبھالنا ہوتا ہے۔ یہ ذرا۔۔۔"

انیتہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ پیچھے پیچھے بھائی صاحب بھی۔ بس کچھ کہنی کہ چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔ ایک ایک کر کے ساری ٹیوبس اور بلبس جل گئے۔ رومانس ختم ہو گیا۔ اُدھر پرکھم بھی جاگ کر ہاتھ پیر اور کلکاریاں بھرنے لگا۔ میں اس کی طرف لپکی۔ اُسے اٹھایا اور اُسے ہنساتے ہوئے بولی، "بھابھی جی! اب میں اس ببوے کو کھلاؤں یا کھانا بناؤں؟"

بھابھی بھی سنجیدہ ہو کر بولیں، "وبھا! تو بھی یوں ہی ہے۔ اری اسے انیتہ کو دے آ۔ اُسے بھی مشق ہو جائے گا بچّے کھلانے کا۔"

اور وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ انیتہ تبھی کسی کام سے باہر آرہے تھے۔ میں نے پرکھم کو انھیں سونپتے ہوئے کہا، "آپ کی بھابھی جی کا حکم ہے کہ آپ اسے کھلائیں گے۔"

پرکھم کو تو انھوں نے سمیٹ لیا۔ لیکن جس طرح تیکھی نگاہ سے میری طرف انھوں نے دیکھا اس نے مجھے پانی پانی کر دیا۔ میں نے دھیرے سے اُن کا ہاتھ دبایا اور رسوئی گھر میں چلی گئی۔

میں سارے وقت اس بارے میں پوری طرح محتاط تھی کہ میں کچھ زیادہ ہی وہمی ہونے کا ڈرامہ کر رہی ہوں۔ اسی عادت کی وجہ سے میں انجانے اور انچاہے طور پر بار بار بے رحم ہو جاتی۔ پھر بھی ایک کسیلی سے پشیمانی مجھے گھیر لیتی اور میں خود کو ہی کوسنے لگی۔ اس واقعہ کے بعد میں نے پوری کوشش کی کہ ان دونوں کی طرف دھیان ہی نہ دوں، لیکن جیسے ہی وہ باتیں کرتے ہوتے میں بالکل بدل جاتی اور اُن کے طرز و ادا کا مطلب لگانے لگتی۔ انیتہ بھول سے بھی مسکراتے تو میرا پورا وجود دہک اُٹھتا۔ دوسرے ہی پل اپنی بھول کا احساس ہوتا تو اپنے کو بُری طرح جھنجھوڑ ڈالتی۔۔۔

رات کو تنہائی پاتے ہی میں نے انیتہ سے چپک کر اتنا ہی کہا" انیتہ! اس بارے میں ایک لفظ نہیں۔ بہت جوجھ چکی ہوں اپنے سے۔ لہولہان بھی ہوئی ہوں۔"

انیتہ بولے،" خود پر لگام لگانے سے بھی کیا بھونچال سے بچ سکوگی۔ اپنے آپ کو نارمل کرلو۔"

" وہی کرنا چاہتی ہوں لیکن۔۔۔"

انیتہ ہنس پڑے،" اس لیکن سے نجات پانا ہی نارمل ہونا ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔"

" وہ تو ہے لیکن انیتہ، میں اپنے پاپی من کا کیا کروں؟"

اور میں یکبارگی سسک سسک کر رو پڑی۔ انیتہ نے مجھے خود سے اس طرح چپکا لیا جیسے میں اُن کے جسم کا ہی حصّہ ہوں۔ پھر میری آنسو چومتے ہوئے کہا،" تم پر جو ردِّ عمل ہو رہا ہے وہ فطری ہے۔ میں تمہیں قصور نہیں دے رہا۔ تم اپنے کو گنہگار نہ مانو۔ اپنے کو اس طرح مت ستاؤ۔ آخر یہ اذیت مجھے ہی تو جھیلنی پڑے گی۔"۔۔

اچانک میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے سرد ہونٹ اُن کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔۔۔ پھر کہیں کچھ نہیں تھا سوا دو ناآسودہ آتماؤں کے جو بے حال و پریشان ایک دوسرے میں آسودگی تلاش کر رہی تھیں۔

اگلے کئی دن بھابھی جی کے قہقہوں، پر تقسیم کی کاکاریوں اور بھائی صاحب کے سگار کے دھوئیں میں ایسے گزرتے چلے گئے کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب بھابھی جی کے جانے کا دن آگیا۔ انھوں نے آنے کے اگلے دن ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ ۱۵ اگست کو دہلی میں رہنا چاہتی ہیں۔ اس سے پہلے ماں کے پاس الہ آباد بھی کچھ دن رکنا ہے، اس لیے وہ پہلی اگست کو یہاں سے نکلیں گے۔

رخصتی کا وقت کچھ زیادہ ہی سوگوار ہوگیا۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ بھابھی جی اصلی حالت کو بھانپ گئی تھیں۔ محکمہ خارجہ میں رہ کر بالخصوص امریکہ میں رہنے کی وجہ سے مزاجاً مکمل طور پر آزاد تھیں۔ چنچل وہ پہلے سے ہی تھیں۔ مجھ سے بس ایک سال بڑی تھیں، مگر نند بھائی صاحب بھی تو انیتہ سے تین سال ہی بڑے تھے، لیکن وہ حکومت ہند کی وزارت خارجہ میں تھے۔ نہ چاہ کر بھی اُن کے مزاج میں رعب تھا۔ یہ رعب بھابھی جی کے لیے عزّت اور رتبے کی نگاہ سے تو مفید

تھا، لیکن ذاتی زندگی میں اس نے ایک دوری پیدا کردی تھی۔ دونوں کے درمیان۔ مکرند بھائی صاحب کو ایک مصروف اور مشینی زندگی جینا پڑتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے اتنے ساتھی نہیں تھے جتنے اپنے ساتھی افسروں کی بیویوں یا پھر اس ملک کے فارن ڈپارٹمنٹ کی عورتوں کے۔ اُسی طرح بھابھی جی سے بھی یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے دیش اور بدیش کے ڈپلومیٹس سے آزادانہ طور پر ملیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھائی صاحب اور ان میں جو اپناپن اور قربت ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی۔ ان کی آپسی زندگی عوامی زیادہ ہوتی چلی گئی...

یہ بات بہت دن بعد انیتہ نے بھابھی جی کا میرے نام ایک طویل تلخیوں بھرا خط پڑھ کر مجھے سمجھائی تھی۔ کچھ کچھ احساس مجھے بھی تھا، پھر بھی میرا دھیان بھابھی جی اور انیتہ کے تعلقات پر مرکوز تھا۔ جتنا میں اُسے بھلانے کی کوشش کرتی اتنا ہی وہ اور گہرا ہوتا جاتا۔ ایک دن جب ہم سب کہیں پکنک پر گئے تھے، بھابھی جی نے پرکھم کو انیتہ کی گود میں دے دیا، وہ تب ہنس رہا تھا۔ انھوں نے پیار سے پکارا، بار بار کلکاری بھری تو وہ کھل کھلایا کہ ہم سب قہقہہ لگا اٹھے تب بھابھی جی نے دھیرے سے کہا، "دیکھا! باپ کی گود میں کبھی نہیں کھل کھلاتا۔ سکار کبھی نکلتی ہی نہیں ان کے مُنہ سے...!"

بہت معمولی سا جملہ تھا، لیکن مجھے اندر تک چیر گیا۔ میں ان کی طرف خاموش دیکھتی رہ گئی۔ اپنے اندر اتنا درد چھپا رکھا ہے اس چنچل خاتون نے اور میں یہاں تک سوچ گئی کہ شاید پرکھم بھائی صاحب کے نہیں انیتہ کے صلب سے پیدا ہوا ہے...

نہیں... نہیں... نہیں...

اُس پل کہیں اپنی ہی نگاہ میں گنہگار بن گئی۔ تب کے بعد میں نے خود اعتمادی سے اس بارے میں سوچنے کا فیصلہ کیا لیکن بات پانی، ہوا اور روشنی سے بھی خوبرو اور سیتال ہوتی ہے۔ کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی ایک کالا سا بادل ہم دونوں کے درمیان آکر چلا جاتا تھا۔ ہم دونوں ہی ہمیشہ اُسے اَن دیکھا کر دیتے تھے لیکن... نہیں سوچوں گی اب اس 'لیکن' کے بارے میں...

اور تبھی سمندر کی طوفان سے پار نکالنے والے تشریف لے آئے۔ پتاجی کی نئی کتاب ابھی ابھی آئی تھی۔ اُسی کو پڑھنے میں مصروف تھی کہ دروازے کی گھنٹی گھن گھنا اٹھی۔ انیتہ کا تو ابھی

آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اور کون ہوگا۔ یہی سوچتی، جھلاتی دروازے پر آئی کہ دراز میں سے جھانکا۔ ایک اجنبی دکھائی دی۔ مشینی انداز میں دروازہ کھول دیا۔ بولی، "کہیے۔"

نوارد ایک دکنی خاتون تھی۔ سانولی سلونی۔ پیٹھ پر لہراتی کالی گھنی زلفیں۔ سادہ سی ساڑی۔ خوبصورت تو وہ نہیں تھی، لیکن آنکھوں میں ایک بے مثال کشش تھی۔ ایک لمحے میں سب کچھ سوچ گئی۔ نوارد نے نگاہ اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا، "آپ وبھا جی ہیں نا؟"

"جی... جی ہاں... آپ...؟"

"میں شیا ملا ہوں، اجیت جی نے آپ کا پتہ دیا تھا۔"

"ارے، تو تم ہو میرے بھیا کی شیاملا! آؤ، آؤ۔ اندر آؤ۔ آپ بھی آیئے۔" تب تک میں اپنے میں ڈوبے ایک طاقت ور سے سانولے نوجوان کو دیکھ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسا کچھ تھا جو اس پل مجھے اچھا نہیں لگا۔

پھر بھی میں بہت خوش تھی۔ وہ لوگ رس گلوں کا ایک ڈبہ اور کلکتیا سنگھاڑوں کا ایک پیکٹ لے آئے تھے۔ نندا سے فوراً چائے تیار کروائی۔ شیاملا بھی خود کو آزاد محسوس کر رہی تھی۔ بولی، "نہ جانے کون سے جنم کے رشتے تھے۔ اجیت جی سے تو ایسا رشتہ ہو گیا ہے ہمارے خاندان کا کہ زبان مختلف ہونے پر بھی ہم اپنے سے لگتے ہیں۔ آپ کے پتا جی تو مشہور ادیب ہیں۔ ہمارے صوبہ کے ایک پرانے مجاہد آزادی کو لے کر انھوں نے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ ہمارے یہاں وہ بہت معروف ہیں۔ اتنے بڑے ادیب کے خاندان سے رشتہ استوار کر ہم کتنے خوش ہیں، بتا نہیں سکتی۔"

میں دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ اتنا ہی پوچھا۔ "کہاں سے آ رہی ہو تم؟"

چمچے سے مونگ کی تلی دال مُنہ میں ڈالتے ہوئے شیاملا بولی، "دہلی میں ہندی ڈائرکٹوریٹ ہے۔ وہ کیمپ لگاتی ہے... نا... نا... لگایا ہے۔ ہندی کا جنس اب بھی میری سمجھ میں نہیں، نہیں آتی۔ اپنے کو مذکر اور اجیت جی کو مونث بنا دیتی ہوں..."

کہہ کر خوب ہنسی۔ تب اس کے شوہر ڈاکٹر نے کہا، "جب یہ اپنوں کے بیچ پہنچ جاتی ہے تو ہنستی رہتی ہے۔ کھاتی رہتی ہے یا سوتی رہتی ہے۔"

شیاملا اب بھی ہنسے جا رہی تھی ۔ "یہ ٹھیک کہتی ہے ۔ میں ایسا ہی ہوں۔"

پھر بھی اُس نے اپنے آپ کو سمیٹا، بولی، "اس کیمپ میں وہ لوگ آتے ہیں جن کی مادری زبان ہندی نہیں ہے اور وہ ہندی میں لکھنا چاہتے ہیں۔ ہندی کے کئی مشہور ادیب شاعری، کہانی، ناٹک کے بارے میں بھاشن دینے آتے ہیں۔ ہم پندرہ شخص تھیں، دس مرد پانچ عورتیں۔ کیمپ کے بعد میں نے سوچا جتنا دیکھ سکیں اتنا شمالی ہندستان دیکھ لیں تو اچھا ہو۔ تب اجیت جی نے سارے پروگرام بنا دیا اور سب جگہ رہنے کا انتظام بھی کروا دیا۔"

ڈاکٹر بولے، "آپ کے پتا جی کی وجہ سے یہ سب بڑی آسانی سے ہو گیا۔ کلکتہ میں اُن کے ایک دوست ہیں، ایک ہفتہ وار کے ایڈیٹر۔ بڑے آرام سے تین دن اُن کے دفتر میں رہے۔ انھوں نے بڑی خاطر مدارات کی۔"

شیاملا بولی، "وہاں سے یہاں آئے ہیں۔ تم تو میری بہن ہو۔ خاطر کرو گی ہی۔ کرو گی نا؟"

اور وہ پھر ہنس پڑی لیکن دوسرے ہی پل اچانک سنجیدہ ہو گئی، "پتہ نہیں کیا رشتہ ہے تم لوگوں سے، کس جنم کا، میں نہیں جانتی۔ جاننے کی ضرورت ہے کیا؟ ایک بار جڑ گئی، ہو گیا۔ میرا من ہی ایسا تھا۔ یہاں سے کاشی جائیں گے۔ وہاں بھی آپ کے پتا جی کے دوست ہیں۔ پریاگ میں تو سمیتا جی کے بھائی ہیں اور دہلی میں ہیں اجیت اور ان کے پتا جی۔ اچھا ہوتا سمیتا جی بھی ہوتیں۔ ان کا چرن چھونے کا بڑا من کر رہا ہے، ایسی معصوم دل والی عورت بہت کہاں ہیں؟"

نہ جانے کہاں سے بول رہی تھی شیاملا اپنی اٹپٹی، لیکن من کو چھو جانے والی زبان میں۔ میں کبھی جائے پینا بھول کر اس کے سانولے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ لوگ تین دن رہے۔ ہمارا گھر قہقہوں، اٹ پٹے مکالموں سے گونجتا رہا۔ شیاملا نے کہا تھا، "ہمارا تمہارا ملن سمندر اور ہمالیہ کا ملن ہے۔ ہمالیہ کا اونچائی اور سمندر کا گہرائی دونوں کے ملن سے بنا ہے ہمارا دیش۔"

شیاملا کو لے کر ہمارے ذہن میں ایک لمحے کو بھی نہیں لگا کہ وہ پرائی ہے، لیکن ڈاکٹر کو نہ تو ہم اپنا سمجھ سکے، نہ وہی ہم سے کھُل مل سکا۔ اُسے پینے کی عادت تھی...

میرے پوچھنے پر شیاملا نے اتنا ہی کہا، "میری قسمت دیدی!"

تین دن میں ہی اُس کی مدّتوں کی واقف دیدی بن گئی جس کے سامنے اس نے اپنا دل

کھول دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے انیتہ سے کہا، "شیاملا کتنی معصوم، کتنی پیاری لیکن اُسے جیون ساتھی ایسے کیوں ملے؟ پہلے نے کتنا ستایا! مجھے تو دوسرا بھی ٹھیک نہیں لگتا۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔ وہ تو شرابی ہے اور کچھ غیر متوازن بھی۔ ڈاکٹر ہے، اپنے پیشے کو جانتا بھی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کہیں ٹک سکے گا۔ ایک دن میں نے سُنا شیاملا اس سے کہہ رہی تھی، 'اگر آپ نے یہاں پی کر ہنگامہ کیا تو میں سچ کہتا ہوں میں گنگا میں ڈوب مروں گا۔ اسی لیے وہ برابر کوشش کرتا ہے کہ ہم سے باتیں کرے۔"

"کیا وہ یہاں بھی پیتا ہے؟"

"ہاں، شیاملا ساتھ جاتی ہے ٹھیکے تک۔ وہ پیئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔"

میں تو کانپ گئی منہ سے نکل گیا — "پربھو شیاملا کی حفاظت کریں۔ کیا کیا روپ ہیں انسان کے۔ مجھے تو لگتا ہے، ہر جگہ ہر گھر میں مسائل ہی مسائل ہیں۔ انھیں سے جوجھتے جوجھتے ہم ٹوٹ جاتے ہیں، شرافت اور سکون کا مکھوٹا لگائے۔"

"لیکن وبھا! مجھے لگتا ہے، راستہ ہے۔"

"کہاں ہے وہ راستہ؟ کہاں ہے؟ بولو..."

کہیں دور سے آرہے روشنی کی لہروں پر تیرتے لفظ ہوں جیسے، ویسے ہی انیتہ بول رہے تھے دھیرے دھیرے، "راستہ ہے اور ہے تو ملے گا بھی۔ ضرورت ہے بس خوف سے کشمکش سے الگ ہو جانے کی۔"

مجھے جیسے کسی نے ہپنوٹائز کر دیا ہو۔ میں نے اپنا سر انیتہ کے سینے پر رکھ دیا اور آنکھیں بھینچ لیں۔ اب تو ہپنوٹزم کو سائنس نے بھی قبول کر لیا ہے۔

اُن دونوں کو کاشی جانے والی گاڑی میں بٹھا کر لوٹی ہی تھی کہ دروازے پر ڈاکیے نے مجھے ایک رجسٹرڈ خط دیا۔ وہ اجیت بھیا کا تھا۔ تجسس سے وہیں کھڑے کھڑے اُسے کھول ڈالا۔ سمیتا نے جو طویل خط بھیا کو لکھا تھا اُسی کو مجھے اس نوٹ کے ساتھ بھیجا تھا، "حالانکہ یہ خط میرے نام ہے لیکن تمھارے لیے بھی اِسے پڑھ لینا ضروری ہے۔ اس کا مجھ پر کیا ردّ عمل ہوا، تم سوچ سکو گی یا نہیں، میں نہیں

جاننا۔ انیتہ کو بھی پڑھوا دینا۔ ابھی اتنا ہی:

خط تھا یا پورا مضمون ویسے ہی لیے لیے اندر آئی۔ انیتہ کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ نندا کسی بھی وقت آسکتی تھی۔ آنے دو اُسے۔ چائے وہی بنا دے گی۔ میں نے کمرے میں جاکر کھڑکیاں کھول دیں۔ غروب ہوتے سورج کی کرنیں مسلسل شانت ہو رہی تھیں۔ آکاش میں بارش کے بادل گھرتے آرہے تھے۔ پانی پڑنا کب شروع ہوا، مجھے نہیں معلوم۔ کھڑکیوں سے آتی بھیگی بھیگی ہوا کی مہک بھی مجھے اس طرف مخاطب نہ کرسکی۔ نندا کے آنے پر ہی میں اٹھی۔ فوراً دروازہ کھولا اور پھر پڑھنے لگی۔ بارش تھمی، دھیمی، لیکن سب کچھ کو اندر تک شرابور کرنے والی تھی۔ نندا چائے رکھ گئی اور جاتے ہوئے کہہ گئی — "بی بی جی! آج کی بارش دھرتی کی پیاس بجھانے والی ہے۔"

میں نے اسے دیکھا، پیالہ اٹھاکر چائے کی چُسکی لی، پھر پڑھنے لگی۔ بیچ بیچ میں میرے ذہن پر مختلف رنگ ابھرے — استعجاب، مذمت، نفرت اور تجسس سے پاگل ہونے کی حد تک۔ لیکن جب پڑھ چکی تو سب کچھ سے گزر کر میرا سر بھابھی کی اس مورتی کے سامنے جھک گیا جو ابھی میرے ذہن کی فضا پر ابھری تھی، ایک خاتون کی مورتی جو ایک ساتھ آزاد اور شاندار، ایک ساتھ پیار سے چھلچھلاتی اور اپنی پہچان کے لیے بیدار، ایک ساتھ ممتا کی مورتی اور محبت کی بت، ایک ساتھ اچھی ساتھی اور خوش...

اس کیفیت کی تشریح کوئی ایک لفظ کرسکتا ہے کیا؟ لفظ کبھی کچھ جذبوں کو بیان نہیں کرسکتے۔ انھیں تو صرف محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ بھابھی وہ خط لکھتے وقت کیسی آزاد ہو گئی ہوں گی، اس کا تصور کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا، کیونکہ میں گواہ ہوں ان لمحوں کی جب وہ اس اذیت سے گزر رہی تھیں اور میں تب مَن ہی مَن ان سے نفرت کرتی رہی تھی اور اب وہی میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتی ہوں کہ وہی یہ خط لکھ سکتی تھیں۔

سُمیتا کا خط اجیت کے نام

میری جان!

اس دن مجھ سے چوک ہو گئی — وہ نہیں لکھ سکی جو لکھنا چاہ رہی تھی۔ سوچا پڑھ کر تمھیں تکلیف

ہو سکتی ہے۔ عدم اعتماد کیا نا میں نے تمہارا۔ یہی عدم اعتماد تو رشتوں کو جھوٹا اور سطحی بناتا ہے۔

میں نے تمہیں لکھا تھا نا کہ اس سنگیت کے پروگرام کے بعد میں بے ہوش سی ہو گئی تھی۔ ہوش آنے پر بھی کئی دن نارمل نہیں ہو پائی تھی، لیکن اندر ہی اندر غور و فکر چل رہا تھا۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا، خود اپنے کو حیران کرتی میں ساتویں دن اس نیگرو نوجوان ڈیوڈ کے پاس پہنچی، بولی، "اُس دن کے حادثے کے لیے شرمندہ ہوں۔ اپنے اپنے سنسکار ہوتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے اچانک گھبرا گئی تھی۔ ایک بار پھر معافی چاہتی ہوں۔ اور ہاں، پرسوں ہم ایک سنگیت کی محفل کا انعقاد کر رہے ہیں۔ وہ محفل میرے کمرے میں ہوگی۔ آپ ضرور آئیے اور اس میں حصہ لیجیے۔ میری گزارش ہے۔ انکار مت کیجیے، ورنہ میں سمجھوں گی آپ مجھ سے ناراض ہیں۔"

غیر یقینی سے نگاہ اٹھا کر ڈیوڈ نے میری طرف دیکھا۔ کئی پل دیکھتا رہا۔ میں جانتی ہوں، اُس لمحے چیتے کی طرح حملہ کرنے کے موڈ میں تھا، لیکن میری آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ اس نے نگاہ جھکا لی۔ بولا، "آپ کی تقریب میں حصہ لے کر مجھے خوشی ہوگی۔"

میں نے خوشی بھرے لہجے میں شکریہ ادا کیا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی۔ ہماری نگاہ میں وہ لوگ خوبصورت نہیں کہے جا سکتے، لیکن ان کی جسامت، ان کی الھڑ ہنسی، سب کچھ معصوم ہے اور ان کی موسیقی میں ایسی دلکشی ہے کہ جی کرتا ہے کہ بس سنتے ہی رہیں، سنتے ہی رہیں۔

اجیت! تم کچھ ایسا ویسا تو نہیں سوچ رہے! سچ مچ میں یہاں آ کر بہت ہی باتونی اور صاف کہنے والی ہو گئی ہوں۔ ایسا ہی ہونا چاہیے نا! ہاں کبھی کبھی ڈپلومیسی کا سہارا بھی لینا پڑ سکتا ہے، لیکن اس پڑ سکنے کے یہ معنی تو نہیں کہ ہر وقت مکھوٹے لگائے رکھو۔

اجیت! میں نے ڈیوڈ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ بہت پڑھا ہے۔ دنیا کے بہت بڑے حصے میں پھیلے پڑے ہیں یہ لوگ۔ ان میں بڑے بڑے حکمراں ہیں۔ عوامی لیڈر رہیں، دوسرے میدانوں میں بھی ذہانت نے ان کا انتخاب کیا ہے۔ ان عظیم شخصیتوں میں مارٹن لوتھر کنگ اور نلسن منڈیلا جیسے مرد آہن بھی ہیں۔ انھوں نے سہا بھی بہت کچھ ہے۔ اپنے ہی ملک میں گوروں کے غلام رہے ہیں اور ہیں۔ جہالت، لاعلمی اور غیر انسانی سنسکاروں میں بھی یہ

لوگ ٹھہرے پڑے ہیں۔ اُس تاریکی سے باہر نکلنے کے لیے پہلے انھیں غلامی سے آزاد ہونا ہوگا۔

لو، میں پھر بھاشن دینے لگی، بس ایک بات اور کہہ دوں۔ ہمارے سنسکاروں میں ممانعت ہی ممانعت، بندھن ہی بندھن کیوں ہے یہ سب کبھی کھلے ذہن سے سوچا ہے تم نے؟ میں تو ہمیشہ اسی نقطے پر سوچتی رہی ہوں۔

اور جانتے ہو اس عمل میں کیا ہوا؟ چونکنا مت اور مجھ سے نفرت کبھی نہ کرنا۔ اپنے آپ کو بہت سنا چکے ہو۔ اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ انھیں پہچان کر ایک بار تو میں بھی چونک پڑی تھی۔ اچانک وہ دونوں میرے ذہن کے پردے پر ویسے ہی مستی میں آ کھڑے ہوئے۔ وہی دو کالے کالے اکھڑ نوجوان، وہ شہدے، جنھوں نے تمھاری اسکوٹر ٹھیک کی تھی اور اجرت میں دو بجا اور مجھ میں سے ایک کو مانگا تھا۔ وہی دونوں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ تعجب! میں نہ ڈری نہ کانپی، بس انھیں دیکھتی رہی اور سوچتی رہی ــ انھوں نے کیوں کیا میرے ساتھ ایسا، کیوں؟

پہلے اس طرح نہیں سوچ سکی تھی۔ ممنوعات سے گھری تھی اور اسی لیے احساس گناہ سے مظلوم تھی۔ ویسا گھائل تن من لے کر کیا سوچتی، لیکن اب میری راہ میں کچھ بھی نہیں تھا، اس لیے سوچتے سوچتے وہ الفاظ یاد آئے جو اُن میں سے ایک نے کہے تھے۔ اس دردناک اذیت اور تکلیف کے بیچ جو اس جب لوٹنے لگا تو محسوس ہوا کہ کوئی میرے منہ میں پانی ڈال رہا ہے۔ تب سنا تھا میں نے جیسے ہزاروں میل دور سے آکر کچھ لفظ زخمی تن من کو چیر رہے ہیں۔

"گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے اب اس کا؟"

جس نے یہ الفاظ کہے تھے وہ زور سے ہنسا تھا۔ کیسی خوفناک تھی وہ ہنسی اور اسی درمیان اتنے ہی خوفناک اس کے ساتھی کے یہ الفاظ "میں اسے مار کر شہید بنا دوں! نہیں، نہیں، یہ زندہ رہے گی اور تڑپے گی گرم ریت پر مچھلی کی طرح۔ مجھے انتقام لینا ہے ان سفید پوشوں سے ..."

میں پھر ہوش کھو بیٹھی تھی لیکن وہ الفاظ ... اجیت! یہ تو میرے الفاظ ہیں۔ اس نے تو جو کہا تھا وہ ایک ممنوعات اور بندھنوں کے بیچ جینے والا ہی کہہ سکتا ہے ... میں جو کہنا چاہ رہی ہوں تم سے وہ یہی ہے کہ میں انھیں اپنے ذہن کے پردے پر دیکھ کر ڈری نہیں، اپنے سے نفرت بھی نہیں کی۔ مجھے لگا اجیت کہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ صرف ہوس کا کھیل نہیں تھا۔ ہوس تو صرف

بدلہ لینے کا بہانہ تھا۔ ہاں اس کی جڑ میں اس وحشیانہ عمل کے پیچھے انتقام لینے کی خواہش بھی خوشحال اور برسر اقتدار طبقے سے انتقام لینے کی خواہش۔

کیا دنیا کی تاریخ مختلف شکل کے برسر اقتدار طبقہ کے ذریعہ غیر اقتدار طبقہ کی عورتوں پر کیے جانے والے وحشیانہ اور دردناک ظلموں کی دل دکھا دینے والی کہانیوں سے نہیں بھری پڑی ہے؟ کیا فاتح نے مفتوح ذات کی عورتوں کو صرف قابل استعمال ہی نہیں مانا ہے؟ شاستروں کی تخلیق کرنے والے رشیوں نے 'ویر بھوگیا وسندھرا' کہہ کر انھیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی ہے کیا؟ عورت وسندھرا ہے اور وسندھرا مرد کی جاگیر ہے۔ اس لیے عورت بھی جاگیر ہے۔ مرد ہی تو خالق کی سب سے اہم تخلیق ہے، عورت کو جگدمبا، رن چنڈی، شاردا، سرسوتی، لکشمی، اَن پُرنا — کیا کیا کہہ کر نہیں لبھایا؟ لیکن بالآخر مرد کو بیوی کا 'پتی پرمیشور' بناکر اسے صرف ایک چیز بنا دیا۔ اُسی لیے تو ہر زمانے میں سمراٹوں اور شہنشاہوں، سامنتوں اور سرداروں کے قلعے، حرم اور محل انھیں بے زبان انسانوں سے بھرے رہے ہیں۔ بازار بھی انھیں سے سجا ہوا ہے۔ اب اگر ان مظلوم اور ستائے ہوئے طبقہ کے لوگوں میں انتقام لینے کی خواہش جاگ گئی ہے تو کیا ہم انھیں الزام دے سکیں گے؟

مانتی ہوں ردّعمل مسئلہ کا حل نہیں ہے، لیکن کیا کبھی حکمرانوں کے عالموں کو انھیں یہ بات سمجھنے کا موقعہ دیا ہے؟ ہمارا سارا سماج غیر مساوی اور یک طرفہ قاعدے قانون سے بھرا پڑا ہے۔ سچ کہنا اجیت، کیا تم ایسا نہیں سمجھتے کہ پرانے آئین، پرانی کتابیں آج کے حوالے سے بے معنی ہو رہی ہیں؟ کیا اب نئی کتابوں اور نئے آئین کی ضرورت نہیں ہے؟

کہاں سے کہاں پہنچ گئی میں۔ جذبات کے ابلتے، امنڈتے دھارے میں بہہ گئی۔ اچھا اب ڈیوڈ کی کہانی پر لوٹوں۔ اس رات خوب گانا بجانا ہوا۔ ہم ناچے بھی۔ ڈیوڈ نے مجھے بھی کھینچ لیا۔ لیکن میں تو ایک دم اناڑی تھی۔ پہلے لمحے تو جھجکی ڈری، لیکن دوسری ہی پل نرم آواز میں کہا، "میں آپ کی طرح ناچنا نہیں جانتی، لیکن ہم اپنا ناچ ضرور آپ کے سامنے پیش کریں گے۔"

"ہاں، ہاں، اس نے مستی میں کہا" ناچو، ناچو!"

ہمارے گروپ میں شری لنکا، پاکستان اور بنگلہ دیش کی بھی ایک ایک خاتون تھی، شری لنکا

کی ہیما سینا نائکے نے بھرت ناٹیم پیش کر کے سب کو مسحور کر دیا۔ ہم چاروں ڈھولک کی تھاپ پر جو تھرکیں تو سماں بندھ گیا۔ ڈینش خاتون اور نیگرو نوجوانوں نے روک اینڈ رول پیش کیا۔ چینی خاتون کی عمر زیادہ تھی، لیکن ناچتے وقت جیسے اُس کی جوانی لوٹ آئی تھی۔

پینے کے لیے بیر کی اجازت تھی۔ کھانا بھارت برصغیر اور شری لنکا کی عورتوں نے تیار کیا تھا، سبھی نے اُسے سراہا لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ ڈیوڈ کا ساتھی اور ڈینش خاتون شراب نہ ہونے کی وجہ سے بے چین تھے، اس لیے سب سے پہلے وہ ہی معافی مانگ کر چلے گئے۔ چینی خاتون امریکہ کے ہی ایک مرد کے ساتھ چلی گئی اپنے ہوٹل۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کی ہم جماعت لڑکیاں بھی مسکان بکھیرتی چلی گئیں۔ وہ کچھ کچھ خوف زدہ تھیں۔ یہ بات شری لنکا کی ہیما سینا نائکے نے میرے کان میں کہی۔

میں نے مسکرا کر پوچھا، "تمھارا کیا حال ہے؟"

"مجھے کوئی ڈر نہیں۔ ان دنوں میرے شوہر یہاں ہیں۔ ان کا ہوٹل پاس ہی ہے۔"

"میں بھی چلوں وہاں تک۔ ڈیوڈ وہیں رہتے ہیں۔ وہ بھی چلیں گے اور ساتھ لوٹ جائیں گے۔"

ہیما نے مسکرا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں نے آہستہ سے لیکن پُراعتماد لہجے میں کہا، "مجھے میری مرضی کے خلاف کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔"

لوٹتے وقت گہری ہوتی رات میں اپنے قدموں کی آواز سنتے ہم دو ہی تھے، کبھی کبھی پاس سے گزرتے کاروں کی روشنی میں بڑھتی گھٹتی اپنی ہی پرچھائیوں پر مسکراتے۔ ڈیوڈ بالکل سٹ کر چل رہا تھا۔ کسی بھی لمحے وہ میری بانہہ کو سمیٹ سکتا تھا، لیکن ہم باتیں بھی تو کر رہے تھے۔

اس نے کہا، "کیا تمھیں میرے کمرے میں چلنے میں کوئی اعتراض ہے؟"

"ہاں اس وقت تو میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"تم جانتے ہو پھر کیوں پوچھتے ہو؟"

"اس ممانعت سے نجات نہیں پا سکتیں؟"

"وہ صرف ممانعت کا سوال نہیں ہے ڈیوڈ۔ میرے 'میرے' ہونے کا سوال بھی ہے۔"

"یہ 'میرا' ! وہ کیا ہے۔"

میں ہنس پڑی " مجھے اپنے کمرے میں بلاتے سے قبل کیا تم یہ نہیں جاننا چاہو گے کہ میری ویسی خواہش ہے کہ نہیں؟"

"عورت ایسے بلاوے کبھی رد نہیں کرتی۔ کر ہی نہیں سکتی۔"

"صرف تمھاری ذات میں یا ہر جگہ؟"

وہ جھجکا، پھر بولا " مجھے لگتا ہے عورت اگر عورت ہے تو مرد کی دعوت کو قبول کرے گی ہی۔"

"پھر وہی قبل قیاس۔ میں نہیں قبول کر سکتی تمھاری دعوت کو۔ میری خواہش پر کوئی دوسرا اپنی خواہش لادے، یہ کیا ناانصافی نہیں ہے؟"

وہ کئی پل چپ چاپ چلتا رہا۔ پھر بولا، "میں نہیں سمجھتا، تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمھارے سماج میں..."

میں نے فوراً بات کاٹ دی ــ "میرے سماج کی بات جانے دیجیے۔ بتائیے کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

"ہاں، ہو چکی ہے، دو بیٹیاں ہیں ہماری۔"

"اگر اس وقت میری جگہ پر تمھاری بیوی ہو اور تمھاری جگہ پر میرے شوہر، تو کیا تم اُسے برداشت کر سکو گے؟"

"کیوں نہیں برداشت کر سکوں گا؟"

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ کوئی بھی شوہر کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ اور کوئی بھی بیوی کسی دوسرے کے شوہر کے ساتھ جب چاہے رہ سکتے ہیں۔"

"ہاں، اس میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر شادی کے نظام کی کیا ضرورت ہے؟"

"کوئی ضرورت نہیں۔ آج کے وقت میں ویسے بھی یہ رواج اپنی معنویت کھو بیٹھا ہے۔"

"میں آپ سے متفق ہوں لیکن ایک حد تک، پھر سماج کا کیا ہوگا؟ کیا ہوگا اُن ان گنت تنظیموں کا جن کے چلن کے لیے قاعدے اور قانون کی ضرورت ہوتی ہے؟ آپ کی کلپنا کا سماج

ایک لاقانون سماج ہوگا، جہاں جو طاقت ور ہے وہی من مانی کرے گا۔ وہی سبھی حسیناؤں کو اپنے حرم میں داخل کرے گا۔ وہی کچھ ہوگا جو صدیوں قبل آدم سماج میں ہوتا تھا اور جس کی آخری منزل زمانہ، غار ہے۔ یعنی اکیسویں صدی کے کمپیوٹر اور الکٹرانک دور کا تصور کرتے کرتے ہم پہنچ جائیں گے ما قبل تاریخی پتھر کے دور میں۔ اور خلا پر فتحیابی کے ہمارے خواب اور ارادوں کی جنین کشی ہو جائے گی۔"

میں جوش میں بولے جا رہی تھی، خود کو ہی زخمی کرتی۔ ڈیوڈ کو لگ رہا تھا جیسے وہ کثیف دھند سے گھرتا آ رہا ہے۔ اس سے بچنے کی کوشش میں صرف چھٹ پٹاہٹ ہی ہاتھ لگتی ہے۔ کافی دیر بعد وہ کہتا ہے، "میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا، لیکن اس کی خلاف ورزی کر سکوں ایسی دلیل بھی نہیں سوچ رہی۔ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ سے مل کر مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ کی باتیں آپ کے دل سے نکل کر آتی ہیں۔ اُس میں جوہر ہے، شاید کسی دن میں سمجھ سکوں۔"

اور اس نے بڑی محبت کے ساتھ میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے، انھیں چوما اور پھر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں کئی پل اُسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کے اس برتاؤ سے میں مان لوں گی کہ میں بھی مسحور تھی لیکن میں نے ایک لڑائی جیت لی ہے۔ یہ کیا کم فخر کی بات ہے۔

لیکن اجیت! کیا تم یہ نہیں مانو گے کہ اس طرح جینا کتنا مشکل ہے اور لکشمن ریکھائیں کھینچنا جنھیں توڑنے کے لیے ہزاروں راون ہر پل تیار بیٹھے رہتے ہیں؟

جو بھی ہو، آج یہ سب لکھ کر بوجھ ہلکا ہو گیا۔

شیا ملا کا کیا حال ہے؟ اُس نے شادی کر لی نا؟ مجھے ساری باتیں لکھنا۔ پتا جی کو میں لکھتی رہتی ہوں۔ ان کی ایک کتاب کا تبصرہ ایک رسالہ میں چھپا ہے۔ میں نے ایک کاپی انھیں بھیج دی ہے۔

مکرر!

رات نیند نے گھیر لیا اور خط ادھورا ہی چھوڑ کر سو گئی۔ صبح دیر سے اٹھی۔ روزمرہ سے فارغ ہو کر سوچا، کام پر جاتے وقت خط بھی لے چلوں گی۔ اس لیے پورا کرتے بیٹھی کہ دروازے کی گھنٹی کرنگ کرنگ کر اٹھی۔ کون ہے، ڈیوڈ ہے کیا؟ سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ لونارائن بھیا

میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں سچ مچ چلا کر اُن سے چمٹ گئی، "آپ بھائی صاحب! آپ کہاں سے نازل ہو گئے اس وقت، نہ خط، نہ تار، نہ۔۔۔!"

وہ تو اعلان شدہ مجذوب ہیں، بولے، "پردیس میں کسی کو حیران کرنے کا اپنا لطف ہے۔"

"بھائی صاحب، بتا نہیں سکتی، کتنی خوشی ہوئی آپ کو اچانک یہاں دیکھ کر، ویسے اجیت نے مجھے تنبیہ کر دی تھی کہ نارائن بھائی صاحب تمھیں تنگ کرنے آ سکتے ہیں کسی نہ کسی دن۔"

"تو ہم تنگ کرنے آئے ہیں تمھیں؟"

"ارے بھائی صاحب! تمھارے جیسا کوئی ہو تو کسی کو تنگ کرنے کو۔"

نارائن ہنسے، "کسی اور کو تنگ کرنا ہے کیا، لیکن پہلے کچھ چائے وائے ہو جائے۔"

"دونوں ہیں، کیا پئیں گے، وائے؟"

"رہنے دو ابھی اُسے، پہلے چائے ہی پلا دو۔ میں زیادہ رک نہیں سکتا۔ شام کی فلائٹ سے نیویارک، پھر وہاں سے واشنگٹن پہنچنا ہے۔"

"شام تک ہیں آپ میرے پاس۔ یہاں کس کے پاس اتنا وقت ہے؟"

چائے کی چسکی کے ساتھ ملک کی خبریں سنیما کے اسکرین کی طرح چل رہی تھیں کہ نارائن صاحب بول اُٹھے، "ارے ہاں، سُنا ہے تو اجیت سے طلاق لے رہی ہے۔ دیکھ اس معاملے میں میں تیرے ساتھ ہوں۔"

میں نے کھٹ سے پیالہ رکھ دیا۔ اس کے لیے میں تیار نہیں تھی۔ پوچھا، "طلاق کس نے کہا آپ سے؟"

"سارے گھر میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ میں تو صاف آدمی ہوں، ونیکا کو ساتھ لے کر اجیت کے پاس پہنچ گیا۔ پوچھ لیا، "تم سمیتا کو طلاق دے رہے ہو یا سمیتا تمھیں؟" یکبارگی دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آئے ایک جائے۔ آخر بولا، "بھائی صاحب، آپ شوہر بیوی کے درمیان آنے کی کوشش نہ کریں۔ مجھے اکیلے لڑنے دو اپنے آپ سے،" الفاظ کچھ سخت تھے، لیکن ہمیں بہت اچھے لگے۔ اچھا، میں بھابھی سے بات کر لوں؟"

"بولا، "وہ تم دونوں کے بیچ کا مسئلہ ہے۔ تم جانو تمھاری بھابھی جانیں۔" تو اب تمھیں جتنے سخت

الفاظ کہنے ہیں کہہ ڈالو۔"

اب مجھے ہنسی آگئی، بولی، "بھائی صاحب! جب وہ اکیلے لڑنا چاہتے ہیں تو میں کیوں پریشان ہوں؟"

"سُن کر بہت لطف آیا۔ اب میں تروتازہ ہوں۔ ایک بوجھ سر سے اتر گیا۔ اسی خوشی میں لنچ کہیں باہر کریں گے۔"

وہ سویرے آٹھ بجے آئے تھے اور شام چھ بجے ٹیکسی لے کر ایئرپورٹ چلے گئے۔ بیچ کے دس گھنٹے کہاں سے آکر کہاں چلے گئے، پتہ ہی نہیں چلا۔ کل کی رات سنگیت میں ڈوب گئی تھی۔ آج کا دن قہقہوں میں، سکھ بھی کبھی کبھی دبے پاؤں چلا آتا ہے۔ لیکن اس سب کے درمیان تناؤ بھرے لمحے کتنا کچھ کہہ گیے، وہ کیا کم حصولیابی ہے۔

تو اس طرح یہ خط ایک دن دیر سے جا رہا ہے۔ کل کی طرح سونے سے پہلے ہی اسے پورا کر رہی ہوں۔ نیند آ رہی ہے، لیکن آج اسے ڈاک میں ڈال کر ہی سوؤں گی۔

اچھا اجیت، میرے پیارے، خوب اطمینان سے سوؤ۔ میری طرف سے ذرا بھی پریشان نہ ہونا۔ ساری باتیں لکھنا۔

بہت بہت پیار کے ساتھ

تمھاری اپنی
سمی

جانتے ہو، کتنی بار میں نے اس خط کو چوما ہے۔
—— سمی

حصّہ دو

سماجی سوچ

وہ کسٹم سے باہر آنے تک قدرے پرسکون تھی۔ لیکن ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اندر کی کشمکش پھر سے تیز ہوگئی۔ اجیت اُسے دیکھ کر بھونچکا رہ جائے گا۔ آنکھیں ملتے ہوئے وہ پوچھے گا۔ تم!! تم سمیتا ہی ہو نا!

وہ بناوٹی غصّے سے کہے گی، "تمھیں شک ہے کیا...!"

اور وہ آگے بڑھ کر اُسے اپنی باہوں میں بھینچ لے گی اور اس کے بعد... اس کے بعد...

اس کا سر پیچھے ٹک گیا تھا اور وہ نہ جانے خوابوں کی کس دنیا میں بھٹک گئی تھی۔ وہاں الفاظ نہیں تھے، ایک ترنگ، مدہوش کن احساس تھا بس۔

لیکن اجیت گھر پر نہ ہوا تو... ہوگا کیوں نہیں؟ کیا ہوا، میں چار دن پہلے آ گئی ہوں۔ چار دن بعد وہ مجھے ہوائی اڈے پر ملتا...

اچانک اس نے آنکھیں کھول کر ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا، "سردار جی، ہم کہاں ہیں؟"

"دھولا کنواں آگیا ہے، بٹیا!"

وہ جیسے اپنے سے ہی کہتی ہو، "بس، دھولا کنواں! ٹیکسی کی رفتار اتنی دھیمی کیوں ہے؟ وقت اتنا دھیرے دھیرے کیوں گزر رہا ہے؟"

اس نے اپنا سر پیچھے ٹکا لیا۔ آنکھیں بھینچ لیں۔ لیکن آنکھیں بھینچ لینے سے ذہن تھوڑے ہی پُرسکون ہو جاتا ہے۔ دل پہنچ گیا گھر کے دروازے۔ سب حیران ہیں۔ انکت بھی اُنیندی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور پہچاننے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ "تم میری ممّی ہو نا!"

اور پتا جی کہہ رہے ہیں۔ "تمھیں تو جمعرات کو آنا تھا، لیکن لگتا ہے من نہیں مانا۔ ایسا ہی ہوتا ہے، بیٹی۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔"

اور وہ کھل کھلا پڑتے ہیں۔
سر دکائے ڈکائے اُسے بھی ہنسی آ جاتی ہے۔ تب گاڑی بہ نسبت اندھیرے میں سے گزر رہی تھی۔ بیچ بیچ میں بتیاں چمکتیں اور اس کے چہرے کو روشن کر دیتیں۔ تبھی اچانک روشنی کا سمندر جیسے اندر داخل ہو گیا ہو۔ لمبی کر پیچ کر پیچ کے بعد ٹیکسی رُک گئی تھی۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ گھنے کہرے سے گھرا اندھیرا پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ سامنے سرخ نشان ہے اور وہ مختلف طرح کی گاڑیوں سے گھرا ہے...

اوہ! یہ سفر تو نیویارک سے دہلی تک کے سفر سے بھی لمبا ہو گیا۔ زمانہ بیت گیا جیسے ہوائی اڈہ چھوڑے۔ تبھی سردار جی بولے — "پہنچ گئے گرین پارک۔ کیا نمبر بتایا تھا تم نے؟"

"۱۱۔ سی لین — تین۔"

ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ تیسرے لین میں مڑی۔ سب کچھ شانت، سنّاٹا۔ دھندلی روشنی سے گھرا جانا پہچانا ماحول۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ اُس نے اتاولی آواز میں کہا، "بس یہی تو ہے۔ روک دیجیے یہیں۔"

ٹیکسی کے رکتے ہی وہ تیزی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی اور آگے بڑھ کر اپنے گھر کی گھنٹی زور زور سے بجانے لگی۔ پھر دو نوٹ نکالے۔ "لیجیے سردار جی... ٹیکسی کے اور دس روپے بچوں کے لیے میری طرف سے۔"

سردار جی سارا سامان دروازے کے پاس رکھ چکے تھے۔ پیسے لے کر ایک بار سُمیتا کی طرف دیکھا — پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔ دو پل بعد گاڑی اسٹارٹ کی، آگے جا کر موڑا۔ ایک لمحے کے لیے پھر گیٹ پر رُکے، بولے، "ست سری اکال، بیٹیا۔"

سُمیتا کئی پل جاتی ٹیکسی دیکھتی رہی۔ انتظار کرتی رہی — اندر آہٹ ہو، دروازہ کھلے۔ لیکن سب کچھ پہلے جیسا پرسکون، خاموش۔ جھنجھلا کر اُس نے گھنٹی کو زور سے دبایا۔ دباتی رہی بار بار۔ تب کہیں جا کر اندر کھٹ کھٹ ہوئی۔ پتاجی کی مانوس آواز کانوں میں پڑی — "آتے ہیں، بھائی۔"

دو پل بعد دروازہ کھلا۔ پتاجی نے سُمیتا کو دیکھا۔ حیرانی سے آنکھیں ملیں، "کون سُمی بیٹی!!"

تب تک سمیتا نے جھک کر اُن کے پاؤں چھو لیے تھے۔ بولی ــ "جی پتاجی، میں ہی ہوں۔"

"لیکن تم تو جمعرات کو آنے والی تھیں نا۔"

"جی ہاں، اُسی دن آنا تھا، لیکن ٹھیک وقت پر افسروں نے بتایا کہ میں لوٹتے ہوئے لندن نہیں رک سکتی۔ سیدھے بھارت جانا ہوگا، اس لیے آج ہی آنا پڑا۔"

وہ اپنی کہانی سنا رہی تھی اور سامان اندر رکھتی جا رہی تھی۔ منع کرتے ہوئے بھی پتاجی نے چھوٹی چھوٹی چیزیں اُٹھا لیں۔ لین اُسی طرح دھندلی روشنی میں سوتی رہی۔ بس، سامنے کے مکان میں اوپر کی منزل سے ایک بار روشنی کی کچھ لکیریں ان پر پڑیں۔ گھنٹی کے بار بار بجنے پر پڑوسی کی بالکنی سے کسی نے ایک بار جھانکا۔ سمیتا نے دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس کے اندر بھیانک طوفان امڈ رہا تھا۔ چٹخنی لگاتے ہوئے پوچھا، "گھر میں کوئی نہیں ہے کیا؟ اجیت کہاں ہیں؟ انکت کیسا ہے؟"

"سب ہیں اور سب ٹھیک ہیں۔ ایسا ہوا بیٹی کہ وہ نروینیدرم سے شیاملا آگئی تجھ سے ملنے۔ پچھلی بار آئی تھی تو تُو نہیں تھی۔ ابھاگن ہے بے چاری۔ دوسرا شوہر بھی چھوڑ گیا اُسے۔ اسی کو لے کر اجیت سنیما چلا گیا ہے۔ انکت کو تو وہ بہت پیار کرتی ہے۔ جیسے اُسی کا بیٹا ہو...۔"

آگے انھوں نے کچھ نہیں کہا لیکن اچانک ایک خیال کوندھ گیا ــ لیکن ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا، بیٹا تو جننی کا ہی ہوتا ہے، لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ماں کی ذات کی ہو جو سب کے جائے کو پیار کرتی ہے۔ کچھ بھی ہو، لیکن یہ حقیقت اس بات کو ضرور ثابت کرتی ہے کہ جننی بننے کی شدید خواہش ہے اُس میں... پھر اچانک چونک اُٹھے وہ اور اپنے کو مقدور بھر پرسکون کرتے ہوئے بولے، "ہاں، کیا بج گیا؟ پون بج رہا ہے۔"

"جی۔"

"بس اتنے ہی ہول گے۔"

سمیتا کچھ سمجھی اور کچھ نہیں سمجھی، کیونکہ تب دو حصوں میں بنٹ چکی تھی۔ وہ پتاجی کو اپنے سفر کی روداد سُنا رہی تھی، لیکن باطن تلخ دھنویں سے گھٹتا جا رہا تھا۔ کیسی خوشی اور مسرت سے ڈوبی اپنے گھر لوٹی تھی۔ اُس نے کیا کیا نہیں سوچ ڈالا تھا۔ لیکن جو اُس کی خوشی اور مسرت کی بنیاد تھا۔

وہ تو سینما ہال میں بیٹھا تھا شیاملا کے ساتھ۔

اندر سے ہی کسی نے جواب دیا۔ تو کیا ہوا، اگر ایک دکھیا کو تسلی دیتے وہ چلا گیا۔ پھر اُسے کیا پتہ تھا کہ تم آج آ رہی ہو؟

لیکن . . .

اچانک وہ نیچے سے اوپر تک کانپ اُٹھی ۔ نہیں، نہیں، نہیں کوئی لیکن نہیں۔ میں بھی تو وہاں . . .

اتفاق سے تب پتاجی باتھ روم چلے گئے تھے۔ لوٹ کر بولے۔ "بیٹی، اپنے لیے کافی بنا لو نا، لمبے سفر کے بعد تھک گئی ہو گی۔"

سمیتا چونک پڑی۔ "کیا کہا آپ نے . . . کافی؟ ہاں، ہاں ابھی بناتی ہوں۔ آپ لیں گے نا؟"

"کیوں نہیں لوں گا؟ اتنے دن بعد تیرے ہاتھ کی کافی . . ."

سمیتا نے بیچ میں ٹوک دیا "چاکلیٹ لائی ہوں، لیں گے؟"

"لوں گا، لوں گا کیوں نہیں . . ." کھل کھلا پڑے پتاجی۔ "انکت اور مجھ میں اب فرق ہی کیا رہ گیا ہے۔"

سمیتا نے فوراً جواب دیا۔ "مکمل مرد بچے جیسے معصوم نہیں ہو جاتے کیا، پتاجی؟"

لمحے بھر خاموش رہ کر پتاجی کھل اُٹھے، بولے۔ "سچ ہے بیٹی، یہ ایک دم سچ ہے لیکن میں مکمل مرد کہاں ہوں؟"

"اسی لیے اتنے بچے بھی نہیں ہیں؟" کہہ کر فوراً اس نے زبان کاٹ لی۔ اور فوراً ایک پلیٹ میں ڈھیر سارے چاکلیٹ لے آئی۔ پھر اندر کی کشمکش کو پیچھے دھکیل کر ایسے کام کرنے لگی جیسے کہیں گئی ہی نا ہو۔ گیس پہ پانی رکھ دیا۔ کافی وہ امریکہ سے لائی تھی۔ بولی۔ "امریکی کافی پلاؤں گی آپ کو . . ."

تبھی سب کچھ ختم گیا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ مشینی انداز سے دوڑی اور تیزی سے دروازہ کھول دیا اور ادا سے سر جھکا کر بولی۔ "خوش آمدید حضور، تشریف لائیے۔"

اجیت کو لگا جیسے اُس پل ساری کائنات انچاس پون کے ساتھ گھومنے لگی ہے۔ گھومتی جا رہی ہے۔ وہ نہ کچھ دیکھ پا رہا ہے، نہ کچھ سُن پا رہا ہے۔ دور کہیں بہت دور سے آتی مانوس سی آواز اُسے

بیدار کر رہی ہے۔ وہ بار بار آنکھ ملتا ہے، اور حیران و پریشان سا کہتا ہے، "ممی، تم! یہ تم ہو سچ مچ کہیں میں کسی جادو کے دیش میں تو نہیں بھٹک گیا؟"

سمیتا اسی نرمی سے بولی، "پہلے اندر تشریف لائیے اور شیا ملا کو بھی اندر آنے دیجیے۔ میں کیا نو مہینے میں اتنی بدل گئی ہوں کہ آنکھیں ملنی پڑیں۔ تب تو ہاتھ ملنے کی بھی نوبت آسکتی ہے۔"

کہتے کہتے اس نے شیا ملا کے کندھے سے چپک کر سوتے ہوئے انکت کو جھپٹ کر اپنی باہوں میں سمیٹ لیا اور چھوٹے بچے کی طرح چومنے لگی تابڑ توڑ، پاگلوں کی طرح۔ انکت کن منایا، پھر چڑ چڑا کر بولا۔ "بُوا، بُوا، سونے دو، نیند آرہی ہے۔"

"ارے انکت، انکت! بُوا نہیں، یہ میں ہوں ممی۔ تو بھی نہیں پہچانتا مجھے؟ میں تیری ممی ہوں۔"

"ممی!" انکت نے یکایک جاگ کر سمیتا کو دیکھا، "ممی، تم سچ مچ میری ممی ہو۔"

"ہاں، ہاں، ہاں میں تیری ممی ہوں۔ تجھے بھی شک ہوگیا مجھ پر۔۔۔"

اور پھر پاگلوں کی طرح چومنے لگی۔ انکت اب جاگ گیا تھا۔ اور سمیتا کے کندھوں پر مکے مار رہا تھا، "کہاں تھیں، تم اتنے دن؟ ہم نہیں بولیں گے تم سے۔۔۔ ہم نہیں بولیں گے۔ کبھی نہیں بولیں گے۔"

سمیتا ایک انوکھے تجربے سے گزر رہی تھی۔ اندر آکر اس نے انکت کو اور بھی چھاتی میں سمیٹ لیا۔ بولی، "تیرے لیے چاکلیٹ لینے گئی تھی۔ باباجی کے پاس رکھے ہیں۔"

شیا ملا تب تک چپ چاپ باورچی خانہ میں پہنچ چکی تھی۔ اجیت اور سمیتا پتاجی کے پاس جا بیٹھے۔ کافی آئی اور فوراً ختم ہوگئی، جیسے سبھی کو ٹرین پکڑنی ہو۔ انکت پھر سو گیا تھا۔ اُسے اجیت کے پاس لٹا کر وہ شیا ملا کے کمرے میں گئی۔ شیا ملا کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ آتے ہی اُسے چھاتی میں بھر لیا شیا ملا نے، معافی مانگتے ہوئے کہا، "کسی کو بھی پتہ نہیں تھا کہ آپ آج آرہی ہیں۔۔۔"

سمیتا نے بات کاٹ دی۔ بولی، "اچانک جاسوسی کرنے کی طبیعت آگئی تھی۔"

پھر ایک دم اپنی زبان کاٹ لی۔ "جاننا چاہتی تھی کہ میرے استقبال کے لیے کون کون آتا ہے۔ تم اتنی دور سے آئیں مجھ سے ملنے۔"

شیاملا ایک دم بولی ــ "نہیں،نہیں بھابھی! سبھی آرہے ہیں۔ جی جی تو کل یعنی آج شام کو ہی آجائے گی۔ ورتیکا دیدی دو دن بعد آئیں گی۔"

"ارے شیاملا، میں تو مذاق کررہی تھی۔ اچھا سناؤ، تمھارے کیا حال ہیں؟"

"سب کچھ سناؤں گی آپ کو، بہت وقت ہے۔ ابھی تو آپ بھیّا کی کہانی سنو۔"

پل بھر کو کہیں وہ کھنچ گیا۔ پھر بھی فوراً نہیں اُٹھی۔ کچھ دیر باتیں کرتی رہی۔ آخر شیاملا نے زور کی جماہی لی، بولی، "نیند آرہی ہے بھابھی! دو بج چکے ہیں، اب سونے دو۔"

سمیتا اٹھی اور بولی، "گڈ نائٹ شیاملا! خوب میٹھی نیند لو اور خواب دیکھو۔"

شیاملا نے بھی لیٹتے ہوئے کہا، "گڈ نائٹ، حسین ملن مبارک۔"

سمیتا کھل کھلاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اجیت ایک رسالہ پڑھنے کا ڈرامہ کر رہے تھے۔ سمیتا نے آکر رسالہ ہاتھ سے لیا اور اُسے میز پر رکھ دیا۔ پھر مسکرا کر اس کے پاس بیٹھنا چاہا کہ پایا، اُس کا سر اجیت کی چھاتی پر ہے اور جسم مضبوط باہوں کے گھیرے میں پس رہا ہے...

رات کا باقی حصہ لمحوں میں بیت گیا۔

اگلے سات دن کدھر سے آکر کدھر چلے گئے، پتہ ہی نہیں چلا۔ خوشی اور مسرت سے گھر کر صدیاں لمحوں میں محدود ہو جاتی ہیں۔ اس درمیان میں سمیتا نے لمحہ کے ہزارویں حصہ میں بھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اُس کے اندر کہیں کوئی پھانس ہے۔

جو سب سے بعد میں آئی تھی وہ ورتیکا سب سے پہلے گئی۔ اُسے نارائن کے ساتھ ایران جانا تھا۔ نارائن کو جنگ نامہ نگار کے طور پر مورچہ پر رہنا تھا اور ورتیکا ایران کی خاتون کو پاس سے دیکھنا چاہتی تھی۔

سمیتا نے ایک دن تنہائی پاکر کہا، "جی جی، آپ کو ایران نہیں جانا چاہیے۔ آپ ماں بننے والی ہیں۔ تین ماہ ہی تو باقی ہیں۔ جنگ کے میدان میں..."

"جنگ کے میدان میں کہاں جا رہی ہوں؟"

"جانتی ہوں، لیکن جنگ کے بھیانک اثرات وہاں کی زندگی پر پڑے ہیں۔ خمینی نے کہا ایک

استحصال کا خاتمہ کرکے عوام پر دوسرے استحصال کو نہیں لاد دیا ہے. سامراجیہ شاہی کے ظلم سے ان کی حفاظت کی اور اب مذہبی پیشوا بن کر خود ان پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔"

"ہر ڈکٹیٹر کا یہی کردار ہوتا ہے۔ میں اُسی کردار کا مطالعہ کرنا چاہتی ہوں۔ نارائن کہتا ہے کہ اس کی اولاد ہسپتال کے سجے بند کمرے میں پیدا نہیں ہوگی، بلکہ اُسی کی طرح بھاگتے بھاگتے کہیں بھی نازل ہو جانا اس کی خوش قسمتی ہوگی۔"

سمیتا ہنس پڑی، "نارائن بھائی صاحب تو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ او گھڑ شنکر ہیں وہ تو لیکن آپ تو سوچ سمجھ سکتی ہیں؟"

ورتیکا اسی سادگی سے بولی، "جب میں نہیں چاہتی کہ وہ میری آزادی پر روک لگائے تو خود میں اُس کے خیالوں کی نافرمانی کیسے کرسکتی ہوں؟"

"لیکن جی جی، یہ تمہارا اور ان کا سوال تھوڑا ہی نا ہے۔ یہ تو آپ دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ یہ مشترکہ ہونا ہی تو سماج کا ہونا ہے۔ یہ ایک اور نئے جُز کی پیدائش کا سوال ہے۔"

"ہے، لیکن ہم دونوں کو بھی اپنے اپنے خیالوں کو جینے کا بھی پورا پورا حق ہے۔ فیصلہ وقت آنے تک ٹالا جاسکتا ہے۔ ابھی سے کیوں حریف کا انداز اپنائیں؟ جانتی ہو، ایک بار نہ جانے کس جھونک میں جناب نے لکھ ڈالا... لو میں تمہیں اس کا ایک خط دکھاتی ہوں۔ میرا جواب بھی ہے۔"

ورتیکا فوراً دو خط لے آئی اور سیدھا سمیتا کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اسی سادگی سے سمیتا پڑھنے لگی۔ نارائن نے لکھا تھا۔

تم جانتی ہی ہو کہ میں جس راہ پر چل پڑا ہوں، وہ بہت ہی خطرناک ہے۔ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ کچھ بھی کرنے کے لیے ویسے تو ہم دونوں پوری طرح سے آزاد ہیں، پھر بھی ایک دوسرے کے لیے ہماری کچھ ذمہ داری بھی ہے۔ جب ہم ایک دوسرے کے لیے جینے کی بات کرتے ہیں تو اُس میں یہ بھی شامل ہے کہ ہمارے جینے کی فکر بھی کوئی کرے۔ یہ بھی ایک طرح کا حق ہے۔ لیکن جیسا کہ گیتا میں لکھا ہے، ہمیں اپنے عمل کی فکر کرنی ہے۔ نتیجہ کی نہیں۔ یعنی ہمیں سچ کی کھوج کرنی ہے، نتیجہ کی نہیں۔ یعنی ہمیں سچ کی کھوج کرنی ہے۔ سچ کی فکر نہیں کرنی...

لو میں پھر ہمیشہ کی طرح الفاظ کے سنسار میں بھٹک گیا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ تم مجھے بہت پیار کرتی ہو۔ میں اُس کی تھاہ لینا نہیں چاہتا۔ چاہوں تو بے بھی نہ سکوں۔ میں نہیں بھی رہا تو تم اُس پیار کے ساتھ جی سکتی ہو۔ یہ بورژوائی سنسار کبھی کبھی بڑا پیارا لگتا ہے نا؟

لیکن یہ مسئلہ اُٹھا کر میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے لیے تم اپنی زندگی برباد نہ کرنا۔ میری طرف سے کوئی مجبوری نہیں ہے۔ تم کہیں بھی کسی سے بھی جُڑ سکتی ہو...

اس خط میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ بہت کچھ غیر تحریری بھی۔ وہ غیر تحریری ہی بنیادی نکتہ تھا۔ کوئی احساس گناہ انھیں کچوٹ رہا تھا۔ جی جی نے بھی اس احساس گناہ کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ بس جواب میں دو سطریں لکھ دیں ــــ

میرے بھولے شنکر! ابھی تو تم ہو۔ جب نہیں رہو گے تب کیسے کیا ہوگا اس کی فکر تمھیں کیوں؟ پیار کرتے ہو اور یقین نہیں کرتے...

پڑھ کر پل بھر کے لیے سمیتا پتھر ہو گئی۔ پھر باطن میں ایک گہری چیخ گونج اُٹھی۔ کسی طرح اپنے آپ کو سمیٹ کر اس نے اتنا ہی کہا ــ "جی جی، اب کچھ نہیں کہوں گی میں۔ آپ کی راہ خود ہموار ہے۔"

پھر کئی لمحے چپ رہ کر وہ بولی ــ "جی جی، تمھارا اتنا گہرا تجربہ ہے۔ ایک بات بتاؤ گی؟"

"پوچھو!"

یہ الفاظ ورتیکا نے کچھ ایسے ڈھنگ سے کہے کہ سمیتا ہنس پڑی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اور بھی سنجیدہ ہو گئی۔ دھیرے دھیرے بولی، "آپ دونوں غیر معمولی حالات کے پیداوار ہیں۔ کیا آپ کی یہ انوکھی ہمت ردّعمل کے طور پر نہیں پیدا ہوئی ہے؟ میں محسوس کرتی ہوں کہ میرا یہ سارا اخلاق بھی ایک ردّعمل ہی ہے۔ ردّعمل کے ذریعہ ہی کیا فطری ہوا جا سکتا ہے؟"

ورتیکا نے فوراً جواب نہیں دیا۔ ان دونوں کے درمیان کئی پل خاموشی چھائی رہی۔ دھیرے دھیرے ورتیکا بولی ــ "بھابھی تم بھی تجربات کے سنسار میں بہت گہری ڈوبی ہو۔ وہیں سچی تعلیم ملتی ہے۔ تم نے سوال پوچھا ہے لیکن جواب بھی دے دیا ہے۔ تجربات کے تپش کے بغیر ایسا نہیں

ہو سکتا۔ ہاں بھابھی، اب تو مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ ردعمل کے ذریعہ ہی نارمل کی منزل ہے۔ تم نے ضرور پڑھی ہوگی کئی مشہور خواتین مصنفہ کی سوانح عمریاں کسی نقاد نے انھیں 'زخمی انا کا دھماکہ' کا نام دیا تھا۔"

سمیتا بول اُٹھی، "انھوں نے کچھ غلط تو نہیں کہا ہے۔"

ورتیکا نے معصومیت سے جواب دیا۔ "جو کہا وہ تو غلط نہیں بھی ہو سکتا، لیکن کہنے کا ڈھنگ ضرور غلط ہے۔ انھوں نے صرف الزام لگایا ہے۔ دھماکہ کیوں ہوا، اُسے واضح نہیں کیا۔ واضح کرتے تو کسی نتیجہ پر پہنچتے کہ جب تک ہمارا سماج نارمل نہیں ہوتا، فطری من سے مرد عورت کی برابری کو قبول نہیں کرتا تب تک ردعمل کی راہ سے ہی آسانی کی راہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ردعمل اپنے میں علاج نہیں ہے، لیکن علاج کی لازمیت کی طرف وہ اشارہ ضرور کرتی ہے اور شدت کے ساتھ کرتی ہے۔"

تبھی اچانک دروازے کی گھنٹی گھن گھنا اٹھی۔

پڑوس میں دو گھر بعد جو گھر تھا۔ وہاں کبھی کبھی ایک لڑکی آتی تھی۔ بڑی بیدار، مستعد اور تیز گفتار۔ اس کا نام تھا شاہدہ انجم۔ غزلیں لکھتی تھی۔ اس گھر میں اجن کلیان، کے ریٹائرڈ مدیر رہتے تھے۔ ان سے ملنے آتی تھی۔ اردو اکادمی میں کام کرتی تھی۔ ورتیکا جب دہلی میں تھی تب انھوں نے شاہدہ کو پڑھایا تھا۔ وہ آئی ہیں، یہ جان کر وہ اُن سے ملنے آئی۔ گھنٹی کی آواز سن کر جب ورتیکا نے دروازہ کھولا تو حیران رہ گئی۔ "ارے، تو شاہدہ!"

شاہدہ جیسے نہال ہو گئی۔ "آپ نے مجھے پہچان لیا میڈم؟"

"ارے، تجھے نہ پہچانوں گی؟ سب سے زیادہ شکایتیں تیری ہی آتی تھیں۔"

"اور آپ شکایت کرنے والوں کو ہی ڈانٹ دیتی تھیں۔"

"تجھے بھی تو ڈانٹا تھا، ایک دن۔"

"وہ ڈانٹنا تھوڑے ہی نہ تھا میڈم۔ وہ تو ایک سیکھ تھی۔ آپ کے وہ الفاظ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ آپ نے کہا تھا۔ 'تو اپنے کو بہت دھوکا دے رہی ہے، شاہدہ آزادی کا مطلب بے لگام ہونا نہیں ہوتا۔ لگام کو کھینچنا ہوتا ہے۔"

ورتیکا نے پوچھا، "کیا کر رہی ہے تو آج کل ؟ شادی ہوئی کہ نہیں ؟"

"شادی تو اب کیا کروں گی ؟ اردو اکادمی میں کام کرتی ہوں۔"

"کیوں ؟ تیری عمر ہی کیا ہے ؟ ۲۶، ۲۷ کی ہو گی۔"

"وہ بات نہیں ہے میڈم ! ابا حضور تو رہے نہیں۔ بھائی جان بھی ایک حادثے میں چل بسے۔ سات بہنیں ہیں۔ ایک۔۔۔ کی شادی ابا کر گئے تھے۔ باقی تین کی ہو چکی ہے۔ ابھی دو اور ہیں۔"

ورتیکا حیران شاہدہ کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ کیا یہ وہی شاہدہ ہے ؟ کیا... لیکن بولی اُسی معصومیت سے۔ "دونوں بہنوں کی شادی کرنے کے بعد اپنی شادی کرے گی ؟"

شاہدہ کافی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ دھیرے دھیرے بولی، "کچھ اور بات کیجیے میڈم۔ ابھی تو یہی خواہش ہے کہ اتی کے سر سے بوجھ اتر جائے۔"

ورتیکا نے شاہدہ کو کھینچ کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ بولی، "میں بتا نہیں سکتی کہ تجھ سے مل کر میں کتنی خوش ہوئی ہوں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ شاہدہ جسے میں نے پڑھایا تھا، اتنی سمجھدار ہو سکتی ہے۔ بہت اچھا لگا۔ پرانی یادیں بھی کیسے گدگدا جاتی ہیں۔"

شاہدہ جھجکتے ہوئے بولی، "میڈم، آپ آج کل کہاں ہیں ؟"

"دہلی سے حیدرآباد چلی گئی تھی۔ اب وہاں سے استعفیٰ دے کر صحافت کے میدان میں آ گئی ہوں۔ میرے شوہر ایران میں جنگ کے نامہ نگار ہیں۔ انھیں کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

شاہدہ بولی، "میرے والد ایرانی ہی تھے، میڈم لیکن میں نے تو سنا تھا کہ آپ کسی صحافی کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔" شاہدہ نے بہت آہستہ آہستہ کہا۔

"ہاں، بعد میں انھیں کے ساتھ شادی کر لی۔"

"آپ کے بارے میں لوگ بڑی ایسی ویسی باتیں کرتے ہیں۔"

"فرصت ہے، تبھی تو کرتے ہیں۔"

"ہاں لوگ میڈم ! ایسی باتوں کے لیے فرصت نکل ہی آتی ہے۔" شاہدہ ہنس پڑی، "جس دن آپ کی بھابی جان امریکہ سے رات میں آئی تھیں، بڑی چرچہ رہی اس بات کی آس پاس کے

گھروں میں سب کہہ رہے تھے، جب وہ رات کے ایک بجے آئیں ٹیکسی میں اکیلے تب اس کا شوہر کسی کالی کلوٹی کے ساتھ سینما دیکھنے گیا ہوا تھا۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ سب اندر آکر میز کے پاس بیٹھ چکے تھے۔ سمیتا اسی درمیان چائے لینے چلی گئی تھی۔ لوٹتے ہوئے اس نے آخری جملہ سُن لیا تھا، لیکن کچھ بولی نہیں۔ ورتیکا نے ہی کہا۔

"سُن لیا بھابھی، تمھارے بارے میں تمھارے پڑوسی کیا کہتے ہیں۔"

"جو دیکھا ہے، وہی تو کہیں گے۔"

"لیکن کیا دیکھنا ہی سب کچھ ہوتا ہے؟"

سمیتا نے چائے کا ایک ایک پیالہ دونوں کو دیا۔ پھر اپنے پیالے سے گھونٹ بھرا اور بولی — "مجھ سے تو انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ کہتے تو میں جواب دے سکتی تھی۔ میں کیوں فکر کروں فضول باتوں کی؟ میرے گھر میں تو دن بھر طرح طرح کے لوگ آتے ہیں — پتاجی کے جاننے والے اور دوست، ان کے دوست، میری سہیلیاں۔"

شاہدہ بول اُٹھی، "سنا ہے، آپ کے سُسر بہت بڑے ادیب ہیں۔ کیا میں بھی آسکتی ہوں کبھی کبھی اُن سے ملنے؟ آپ سے بھی امریکہ کے بارے میں سننا چاہتی ہوں۔"

سُمیتا بولی، "جب تمھارا جی کرے آجانا۔ تم اکادمی میں کام کرتی ہو اور میں کالج میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ ایک رسالہ میں بھی کام کرتی ہوں۔ تمھارے آنے سے مجھے فائدہ ہی ہوگا۔ کبھی کبھی کام میں ہاتھ بٹادو گی۔"

ورتیکا کھل کھلا پڑی — "دیکھا شاہدہ، میری بھابھی کیسی چالاک ہیں۔ آنے کو صاف منع نہیں کیا۔"

سمیتا جیسے چیخ اُٹھی — "جی جی، تم بھی اتنی بے رحم ہوسکتی ہو۔"

ورتیکا اسی طرح ہنستی رہی۔ پھر اچانک سنجیدہ ہوکر بولی — "کبھی کبھی فضول کی بات پر ہنسنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ شاہدہ بھابھی سے ملتی رہنا۔ ان سے اچھی دوست تجھے کہیں نہیں ملے گی۔"

تینوں دیر تک چائے پیتی رہیں، اور باتیں کرتی رہیں تب تک جب تک وبھا اور رانیتہ

نہیں آ گئے۔ شیاملا اور انکت بھی انھیں کے ساتھ تھے۔

ورتیکا کے رخصت ہوتے وقت سمیتا مغموم ہو گئی" جی جی خط لکھتی رہنا۔ بڑا بھروسہ ہے تمھارا۔"

" ابھی بھی تمھیں بھروسے کی ضرورت ہے۔" ورتیکا نے چلتی بس سے ہلکی سی چپت لگا دی۔ جب تک سب اوجھل نہ ہو گئے وہ ہاتھ ہلاتی رہی۔ پھر آنچل سے آنکھوں کے کونے پونچھ کر کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

ورتیکا کو بس میں بٹھانے کے لیے اجیت کے ساتھ اکیلی ہی آئی تھی۔ کچھ دیر تک دونوں پاؤں پاؤں چلتے رہے۔ اچانک سمیتا نے کہا۔ "سنو اجیت، مجھے لگتا ہے کہ وبھا کچھ پریشان ہے۔"

"کیوں؟ تم سے کچھ کہا اُس نے؟"

"کہا ہی تو نہیں۔ تمھیں بھی نہیں بتایا۔ تب بات گمبھیر ہے۔"

" مجھے لگتا ہے کہ اتنی گمبھیر نہیں ہے جتنی تم سمجھتی ہو۔ انیتہ کے بڑے بھائی کچھ دن کے لیے بھارت آئے تھے۔ یہاں سے لوٹنے کے فوراً بعد اچانک دل کا دورہ بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سے اُس کی جیٹھانی اُسی کے پاس رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے، دیورانی جیٹھانی میں کسی بات کو لے کر من مٹاؤ چل رہا ہو۔"

" ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔" وہ اچانک چپ ہو گئی۔

اجیت نے پوچھا" کیا ہو سکتا ہے بتاؤ نا۔"

" ابھی نہیں۔ آج وبھا سے بات کروں گی۔"

اور سمیتا نے وبھا سے سچ مچ بات کی۔ اُسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ دو چار منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ بولی" تو کچھ چھپا رہی ہے۔"

وبھا چونکی۔" کیوں، کیا ہوا؟"

" کیا ہوا، یہی تو پوچھ رہی ہوں۔ تیری اداس آنکھوں میں جو درد جم کر رہ گیا ہے وہ بہت کچھ کہہ رہا ہے۔ کیا بات ہے سچ مچ بتا۔ تیرے بھیا بھی بہت پریشان ہیں۔"

وبھا نے ایک پل کے لیے بھابھی کی آنکھوں میں گہرائی تک جھانکا، پھر پھپھک کر اس کی چھاتی

سے لپٹ گئی، "میں نے تمھارے ساتھ بہت ظلم کیا ہے بھابھی، اسی کا پھل بھوگ رہی ہوں۔"

سمیتا بہت دیر تک کمر سہلاتی رہی۔ جب سسکیاں رکیں تو اُسے اپنے پاس بٹھا کر بولی "اب بتاؤ۔"

اور تب دھیرے دھیرے کبھی رندھے گلے سے، کبھی سنجیدہ آواز میں، کبھی پرجوش ہو کر انیتا اور اُس کی بھابھی کے تعلقات کی ساری کہانی سنا دی ــ "جب انیتا نے مجھے یہ کہانی سنائی تھی تب مجھے اُس پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔ قصور اس کا نہیں بھابھی کا تھا اور بھابھی کو بھی اتنا قصوروار نہیں مانا جا سکتا۔ لیکن بعد میں جس طرح سے حادثات واقع ہوئے، اُن سے مجھے لگا کہ تب وہ بھلے ہی ایک ناگہانی حادثہ رہا ہو، لیکن ان دونوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک کشش کا مرکز بن گیا۔ اور جب سے بھائی صاحب کا اچانک انتقال ہوا ہے اور بھابھی ہمارے پاس آگئی ہے تب سے یہ دونوں دھیرے دھیرے کیسے ایک دوسرے کے پاس آتے گئے۔ اس کی میں خاموش گواہ بنی رہی۔ ایک دو بار انیتا کو تنبیہ بھی کی۔ پہلے تو پیار سے اس نے میرا مُنہ بند کر دیا پھر دھیرے دھیرے خاموش ہوتا چلا گیا۔ میں ویسے ہی سخت ہوتی گئی۔ تب ایک دن اُس نے واضح الفاظ میں کہا ــ 'میں جانتا ہوں، تم مجھے پیار کرتی ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔ لیکن وبھا، سچ کہتا ہوں، جب بھابھی کے پاس ہوتا ہوں تو لگتا ہے میرے چاروں طرف ایک روشنی بکھری ہوئی ہے۔ میں کیا کروں، میں مجبور ہوں۔ اب تو ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھاتے بھی ہیں۔ اور . . .'

" اور وہ چپ ہو گیا جیسے خود سے جدوجہد کر رہا ہو۔ کئی پل دونوں ایک دوسرے کو تولتے رہے۔ پھر بہت دھیرے دھیرے انیتا نے کہا ــ 'بھابھی نے مجھے بتایا ہے کہ ان کا یہ بیٹا بھائی صاحب سے نہیں، مجھ سے ملا ہے۔'"

یہاں آکر وبھا چپ ہو گئی۔ ہو جانا پڑا۔ باطن کے بوجھ سے دونوں کے درمیان کئی پل تک خاموشی چھائی رہی۔ سُمیتا حیران نہیں تھی، پریشان ضرور تھی۔ لیکن اس بار بھی خاموشی وبھا نے ہی توڑی ــ بولی، "بھابھی یہ کیسا قانون ہے خالق کا۔ مرد عورت کے ساتھ بلاتکار کرے تو عورت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدنام ہو جاتی ہے اور عورت مرد کے ساتھ بلاتکار کرے تو

دونوں کے تعلقات مسلسل گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، مرد کے ساتھ بلاتکار نہیں ہوتا، وہ تو شکاری ہے۔ شکار خود اس کے پاس چل کر آئے تو۔۔۔"

سُمیتا اب بھی خاموش تھی۔ اُس کے اندر ایک طوفان برپا تھا۔ سب کچھ اس کے شور میں کھوگیا۔ سب کچھ اُڑ رہا تھا اور یہاں وہاں پھیل رہا تھا۔

تبھی اُس نے وِبھا کی آخری بات سُنی۔ ایک لمحے کے لیے سوچا، پھر سنجیدہ آواز میں بولی، عورت کبھی بلاتکار نہیں کرتی۔ وہ تو سحور کرتی ہے اور مرد اس دعوت کو اپنا پیدائشی حق مانتا ہے۔ اس کے لیے عورت صرف بھوگیا ہے۔"

اور اس کے بعد وہ دیر تک عورت مرد کے رشتوں کی تشریح کرتی رہی، ایک رٹے رٹائے بھاشن کی طرح۔

اور پھر اُسی طرح اچانک خاموش بھی ہوگئی جیسے اُسے خود پر افسوس ہو۔ "تقریر کرنے کی مجھ میں کیسی بری عادت پڑگئی ہے۔" اُس نے وبھا کی طرف دیکھا، پھر جیسے اُسے مطمئن کرتی ہوئی بولی، "میں انیتہ سے بات کروں گی۔"

وِبھا نے اُسے روک دیا ــــ "نہیں، نہیں، بھابھی تم کچھ نہیں کہوگی۔ تمھاری ساری کہانی بتا چکی ہوں۔ ہوسکتا ہے، جوش میں وہ خود کو سچ ثابت کرنے کے لیے تمھیں کچھ کہہ بیٹھیں۔"

سمیتا کے دل میں آیا کہ کہہ دے کہ وہ کسی سے نہیں ڈرتی۔ اُس کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے، لیکن تبھی اُسے یاد آیا کہ اُس کی کہانی تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ جان جائے تو۔۔۔

لمحے بھر میں وہ جملہ طوفان کی رفتار سے شور مچاتا ہوا اس کے ذہن میں گھومنے لگا۔ لگا جیسے رگیں پھٹ جائیں گی۔ خود کو پرسکون کرنے کے لیے کافی محنت کرنی پڑی۔ پُر اعتماد لہجے میں بولی، "جیسا تُو چاہے، میں نہیں کروں گی انیتہ سے بات۔ لیکن جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کرنا۔ یاد رکھنا کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔ اور ہاں پتا جی سے ابھی کچھ نہ کہنا۔"

"سب جانتی ہوں، بھابھی، تم پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ پتاجی سے تو میں ہمیشہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہوں۔ لیکن بھابھی، وہ تو ادیب ہیں۔ کافی گہرائی تک دیکھ لیتے ہیں۔"

"کچھ کہا انھوں نے؟"

"پرسوں کہنا چاہتے تھے لیکن اچانک چپ ہو گئے۔ میں نے پوچھا:" آپ کچھ کہہ رہے تھے؟' ہاں، کہہ رہا تھا۔ ہو سکے تو پانچ دس دن اور رہ جاؤ! میں نے جواب دیا: رہ سکتی تھی، لیکن بھابھی اپنی ماں کے پاس جارہی ہیں کچھ دن کے لیے انیتہ کیسے اکیلے رہیں گے؟"

وبھا دو دن بعد انیتہ کے ساتھ چلی گئی۔ اجیت نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ وہ سب ثمینا پر چھوڑ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن رات کے گہرے سناٹے میں کوئی کن کھجورا اس کے ذہن پر رینگنے لگتا تھا، دھیرے دھیرے اس کی رگوں میں پنجے گڑاتا ہوا، خاص کر سمیتا کا وہ خط یاد کر کے جس میں اس نے اپنے بیگروہم جماعت کی سرگرمیوں کا ذکر کیا تھا۔ کیا سمیتا نے جو کچھ لکھا تھا وہ سب صحیح تھا، صرف اتنا ہی واقع ہوا اُن دونوں کے درمیان؟ کیا سمیتا...؟

نہیں... نہیں... نہیں۔ سمیتا اُسے بے حد پیار کرتی ہے۔ وہ اسی کی ہے...

وہ چونکا۔ یہ اسی کی، کیا ہے؟ کیا یہ اجارہ داری نہیں ہے؟ کیا وہ صرف سمیتا کا رہا ہے؟ کیا اُس کے باطن نے سمیتا کی اذیت کو باپ کا نام نہیں دیا ہے؟

وہ پھر چیخا، نہیں، نہیں، نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ ایسا نہیں ہوا۔ ہوا بھی تو میں اُس ہونے کو قبول نہیں کرتا۔ میں سمیتا سے نفرت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں اُسے پیار کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا اور جب میں اُسے پیار کرتا ہوں تو یقین بھی کرتا ہوں؛

اسی طرح اجیت نہ جانے کتنے حصّوں میں منقسم تھا۔ وہ منقسم ہونا، ہونے یا نہ ہونے کی حالت سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ اس لیے اور بھی کہ اوپر سے وہ سب اتنے ہی شانت رہتے تھے جتنے اندر سے بے چین۔ شاید انسان کا یہی مقدر ہے، لیکن اُن میں سے بیشتر اندر کے انسان کے وجود سے اکثر بے خبر رہتے ہیں اور دوہرے قدروں کو ہی سچ مان کر جیتے رہتے ہیں۔ لیکن کچھ ہیں جو قدروں کے اس دوہرے پن سے واقف ہو جاتے ہیں اور اسی لیے عمر بھر تناؤ سے پریشان رہتے ہیں۔

سمیتا بھی بار بار ان حالات پر غور کرتی ہے۔ اور سوچتی ہے کہ کیسے ملے اس دوہرے پن سے نجات؟ کیسے ہو سکتے ہیں ہم نارمل؟

غور و فکر کے ان لمحوں میں اچانک پڑوسیوں کی گھورتی آنکھیں اور پھسپھساتی آوازیں اُسے پریشان کر دیتی ہیں۔ یہاں تو پھر بھی غنیمت ہے۔ ایک دو کو چھوڑ کر کسی کو سوچنے کا وقت ہی نہیں

ملتا۔ لیکن پرانے شہر کی تنگ گلیوں میں۔۔۔

تبھی خلل پڑ گیا۔ دیکھا کر اجیت آگئے ہیں۔ اور شیاملا میز پر چائے لگا رہی ہے۔ اس نے اپنی کاپیاں ایک طرف رکھ دیں اور وہیں آ گئی۔ کئی پل ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے چائے پیتے رہے۔ پھر اچانک سمیتا اجیت کی طرف دیکھ کر بولی، "تم اپنی اس شیاملا کو سمجھاتے کیوں نہیں؟"

شیاملا تیزی سے بولی، "یہ اپنی کیا ہوتی ہے، بھابھی؟ میں تو تم سے ملنے اتنی دور آئی قرض لے کر، اور تم مجھے۔۔۔"

سُمیتا ہنس پڑی۔ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے پاس لے جاکر بولی "پگلی کہیں کی۔"

پھر اجیت کی طرف دیکھا اور کہا، "یہ جانے کی جلدی مچا رہی ہے۔ میں کہتی ہوں ابھی نہیں جانے دوں گی۔ کم سے کم دو چار مہینے تو رہے۔"

اجیت کی نگاہ شیاملا کے چہرے پر تھی۔ بولے، "ٹھیک ہی تو کہتی ہے سُمیتا۔ کچھ دن اور رہ جاؤ نا!"

شیاملا نے دور خلا میں جھانکتے ہوئے جواب دیا، "آپ تو جانتے نہیں، بھیا بھی نہیں جانتے، میری نوکری چلی گئی ہے۔ بڑی خوشامد کی میں نے، لیکن پادری صاحب پگھلے ہی نہیں۔ کہیں اور تو کام ڈھونڈنا ہی ہوگا۔ ایسی ابھاگن ہوں۔ دو دو شادیاں کی لیکن۔۔۔"

گلا رندھ گیا۔ سُمیتا نے اپنا ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ کئی پل سہلاتی رہی، پھر بولی "تبھی تو کہتی ہوں، کچھ دن فکروں سے آزاد ہو کر یہاں رہ۔"

"فکروں سے آزاد؟" مضمحل سی ہنسی شیاملا — "میرے ناول کا کردار رہ سکتا ہے فکر سے آزاد، میں نہیں۔ میں اُس سے جیسا چاہوں، ویسا کروا سکتا ہوں لیکن اپنے آپ سے نہیں۔ میں، میں کہاں ہوں؟ نہ جانے کتنے دوہری تہری قدر، کتنی کتنی آنکھیں مجھے گھیرے ہوئے ہیں اور میرے وجود کو نگل گئی ہیں۔"

اجیت اور سُمیتا نے ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر نگاہیں جھکا لیں۔ وہ دونوں کہیں اندر تک زخمی ہو گئے تھے۔ شیاملا اسی طرح کہتی رہی — "بھابھی، میں نے جو کچھ دیکھا اور سہا ہے اُس سے یہی سیکھا ہے کہ اس دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ پیسہ ہے تو سارے رشتے ہیں۔

جب کماتی تھی تو بھائی بھابھی سب اپنے تھے۔ اب تو ماں بھی آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ اگر اجیت بھیا آکاش کے دیوتا کی طرح اچانک کہیں سے نہ آجاتے تو میرا کیا ہوتا؟"

"ہوتا کیا؟ مرجاتی۔ کیا بگڑ جاتا کسی کا۔" نہ جانے کس جوش میں سُمیتا بول گئی۔ لیکن شیاملا نے اُسی سنجیدہ آواز میں کہا "کاش، میں مرجاتی۔ بہت آسان ہے نا، مرنا لیکن میں ابھاگن جو ٹھہری۔ مرنے کی جگہ ایک اور شادی کرلی۔ تب پتہ لگا کہ اصلی مرنا کیا ہوتا ہے۔ پَراٰنوں کا خاتمہ مرنا نہیں ہے۔ مرنا جینے جی مسلسل وہ کچھ کرنے کو مجبور ہونا ہے جو ہم نہیں کرنا چاہتے۔ کرہی نہیں سکتے، وہ میرا شوہر جس کے لیے میں نے پتا کے دیئے ہوئے ناریل کے سارے پیڑ بھی بیچ دیئے اُس کے لیے کار خریدی، وہ شرابی اور نیم پاگل نکلا۔ مجھے مارتا تھا۔ اُس نے میری نوکری چھوڑوا دی۔ کہتا تھا کیسی لکھنے والی ہے تو۔ ایک ناول ہر مہینے لکھ اور دو ہزار روپے لا..."

وہ اچانک چپ ہوگئی۔ اس فضا کی خاموشی نے اُسے پریشان کردیا۔ مجبوراً وہ پھر بول اُٹھی۔ "اب تمھیں بتاؤ بھابھی، لکھنا کیا ناریل کی گری نکالنا ہوا، جب چاہا جیسے چاہا کرلیا۔ لکھنا تو خواب ہے۔ خون کی ہزار بوندیں جلانی پڑتی ہیں تب کہیں ایک جملہ بنتا ہے...

"میں بیٹھتی۔ رات رات بھر بیٹھ کر لکھتی، لیکن سویرے سب پھاڑ دیتی۔ وہ لکھا کیا لکھا ہوتا تھا۔ "پھر بھی میں نے بار بار کوشش کی۔ ایک خاتون ایڈیٹر کو اپنی کہانی سنائی۔ بے چاری، میری کہانی سُن کر میرے لیے ان کے دل میں محبت کا جذبہ ابھر آیا۔ جو میں لکھتی اسے وہ چھاپ ضرور دیتی لیکن پورے پیسے نہیں دیتی۔ دھیرے دھیرے اس کی وہ ہمدردی کاروبار میں بدل گئی۔ اُس نے میری مجبوری کا فائدہ اُٹھایا۔ میری تخلیقات اپنے نام سے چھاپنے لگی۔ میں مجبور تھی۔ مجھے پیسے چاہیے تھے۔ لیکن وہ وہیں تک نہیں رکی۔ اُس بار اس نے میرے ناول کے لیے دو ہزار روپے کی جگہ صرف پانچ سو روپے دیئے۔ میں نے اعتراض کیا تو بولی "ضرورت ہے تو دے، نہیں تو کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ۔"

"استحصال... استحصال... ہر طرف استحصال۔ عورت ہی عورت کا استحصال کرتی ہے۔ بتاؤ بھابھی، یہ بھی کیا بلاتکار نہیں ہے؟"

جیسے کسی نے ذہن پر گھن کی چوٹ کی ہو، 'بلاتکار' لفظ نے سمیتا کو بے چین کردیا۔ اجیت

بھی چونک اُٹھے۔ تب تک شیا ملا نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ جہاں الفاظ آواز میں تبدیل ہو کر بس گونجتے رہتے ہیں۔

اسی وقت کسی کی آمد کی اطلاع دیتی ہوئی گھنٹی کی ٹرن ٹرن گونج اُٹھی۔ سمیتا چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی، "دیکھتی ہوں، شاید پتاجی اور انکت آگئے ہیں۔"

لیکن وہ نیچے اترتی اس سے قبل شیا ملا دروازہ کھول چکی تھی۔ وہیں سے اس نے آواز دی ــ "بھابھی، بمبئی سے راج کلی بہن آئی ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

حیرانی اور خوشی سے سمیتا دوڑتی ہوئی نیچے بھاگی، "کہاں ہے راج کلی، کہاں ہے...؟"

واقعی اس کے سامنے راج کلی کھڑی تھی۔ وہی الھڑپن، وہی اعتماد، وہی بہت کچھ کہتی ہوئی پیاری پیاری آنکھیں۔ لیکن مایوسی کی جھلک چہرے پر نہیں تھی۔ نیل گگن سی نیلی ساڑی۔ ماتھے پر منگل گرہ سی دمکتی بندی۔ کلائی پر بندھی گھڑی...

"ارے تو ہے راج کلی! سچ تو ہی ہے، کب آئی؟ خبر بھی نہیں دی۔"

اور اُسے باہوں میں بھر لیا۔ راج کلی اور بھی خوش تھی۔ بولی، "آپ کو چونکانا چاہتی تھی۔"

پھر پیچھے کھڑے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا، "یہ میرے گھر والے ہیں۔ ماسٹر ہیں۔ انھیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس شہر میں میرا بھی کوئی ہو سکتا ہے۔"

سمیتا نے اب دیکھا۔ صحت مند جسم کا ایک سانولا آدی واسی نوجوان پیچھے کھڑا ہے۔ آنکھوں میں ایک بھرپور اعتماد اور اپنا پن۔ بولی، "آؤ بھائی، اندر آجاؤ۔ کیا نام ہے تمھارا؟"

نوجوان نے معصومیت سے جواب دیا، "میرا نام ولیم ہے۔ رانچی کے پاس میرا گاؤں ہے۔ مشن اسکول میں پڑھاتا ہوں۔ ابھی ابھی نینی تال کے اسکول میں تبادلہ ہوا ہے۔"

پل بھر کے لیے سمیتا چونکی، دوسرے ہی لمحے اسی اپنے پن سے بولی، "تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ میں راج کلی کی دیدی ہوں۔ تم بھی مجھے دیدی ہی کہہ سکتے ہو، آؤ دونوں یہاں بیٹھو۔"

تکلفات کی رسم ادائیگی ہوئی تو سبھی میز کی چاروں طرف بیٹھ گئے۔ سمیتا بولی، "تو تو نے شادی کر لی۔"

"ایسے ہی نہیں کی۔ سب کچھ بتا کر کی ہے۔ بمبئی میں اچانک ایک دن ملاقات ہو گئی تھی۔ رات

گھر آئی تھی اور انھیں کہیں دور جانا تھا۔ بمبئی میں آدمی ویسے ہی پاگل ہوا رہتا ہے۔ رات میں تو سبھی سوتے دھندے جاگ اُٹھتے ہیں۔ آدی واسیوں پر کوئی فلم بن رہی تھی۔ اُسی کے بارے میں آئے تھے۔ راستہ بھول گئے تھے۔ میں نے انھیں وہاں جانے کی راہ کیا دکھائی کہ اگلے دن تمھاری طرح میرے گھر آ پہنچے۔ کچھ کچھ ویسا ہی ہوا ان کے ساتھ جیسا آپ کے ساتھ ہوا تھا۔ آتے ہی بولے 'اگر شوٹنگ دیکھنی ہو تو چلو میرے ساتھ۔ سب چلو۔ میں رات میں چھوڑ جاؤں گا۔'

" لمبی کہانی ہے دیدی۔ ایک مہینہ شوٹنگ چلتی رہی اور ہم ملتے رہے۔ کبھی گھر والوں کے ساتھ کبھی اکیلے۔ انھوں نے میری ساری کہانی جان لی۔ اسی حوالے میں میں ایک دن بہت دُکھی ہو گئی تھی۔ انھوں نے کہا، " اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ بلاتکار ہی تو کیا اُس نے، زندگی تو نہیں چھین لی۔ اہم ہے جینا۔ جینا سیکھو۔۔۔'

" ایسی ایسی باتیں کرتے۔ ماں بابا کو سمجھاتے۔ اچانک ایک دن بولے " سنو تمھارے بارے میں میں نے بہت سوچا ہے۔ تمھارے جیسی ہمّت والی لڑکی اپنی زندگی اس طرح برباد کرے۔ میں تیار ہوں تم سے شادی کرنے کے لیے اگر اس سے تمھارا دُکھ دور ہوتا ہو۔'

" میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ ویسے ہی جیسے تم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا تھا، اسی طرح کا سکھ میری رگوں میں پھیلتا چلا گیا۔ ہم دونوں نہ جانے کب تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے جیسے دو تصویریں بن گئے ہوں۔۔۔"

تبھی نیچے سے شیاملا کی آواز گونجی، " بھابھی، ایک بار یہاں آنا تو۔"

سُمیتا فوراً یہ کہتی ہوئی نیچے بھاگی، " اس شیاملا نے کیا سمجھ رکھا ہے اپنے آپ کو۔"

پاس آکر بولی، " تو بھی کمال کرتی ہے شیاملا! تو اس گھر کی باورچن ہے کیا؟"

شیاملا نے آنکھ اُٹھا کر سُمیتا کی آنکھوں میں دیکھا بولی، " میں تو تیار ہوں، بناؤں گی ہسات جنم تر جائے گا میرا۔"

دھک سے رہ گئی، معافی مانگتی سی بولی، " تجھے باورچن بنا کر کسی دوزخ میں جگہ ملے گی مجھے؟"

شیاملا اچانک زور سے ہنس پڑی، " تم بھی اُس دنیا کے دوزخ جنّت میں یقین کرتی ہو؟"

پھر اچانک سنجیدہ ہو کر بولی، " میں اپنے کرشن میں پورا یقین رکھتی ہوں۔ پھر بھی بھابھی، کیا ایسا

نہیں لگتا کہ جنت اور دوزخ ہر شخص کا اپنا اپنا ہے؟ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والا ایک شخص جنت میں رہتا ہے اور ایک دوزخ میں...۔"

دونوں نے سارا سامان اٹھا لیا تھا۔ سمیتا نے شیاملا کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ایک بار اقرار کے سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ جب وہ اوپر پہنچی تو ولیم بغیر کسی تکلف کے اپنی کہانی کا آخری حصہ سنا رہے تھے۔ "پہلے تو اس کے ماں باپ نے اعتراض کیا۔ وہ اعتراض صرف رسمی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہاں ان کی بیٹی کا کوئی مستقبل نہیں ہے، اسی لیے وہ جلد ہی راضی ہو گئے۔ ہم نے کورٹ میں جا کر شادی کر لی۔ پھر گھر پر ایک 'پارٹی' بھی دی۔ پڑوسی بڑے پیار سے ہم سے ملے۔ جانتے ہو کیوں؟ میں نے اپنے چرچ کے بڑے پادری کو بلا لیا تھا۔ ان کے ساتھ آئے آدی واسی مجسٹریٹ فرنانڈیز صاحب۔ وہیں انھوں نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ راج کلی کا دھرم نہیں بدلا جائے گا۔ اس بات سے بھی سبھی لوگ متاثر ہوئے، لیکن متاثر ہونے کی سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ مجسٹریٹ کے وہاں رہنے کی وجہ سے پولس بڑی تیزی سے سارے انتظام کر رہی تھی۔"

اور یہ کہہ کر وہ بڑی ادا سے مسکرایا۔ راج کلی کی نگاہ اس کے چہرے پر تھی۔ اس کی آنکھوں میں فخر تھا۔ اجیت نے دونوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک دوسرے کے لیے سچے رہتے ہوئے تم دونوں سکھی رہو۔ آمین!"

دوسری ہی پل وہ کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ چائے پیتے ہوئے سمیتا نے کہا۔ "اب تو تم تھوڑا سا پاس آ گئے ہو۔ کبھی کبھی آتے رہنا۔ وہاں سے سیدھی بس آتی ہے۔"

"آؤں گی دیدی، ضرور آؤں گی۔ آپ تو میرے لیے روشنی کا مینار ہیں۔"

جب وہ جانے لگے تو سمیتا نے ایک ساڑی راج کلی کو دی۔ وہ خوش ہو گئی۔ رندھی آواز میں کہا۔ "دیدی، یہ سب کیوں؟"

"اس لیے کہ چھوٹی بہن پہلی بار بڑی بہن کے گھر آئی ہے۔ نا، اب ایک لفظ بھی نہیں۔ اور ولیم! تمھارے لیے یہ ٹین سیٹ ہے۔ نہ، نہ، تم کچھ نہیں بولو گے۔ مجھے تم دونوں پر ناز ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، میں راج کلی کو بہت پیار کرتی ہوں۔"

اُن کے جانے کے بعد کچن میں بات کرتے ہوئے سمیتا نے شیاملا کو راج کلی کی پوری کہانی سُنا دی۔

شیاملا حیران بھی تھی اور غمگین بھی۔ بولی، "بھابھی، پاس جانے پر لگتا ہے کہ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے اندر کیسی کیسی آگ دبائے رہتا ہے۔ پھر بھی باہر اُس کی اَنا کا ٹھکانہ نہیں۔"

"ضروری ہے یہ اَنا شیاملا، بہت ضروری۔ یہ انا نہ ہو تو کیسے جیئے گا وہ جھوٹے سنسکاروں کے سہارے؛ یہی دویت ہے اور یہی سچ بھی۔"

شیاملا بولی، "نہیں جانتی، یہ سچ ہے یا اِسے ہم سچ ماننے کو مجبور ہیں۔ لیکن آج میں ایک بات ضرور سمجھی ہوں کہ جنھیں ہم پچھڑے یا چھوٹے لوگ کہتے ہیں وہ ان خود ساختہ اونچے لوگوں سے کہیں زیادہ عملی اور ترقی پسند ہوتے ہیں۔ گناہ و ثواب جنت و دوزخ انھیں زیادہ تنگ نہیں کرتے اُن کے اندر آگر آگ ہے بھی تو اس میں اتنی لپیٹ نہیں ہے جتنی ہماری اور آپ کی آگ میں۔"

سمیتا نے مسکرا کر شیاملا کی طرف دیکھا، "جانتی ہو، ولیم نے کیا کہا؟ اس نے کہا تھا، 'ہماری زبان میں بلاتکار جیسا لفظ ہی نہیں ہے، لفظ بعد میں آتا ہے پہلے تو معنی ہوتا ہے۔ معنی ہی تو تہذیب ہے۔ اس کی تہذیب بلاتکار کے مفروضہ کو قبول نہیں کرتی۔ تب ان کی زبان میں یہ لفظ کہاں سے آتا؟'"

"میں تو دیکھتی ہی رہ گئی ان دونوں کو۔ کتنے خوش کتنے سیدھے۔ مجھے تو حسد ہو رہی تھی اُن سے۔ کاش میں بھی۔۔۔"

اچانک شیاملا رک گئی۔ ایک ناقابل بیان سا شور اس کے اندر مچ اُٹھا۔ ایک تیز رفتار والی ٹرین اور ایک لمبی مال گاڑی جیسے ایک دوسرے کی الٹی سمت میں دوڑ رہی ہوں۔ سمیتا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ اُس نے آنکھیں جھکا لی تھیں۔ گھنٹی بج رہی تھی، انکت اور پتا جی کی آمد کا اعلان کرتی ہوئی۔ شیاملا نے تقریباً دوڑتے ہوئے دروازہ کھول دیا اور لپک کر انکت کی انگلی تھام لی، یہ کہتے ہوئے، "کافی دیر کر دی پتا جی، آپ نے۔"

"ارے بیٹی، کسی نے اُٹھنے ہی نہیں دیا۔ سب مجھے گھیرے رہے۔ انکت نہ ہوتا تو آنے ہی نہیں دیتے۔"

"چائے لیں گے۔"

"چائے ہی پینے کے لیے تو اتنی دیر ہوئی۔ منتظمین نے بہت بڑی پارٹی دی۔"

شیاملا بھی چلی گئی۔ سمیتا اور راجیت دونوں ہی اُسے گاڑی میں بٹھانے آئے۔ اس دن صبح سے

ہی وہ اداس اداس رہی۔ چائے بھی ٹھیک سے نہیں پی۔ جیسے سمیتا اور اجیت دونوں سے بچنا چاہتی ہو۔ زیادہ تر پتاجی کے پاس بیٹھی رہی اور اپنے وان کے ناولوں کو لے کر سوال کرتی رہی۔ کچھ نوٹس بھی لیے۔ یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اس کا کوئی ناول ہندی میں آ سکے تو...

تبھی سمیتا نے آکر کہا "گیارہ بج رہے ہیں۔ جی بدل گیا ہو تو..."

شیا ملا ایک دم اُٹھ گئی، "سچ بھابھی، میں تو کھو ہی گئی تھی۔ پتاجی سے باتیں کرتے کرتے، پتہ نہیں اب کب موقع ملے؟"

وہ سراسر جھوٹ بول رہی تھی۔ سارا سامان باندھ چکی تھی اور اُس کے پاس سامان تھا بھی کیا؟ بستر کے نام پر ایک چادر اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس جو سمیتا نے اُسے دیا تھا۔ ہاتھ میں ویسا ہی ایک چھوٹا سا پرس تھا اور کندھے پر ڈالنے والا ایک خوبصورت سا تھیلا تھا۔ اُس میں ایک مٹھائی کا ڈبہ، راستے میں کھانے کے لیے پھل، نمکین، بسکٹ، سوٹ کیس میں دو ساڑیاں پیٹی کوٹ اور بلاؤز۔ یہ سارا انتظام سمیتا نے اپنے آپ ہی کر دیا تھا۔ اجیت کو کچھ نہیں کہنا پڑا تھا۔

سمیتا کھانے کے لیے پلیٹ لے کر آئی تو شیا ملا رو پڑی، "میری بھابھی! مجھے مجبور مت کرو۔ میں کھا نہ سکوں گی۔"

"تھوڑے سے چاول۔"

"نہیں، نہیں۔ رکھ دو کسی ڈبے میں۔ رات کو کھا لوں گی۔"

جاتے ہوئے وہ پتاجی کے کمرے میں گئی۔ اُن کے پیر چھوئے اور بولی، "خط لکھوں گی، جواب دیں گے نا؟"

"ضرور دوں گا۔"

"ترویندرم آئیں تو میرے گھر ضرور آنا۔"

انھوں نے اُسے اپنی دو کتابیں دیں، بولے، "راستے میں پڑھنے کے لیے رکھ لو۔ لمبا سفر ہے، یہ تیری تنہائی کو کچھ تو بانٹ ہی لیں گی۔"

نیچے کی برتھ تھی۔ ہمسفر بھی ترویندرم جا رہے تھے۔ شیا ملا جیسے اُن دونوں کو بھول کر انھیں سے اپنی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ لیکن جیسے ہی گاڑی نے سیٹی دی، اجیت اور سمیتا اُٹھے تو وہ

اُن سے لپٹ کر رونے لگی۔ یکایک سسکیاں بندھ گئیں۔ بڑی محنت سے روکا گیا باندھ آخر ٹوٹ گیا۔ سمیتا نے اُسے چھاتی میں بھر کر پیار کیا اور برتھ پر بٹھا دیا۔ شیاملا اتنا ہی بولی۔" انکت کو بہت بہت پیار کرنا۔ اُسے لے کر ترویندرم آنا۔ خط لکھتی رہنا، تڑپا نا مت۔"

گاڑی دھیرے دھیرے کھسکنے لگی تھی۔ وہ تب تک کھڑکی سے جھانکتی رہی اور روتی رہی جب تک سب کچھ اوجھل نہ ہو گیا۔

سُمیتا، اجیت چپ چاپ بس میں ساتھ ساتھ بیٹھے رہے۔ اجیت نے صرف اتنا ہی کہا، "کیسی گہری کشمکش میں مبتلا ہے، کاش اس میں جتنی ذہانت ہے اتنی ہی ہمت بھی ہوتی، مرد کے بغیر رہنا سیکھ سکتی۔"

سمیتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تھکی بھی نہیں تھی، تیس منٹ کے پورے راستے اپنے آپ میں ہی گھٹتی رہی اور اجیت باہر دوڑتی ٹریفک کو دیکھتا رہا لیکن وہ سب چھلاوہ تھا۔ حقیقت میں وہ دونوں شیاملا کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ بس سے اتر کر گھر کی طرف جاتے ہوئے اچانک سمیتا نے کہا۔" اجیت، تم اُسے روک لیتے تو بچ جاتی بے چاری۔ اپنے گھر میں وہ زیادہ دن نہیں جی سکے گی، دیکھ لینا۔"

اجیت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک ایسا سچ تھا جو اُسے اندر تک جھنجھوڑ گیا تھا۔ وہ گھر کے دروازے پر آ گئے تھے اور اندر سے انکت کی تیز تیز آواز آ رہی تھی۔ وہ باباجی کو بتا رہا تھا کہ آج اُسے کتنے 'گڈ' ملے۔ لیکن جیسے ہی اُس نے ممی ڈیڈی کو دیکھا، بھاگا ہوا آیا، پوچھا، "بوا گئیں؟"

"ہاں بیٹا، گئیں،" اجیت نے جواب دیا۔

سمیتا سیدھے اندر چلی گئی تھی۔ اچانک انکت تیز ہو کر بولا، "تم نے انھیں کیوں جانے دیا؟"

"کیونکہ بیٹا، وہاں اُن کا گھر ہے۔ اُن کی ماں ہے، بھائی ہے۔"

"اچھا!" ایک لمحے بھر کے لیے انکت رُکا، پھر بولا، "بُوا بہت اچھی تھی۔"

سمیتا نے آواز دی، "اجیت، کھانا میز پر لگ گیا ہے۔ پتا جی سے پوچھو، وہ یہیں آئیں گے یا وہیں بھیج دوں؟"

"انہیں بھیج دے بیٹی" جواب پتاجی نے ہی دیا۔

کھانا کھاتے ہوئے بھی دونوں تقریباً خاموش رہے۔ لیکن دونوں کے اندر ایک سرد جنگ جاری تھی۔ نہیں رہا گیا تو سمیتا بولی "اجیت! تم نے اُسے کتنے روپے دیئے؟"

"تم سے پوچھ کر ہی لوٹ رہے تھے تین سو روپے اور ریزرویشن بھی کروا دیا تھا۔"

"اُس نے لینے سے انکار نہیں کیا؟"

"نہیں۔"

پھر گہری خاموشی۔ جیسے جنگ کرتے کرتے تھک گئے ہوں۔ چپ چاپ کھاتے رہے۔ تعجب، انکت بھی بہت نہیں چہک رہا تھا۔ بڑا ہو گیا تھا اور زیادہ سمجھدار بھی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پتاجی کے کمرے میں پارٹیشن کر کے اُس کے پڑھنے کے لیے الگ کمرہ تیار کر دیا گیا تھا۔ ایک الماری دیوار میں تھی ایک لکڑی کی اور ایک ڈیسک۔ پتاجی کی طرح ہی زمین پر فرش لگا تھا۔ اجیت اور سمیتا دونوں اوپر سوتے تھے۔ بیٹھنے کا کمرہ کھانے کے کمرے کے برابر تھا۔ کھانے کی ایک میز اوپر برآمدے میں بھی تھی۔ مہمان آتے ہی رہتے تھے۔ تب ممی پاپا نیچے سوتے تھے۔ اب تک سو رہے تھے، کیونکہ اوپر شیاملا سوتی تھی۔ آج وہ اپنے کمرے میں سوئیں گے۔

تعجب، سمیتا کے پلنگ پر ایک بند لفافہ رکھا تھا۔ پتہ کی جگہ پر لکھا تھا۔ 'سمیتا بھابھی کے لیے' سارا کام چھوڑ کر وہ اُسے پڑھنے بیٹھ گئی۔ اجیت کہیں چلے گئے تھے۔ پڑھتے پڑھتے سمیتا کئی بار رونے لگی۔ کئی بار رکی اور کہیں کھو گئی۔ شیاملا نے لکھا تھا۔

"سمیتا بھابھی، تمہارے گھر میں بیٹھ کر تمہیں ہی خط لکھ رہی ہوں۔ تین ہفتے تمہارے گھر میں رہی۔ نہ جانے کتنی بار سوچا کہ چاہوں تو میں اس گھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہ سکتی ہوں لیکن...

"یہی لیکن تو سب سے بڑا خلل ہے۔ کیوں رہوں میں؟ کس حق سے تمہاری زندگی میں زہر گھولوں؟ کون ہوں میں تمہاری؟ سچ بولو، کون ہوں میں تمہاری؟ تبھی تو بھاگ کر جا رہی ہوں۔ کچھ چھپاؤں گی نہیں۔ میری کہانی تو سب جانتی ہی ہو۔ تم لوگوں کے پاس پڑوس میں میرا سچا تعارف ہو جائے تو کیا حالت ہو میری اور تمہاری۔ ہوں نہ ابھاگن؟ بچپن میں باپ کو کھا گئی۔ شادی ہوئی تو شوہر نے چھوڑ دیا۔ سب میرے کھوٹے کرموں کی وجہ سے ہی تو ہوا۔ شادی کے بعد بھائی میری فکر کیوں کرتے؟

ماں اُن کے بھروسے تھی۔ اس لیے وہ بھی میرے لیے بیگانہ ہو گئی۔

"تب میں کیسے پڑھی، کیسے اپنے زیور بیچ کر کچھ سال بتائے۔ اُس عرصہ میں تمھارے شوہر اردھ ناریشور بن کر میری زندگی میں آئے۔ کیسے انھوں نے میری مدد کی، وہ بھی تم جانتی ہو۔ قبول کروں گی کہ ہماری ملاقات کے شروع کے دنوں میں وہ لمحے بھی آئے جب ہم اپنی شناسائی کھو کر صرف عورت مرد رہ گئے تھے۔ لیکن یقین کرو بھابھی میری، کہ میں نے لکشمن ریکھا کبھی نہیں پار کی۔ تمھاری کہانی سُن چکی تھی بھیا سے۔ اُن سے پیسے لیے۔ جو سنیں گے وہ تو یہی کہیں گے کہ میں موذی ہوں۔ جال پھنسا کر لوگوں کو ٹھگنے والی کُٹنی۔

"اسی لیے میں نے اجیت بھیا سے کہا تھا کہ مرد کے بغیر میری نجات نہیں ہے۔ ایک عدد محافظ جس کا سماج میں موّدبانہ نام ہے شوہر، وہ چاہیے ہی مجھے۔ تم کب تک مدد کرو گے؟ نوکری کبھی ملتی کبھی نہیں۔ پیسے کے بغیر آگے پڑھ نہیں سکتی اور تم جانتی ہی ہو، کیسے اجیت بھیا کی مدد سے ایک ڈاکٹر سے میرا تعارف ہوا۔ وہ ڈاکٹر میرا ناول پڑھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔ ہماری شادی ہو گئی شروع کے دن کیسے گزر گئے۔ پنکھ لگا کر اُڑ رہے ہوں جیسے کسی ماورائی دنیا میں۔ لگا تھا جیسے سُکھ کے دن آ گئے ہیں۔ لیکن میں تو جنم جنم کی ابھاگن جو ٹھہری۔ دھیرے دھیرے مجھ پر یہ راز کھلا کہ ڈاکٹر نہ صرف شرابی ہے بلکہ ذہنی طور پر پراگندہ بھی ہے۔ بہت کوشش کی سمجھوتہ کرنے کی، لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں مار کھاتی رہی اور زندگی گھسٹتی رہی۔ میرے دل کی کیا حالت ہو سکتی تھی، اُسے بیان کرنے کے لیے لفظ کہاں سے لاؤں۔ محسوس کر سکتی ہیں آپ۔

"میری نوکری تھی تو دو مٹھی چاول کا انتظام ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ بھی اُس کی وجہ سے چلی گئی۔ وہ چاہتا تھا، میں اُس کے گاؤں جا کر وہاں کسی اسکول میں پڑھاؤں، لیکن اس کے گاؤں کی حالت میں جانتی تھی۔ اُس کا اپنا کہنے کو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بہن کے رحم و کرم پر جیتا تھا۔ اُسی بہن سے میں نے ایک دن پوچھا تھا — جان بوجھ کر تم نے میری زندگی کیوں برباد کی؟"

"اس کا جواب تھا — ہم سوچتے تھے کہ شاید شادی کے بعد تم اسے سیدھی راہ پر لا سکو گی۔"

"قصور یہاں بھی میرا ہی تھا۔ عورت تھی نا۔ لیکن بھیا جانتے ہیں کہ اس نے میرے ساتھ کیسا بُرا برتاؤ کیا، میرے بھائی کے گھر میں۔ تب بھیا نے مجھے حکم دیا تھا — تو اب اس کے ساتھ نہیں رہے گی۔ یہ

تجھے مار ڈالے گا، مرنا ہی ہے تو خود جدوجہد کرتے ہوئے مرو۔

"اور اب وہی جدوجہد کر رہی ہوں۔ کئی طرح کے تہمت لگاتے ہیں یہاں کے لوگ فاحشہ تک کہتے ہیں۔ عورت سے دوستی کا مطلب ان کے لیے صرف ہم بستری ہے اور ہم بستری کے معنی تعاون نہیں ہوتا۔

"سوچتی ہوں، کیا مقصد ہے جینے کا؛ لیکن مرنے کی ہمت بھی نہیں جٹا پا رہی ہوں۔ پتاجی کے ایک ناٹک میں ایک کردار کہتا ہے ــــ میں جیتا رہوں گا آخری لمحے تک، وہ سب دیکھنے کے لیے جو قسمت نے میرے لیے معین کیا ہے۔"

"میں بھی جیوں گی اُسی لمحے تک۔ لیکن بھابھی، تم سے دل کی بات کہتی ہوں۔ مرد کی کشش سے آزاد نہیں ہو پا رہی۔ ایک عدد اولاد کی خواہش مرد کی خواہش سے ہی تو جڑی ہوئی ہے۔ میں اس مایا جال سے کیوں نہیں نکل پاتی؛

"میں کیا کیا لکھ گئی۔ تم گنگا جیسی پاک ہو۔ شاید اسی لیے تمھارے سامنے خود کو کھول دینا چاہا۔ اسی لیے میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتی کہ تمھاری جائداد پر ڈاکہ ڈالوں۔ بھیا نے جب سے تمھاری کہانی سنائی تبھی سے میں دل ہی دل میں تمھاری پوجا کرتی ہوں۔ اب تمھیں دیکھ کر میرے پیار کا سرچشمہ جیسے کھل گیا۔ کیسی مایا ہے میرے کرشن کی جو میرے خون کے رشتہ دار تھے وہ میرے بیری بن گئے اور جو اجنبی تھے اپنے ہو گئے۔ کیسے بدل جاتا ہے یہ قدرتی سچ؛

"میں جانتی ہوں، تم مجھے چھوٹی بہن بنا کر رکھو گی لیکن میں بھی آخر عورت ہوں، مرد کی قوت کی کشش سے بندھی کمزور عورت۔ نہ جانے کن کمزور لمحوں میں کیا ہو جائے۔ نہ بھی ہو تو وہم کا ماحول تو بن ہی سکتا ہے۔ پہلے زخم کھائے بیٹھی ہو۔ میں کیوں وجہ بنوں، اُس پر نمک چھڑکنے کے لیے؛

"جا رہی ہوں۔ کیسے ہوگا؛ کیا ہوگا؛ پتہ نہیں۔ بھیا کب تک مدد کریں گے؛ جانتی ہوں، وہ کریں گے۔ بغیر کیے رہ نہ سکیں گے۔ دل میں کچھ خیال ہیں۔ گھر جاکر اُنھیں بر عمل کروں گی۔ چوٹ کھا کر بھی کروں گی۔ نتیجہ جو بھی ہو۔

"یقین دلاتی ہوں تمھیں اور بھیا کو، سب کچھ لکھتی رہوں گی۔ اب تمھیں میرے ہو۔ بھیا نے تین سو روپے دیئے ہیں۔ اب وہ میری امانت ہے۔ اُسی میں سے بیس روپے انگوٹھی کے لیے

رکھ رہی ہوں۔ کچھ دینے کا غرور کیا انسان سے چھوٹ سکتا ہے۔ اُس کی بہت یاد آئے گی۔ اس کی تصویر لیے جا رہی ہوں۔ ہمیشہ اپنے دل کے پاس رکھوں گی، اس خواہش کے ساتھ کہ اُس پر مجھ ابھاگن کا سایہ نہ پڑے۔

" اچھا بھابھی میری! اگر انسان کے کئی جنم ہوتے ہیں تو ضرور پچھلے جنم میں میرے بھیا بھابھی رہے ہو تم۔ تبھی آملے ہمالیہ کی اونچائی سے عرب ساگر کے کنارے پہ یہ کیسی کشش ہے، بتا سکو گی؟ آخری بات بھابھی! بھیا بہت سیدھے ہیں کیونکہ کھرے ہیں۔ اُن پر ہمیشہ یقین کرنا۔

تمھاری اپنی

شیاملا "

اجیت نے لوٹ کر دیکھا کہ انکت اپنے باباجی کے پاس ہمیشہ کی طرح سو رہا ہے۔ اور اوپر کمرے میں بتی جل رہی ہے۔ چھاتی پر ایک کھلا خط رکھے سُمیتا سوچتے ہوئے سو گئی ہے۔ یہ کس کا خط ہو سکتا ہے؟ چپکے سے ہاتھ اُٹھا کر لینا چاہا لیکن آہٹ ہوتے ہی سُمیتا ایسے چونکی جیسے کسی درندے نے دبوچ لیا ہو " نہیں... نہیں... ای... ای "

" سُمیتا سمیتا یہ میں ہوں "

سمیتا نے ڈرتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ چہرے کا رنگ لوٹ آیا۔ طویل سانس لے کر اجیت کو دیکھا " تم آگئے؟"

" تم اس طرح گھبرا کیوں گئیں؟ میری آہٹ کیا...؟ "

کئی پل بعد سمیتا بولی " کیسے بتاؤں اجیت۔ جب بھی میری چیتنا کی عدم موجودگی میں کوئی مجھے چھوتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ ایک بار پھر ہیں... "

اجیت تب تک اُس کے سینے پر اپنا بوجھ ڈال کر بیٹھ چکے تھے۔ اس کی بات کا جواب نہیں دیا، پوچھا " کس کا خط ہے؟ کسی امریکن دوست کا...؟"

" تمھارے دوست کا ہے، پڑھ لو میرے نام ہے "

ایک لمحے کے لیے حیران ہونے کا وہم پیدا کرتے ہوئے اجیت نے خط لے لیا۔ حروف دیکھتے ہی

سمجھ گئے۔ فوراً پڑھنے لگے۔ ایک ہاتھ میں خط تھا، دوسرے ہاتھ سے سمیتا کے بالوں کو انگلیوں سے سہلا رہے تھے۔ پڑھ چکے تو چپ چاپ سمیتا کو لوٹا دیا۔

سمیتا کی نگاہیں برابر اُس کے چہرے پر تھیں۔ بولی، "کیا کہتے ہو؟"

"کہنے کو کچھ ہے کیا جو کہوں گا۔ مجھے تو ایشور کے وجود پر شک ہونے لگا ہے۔ کچھ بھی تو انسان سے پرے نہیں ہے۔ وہی دائرے بناتا ہے۔ لکیریں کھینچتا ہے اور پھر انھیں مٹاتا ہے۔ وہ اُن کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، اُن کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا۔"

"جیسے عورت، مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی، اُس کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتی۔"

"یہ تم سشیا ملا کی بات دوہرا رہی یا اپنی؟"

"میں تو تمھاری بات دوہرا رہی ہوں۔ ویسے یہ سب کی بات ہے — گھروندے بنانا، پھر توڑنا۔ پھر بنانا، پھر توڑنا، بنانا، ہر بار گھروندے کا روپ بدلتا ہے۔ دھرتی، آکاش، پاتال، خلا، سیاروں کی دنیا، آکاش گنگا، کہیں بھی رہیں یہ بنانے توڑنے کا عمل وہی رہے گا۔ وہی صداقت کی مسلسل تلاش ہے۔"

اجیت جب تک کپڑے بدل چکے تھے۔ وہیں سے بولے، "سُمی، تم تو امریکہ جا کر فلسفیوں جیسی باتیں کرنے لگی۔"

"پتہ نہیں، فلسفی بنی یا کچھ اور لیکن نگاہ صاف ضرور ہوئی ہے۔ حقیقت کے اُس پار کچھ کچھ دکھائی دینے لگا ہے۔"

"سچ!"

سمیتا نے جواب نہیں دیا، صرف کروٹ بدل لی۔ اس کی گھنی زلفیں پلنگ کے نیچے لٹک گئیں۔ اجیت نے آہستہ سے اُسے اُس کے کندھے پر رکھ کر اُس کا مُنہ اپنی طرف کرلیا۔

سُمیتا نے مسکرا کر کہا، "اب سونے بھی دو۔"

"ایک اطلاع دینی ہے تمھیں۔ اس گہما گہمی میں پہلے نہیں دے سکا۔ ویسے قطعی جواب آج ہی آیا ہے۔ اُسی کا پتہ کرنے گیا تھا۔"

سُمیتا نے آہستہ سے پوچھا، "کہیں جا رہے ہو؟"

"تمھیں کیسے معلوم؟"

"معلوم کیسے نہیں ہوگا؟ مجھ سے بھاگنا جو چاہتے ہو تم۔" سمیتا یکبارگی کہہ گئی۔ اور دوسرے ہی لمحے پشیمانی سے جیسے پریشان ہو اٹھی، لیکن وہ کچھ کہہ پاتی، اجیت نے ہی کہا "تمھیں یاد ہے نا، تمھیں نے خلیل جبران کی وہ سطریں دوہرائی تھیں ___ ایک دوسرے کا پیالہ بھرو۔ ایک دوسرے کے پیالے سے پیو مت۔"

"ٹھیک ہے، لیکن مجھے آئے پندرہ دن بھی نہیں ہوئے کہ . . ."

اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر اجیت نے کہا، "پہلے میری بات تو سنو۔ میں ایک سال کے لیے جاپان جا رہا ہوں۔ یونیورسٹی پروگرام ایکسچینج کے تحت۔ بیچ میں ایک بار یہاں آسکوں گا اور تم بھی ایک بار وہاں آؤ گی انکت کے ساتھ۔ بس اتنی ہی تو بات ہے۔"

سُمیتا اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ زلفوں کو ڈھیلے سے جوڑے میں لپیٹتے ہوئے بولی، "یہ بات ہے تو پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"خط میں لکھا تو تھا، تمھیں بھول رہی ہو اور قصور مجھے دے رہی ہو۔"

اور کہتے ہوئے اُسے اپنی بغل میں کھینچ لیا، "ایک دوسرے کا پیالہ بھرنا چاہیے، یہی ٹھیک ہے، لیکن کبھی کبھی غلطی کرنے کا بھی اپنا ایک لطف ہے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کے پیالے سے چوری چوری پی لینا بھی چاہیے، ایسے۔"

دونوں کھل کھلا پڑے۔ وہ بیباک ہنسی ایک ہو کر کمرے میں گونج اُٹھی۔ اُسی لمحے نیچے پتاجی نے کروٹ بدل کر انکت کو اپنے سے سٹا لیا۔

اچانک سمیتا کی آنکھ کھلی تو دیکھا، نائٹ لیمپ کی ہلکی روشنی کتنی تیز ہو گئی ہے۔ اُس کی روشنی میں وہ سب کچھ دیکھ سکتی ہے۔ اجیت کروٹ بدل کر ڈبل بیڈ کے دوسرے کونے پر پہنچ گئے ہیں۔ باقی سب خاموش ہے۔ جیسے وقت رُک گیا ہو۔ لیکن اجیت کی سانسوں کی آواز وہ بہت اچھی طرح سُن رہی ہے۔ ابھی ابھی اُس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ابھی ابھی وہ بھول بھی گئی۔ بس، اتنا ہی یاد ہے اُسے کہ وہ ڈراؤنا خواب تھا . . .

اچانک ایک خیال ذہن میں کوندھ گیا، اُسے ہی چونکاتا ہوا۔ اجیت نے جب اُسے چھوا تھا وہ کس طرح سے ڈر گئی تھی۔ کیوں ڈر گئی تھی؟ اکثر ڈر جاتی ہے۔ کیوں... کیوں...؟

اس لیے کہ وہ تمھیں یاد دلاتا ہے اُن درندوں کی جنھوں نے تمھاری عصمت کا سودا کیا تھا۔ یاد دلا دیتا ہے اس نیگرو ہم جماعت کی جس نے تمھارے کھلے پن کا غلط مطلب لگایا تھا۔

سچ کہتے ہو تم۔ کیوں آتی ہے بار بار اُن کی یاد؟ کیوں ڈراتے ہیں وہ مجھے اس طرح مسلسل ان چاہے؟

وہ تمھیں نہیں ڈراتے۔ تم خود ڈرتی ہو اُن سے۔

میں ڈرتی ہوں خود؟ جان بوجھ کر؟

ہاں، جن سنسکاروں کے دائرے میں تمھاری پرورش ہوئی ہے وہاں یہ سب ممنوع ہی نہیں گناہ بھی ہے۔ یہ احساس گناہ ہی تمھیں ڈراتا رہتا ہے۔ نہیں تو ایک حادثے کی طرح اُسے تم کبھی کا بھول گئی ہوتیں...

یہ تذبذب اپنے آپ سے ہی یہ سوال و جواب، نہ جانے کتنی بار ہوا۔ ہر بار اُس نے ارادہ کیا کہ وہ اب نہیں ڈرے گی۔ لیکن جب بھی موقع آیا وہ بے ساختہ ڈر گئی۔

اُس نے دھیرے سے بےبس پھُسا کر جیسے اپنے آپ سے کہا، لیکن جب میں ڈر رہی ہوتی ہوں تو میں وہاں ہوتی کہاں ہوں؟ ڈرنے والی میں نہیں ہوتی، سنسکار ہوتے ہیں۔ میں تو صرف سبب ہوں۔

یہ دُنیا بہانوں کے سہارے ہی تو چلتی ہے۔

نہیں میں بہانہ نہیں بنوں گی۔ میں، میں، بنوں گی۔

اور تبھی اُس کی نگاہ اجیت کی طرف اُٹھی۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ لیکن کروٹ اُس نے اُس کی طرف بدل لی تھی۔ اُس کا معصوم چہرہ اُس ہلکی روشنی میں اور خوبصورت لگ رہا تھا۔ ایک پل کے لیے جی میں آیا کہ پاس جاکر اُسے چوم لے، چومتی رہے۔ لیکن اچانک خلل پڑ گیا۔ من کڑوا ہو گیا۔ اجیت کے جاپان جانے کے پیچھے میرے لیے اس کے دل میں پیدا ہو گئی لاتعلقی نہیں ہے کیا؟

ہے۔

ہے تو کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں؟

الگ ہوجانے سے بھی کیا مسئلہ حل ہوجائے گا؟

کیوں نہیں سلجھے گا؟''

کیونکہ لاتعلقی اُسے نہیں، سنسکاروں کو ہے۔ وہی تو اُن سنسکاروں سے مسلسل جوجھتا رہتا ہے، جوجھتے جوجھتے لہولہان ہوجاتا ہے۔ تمھارے لیے اس کے محبت کی تھاہ نہیں بھلانے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ ماں کے بعد تمھیں تو اس کی اپنی ہو۔

وہ چونک پڑی، کیا یہ زیادہ انحصار ہی لاتعلقی اور خوف کی وجہ نہیں ہے؟ یقیناً ہے'

اس لیے تم اُس پر شبہ مت کرو۔ اِسے جانے دو۔ لڑنے دو خود سے۔ تم بھی تو لڑ رہی ہو۔

پھر جیسے کوئی ہنس پڑا ہو۔ اپنے آپ سے لڑتے رہو۔ ایک دوسرے سے مت لڑو۔

ٹیپنا جیسے خود ہنسی تھی۔ واقعی وہی تو ہنسی تھی۔ اور ہنسی کے ساتھ ہی جیسے اُس کے دل کا بوجھ اُتر گیا تھا۔ چپ چاپ اجیت کی طرف دیکھتی مسکراتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے پاس آکر یکبارگی اُسے چھاتی میں بھر لیا۔ گہری نیند سے چونک کر اجیت جاگ اٹھا۔ کچھ پل کے لیے وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا۔ پھر باہوں کے گھیرے نے سب کچھ سمجھا دیا۔ بولا'' ٹمی، ٹمی، یہ کیا ہے؟''

چھاتی میں مُنہ گڑا کر کانپتی ہوئی بولی،'' ڈر لگ رہا ہے۔''

'' کس سے ڈر لگ رہا ہے؟''

'' تمھارے جانے سے۔ یہاں بھی کم درندے نہیں ہیں۔ اکیلی عورت کو دیکھ کر رال ٹپک پڑتی ہے بھیڑیوں کی۔''

'' تم کیا ہر وقت یہی سوچتی رہتی ہو؟''

'' تم نہیں سوچتے؟''

'' یہ تو کوئی جواب نہیں ہوا۔''

'' تو کیا ہوا؟''

'' دلیل۔ اور دلیل مطمئن کم کرتی ہے، ہار جیت کا فیصلہ زیادہ۔''

"خود اعتمادی کیسے ملتی ہے؟"

"خود یقینی سے — میں کے 'ہیں' ہونے سے۔"

"سچ بتاؤ، تم مطمئن ہو؟"

"مطمئن ہوں، تبھی تو جا رہا ہوں۔"

"مطمئن ہوں، ایسا نہ کہہ کر یہ کہنا کیا زیادہ مناسب نہ ہوگا کہ مطمئن ہونے جا رہا ہوں؟"

دھک سے رہ گیا اجیت۔ اچانک ایک جنگ سی چھڑ گئی، لیکن تبھی نیچے سے آوازیں آنے لگیں۔ پتاجی جاگ گئے تھے۔ سمیتا تیزی سے اٹھی "باپ رے، پانچ کبھی کے بج چکے ہیں۔ مجھے چل کر چائے بنانی چاہیے۔ انکت کو اسکول بھیجنا ہے۔"

اور وہ تیزی سے نیچے اترتی چلی گئی۔

اجیت نے واقعی اطمینان کی سانس لی۔

ورتیکا کے جانے کے بعد آج شاہدہ پہلی بار سمیتا سے ملنے آئی۔ چھٹی کا دن تھا۔ انکت کبھی باباجی کے پاس، کبھی ماں کے پاس، کبھی کھیلنے چلا جاتا۔ کالج کے زمانے میں وہ بڑی تیز طرار لڑکی تھی، بیباک اور چنچل۔ لیکن اچانک آن پڑی ذمہ داریوں نے اُسے کچھ اس طرح محتاط کر دیا کہ وہ بے حد خوش دل ہو کر بھی تکلفات نبھانا سیکھ گئی تھی۔ اُسے دیکھ کر سمیتا بے حد خوش ہوئی۔ بولی "آج یاد آئی ہے تمھیں بھابھی کی۔ بیٹھو۔ میں ابھی چائے بنا لاتی ہوں۔"

پھر چائے پر باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو تین گھنٹے کہاں چلے گئے، یہ پتہ ہی نہ لگا۔ امریکہ کی باتیں بہت ہوئیں۔ انھی میں سے نکلی عورت کی بات۔ جہیز، بلاتکار...

یکبارگی شاہدہ بولی، "سنا ہے، آپ نے اس موضوع کا گہرا مطالعہ کیا ہے؟"

"ہاں، ایک میگزین نے مجھے خاص طور پر یہ کام سونپا تھا۔ تب مطالعہ کیا تھا۔ لیکن تم سے یہ سب کس نے کہا؟"

شاہدہ ایک پل کے لیے جھجکی، پھر بولی، "میں 'جن کلیان' کے سابق مدیر سے ملنے آتی ہوں۔ وہ میری غزلیں درست کرتے ہیں۔ وہی کہہ رہے تھے۔ پہلے تو تعریف کرتے رہے، پھر

آہستہ سے بولے، جیسے کوئی راز کھول رہے ہوں۔"
شاہدہ پھر جھجکی۔ سمیتا کا دل بھی دھک دھک کرنے لگا۔ سمجھ گئی، کیا کہا ہوگا انھوں نے۔ پھر بھی اسی پرسکون انداز میں بولی، "رک کیوں گئی، کیا کہا تھا انھوں نے؟"
"انھوں نے کہا تھا، تم بھی بلاتکار کی شکار ہو چکی لگتی ہو۔"
ایک بار پھر سمتیں طوفانی رفتار سے گھوم گئیں۔ دو پل لگے سنبھلنے میں۔ پوچھا، "انھوں نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟"
"کہہ رہے تھے کہ تم نے کسی راج کلی کہانی لکھی ہے۔ اُسی کو تسلی دیتے ہوئے تم نے کہا تھا کہ تمھارے ساتھ کیا نئی بات ہوئی ہے۔ ہمارے جیسے نہ جانے کتنوں کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔"
تعجب، خود کو ہی حیران کرتی ہوئی سمیتا بولی، "ارے وہ، وہ تو میں نے راج کلی کی پوری کہانی جاننے کے مقصد سے کہہ دیا تھا۔ اسے مطمئن کرنے کے لیے۔ یہ بہت ضروری تھا۔ من کی بات سننے کے لیے من لگتی بات کہنی پڑتی ہے اور پھر ہمارے جیسوں میں ہیں کہاں سے آگئی۔ میرے ساتھ ویسا حادثہ ہوا ہوتا تو میں گھر میں کس طرح رہ پاتی؟ خاص طور سے ہندو گھرانے میں؟ کوئی بناتا مجھے اپنے گھر کی بہو؟"
شاہدہ کے چہرے پر جیسے روشنی لوٹ آئی ہو، "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم ایسے ہی ہیں۔ پھر بھی دیدی، آپ وہ باتیں نہ کہتیں تو اچھا تھا۔"
"لیکن شاہدہ، تب اُس کی حالت دیکھ کر میرے مُنہ سے وہی نکل سکتا تھا۔ جو نکلا۔"
"دیدی، آپ نہیں جانتیں، لوگ کتنے خراب ہیں۔ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں اور چٹخارے لے لے کر تذکرہ کرتے ہیں ایسی باتوں کا۔"
"عادت ہے شاہدہ عادت۔ تم نے تو پڑھا ہی ہوگا وہ کون سا ناول ہے جس کا ایک کردار گھر لوٹ کر بیوی سے کھانا لانے کے لیے کہتا ہے۔ کھانا ابھی نہیں بنا ہے، یہ جان کر وہ کہتا ہے — اچھا، جب تک کھانا بنتا ہے تم مجھے شہر میں جو تازہ افواہ پھیلی ہے اُس کے بارے میں بتاؤ۔"
دونوں کھِل کھِلا کر ہنس پڑیں۔ لیکن شاہدہ دیکھ پاتی تو سمیتا کی ہنسی جتنی کھلی تھی اتنی ہی پُردرد بھی اس کے اندر جو اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ اس نے شاہدہ کو دیر تک بٹھائے رکھا "تمھاری کہانی

سُن کر تو مجھے اپنے عورت ہونے پر فخر ہو رہا ہے۔ تم نے تو ایسی ذمہ داری نبھائی جیسی بھائی بھی نہ نبھا پاتا۔"

"کیا کرتی بھابھی! امّی جان کا دُکھ دیکھا نہیں جاتا۔ نوکری سے اتنے پیسے نہیں ملتے۔ کتابت کرتی ہوں۔ ساری ساری رات بیٹھی رہتی ہوں۔"

سمیتا اس غیر ذات کی لڑکی کے لیے عقیدت سے بھر گئی تھی۔ بتا نہیں سکتی تھی، اس لیے چپ رہی۔ یہ ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، چھوت، اچھوت، نیگرو، ڈینش ــ یہ سب کیا ہے؟ عورت مرد سب ایک ہیں۔ خواہشیں، اُمیدیں، حسد، کینہ، نفرت، محبت، تشنگی، آسودگی ــ سب میں ایک سے ہی جذبے ہیں تو . . .

"کہاں چلی گئیں، بھابھی" شاہدہ نے گدگدایا۔

"اوہ!" وہ چونکی، "نہ جانے کیا سوچنے لگی تھی۔ بیٹھو نا۔ اُٹھ کیوں گئی؟"

شاہدہ بولی، "اب چلوں گی۔ دادا بھی آنے والے ہوں گے۔ ہاں، سنا ہے دادا جاپان جا رہے ہیں؟"

سمیتا کانپ اُٹھی۔ "یہ بھی سُن لیا تم نے۔"

"یونیورسٹی میں میرے ایک ماموں زاد بھائی ہیں۔ انھیں سے پتہ لگا ہے۔ سچ، بہت خوشی ہوئی۔ ایسے مواقع کسی کو کہاں ملتے ہیں؟ لیکن اتنی جلدی جانا عجیب سا لگتا ہے۔ جس نے سُنا اُسی نے کہا ــ ابھی تو بیوی باہر تھی۔ وہ آئی تو شوہر چل دیے۔ تمھیں بتاؤ، تمھیں اچھا لگ رہا ہے؟"

"بالکل نہیں۔ لیکن یہ موقع کھونا بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا۔ اور اسی بہانے ایک بار میں بھی جاپان گھوم آؤں گی۔ بہت خوبصورت ملک ہے وہ وہاں ہماری طرح کے رسم و رواج ہیں۔ پتا جی کا ایک ناٹک اسی لیے وہاں کھیلا گیا تھا۔"

"اچھا!" اس اطلاع سے شاہدہ خوش ہوئی۔ اور سمیتا کو موضوع بدل جانے سے کافی راحت ملی۔ اس نے بار بار اصرار کیا لیکن شاہدہ نہیں رکی۔ یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ رات ہو گئی تو اُسے کون چھوڑنے جائے گا۔

سمیتا جیسے جوالا مکھی کے دہانے پر بیٹھی ہو۔ کسی لمحہ دھماکہ ہو اور اس کی چندی چندی بکھر جائے۔

وہ بہت دیکھ اور سُن چکی تھی، اس لیے خود کو بہت جلدی سنبھال لیا۔ ایک انجانے خوف کا سایہ اُس کے دل و دماغ پر منڈراتا رہا۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے کہ صرف ایک جگہ اُس نے ایسا اشارہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ پوری رپورٹ میں کہیں کوئی تذکرہ نہیں۔ پھر بھی اس نکتہ چیں انڈر سکریٹری کے ایجاوٗ ذہن میں یہی اشارہ اہم ہو گیا۔ کیا کیا نہ سوچا ہوگا انھوں نے۔ اہم بھی نہ ہوئے، کے انداز ہیں۔

انکت نہ جانے کب آ کر اُس کی گود میں سو گیا تھا۔ اُسے پلنگ پر لٹاتی ہوئی وہ ہنس پڑی... تبھی دروازے کی گھنٹی بجی اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بات کا ذکر اجیت سے کبھی نہیں کرے گی، لیکن...

لیکن دروازہ کھل چکا تھا۔ اجیت اور پتاجی ایک ساتھ اندر داخل ہو رہے تھے۔

اُس رات اجیت نے سمیتا سے خاص طور سے کہا" اور سب تو تم سنبھال ہی لوگی، لیکن شیاملا کا خاص طور سے دھیان رکھنا۔ کیا کروں...؟"

"تمھیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ خوشی خوشی جاؤ اور خوشی خوشی لوٹ آؤ۔ ہاں، اگر..."

"اگر کیا..."

"اگر آنے کا دل نہ ہو تو لکھ بھیجنا۔ میں اعتراض نہیں کروں گی۔ سچ۔ بس تم بھاگنا مت۔ وہ میں برداشت نہ کر سکوں گی۔"

اجیت جیسے چیخ پڑا "سمیت! تم کیوں مجھے پاگل کرنے پر تُلی ہوئی ہو؟ کیوں بار بار مجھے زخمی کرتی ہو؟"

"میں زخمی نہیں کرتی۔ پڑوس میں، گھر گھر میں چرچا ہے کہ بیوی آئی نہیں، شوہر چل پڑے بدلیش اور..."

"اور...؟"

"وہ سب بھی میں بتاؤں گی۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ میں تو انھیں کے معنی کا بے معنی کرتے من کے چور کی بات کہہ رہی تھی۔ بے چاری اور بے چارے۔ اُن کی ذہنیت کہ شوہر کے بغیر زندگی

ہوتی ہی نہیں عورت کی۔"

"ان کی بات چھوڑو، اپنی کہو۔"

"ایک دن میں بھی اُن جیسی تھی، لیکن اب مجھے کچھ نہیں ہوتا... تھوڑا سا جھوٹ کہہ گئی ہوں۔ ہونا تو ہے، سنسکار ہیں۔ لیکن اب میں نے ان سنسکاروں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"سمیتا..." اجیت نے بہت آہستہ سے کہا۔

"ہوں" سمیتا نے اجیت پر گہری نگاہ ڈالی، "سچ کہوں، اب بھی کبھی کبھی میرا من بھاگنے کو کرتا ہے۔"

سمیتا کو نہ جانے کیا سوجھی۔ دونوں باہوں میں اُسے کس لیا" دیکھتی ہوں کیسے بھاگتے ہو۔"

"سچ سُمیتا، کتنا بھٹکا ہوں میں، لیکن میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے..."

سمیتا نے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا "ایک ہی بات کو بار بار کہنے سے اس کی قدر کم ہو جاتی ہے۔"

پھر دونوں اُسی طرح خاموش ایک دوسرے میں کھوئے، ایک دوسرے سے لپٹے لیٹے رہے۔ تب تک جب تک نیند کی پریوں نے انھیں اپنی آغوش میں نہ لے لیا۔

اچانک ایک خواب دیکھ کر سمیتا کی آنکھ کھل گئی۔ اجیت ہمیشہ کی طرح گہری نیند میں تھے۔ سب کچھ ویسے ہی خاموش تھا اور اس کا من بھی ویسے ہی خیالوں کے جال میں الجھ رہا تھا۔ بالخصوص شاہدہ نے جو اطلاعات اُسے دی تھیں اُن سے وہ بہت مضطرب تھی۔ اچھا ہی ہوتا، وہ سب کچھ کہہ کر آزاد ہو جاتی۔ لیکن جدائی کے اس لمحے میں کہنا اُسے اچھا نہ لگا۔ اُسے خود حیرانی ہوئی کہ وہ اتنی سمجھدار کیسے ہو گئی۔

اور پھر وہ اچانک ایک لمحے میں اس زمانے میں پہنچ گئی، جب وہ اور اُس کی سہیلیاں اپنے اپنے شوہروں کو لے کر خواب بُنا کرتی تھیں۔ خوبصورت، پیار کرنے والا، کمانے والا اور پھر گود بھر دینے والا۔ کوئی کوئی تو یہ بھی سوچتی کہ اُس کا شوہر گھوڑے پر چڑھ کر دوڑتا ہوا آئے گا اور اُسے اُٹھا لے جائے گا۔ لیکن خوابوں کی لکیریں جتنی دلکش، جتنی آسان، ہوتی ہیں، زندگی نہ اتنی دلکش ہوتی ہے نہ اتنی آسان۔ جتنی ہوتی ہے اُس میں رس نہیں ہوتا۔ حادثے، اور درد ایسی تو زندگی کو

جینے کے لائق بناتے ہیں۔ چیلنج نہ ہو تو وہ زندگی کیسی؟

اس کی شروع کی زندگی کتنی پُرسکون، سکھی اور پیار سے لبریز، کتنے بڑے ادیب کی بہو، کیسی پیار کرنے والی ماں جیسی ساس، کیسا سیدھا اور پُرخلوص شوہر جیسے نندن ون میں اڑتی تتلی ہو وہ۔

پھر آیا اچانک وہ زلزلہ۔ سب کچھ الٹ پلٹ گیا۔ لیکن اُسی کے ملبے کے نیچے سے بجلی کا سا تن اور من لے کر نکلی ایک نئی سمیتا۔ زندگی کا مطلب سمجھا اُس نے۔ کھائی خندقوں سے پُر راہ پر جو چلنا جانتا ہے وہی زندگی کی راہ طے کر سکتا ہے۔ سیدھی راہ پر چلنا گھٹنا ہے۔ اور گھٹتی بے جان زندگی سے کہیں اچھا ہے کانٹوں کے درمیان اُن کی چبھن کو سہتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جانا۔

لیکن... لیکن آج بڑی آسانی سے اُس نے ہار مان لی۔ کیوں نہیں اپنے باطن میں رہ رہ کر جاگ اُٹھتے احساسِ گناہ کو پرے دھکیل کر یہ کہنے کی ہمت کر سکی "ہاں میں نے ہونے دیا ہے اپنے ساتھ بلا انکار۔ وہ میرے لیے ایک حادثہ ہے اور زندگی حادثے سے کہیں بڑی ہے کیا...؟"

اسی سوال سے وہ بچنا چاہتی تھی اور یہی بالآخر سامنے آن کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے دل کو سمجھایا — فضول ہی اندھے سماج سے الجھنے سے کیا ملتا ہے؟ کیا ملتا ہے ہر روز اُن کی آنکھوں سے بہتے نفرت کو پینے سے؟ سماج کو بدلنے سے پہلے خود جینا سیکھنا چاہیے۔ اگر اجیت چاہتا ہے تو میں اسی پل جانے کو تیار ہوں۔ کیسا لڑ رہا ہے وہ خود سے، میں کیوں اُسے کمزور کروں؟ اس کی طاقت کیوں بنوں؟

یکبارگی اُسے لگا کہ کوئی ہنس رہا ہے۔ کوئی اُس کے اندر سے ہی ہنستے ہنستے بولا "اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لیے دلیل کو ڈھال بنانا بہت آسان ہے۔"

تعجب، اُس نے اسی سادگی سے کہا، "یہ دلیل نہیں، حقیقت ہے جو خود کو پانے کے لیے ایمانداری سے جدوجہد کر رہا ہے وہ اسے سماج کے سامنے کھڑا کر کے کمزور کروں؟ نہیں، میں ایسا نہیں کروں گی۔ افواہ پھیلتی ہے پھیلے، سماج ہم سے نفرت کرنا چاہتا ہے، کرے۔ لیکن اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہم میں، افواہ پھیلانے والوں میں نہیں ہوتی۔ ہو ہی نہیں سکتی۔"

اور اس نے ایک قطعی ارادہ کے ساتھ اپنا ہاتھ اجیت کے کندھے پر رکھ دیا اور اجیت جیسے

نیند میں ہی اُسے دبانے لگا۔ وہ دبا رہا تھا یا اُس کا وہم تھا، وہ یہ کبھی نہیں جانتی تھی۔ اُسے تو گہری نیند آ رہی تھی۔

جانے کے دن تک لوگوں کا آنا جانا لگا رہا۔ سمیتا ایک پل کے لیے بھی پریشان نہیں ہوئی۔ ورتیکا جی جی کے گھر جو بندیا کام کرتی تھی وہ خود اپنی چھوٹی بہن کو ساتھ لے آئی، بولی، "بڑی دیدی کی چِٹھی آئی تھی، اس لیے کرن کو لائی ہوں۔ جیسے چاہے رکھیے۔ بارہویں میں پڑھ رہی ہے۔ آپ کا کام کرے گی، بھیا کو دیکھے گی۔ آپ اُس کی پڑھائی دیکھ لیجیے۔ آپ سے کچھ سیکھے گی تو یہ بھی نرک سے چھوٹ جائے گی۔"

سمیتا کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا، "یہ تو نے بہت اچھا کیا۔ جیسے تو میری بہن ہے ویسے ہی اِسے بھی چھوٹی بہن بنا کر رکھوں گی۔"

بندیا نے درد بھری آواز میں کہا، "کیا بتاؤں، دیدی! ذرا بھی ہم سلیقے سے رہیں تو درندوں کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ موروثی حق سمجھتے ہیں ہم پر اپنا، لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے۔ یہ حاکم ذات کے لوگ، یہ نواب بھی۔۔۔"

وہ ایک لمحے کے لیے رُکی اور پھر اسی سنجیدگی سے بولی، "اور ہم ہی کیوں، جو اپنے آپ کو اب تک اونچا کہتے رہے ہیں اُن کی بہن بیٹیاں بھی تو کال گرل بن رہی ہیں۔ میں تو انھیں 'کال گرل' کہتی ہوں۔"

'کال گرل'، سمیتا کی ہنسی پھوٹ پڑی، "بندیا، تو نے سہی نام دیا ہے۔ وہ سچ مچ 'کال' ہیں اور 'گرل' بھی۔ لیکن تو فکر نہ کر۔ تو بھی کبھی کبھی کرن کو دیکھنے آتی رہنا۔ لیکن ایک بات کہتی ہوں بندیا، تو نے جنھیں کال گرل کہا ہے وہ بھی مجبور ہیں، نہ جانے کن کن وجوہات سے۔ سب سے بڑی وجہ تو سماج کا موجودہ ڈھانچہ ہے، مرد کا غلبہ اور پھر اُن میں بھی مٹھی بھر مہذب۔"

سمیتا بولتی جا رہی تھی اور بندیا ایک ٹک اس کے مُنہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک سمیتا کو ہی دھیان آیا، بولی، "لو، تمھیں بھی میں بھاشن دینے لگی۔ بابا، بہت کام کرنے ہیں۔ اگر کوئی آ گیا تو۔۔۔"

جملہ پورا کر پائی کہ گھنٹی بجی دروازہ کھول کر دیکھا تو ویبھا ہاتھ میں سوٹ کیس لیے کھڑی تھی۔ خوشی سے بے حال ہو بولی، "ارے تو، آ۔ تو نے تو لکھا تھا آ نہ سکوں گی۔"

ویبھا اندر آکر بولی، "بات یوں ہوئی بھابھی، میں نے لکھا تھا تاکہ انیتہ کو کہیں ایک کیمپ میں جانا پڑا۔ ادھر بھابھی جی بھی کالی کٹ چلی گئیں، ہندی ڈائرکٹوریٹ کے کیمپ میں۔ اُن کے آنے میں ابھی چار دن باقی ہیں، اس لیے مجھے موقع مل گیا۔ پرسوں بھائی صاحب کو ہوائی جہاز میں بٹھا کر لوٹ جاؤں گی۔"

لیکن کچھ لمحے بعد چائے پیتے ہوئے وہی ویبھا بے حد سنجیدہ آواز میں بولی "بھابھی، بھیّا سے ایک لفظ بھی ابھی نہ کہنا۔ وہ دونوں لوٹ آئیں تبھی آخری فیصلہ کروں گی۔ تب تک سب کچھ پہلے جیسا، بس۔"

"پتا جی کو معلوم ہے؟"

"ابھی نہیں، جا کر خط لکھوں گی۔"

"تمھارے بھیّا کو شک ہے کہ..."

"میں جانتی ہوں۔ سمجھا دوں گی۔"

"لیکن ویبھا..."

ویبھا نے ایک دم بات کاٹ دی، "میرے لیے بہت برداشت کیا ہے آپ نے۔ سمجھنے میں دیر لگی لیکن اب پوری طرح مطمئن ہوں۔ اس میدان میں آپ ہی تو میری رہنما ہیں۔"

سمیتا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ وہی کمزور ویبھا ہے جو اس سے دل ہی دل میں نفرت کرتی تھی، آج کس اعتماد سے بول رہی ہے۔ اُسے خوشی ہوئی اور اس نے دھیرے سے اُس کا میز پر پھیلا ہوا ہاتھ دبا دیا۔ جیسے اپنا سارا پیار، ساری ممتا انڈیل رہی ہو۔ اُسے فخر ہوا کہ اُس نے اس دن جو فیصلہ کیا تھا وہ کتنا صحیح تھا...

یکبارگی چونک پڑی۔ ویبھا پوچھ رہی تھی، "کہاں چلی گئیں آپ؟"

وہ جواب دے پاتی کہ گھنٹی پھر بج اُٹھی۔ کئی بار بجی۔ پہلے دوڑ کر انکت آیا اور ویبھا سے چپک گیا، "آپ آگئیں بوا! ممی تو کہتی تھیں آپ نہیں آئیں گی۔"

"ہم تم سے ملنے کیسے نہ آتے، انکت بیٹے۔ دیکھو ہم تمھارے لیے ملک چاکلیٹ بھی لائے ہیں اور..."

تبھی اجیت آگئے، پھر آئے پتاجی، ساتھ میں شاہدہ بھی تھی۔ اب تک وہ اتنی گھل مل گئی تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کوئی غیر ہے۔ سمیتا اُسے رات میں آیا دیکھ کر حیران ہوگئی،

"تو، اس وقت..."

"لو، دادا کو ٹاٹا کرنے نہ آتی۔ ڈر نہیں، چچا جان ساتھ آئے ہیں۔ انڈر سکریٹری سے کچھ کام تھا۔ وہ بات کریں۔ تب تک میں آپ لوگوں کے ساتھ رہ لوں گی۔ شاید دادا انہیں بھی جاپان دکھا دیں۔"

پھر تو سارا گھر قہقہوں سے گونجتا رہا۔ کرن کچھ دیر اجنبی سی شرمائی سمٹی دیکھتی رہی۔ پھر نہ جانے کب وہ اُسی دھارے میں بہہ گئی۔

کل سویرے اجیت کی اڑان تھی۔ رات کو سب پتاجی کے کمرے میں جمع ہوئے۔ بغیر کسی تمہید کے انھوں نے کہا "اچھا ہوتا، اجیت بھی یہاں رہتا۔ وہ ممکن نہ ہوا۔ تمھاری ماں بہت پہلے ہی چلی گئی تھی۔ جاتے وقت تم لوگوں کا بوجھ مجھ پر ڈال گئی۔ ہونا چاہیے تھا الٹا، میرا بوجھ تم لوگوں پر رہتا، خیر۔ تو تم میرے دست نگر ہو، نہ میں تم پر کچھ خاص منحصر ہوں۔ خاص کا مطلب اتنا ہی ہے کہ ابھی خوب چل پھر لیتا ہوں اور معاشی طور پر بھی مجبور نہیں ہوں۔

لیکن انحصار کا مطلب اتنا ہی نہیں ہوتا۔ تمھارے سکھ دُکھ، عزت آبرو، شہرت بدنامی کے ساتھ میری بھی سکھ دُکھ، عزت آبرو، نیک نامی بدنامی جڑی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ تم سب ذہین ہو، معمولی سے کچھ زیادہ ہی ہو۔ غیر مناسب حالات نے تمھیں توڑا کم، جوڑا زیادہ ہے تم سب اپنے اپنے سے جنگ کرتے رہے ہو۔ اُس کا احساس مجھے نہ ہوا ایسا نہیں ہے لیکن مجھے تم پر یقین ہے۔ اوپر سب کچھ کس قدر پرسکون اور پرکشش ہے۔ لیکن مادی عیش و عشرت خوش حالی کی غلط پہچان ہے۔ خوش حالی دل کے سکون، بیقراری سے جڑی رہتی ہے۔

"سب سے زیادہ فخر سمیتا پر ہے۔ وہ آج میرے گھر کی آبرو ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُسی

کی وجہ سے اجیت غلطی پر غلطی کرنے سے بچا ہے۔ اُسی کی وجہ سے و بھانے اپنے آپ کو پہچانا ہے۔ تم لوگوں کے بیچ میں کبھی نہیں آیا، کبھی کبھی صرف تنبیہ کی ہے۔ لیکن ادیب ہوں، حقیقت پر ہی میں نہیں ٹھہرتا۔ اس کے خلاف ورزی کر کے ہی سچ کا پتہ لگتا ہے۔ ویسے سچ بھی تو ایک تصور ہے ایشور کی طرح، تبھی تو گاندھی جی نے کہا تھا "ایشور سچ ہے، یہ کہنے سے زیادہ مناسب یہ کہنا ہوگا کہ سچ ہی ایشور ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں، سچ سے اہم ہے سچ کی تلاش۔

"یہ سب میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ سب سے بڑی چیز ہے خود اعتمادی۔ اُس کے بغیر سچ کی تلاش ممکن نہیں ہے۔ انیتہ یہاں نہیں ہے، اُس کی ایک وجہ ہے۔ ایک فلم دیکھی تھی، آسامی زبان کی کہانی تھی۔ دیوی پوجا کے موقع پر بیٹی شوہر کے بغیر اپنے میکے آتی ہے۔ باپ پوچھتا ہے "بیٹی تو آئی، لیکن داماد کیوں نہیں آئے؟ اسی طرح مسکراتی ہوئی بیٹی جواب دیتی ہے" اپنی دکان میں بہت مصروف ہیں، اس لیے آنا نہ ہو سکا۔

"لیکن سہیلی سے بات کرتے ہوئے وہ دل کی بات کہہ دیتی ہے۔ اس کی سہیلی کا شوہر مر گیا ہے، یہ اطلاع دیتی ہوئی وہ کہتی ہے" وہ مجھے جان سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ بس ایک دن بخار چڑھا اور چلا گیا۔"

تب وہ درد بھری آواز میں کہتی ہے 'ایک گھسٹتی ہوئی زندگی سے دو لمحے کا پیار کتنا سکھ دے جاتا ہے۔'

"اس ایک جملہ میں کتنا درد ہے، کوئی پیمانہ اُسے نہیں ناپ سکتا۔ یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پھر موقع ملے نہ ملے۔ اجیت ایک سال کے لیے جا رہا ہے، میرا کچھ پتہ نہیں۔ ندی کنارے کا رُخ ہوں، کب گر پڑوں۔ لیکن مجھے کوئی فکر نہیں، پروا بھی نہیں۔ بس یہی کہنا چاہتا ہوں کہ تم خوش رہو، گھسٹو مت۔ مجھے امید ہے تم اس گھسٹنے کا مطلب سمجھتے ہو۔"

پھر اجیت کی جانب مڑ کر بولے، "تم کل جا رہے ہے۔ میری اور تمھاری ماں کی دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ سمیتا کے رہتے تمھیں یہاں کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

پتاجی یہاں آکر خاموش ہو گئے۔ وہ تینوں بھی کہیں دور ڈوبے ہوئے تھے۔ اب بھی کوئی ایک لفظ نہیں بولا۔ اجیت نے چپ چاپ اُٹھ کر پاؤں چھوئے اور چلا گیا۔

پتا جی نے ہی پوچھا، "ٹیکسی کے لیے کہہ دیا ہے؟"

"جی ہاں!"

"جاپان کے جو پتے دیئے ہیں سب سے رابطہ کرنا!"

"جی، سبھی کو لکھ دیا ہے!"

دِبھا نے پاس بیٹھ کر اپنا سر اُن کے کندھے پر رکھ دیا، بولی، "آپ مجھ پر یقین رکھیے!" سب سے آخر میں سمیٹا گئی۔ اس کا دل بہت بھرا ہوا تھا۔ اتنا ہی کہا، "آپ نے دل کی باتیں کہیں، اچھا لگا۔ میں واقعی تجربہ کر رہی ہوں، قدرت کو پہچانتی ہوں، تبھی تو اُس سے ڈرتی ہوں۔ ٹوٹتی ہوں، لیکن کھوج کی ہر خواہش میری حفاظت کرتی ہے۔ نتیجہ کیا ہوگا، اس کی فکر نہیں۔ آپ کا آشیرواد میرا سب سے بڑا سہارا ہے۔ میری ماں تو بچپن میں ہی چلی گئی تھی، باپ شادی کرنے کے بعد چلے گئے۔ بھائی اب ملک کے باہر رہتے ہیں۔ آپ سے اور اماں جی سے ہی میں نے پیار کا مطلب سمجھا ہے، کہوں گی پیار کو پہچانا ہے۔ وہی میرا ڈھال ہے!"

وہ بھی پیر چھو کر جانے کو مڑی۔ "آپ سو جایئے، دس بج رہے ہیں۔ تین بجے ہمیں جانا ہے۔ آپ ہوائی اڈے پر جا کر کیا کریں گے؟"

اور پھر اس نے انکت کو اٹھانا چاہا، لیکن پتا جی نے ہاتھ سے روک دیا، "اسے یہیں رہنے دے بہو! تمھیں تو ابھی سامان بھی دیکھنا ہوگا!"

ایک لفظ بھی بولے بغیر سمیٹا اوپر چلی گئی۔ کرن نیچے ہی سو رہی تھی۔ پہلے وہ دِبھا کے کمرے میں گئی۔ چھت کی طرف تاکتی دِبھا نہ جانے کہاں بھٹک رہی تھی۔ اُس کے گال پر پیار سے تھپکی لگاتے ہوئے بولی، "کس کے خیال میں کھوئی ہے میری نند یا!"

ویسا ہی جواب دِبھا نے دیا، "بھابھی کے خیال میں کھوئے اس وقت تو بھیا راہ دیکھ رہے ہیں!"

دونوں ہنس پڑیں۔ اجیت واقعی راہ دیکھ رہے تھے۔ دروازہ بند کر کے پاس بیٹھ گئی اور جیسا وہ اکثر کرتی ہے، مسکرا کر آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ اجیت نے کچھ کہنا چاہا، دور سے آتی ہوئی آواز کی طرح وہ فوراً بولی، "اب ایک لفظ بھی نہیں!"

اور اُس نے اپنے ہونٹ اجیت کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ رات اچانک چلتے چلتے ٹھہر گئی ہو جیسے، بغیر الفاظ بغیر رفتار۔

اجیت کو رخصت کر کے سمیتا جب و بھا اور انکت کے ساتھ گھر کے سامنے ٹیکسی سے اتری تو انکت و بھا کی انگلی پکڑ کر بابا جی کو سب کچھ بتانے اندر کھینچ لے گیا۔ سمیتا ٹیکسی کا کرایہ ادا کرتی کھڑی رہ گئی۔ تبھی سامنے کے مکان کی کھڑکی کھلی۔ معمر خاتون نے پوچھا "پروفیسر صاحب کو چھوڑ آئی؟"

جملے میں جو چبھن تھی اُسے نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے جواب دیا "جی پلین ساڑھے پانچ پر جانا تھا، آج کچھ دیر سے گیا۔ یہاں سے کلکتہ گئے ہیں، وہاں سے ٹوکیو کا پلین لیں گے۔"

"سال بھر باہر رہیں گے؟"

"جی ہاں، سال بھر کا پروجیکٹ ہے۔ اچھا موقع مل گیا ہے۔ بیچ میں ایک بار آئیں گے اور ایک بار میں بھی جاؤں گی۔"

"تم لوگوں میں بڑی ہمت ہے۔ ابھی تم اکیلے امریکہ رہ کر آئی ہو۔ ابھی شوہر چلے گئے جاپان سال بھر کے لیے۔"

"جی، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارے فوجی تو اپنے گھر والوں سے برسوں نہیں مل پاتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ تمھاری نند تو کل چلی جائے گی۔ پھر تم اور تمھارے سسر، دو ہی رہ جائیں گے اکیلے۔"

"جی نہیں، انکت بھی ہے اور کرن بھی۔"

"کرن، وہ نوکرانی۔"

"جی، نوکرانی کیوں؟ میری مدد کرے گی اور پڑھے گی۔ بارہویں میں پڑھتی ہے۔"

"لیکن ہے تو جمادارن کی بیٹی ہی۔"

"جی ہاں، بیٹی تو اُسی کی ہے اور اُسی کی رہے گی۔ اُس کی بڑی بہن بھی ایسے ہی پلی بڑھی ہے۔ میری بڑی نند کے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن اب تو ایک اور بہن یہاں آنے لگی ہے۔ شاہدہ کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ مجھے اکیلی کیسے رہنے دے گی؟"

خاتون ہنس پڑی، "تم لوگ تو بھائی بڑے ہمتی ہو۔ ہم لوگ تو۔۔۔"

تبھی دیکھا، شاہدہ بھاگتی ہوئی وہاں آ کھڑی ہوئی ہے۔ "ارے بھابھی، دادا کو بٹھا آئیں پلیٹ فارم ہیں؟ میں تو آ نہیں پائی۔ صبح اٹھتے ہی بھاگی ہوں۔ آج میری چھٹی ہے۔ دادا کب پہنچ جائیں گے؟"

"آج ہی پہنچ جائیں گے۔ سائنس نے مقامات کے فاصلے کیسے مٹا دیئے ہیں؟"

یکبارگی تبھی ذہن میں ایک خیال کوندھ گیا۔ کاش! وہ دل کی دوری کو۔۔۔

اُسی یکبارگی سے اُس نے گردن کو جھٹکا دیا اور سادگی سے بولی، "آ، اندر آ، ودیا بھی ہے۔ ابھی تو میری چھٹیاں بھی ہیں۔ سارے دن بیٹھ کر گپیں ہانکیں گے۔"

اور وہ اُسے کھینچ کر اندر لے گئی۔ سامنے والی خاتون نے منہ بچکا کر کہا، "کیسے بے شرم لوگ ہیں۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

اور وہ یہ کھلتی بند ہوتی کھڑکیاں، کھڑکیاں باہر ہی نہیں ہوتیں، دل کے اندر بھی ہوتی ہیں اور معنی کا بے معنی وہ بھی کرتی ہیں۔

اور کھڑکیاں ایئر کنڈیشنڈ ٹرین کی بھی ہوتی ہیں، جن سے صرف باہر دیکھا جا سکتا ہے، اندر نہیں۔

ودیا لوٹ آئی، لیکن انیتہ تب تک نہیں آئے تھے۔ اُن کی بھابھی بھی ابھی تک نہیں پہنچی۔ ودیا کو حیرانی نہیں ہوئی، انجانے، اچھا ہے، احساس کے اندر ایک کسک ضرور ہوئی۔ اس لیے اُس نے کالج فون کیا۔ پتہ لگا کہ انیتہ نے ایک ہفتہ کی چھٹی بڑھوالی ہے۔

فون رکھنے کے بعد وہ وہاں بیٹھی اپنے باطن کے کشمکش سے جوجھتی رہی۔ وہ بہت پریشان نہیں تھی، کیونکہ وہ کچھ فیصلہ کر چکی تھی۔ پھر بھی پھانس جب تک نکل نہ جائے تب تک تن من میں کشمکش کی لہریں تیرتی رہتی ہیں۔

اوپر سے وہ پوری طرح شانت تھی۔ تب بھی وہ شانت رہی جب وہ دونوں ایک شام کو ایک ساتھ لوٹے۔ وہ اُس کے لیے بہت سارے تحفے لائے تھے اور کچھ اضافی حوصلہ کے ساتھ اُسے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رات کی تنہائی میں بھی انیتہ نے اظہارِ محبت میں ذرا سی بھی کنجوسی نہیں کی۔ لیکن سات پردوں کے

پیچھے چھپا کر رکھنے پر بھی زندگی کی سرد مہری عیاں ہونے سے رک جاتی ہے کیا؟ اس لیے بیچ بیچ میں وبھا نہ جانے کہاں کھو جاتی تھی۔ تب انیتہ پوچھتے، "وبھا، مائی ڈارلنگ، کیا بات ہے؟ کہاں چلی جاتی ہو تم؟"

وبھا مسکرا دیتی، "جاؤں گی کہاں۔ تمھاری باہوں میں ہی تو ہوں، لیکن آپ بتایئے آپ کہاں ہیں؟"

"تمھاری آغوش میں۔"

"سچ؟"

ایک لمحے کے لیے انیتہ جیسے حیران رہ گیا اور وبھا کو لگا کہ اس کے اندر کا جوالا مکھی پھٹ پڑے گا۔ وہ اُسے روکنے کے لیے کتنا جھلسی، لیکن روک لیا۔ انیتہ نے جیسے اُسے ہاتھوں میں اُٹھا لیا، "ارے کیا سوچ رہی ہو؟"

ایک راستہ مل گیا، بولی، "نہ جانے کیوں مجھے بار بار سمیتا بھابھی کا دھیان آرہا ہے۔ وہ امریکہ سے لوٹی ہی تھیں کہ بھیا جاپان چلے گئے۔ وہ بھی ایک سال کے لیے باہر سب کچھ پُرسکون ہے لیکن اندر کہیں..."

انیتہ نے بڑے پیار سے کہا، "دیکھو وبھا رانی، ان باتوں پر بہت دماغ خراب نہیں کرنا چاہیے۔ آج کی دنیا تیز رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ رفتار کی تیزی رشتوں کی فکر نہیں کرتی۔"

"وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔" طنز سے وبھا مسکرائی، "تمھاری اپنی بھابھی ذرا بھی پریشان نہیں رہتی۔ تمھارے بھائی صاحب کا انتقال ہوئے ایک سال بھی ابھی نہیں گزرا۔"

"وہ ایک عملی خاتون ہیں، تمھاری طرح رام کے زمانے کی سیتا نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میں بھی کوشش کر رہی ہوں عملی بننے کی۔"

جواب میں جو چبھن تھی، انیتہ کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ وہ کھل اُٹھا، "یہ ہوئی نہ بات وبھا جیسی۔"

اور ہنستے ہوئے اُس نے وبھا کو گدگدا دیا۔ وبھا بھی جان بوجھ کر کھل کھلا پڑی۔ وہ دلفریب ہنسی رکی تو اُس نے پوچھا، "اچھا ایک بات بتاؤ، تم تو ادئی گئے تھے نا اور رجا بھی گئی تھیں کا لیکٹ پھر...؟"

انیتہ نے بیچ میں ہی ٹوک دیا، "وہ وبھا، ایسا ہوا کہ جب ہمارا کیمپ ایک دن پہلے ختم ہو گیا تو

ہم کالیکٹ چلے گئے۔ ہم لوگوں نے پیریار لیک اور کنیا کماری جانے کا پروگرام بنالیا تھا، تب وہ لوگ بھی ہمارے ساتھ مل گئے۔"

انیتہ سچ بولنے میں ذرا سی کنجوسی کر گئے۔ وہ کسی گروپ کے ساتھ نہیں، اکیلے گئے تھے۔ وبھا اس بات کو سمجھتی تھی اور اسی لیے اس نے کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زخمی زندگی کے ساتھ گھسٹنے سے کیا فائدہ؟ اس لیے ایک معنی خیز ہنسی ہنس، کہہ کر وہ اُسے سہلاتی ہوئی بے حد اپنے پن کی آواز میں بولی، "ایک بات کہوں؟"

"کیا، بولو؟"

"تم بھابھی جی سے دوسری شادی کی بات کیوں نہیں کرتے؟ ابھی اُن کے سامنے ساری زندگی پڑی ہے۔ جوان ہیں، خوبصورت ہیں اور اپنے پیروں پر کھڑی بھی۔"

انیتہ وبھا سے یہ سب سُن کر ایک لمحے کے لیے حیران اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر دھیرے دھیرے سنجیدہ آواز میں بولا "شاید تم ٹھیک کہتی ہو، وبھا۔ میں بھی کئی بار ایسا ہی سوچتا ہوں، لیکن کوئی مناسب رشتہ ملے تو بات چلا کر دیکھوں۔"

"وہ تیار ہیں کیا؟"

"میں کیا جانوں، میں نے تو کبھی پوچھا نہیں۔ اب تم نے سوجھایا ہے تو لگتا ہے تیار ہو ہی جائیں گی۔ تمھاری طرح انھوں نے حدود نہیں مقرر کر رکھی ہیں۔ امریکہ رہ آئی ہیں۔ تم دیکھ ہی رہی ہو بھائی صاحب کی اچانک موت کے بعد سب سے پہلے کی طرح کھلے طور سے ملتی ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے رُکے، پھر بولے، "اور بھی ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

کئی پل امنڈتی خاموشی کے بعد انیتہ نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا، جیسے دور سے آواز آرہی ہو، "بھیا بڑے انجینئر ضرور تھے، لیکن بھابھی کے قابل نہیں تھے۔ ہر وقت ہیور و کریسی کا مکھوٹا لگائے رہتے تھے۔ اور بھابھی، تم جانتی ہی ہو، وہ ادب سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ اب تو لکھنے بھی لگی ہیں اور بھیا کے لیے رات کی زندگی بھی ایک دھندا تھی، کسی پروجیکٹ کی طرح۔"

"بھابھی نے تمھیں یہ سب بتایا؟" اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وبھا نے پوچھا۔

"بھابھی کے بتانے سے ہی کیا میں سب کچھ جانوں گا۔ بھیا تو میرے تھے۔ میں انھیں نہ پہچانوں گا تو کون پہچانے گا؟ تم نے بھی تو دیکھا ہے۔"

وبھا اچانک ہنس پڑی، "ہاں دیکھا ہے، لیکن تمھاری طرح نہیں۔ تمھاری پرکھ بہت تیز ہے۔"

انچاہے اس تناؤ سے نجات پانے کی کوشش کرتے ہوئے انیتہ بولے، "کیا تم میری پرکھ نہیں ہو؟"

"تمھاری یا سمیتا بھابھی کی؟" وبھا نے پھر نگاہیں ملائیں۔

"ایک ہی بات ہے۔"

"ہاں، سب ایک ہی بات ہے۔" ایک خاص انداز سے وبھا نے کہا اور پھر ایک گہری جماہی لی، بولی، "اب سو جاؤ تم بھی، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اور اس نے کروٹ بدل لی۔ ان حالات کو جھیلتی ہوئی کیسے کیسے کرب سے وبھا گزر رہی تھی، اس لیے انیتہ کا مجرم دل بہت دیر تک ان باتوں کے گہری معنی ڈھونڈتا رہا۔ وہ جانتا ہے کہ وبھا نادان نہیں ہے۔ وہ اُسے چاہتا بھی ہے۔ بھابھی کے لوٹ آنے تک سچے من سے چاہا ہے، لیکن اب؟ بھابھی ہیں نہ جانے کیسا جادو ہے، کیسی کشش ہے کہ اس کا مرد اُسے مجبور کر دیتا ہے اور پھر یہ تخم اُسی کا بیٹا ہے۔ بھائی صاحب کا نہیں۔ بھابھی نے اُسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اُن کی زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن وبھا...

کیا وبھا بھی ساتھ نہیں رہ سکتی؟ نہیں، نہیں، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ تو کیا وہ وبھا سے بات کرے؟ لیکن اتنی ہمت اس میں نہیں ہے۔ تو کیا طلاق کے لیے عدالت میں جائے؟ لیکن وجہ، وجہ تو وبھا کے پاس ہے۔ وہ کیوں نہیں دے دیتی طلاق؟ لیکن میں کیسے کہوں اُس سے؟ لڑوں، ہنگامہ کروں...؟

اچانک نیند کھل گئی۔ ہاتھ بڑھا کر وبھا نے دیکھا، انیتہ وہاں نہیں ہے۔ ایک لمحے کے لیے منہ کا ذائقہ بگڑ گیا۔ جیسے رلائی پھوٹ پڑے گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس نے جیسے اپنے آپ سے ہی کہا ہو، 'کیا کیا سپنے بنے تھے میں نے، اس محبت کے سپنے، جو داخلی ملن سے پیدا ہوتا ہے، جس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے۔۔ سمانے سمانے ہوئے یہ ڈیرو نیمے، یہی محبت تو دو افراد کو ایک بناتی ہے۔

اسی خواب کو لے کر میں نے انیتہ سے شادی کی۔ اور یہ بھی میں بلا جھجک قبول کروں گی کہ اُس نے مجھے وہ محبت دینے کی پوری کوشش کی۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی، مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی عجیب سی تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے کچھ نہیں لیکن ان کا سرد برتاؤ انھیں ایک دم اجنبی بنا دیتا ہے... جب انھوں نے اپنے اور بھابھی کے اس پہلی ملن کا تذکرہ کیا تھا تب ایک لفظ کا استعمال کیا تھا۔ 'میں قبول کروں گا'، میں نے پھر انھیں مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی تھی، میں نے انھیں معاف کر دیا تھا، کیونکہ پہل انھوں نے نہیں کی تھی۔ لیکن بھابھی جب بھی بھارت آتیں ان کا برتاؤ بدل جاتا اور اب تو سب کچھ واضح ہو گیا ہے۔ وہ بھابھی کے ساتھ رہنے کا کوئی موقع نہیں چوکتے اور تب میں نے دیکھا ہے، وہ کتنے کُھلے اور کِھلے رہتے ہیں۔ اور بھابھی بھی...

تبھی اُسے محسوس ہوا کہ باہر کوئی آہٹ ہو رہی ہے۔ اس نے کروٹ بدل لی اور گہری نیند میں ہونے کا ڈرامہ کرنے لگی۔ انیتہ مطمئن ہو کر اُس سے کچھ دوری پر لیٹ گئے، لیکن پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ وبھا نے جماہی لی اور اپنا ہاتھ انیتہ کے اوپر رکھتے ہوئے کہا، "انیتہ، اٹھو گے نہیں، تمھیں تو لیسن تیار کرنے تھے۔"

انیتہ نے سُن کر ان سُنا کر دیا۔

وبھا نے اُٹھ کر اُس کے مُنہ پر ہلکا سا بوسہ دیتے ہوئے کہا، "اُٹھو گے نہیں، تمھیں لیسن تیار کرنے ہیں۔"

انیتہ ایک پل کے لیے کن منایا، پھر فوراً اُٹھ بیٹھا، "کیا کہا تم نے؟"

"لیسن۔"

"اوہ، ہاں مجھے تو لیسن تیار کرنے ہیں۔ تم کتنی اچھی ہو ڈارلنگ۔"

اور اُس نے بھی اُس کے ماتھے پر ایک بوسہ چسپاں کر دیا۔ دونوں ایک دوسرے کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ وبھا جا کر فوراً چائے بنا لائی۔ انیتہ نے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، "تم نے نمائش میں جانے کی بات کہی تھی نا۔ آج چلیں گے۔ میرے پیریڈس سویرے ہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

اور وہ نمائش گئے بھی۔ خریداری بھی کی۔ لیکن سارا وقت انیتہ اپنے دوستوں میں الجھے رہے

جو قدم قدم پر انھیں مل جاتے تھے۔ وبھا بھی ان سے باتیں کرتی تھی، ہنستی بھی تھی، لیکن سب کچھ جیسے کھو پا گیا ہو۔

دونوں کی ہمیشہ کوشش رہتی دونوں کو خوش کرنے کی، لیکن جان کرانجان بننا کتنا بڑا المیہ ہوتا ہے۔ اُسی سے تو وبھا نجات چاہتی ہے۔ جب جیتے جی کسی اپنے کا اپنی ہی زندگی سے غیر حاضر رہنے کا درد بھلے ہی چہرے پر نہ دکھائی دے لیکن اس کے باطن میں بھی اپنی غیر موجودگی کا احساس درج کرا سکا ہو۔ کیا وہ اتنی ریاضت کر سکی؟

وہ ایک دن پھر شہر کے جانے مانے وکیل سردار من موہن سنگھ کے پاس پہنچی۔ سنگھ مہندر جی کے قریبی دوست تھے۔ وبھا انھیں سنگھ چاچا کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ انھیں اپنی پوری کہانی سنا چکی تھی۔ لیکن سمیتا بھابھی کے ساتھ ہونے والے بلاتکار کی بات اُس نے انھیں نہیں بتائی تھی۔ صرف انیتہ کو بتائی تھی۔ اُسے وہ اپنا راز دار مانتی تھی۔ لیکن اب اُسے شبہ ہے کہ انیتہ کا اپنی بھابھی کے لیے لگاؤ بڑھنے کی ایک وجہ سمیتا بھابھی کے ساتھ بلاتکار کا وہ حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی سنگھ بولے، ''آؤ بٹیا، آؤ، کیا خبریں ہیں؟''

''خبر تو آپ جانتے ہی ہیں، سنگھ چاچا۔ اب یہ نقاب اور نہیں اوڑھا جا سکتا۔ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے یہ درد۔ دوہری زندگی کوئی کب تک جی سکتا ہے؟ اور پھر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ دونوں ساتھ رہ کر ایک آدرش زندگی گزار سکتے ہیں۔ جب بھی پاس رہتے ہیں کھلے رہتے ہیں۔ کیوں نہ میں انھیں یہ موقع ہمیشہ کے لیے دے کر حیران کر دوں؟''

سنگھ مسلسل اُس کے چہرے پر نگاہیں گڑائے تھے، بولے، ''میں تمھارے خیالات کی قدر کرتا ہوں، بیٹی! میرے پیارے دوست مہندر جیسے ادیب کی بیٹی اُسی طرح بہادر ہے۔''

''جانتی ہوں، چاچا جی۔ آپ مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ تبھی تو آپ کے پاس آتی رہی ہوں۔ آپ صلاح دیجیے کیا کروں، کیسے کروں؟''

''خوب سوچ لیا ہے؟''

''جی، چاچا جی! مستقبل کے لیے پروگرام بھی بنا لیا ہے، بھاگوں گی نہیں، بس اپنے آپ کو کسی کام میں

لگالوں گی۔ اور اُسی عمل میں کوئی اچھا رازدار مل گیا تو اُسے ہمسفر بھی بنالوں گی۔"

سنگھ چاچا مسکرائے۔ پھر کئی پل خاموش رہے۔ بالآخر بولے، "دیکھو بیٹی، جیسا میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، ایک راستہ تو یہ ہے کہ تم دونوں میں کوئی ایک عدالت میں طلاق کے لیے مقدمہ دائر کرے، اُس کے لیے تمھیں ثابت کرنا ہوگا کہ تمھارا ساتھی ظالم نامرد یا دوسری عورتوں سے تعلقات رکھتا ہے یا کسی موذی مرض کا شکار ہے۔ اگر تمھارے شوہر مقدمہ کرتے ہیں تو انھیں بھی ایسے ہی ثبوت دینے ہوں گے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ تم دونوں مل کر شادی کے منقطع کرنے کے لیے گزارش کرو۔ وجہ تو اس میں بھی دینی ہوگی۔ لیکن وہ دونوں کو قبول ہوگا۔ اس لیے اختلاف کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ چھ ماہ بعد دونوں شادی کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔

"ایک بات تو لے کر پھر بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔ اس کا تعلق اولاد سے ہے۔ وہ کسی کے پاس رہے؛ لیکن تمھاری تو اولاد ہے ہی نہیں۔

"اور اب رہی تیسری بات۔ اپنے گزارے کے لیے تم کتنا پیسہ چاہو گی؟"

دبھا نے سلجھے اور سنجیدہ آواز میں جواب دیا، "میں جب اُن کے پاس رہوں گی ہی نہیں تو اُن کا پیسہ کیوں لینا چاہوں گی؟ مجھے اُن سے نفرت نہیں ہے۔ میں انھیں نیچا بھی نہیں دکھانا چاہتی ہوں۔ میں تو چاچا جی اس خیال کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ عورتیں صرف بھڑکیلے پوشاک کی باتیں کرنے میں ہی ہوشیار ہوتی ہیں۔"

سنگھ چاچا نے تحسین کے جذبہ سے دبھا کی طرف دیکھا، "معلوم ہوتا ہے تمھاری ماں نے تمھارے پتا کے آدرشواد کو گھٹی میں گھول کر تمھیں پلا دیا ہے۔ پھر بھی بیٹی میں نے اپنے پروفیشن میں بہت سی عورتوں کو دیکھا ہے، ان کی حالت قابل رحم ہے۔ انھیں بچپن سے سکھایا جاتا ہے کہ بغیر سہارے کے وہ نہیں رہ سکتیں۔ انھیں یہ تعلیم ہی نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکیں۔"

دبھا نے دھیرے سے لیکن پُراعتماد لہجے میں کہا، "لیکن میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔ عورت کے پاس محبت کرنے کی بے پناہ طاقت ہے، اُسی میں وہ اپنی حفاظت دیکھتی ہے۔ اگر وہ محبت مل جائے تو عورت کا دل یقین سے لبریز ہو جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے چاچا جی کہ جب وہ محبت نہ ملے تو وہ کیا کرے؟ کیا وہ اُس گھسٹتی لہولہان زندگی کے ساتھ گھسٹتی رہے، یا اُس سے

نجات پاکر نئی با معنی زندگی کی تلاش کرے ؟ ضرورت خود اعتمادی اور ارادے کی ہے۔ وہ محبت کرنے کا ارادہ کر سکتی ہو تو عمل کرنے کا کیوں نہیں ؟"

سنگھ چاچا نے اچانک پوچھ لیا۔" ایک بات بتا، بیٹی! انیتہ تیری سکھ سہولتوں کا دھیان رکھتا ہے کہ نہیں ؟"

" میں جھوٹ نہیں بولوں گی، وہ میری ساری خوشیوں اور سہولتوں کا دھیان رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے نفرت بھی نہیں کرتے، لیکن وہی کیا محبت ہے؟ محبت تو اپنے آپ میں اتنی مکمل ہوتی ہے کہ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی احساس کی ضرورت ہو جاتی ہے۔"

" ایسی محبت مل سکتی ہے ؟"

" ان دونوں میں کچھ کچھ لگتا ہے ایسی محبت ہے۔ میں انیتہ سے بات کروں گی۔ آپ ایسی اتفاق سے منقطع کی درخواست تیار کر دیں، میں پرسوں لے جاؤں گی۔ اچھا اب میں چاچی سے ملتی چلوں۔"

اس کے دو ہفتے بعد۔ انیتہ اس دن جلد ہی آ گئے تھے۔ وبھا کو کہیں جانا تھا۔ ارپنا بھابی کو بھی یہ بات معلوم تھی، اس لیے وہ بھی جلدی لوٹ آئی۔ دونوں ارپنا کے کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے سے انجانے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اجنبی کی طرح۔ بہت دیر تک ارپنا ایسے ہی دیکھتی رہی، مسکراتی رہی، پھر دھیرے دھیرے کہنے لگی۔" میں نہیں جانتی تھی کہ میں تمھیں اتنا زیادہ چاہتی ہوں۔ اب مجھے لگتا ہے کہ ہماری پہلی ملاقات محض اتفاق نہیں تھی۔ تمھارے بھیا کسی دوسری ذات کے تھے۔ اونچے عہدے کی وجہ سے انھوں نے اپنی سنجیدگی کو اپنا وقار بنا لیا تھا۔ پیار ان کے لیے صرف ہم بستری تھا یا ایک رسم جسے انھیں نبھانا تھا، کسی ہم روجیکٹ کی طرح۔ ان میں نہ حرارت تھی نہ ذاتیت، اکمپیوٹر کا حساب تھا۔ وہ ہمیشہ جلدی میں رہتے تھے۔ وہ صرف دہشت زدہ کر سکتے تھے، آسودہ نہیں، اُن کے جانے کا مجھ پر اثر ضرور ہوا، میرے شوہر تھے، ہندو عورت کے شوہر۔ لیکن میں نے کبھی ان کی کمی محسوس نہیں کی۔ بلکہ تم سے دور رہتے ہوئے بھی ہمیشہ ایسا محسوس کیا کہ تم میرے پاس ہو۔ میں یہ سب اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت ہے۔ میں سہارا نہیں، پیار چاہتی ہوں وہ تم ہی دے سکتے ہو۔ گناہ کی راہ آیا یا ثواب کی راہ، پر تم تمھارا بیٹا ہے۔ تمھارے پاس ہوتی ہوں

تو لگتا ہے جیسے ایک ماورائی روشنی مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ سب کچھ مانوس، سب کچھ اپنا۔ جیسے تم میرے لیے ہی بنے ہو۔ سچ انیتہ، میں تمھیں بے حد پیار کرتی ہوں۔"

انیتہ اس کے اتنا پاس تھا کہ اُس کے کندھے کو چھو رہا تھا۔ اُس نے اپرنا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، "میں بھی تمھیں بے حد پیار کرتا ہوں، میں تمھیں وہ سب کچھ دے سکتا ہوں جو تم چاہتی ہو۔ مجھے بھی تمھارے پاس ہونے پر لگتا ہے کہ تم میرے لیے ہی آئی ہو، واقعی اس روز وہ اتفاق نہیں تھا، دستورِ فطرت تھا۔ دنیا کی زبان میں وہ گناہ ہو سکتا ہے، لیکن ..."

ایک لمحے کے لیے وہ رُکا جیسے رفتار خود رک گئی ہو، لیکن دوسرے ہی پل اسی سادگی سے بولا، "اسے قبول بھی کرلوں تو میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے وبھا کو وہ سب کچھ دینے کی کوشش کی ہے جو ایک شوہر اپنی بیوی کو دے سکتا ہے۔ تعاون، ہم بستری۔ لیکن مجھے لگتا رہا ہے کہ میں وہاں ہوں نہیں۔ وبھا بھی رفتہ رفتہ اس سچ کو سمجھتی رہی ہے اور اب تو وہ سب کچھ جانتی ہے۔"

"یہ جاننا اُس کے لیے بہت ضروری ہے۔ پاپ وہی ہے جو چھپ کر کیا جاتا ہے۔"

"اسی لیے مجھے لگ رہا ہے کہ میں گنہگار ہوں۔"

اپرنا نے اُس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنی باہوں میں گھیر لیا۔ بولی، "جو ہو، گناہ یا ثواب، اخلاقی یا غیر اخلاقی، سچ یہی ہے۔ میں اُس سے سب کچھ کہہ دوں گی۔"

"میں بھی کہہ دوں گا کہ تمھارے ساتھ رہتے ہوئے مجھے جو سکون ملتا ہے وہ اُس کے ساتھ نہیں۔ حالانکہ اُس نے وہ دینے میں کبھی کنجوسی نہیں کی۔ جو وہ دے سکتی تھی۔ ہم اُسے بتا دیں گے کہ ہم کافی عرصہ سے مل رہے ہیں۔"

"ہم اب اور الگ نہیں رہ سکتے۔ ہم ساتھ رہ کر بہت سکھی ہیں۔ کیرل کے سفر میں ہم نے اسے محسوس کرلیا ہے۔ امریکہ میں رہتے ہوئے رابطہ کئی ایسے مردوں سے ہوا جو مجھے چاہتے تھے لیکن میری نگاہ میں وہ بہت گندے تھے۔ مجھے ان کے لمس سے کراہت ہوتی تھی۔ میں نے انھیں کبھی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ لیکن تمھارے ساتھ بات ہی کچھ اور ہے۔ ایک انوکھی خوشبو سے معطر فضا مجھے گھیرے رہتی ہے۔"

"وہی خوشبو میری ناک میں بھی داخل ہو جاتی ہے۔ میں وبھا کو جو وہ چاہے گی دوں گا، لیکن

اُس سے یہی کہوں گا کہ وہ ہمیں الگ نہ کرے۔"

"اگر وہ نہ مانی تو؟"

"نہیں، وہ مان جائے گی۔"

"تمھیں یقین ہے؟"

"تمھیں نہیں ہے؟ کیا تم سمجھتی ہو، وہ جانتی نہیں ہے؟ پھر بھی تم نے اُسے کبھی روتے یا گڑگڑاتے دیکھا؟ وہ ہمیشہ شانت اور خاموش رہتی ہے۔"

تبھی دروازہ کھلتا ہے اور وبھا اندر آتی ہے۔ وہ ویسی ہی پرسکون اور خاموش ہے۔ وہ اُسے دیکھ کر ایک پل کے لیے کانپ جاتے ہیں۔

جیسے ایک گدھ اُن کے اوپر سے اڑتا چلا گیا ہو، لیکن دوسرے ہی لمحے پھر پرسکون ہو کر الگ الگ بیٹھ جاتے ہیں۔ وبھا بھی بیٹھتی ہے، مسکراتی ہے، کہتی ہے، "سچ مچ تم دونوں پاس پاس بیٹھے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ تمھاری کچھ باتیں میں نے سن لی ہیں۔ پچھلے کافی عرصہ سے تمھاری سرگرمیوں سے بھی میں واقف ہوں۔ جانتی ہوں۔ تم دونوں کے دل میں احساس گناہ ہے۔ وہی تو تمھیں کھلے عام ملنے سے روکتا رہا ہے۔ میں اُسی احساس گناہ سے اب تم دونوں کو نجات دلانا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں، میں بہت کچھ کر سکتی ہوں — ذلیل، رسوا۔ تم بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔ ہماری کہانی کو لے کر ویسے ہی تہمات لگا سکتے ہو۔ لیکن میں سوچتی ہوں، اُس سے کیا ہم سکھی ہو سکیں گے؟ طلاق لے کر بھی میں سکون پا سکوں گی کیا؟ سماج تمھیں سزا دینے کی وکالت کرے گا۔ تم دونوں کو الگ الگ کرنے کی مانگ بھی کرے گا لیکن میں جانتی ہوں، تم واقعی ایک دوسرے کے ساتھ سکھی رہ سکتے ہو، کیونکہ تمھیں محبت کا وہ تجربہ ہے جو جوڑتا ہے۔ ادب کے میدان میں تم دونوں ایک دوسرے کے لیے نصیحت بن سکتے ہو۔ ایک دوسرے کے ضمیمہ ہو سکتے ہو۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے۔۔۔!"

وہ ایک پل کے لیے رکی، اوپر دیکھا، شاید کہیں خلا میں سے قوت پانا چاہ رہی ہو۔ اُسی پل اُن دونوں نے بھی جواب تک خاموش، حیران اور ان بوجھ سے بیٹھے تھے، محسوس کیا کہ اُن کے اندر کا گدھ منتقل ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ اُسی لمحے وبھا پھر بول اُٹھی، ویسے ہی پرسکون آواز میں — "میں نے وکیل سے بات کر لی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہم لوگوں کے الگ رہنے میں ہی ہم سب کی بھلائی ہے، ہاں،

ہیں اپنی بھلائی بھی اسی میں مانتی ہوں۔ دو راستے ہیں ہمارے سامنے ــ قاعدے کے مطابق طلاق کے لیے عدالت میں جانا یا آپسی اتفاق سے دونوں کو مل کر جج سے شادی منقطع کرنے کی درخواست اب انتخاب تمھیں کرنا ہے۔ میں ذاتی طور پر اتفاق رائے سے عرضی دینے کے حق میں ہوں۔ طلاق کا مقدمہ وقت بھی لے گا اور ہمیں خرچ کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑے گا۔ اولاد ہماری کوئی ہے نہیں، اس لیے اس کو لے کر اختلاف اُٹھنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ رہی تمھیں میرے خرچ کے لیے رقم دینے کی بات، اُس کے لیے بھی میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں اصرار نہیں کروں گی۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی طاقت مجھ میں ہے۔ جو زندگی میں آج جی رہی ہوں اُس سے مسلسل خون بہہ رہا ہے۔ اس بہاؤ سے نجات پانا میری سب سے بڑی دستیابی ہوگی۔

"پانے میں سکھ ہے، دینے میں مسرت۔ وہی مسرت میں چاہتی ہوں۔ اُمید ہے تمھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ جاتے جاتے میں تم دونوں کے لیے دعا کرتی ہوں کہ سچی محبت کے مستحق ہو کر ہمیشہ آگے بڑھتے رہو، احساس گناہ سے آزاد ہو کر۔ جانتی ہوں، تمھارے ملن کی ابتدا حواس کی آسودگی سے ہوئی تھی اور صرف وہی بہانہ نہ بنا رہے، تم اس کی خلاف ورزی کر سکو، کیونکہ خلاف ورزی ہی سچا حصول ہے۔"

اور وکیل کے ذریعہ تیار کیے گئے اُس نے سبھی کاغذات سامنے رکھ دیے۔ "ہم دونوں کل وکیل کے پاس چلیں گے۔ تب تک آپ غور سے پڑھ لیجیے اور دستخط کر دیجیے۔"

وہ دونوں ابھی بھی حیران تھے۔ محسوس کر رہے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت ہے یا خواب۔ اُن کے مُنہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکل پا رہا تھا۔ لیکن اس اچانک اور اضافی خوشی نے اُن کے اندر ایک طوفان سا برپا کر دیا تھا۔

وبھا نے اس صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ "آپ یقین کیجیے۔ میں نے جو بھی کیا ہے ہوش و حواس میں کیا ہے۔ اس لیے ٹھیک کیا ہے۔ آج رات میں اپنی سہیلی کے گھر پر رہوں گی۔ کل دس بجے آپ سنگھ جی کے گھر پر پہنچ جائیں تو سارے لائحہ عمل پر غور کر لیں گے۔"

اور وہ اُٹھی۔ جیسے آئی تھی ویسے ہی باہر نکل گئی۔ دروازہ بند کر رہی تھی کہ اچانک انیتہ نے جیسے جاگ کر کانپتی آواز میں کہا، "وبھا، کیا میں تم سے دو باتیں کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں کر سکتے؟ لیکن آج کے بعد۔"

اور اُس نے دروازہ بند کر دیا۔

نہ کرتی تو وہ بے ہوش ہو کر خود گر پڑتی۔ باہر وہ جتنی پرسکون دکھ رہی تھی اندر اتنا ہی طوفان برپا تھا۔ جس شخص کو اس نے بے حد پیار کیا تھا اور جس سے مطمئن بھی ہوئی تھی، اسی کو اپنی مرضی سے چھوڑنے یا کھو دینے کا احساس... نہیں نہیں، اُس نے جیسے خود سے ہی، پختہ آواز میں کہا، 'نہیں، میں اس بارے میں نہیں سوچوں گی۔ لیکن...'

شیاملا نے گاؤں لوٹ کر دیکھا کہ آبائی گھر میں اب اُس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ماں بے بس ہے۔ بھائی ہمیشہ اس کا مخالف رہا ہے اور بھابھی جو اب تک اس کی رازدار رہی تھی، اُس نے بھی آنکھیں پھیر لی ہیں۔ اپنے ہی جائے پیدائش پر وہ بے حد اکیلی اجنبی، لیکن ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرنے کو بے چین۔ کئی دن تک وہ بس لکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ دلّی سے ماں، بھابھی، بھتیجوں کے لیے وہ جو کچھ لا سکی تھی، وہ بہت معاون ثابت نہیں ہوئے۔ پاس پڑوس والے پوچھتے، "تیرے شوہر کا کیا ہوا؟"

"کہیں دور نوکری پر چلا گیا۔"

"تو جائے گی؟"

"ابھی نہیں۔"

وہ جانتی تھیں کہ اُس 'ابھی نہیں' کا مطلب ہے 'کبھی نہیں'۔ اس لیے اس نے ایک پروگرام بنایا۔ اس قصبے میں ایک ڈرامہ پارٹی تھی، اور ایک لکھنے والی کے طور پر اُسے اچھی شہرت حاصل تھی۔ ریڈیو پر اُس کے ڈرامے سبھی سنا کرتے تھے۔ اُن میں اُس نے رول بھی کیا تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ وہ اُن کے لیے ایک اچھا سا ڈرامہ لکھے۔

بس اُسی نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنا وقت اُس ڈرامہ پارٹی کو منظم کرنے میں لگائے گی۔ اس لیے اُس نے اس کے کارکنان کو جمع کیا۔ اُن میں ایک نوجوان اداکار بھی تھا۔ کیشون۔ وہ فلم میں کام کر چکا تھا۔ اُس نے تجویز رکھی — "اگر آپ ایک ایسا ڈرامہ لکھ دیں جو با اثر اور وقت کی مانگ کے مطابق ہو تو اُسے اسٹیج کرنے کا وعدہ ہم کرتے ہیں۔ ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

اس نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا، "میں لکھوں گی۔"

اور اس نے لکھا اور خود سب کے سامنے پڑھا، سبھی نے کھلے دل سے اُسے سراہا۔ فوراً ریہرسل کرنے کا انتظام کیا گیا۔ وہ خود دو عورتوں کا رول کر رہی تھی ۔ مظلوم عورت اور ظلم کرنے والی ظالم مکان مالکن کا۔

ذرائع کی کمی واضح تھی، پھر بھی ایک دو ریہرسل دیکھ کر کچھ ہمدرد مل گئے۔ اُس نے رات کی فکر کی نہ دن کی۔ نہ سونے کی نہ کھانے کی۔ کوئی دو مٹھی چاول لا دیتا تو انھیں ہی سوکھی چٹنی سے کھالیتی اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ڈرامہ کی ہدایت کاری بھی تو وہی کر رہی تھی۔ کئی بار تو وہ رات کو گھر بھی نہیں پہنچ پاتی۔

آخر دو ماہ کی انتھک کوششوں کے بعد وہ دن بھی آیا جب ایک رات وہ ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ وہ اتنا کامیاب ہوا کہ عوام کے اصرار پر اُسے تین رات تک اسٹیج کرنا پڑا۔ آس پاس کے قصبوں سے بھی مانگ آنے لگی۔ ہر طرف شیاملا کا نام تھا۔ شیاملا کا جسے گمان تھا، لیکن اُس کے اپنے گھر میں...

ان سارے دنوں میں اُس سے کسی نے سیدھی مُنہ بات نہ کی۔ بس ماں کبھی کبھی پوچھ لیتی: "تو نے کچھ کھایا بھی؟"

"کھا ہی تو رہی ہوں ـــ سوکھی پاپڑی چباتی وہ جواب دیتی۔ کبھی دو مٹھی چاول اور کبھی وہ بھی نہیں۔ لیکن وہ تو ڈوبی رہتی اپنے ہی بنے شیخ چلی کے سپنوں کے جال میں۔ ڈرامہ کامیاب ہوگیا تو اُس کا نام چاروں طرف پھیل جائے گا۔ لوگ اُس کی تعریف کریں گے۔ اخباروں میں مضامین لکھے جائیں گے۔ تب اُسے نوکری بھی مل جائے شاید۔ شاید..."

یہاں پہنچ کر وہ کھو جاتی، ڈوب جاتی اس طلسمی دنیا میں، جہاں احتراز تو ہے لیکن یقین دہانی نہیں۔

بھائی بھابھی ڈرامہ دیکھنے تو گیا آتے، انھوں نے اُس کے تین دن بعد گھر لوٹنے پر خوب ڈانٹا، اور کہا، "یہاں کیوں آئی ہے؟ ناٹک کر، ناچ گا، وہیں رہ، یہاں تیرا کیا کام؟"

اُس نے چپ چاپ ماں کے کمرے میں جانا چاہا، لیکن بھائی کے سر پر تو شیطان نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اُس نے بہن کو زور سے دھکا دیا۔ وہ اس خلاف توقع حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ دور جا کر گری۔ کئی دن بھر پیٹ کھانا بھی نہ کھا سکی تھی۔ سر میں اور ہاتھ پیروں میں، جگہ جگہ خون نکل آیا۔ اُس

کی چیخ نکل گئی لیکن دروازہ بند ہو چکا تھا۔ ماں زور زور سے رو رہی تھی۔ اور رات گھرتی آ رہی تھی، گھرتی آ رہی تھی۔

کافی دیر بے ہوش رہنے کے بعد اُسے کسی کی تسلی دیتی آواز اور لمس کا احساس ہوا۔ "شیامل، شیامل اُٹھو۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔"

وہ کیشون کی آواز تھی۔ ناٹک میں اُس نے اس کے شوہر کا رول ادا کیا تھا۔ شیاملا نے آنکھیں کھولیں، اُسے دیکھا۔ کیشون نے پرخلوص آواز میں کہا، "اٹھو، میرے ساتھ چلو۔"

شیاملا کو پتہ نہیں، وہ کیسے اُٹھی، اور کیسے کیشون اُسے اپنے ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں اور بھی لڑکے لڑکیاں تھے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ وہ ڈرامہ دیکھ چکا تھا۔ جانچ کرنے کے بعد اُس نے کہا، "چوٹ جان لیوا نہیں ہے، لیکن یہ بہت کمزور ہیں۔ انھیں دوا سے زیادہ اچھی غذاؤں کی ضرورت ہے۔"

شیاملا نے سب کچھ سنا۔ واقعی تن کی چوٹ اتنی تکلیف دہ نہیں تھی جتنی من کی۔ مرہم پٹی ہوئی۔ اس نے دوا لی اور کچھ کھایا بھی۔ پھر بولی، "کیشون، مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ۔"

تم اس گھر میں جاؤ گی اب بھی؟"

"جانا ہی ہوگا۔ دوسری کون سی جگہ ہے عورت کے لیے اور پھر ماں کو گھر سے نکلنے والے وہ کون ہوتے ہیں؟ کھانا نہیں دیں گے، یہی نا۔ اس کا انتظام کر لوں گی۔"

گھر لوٹی تو ماتھے پر پٹی بندھی دیکھ کر ماں چیخ اُٹھی۔ اُس نے دھیرے سے کہا، "چنتو مت ماں! چوٹ گہری نہیں ہے۔ اب میں سوؤں گی۔"

"تو نے یہ سب کیا کر ڈالا، شیاملا؟"

"کہانا مجھے سونے دو اب کل بتا دوں گی۔"

پاس کے کمرے سے بھابھی نے ذرا سا دروازہ کھولا، اندر جھانکا۔ سر پر پٹی بندھی دیکھی تو گھبرا گئی۔ لیکن وہ اندر نہیں آ سکتی تھی۔ بہت دیر تک نم آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ تب تک، جب تک ماں بیٹی سو نہیں گئیں۔

اگلے دن کیشون اپنی پارٹی کے ساتھ آیا۔ ہمیشہ کی طرح مسکرا کر اُس نے اس کا استقبال کیا۔ ایک لڑکے نے پوچھا، "کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں"

"آپ نے بہت کام کیا، تبھی کمزور ہو گئیں اور گر پڑیں"

"کبھی کبھی خوشی سے بھی سر چکرا جاتا ہے"

یہ سن کر سبھی ہنس پڑے۔ کافی دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ نہ جانے کب دونوں بھتیجے اُن کے لیے چائے رکھ گئے۔ پیتے ہوئے کیشون نے کہا" ڈرامہ کا کام تو آگے بڑھانا ہے۔ ابھی تم ترویندرم چلو۔ کہیں کام مل جائے تو دیکھیں گے۔ تم تو ریڈیو وائس بھی ہو"

"سوچوں گی۔ لیکن تم اگر۔ ۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

کیشون نے پوچھا" کیا بات ہے، کہو نا"

"مشن اسکول کی نوکری چھوٹ گئی تھی۔ بڑے پادری وہاں رہتے ہیں۔ اُن سے پتہ کر سکو تو۔ ۔"

"میں کروں گا۔ لیکن تم نہیں چلو گی؟"

"آج نہیں۔ دس دن بعد میں خود ہی آؤں گی۔ ہوٹل تلک کے پاس والے میس میں میں اکثر ٹھہرتی ہوں۔ وہیں پتہ کر لینا"

کیشون پانچ دن بعد ترویندرم چلا گیا۔

وہ اب باہر کم، گھر کے اندر زیادہ رہتی تھی۔ سمیتا نے ۲۰۰ روپے بھیج دیے تھے۔ وہ ہمیشہ اُسے لکھتی رہتی تھی۔ جاپان سے اجیت کا بھی خط آیا تھا۔ لکھا تھا ___ " کہیں نوکری کا انتظام ہوا کیا؟ یہاں آئے ایک مہینہ بیت چکا ہے بہت مصروف رہا۔ جاپانی بچوں کو ہندی پڑھاتے ہوئے تمھاری یاد آتی رہی، لیکن یہ تو کالج کے طالب علم ہیں۔

"تمھاری یاد تب بھی آئی جب ہم سب نے مل کر پتا جی کا ایک ناٹک اسٹیج کیا۔ صحیح تلفظ ادا کروانا بہت مشکل ہے۔ یہ تمھاری طرح اپنے لہجے میں بولتے ہیں۔ لیکن شیا ملا یہ لوگ بہت محنت کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت اچھی اداکاری کی۔ کافی تعریف ہوئی۔

"بہت ہی خوبصورت ملک ہے یہ جاپان۔ اسی لیے تو اس کا نام پڑا ہے" اگتے سورج کا ملک"۔ سورج کی پہلی کرن جب یہاں کی قدرت اور یہاں کے مرد کا لمس کرتی ہے تو خوبصورتی مچل اُٹھتی ہے۔ میں ابھی تک ٹوکیو میں ہوں۔ جمہوریت ہے، لیکن راجہ بھی ہے۔ پرانی تہذیب بھی ہے اور بے حد جدید

خیالات بھی۔ پرانا نیا سب ساتھ ساتھ ہیں۔ وہاں آکر تمھیں سب بتاؤں گا۔ سائنس کے میدان میں بے مثال ترقی انھوں نے کی ہے۔ اتنے ہی ایماندار بھی ہیں۔ کسی کی کوئی چیز بس میں چھوٹ جاتی ہے تو ایک ہفتہ میں گھر پہنچ جاتی ہے۔

"چھوٹے چھوٹے بے شمار جزیرے ہیں۔ جوالا مکھی بھی یہاں بہت ہیں، اسی لیے زلزلہ بھی بہت آتا ہے۔ یہ چھوٹا سا ملک کبھی روس اور چین کو ہرا چکا ہے۔ یہاں گیشائیں بھی ہیں اور ایکیبانا بھی۔ پھول سجانے کے فن کو ایکے بانا کہتے ہیں۔ گیشائیں طرزِ رہائش اور خوبصورتی کی تنظیم ہیں۔ مہمان نوازی کا ان کا اپنا طریقہ ہے۔

"سمیتا کے خط سے معلوم ہوا کہ تم کسی ڈرامہ پارٹی میں کام کر رہی ہو۔ تم نے ڈرامہ بھی لکھا ہے اور اُس میں اداکاری بھی کروگی، یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ ساری باتیں لکھنا۔ سمیتا نے تمھیں پیسے بھی بھیجے ہیں۔"

خط پڑھ کر شیاملا کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ ماں کو ترجمہ کرکے بتایا۔ بھابی کبھی کبھی بول لیتی تھی۔ اخلاق کی باتیں اُسے بھی بتائیں۔ تھیٹر میں سارے دوستوں کو بتایا۔ کیشون ایک بار اجیت سے مل چکا تھا تروینڈرم میں۔ اسے ایک خاص خوشی ہوئی۔

اس کی بھی عجیب کہانی ہے۔ کئی بھائی بہن ہیں۔ سب شادی شدہ اور خوشحال۔ سبھی کے پاس باپ کی دی ہوئی جائداد بھی ہے لیکن اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ فوج میں تھا، لیکن اتنا نہیں کہ پنشن مل پاتی۔ جو کمایا وہ باپ نے مکان بنانے میں خرچ کر دیا۔ لیکن مکان اُسے نہیں ملا۔ سب سے چھوٹا تھا۔ ماں بچپن میں ہی چلی گئی تھی۔ باپ بھی چلے گئے تو اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں رہا کہ اُس نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔

یہ ساری باتیں اُسے کیشون نے رفتہ رفتہ بتائی تھیں۔ اُس کی اپنی مصیبت نے کیشون کی مصیبت کو بہت گہرائی تک محسوس کیا۔ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ دونوں کو تسلی اور محبت کی ضرورت تھی۔ دونوں کے اندر انجانے ہی ایک دوسرے کے لیے لگاؤ پنپنے لگا۔

شیاملا جب تروینڈرم گئی تو دونوں ساتھ رہے۔ شیاملا نے کچھ نہیں چھپایا۔ اپنی پہلی شادی کی بات، پھر ڈاکٹر سے شادی کی بات، اجیت سے گہرے تعلقات کی بات — رائی رتی سب کچھ بتا دیا۔

کیشون نے سب کچھ سن کر بہت دھیرے سے کہا، "اگر تمھیں خود کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اب

بھی تیار ہوں تمھیں اپنانے کو۔ تمھاری کہانی ہم دونوں کے بیچ رہے گی۔"

"بہت تھکی گئی ہوں میں۔"

"میں بھی بہت تھکا گیا ہوں۔ میرا بھی اپنا کوئی نہیں ہے، تمھارا بھی کوئی اپنا نہیں ہے۔"

شیاملا نے نگاہ اُٹھا کر کیشون کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔ دونوں کی نگاہوں سے ایک ایسا پل بن گیا جو پیار کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اُس کے باطن میں ایک غیر یقینی اور انجانے خوف کے جو جالے چھا گئے تھے وہ پل بھر میں غائب ہو گئے۔ دل کا آکاش صاف شفاف ہو گیا۔ خوشی سے اس نے اپنا ہاتھ کیشون کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس خاموش اقرار نے دونوں کو ایک مقدس بندھن میں باندھ دیا۔ ایک ہفتہ بعد ایک ہی منزل کے مسافر پیار کے بعد کے باقاعدہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

سمیتا نے کالج سے اور چھٹی بڑھالی تھی۔ فیلوشپ تین سال کے لیے تھی۔ پروجیکٹ کے خاکہ کے علاوہ، وہ پہلی رپورٹ بھی دے چکی تھی۔ کام مسلسل چلتا رہا اور وہ مطالعہ کرتی رہی۔ عورت کے دل کا، مرد کے دل کے ضمن میں "ناری من" رسالہ میں اُس کے مضامین برابر شائع ہو رہے تھے۔ اس دن وہ گھر لوٹی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اُلٹے پیروں واپس آئی۔ تار آیا تھا۔ فوراً کھول کر پڑھا لکھا تھا۔

The sun has appeared with full glory of moon.

Mother and child are healthy, wealthy and wise.

کئی پل تار کو سینے سے لگائے سمیتا کھڑی رہی، خوشی کے سمندر میں بھر دوڑتی ہوئی پتاجی کے کمرے میں پہنچی۔ ہنسی کی وجہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ حیران پتاجی ہی بولے "کس کا تار ہے بیٹی؟"

"نارائن بھائی صاحب کا" کسی طرح مُنہ سے الفاظ نکلے اور تار پتاجی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پڑھ کر پتاجی نے مسرت سے کہا "نارائن ہی ایسا لکھ سکتا ہے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ بھگوان اُسے لمبی عمر دے۔ دونوں کا نام روشن کرے۔"

پھر دو پل خاموش رہنے کے بعد بولے "ایک بات دیکھی بیٹی، اوپر سے کتنا اوگھڑ دانی بے نیاز لیکن اندر سے اُسے کتنی خوشی ہوئی باپ بننے میں۔"

پھر جیسے خود سے ہی کہتے گئے "یہ اپنا پن کتنا کھوکھلا ہے، پھر بھی کتنا باندھتا ہے۔ آزادی اور

بندھن، دونوں ایک ہی سرے پر آجاتے ہیں۔ ۔"

تبھی انکت لوٹ آیا۔ سمیتا نے ہنستے ہوئے اُسے بھی بتایا۔ "ورتیکا بوا جی کو بیٹا ملا ہے۔"

"کہاں سے ملا ہے؟"

"بھگوان سے۔ جیسے تو مجھے ملا ہے۔"

"اچھا۔"

"تیرے پھوپھا جی نے انگریزی میں لکھا ہے، جس کے معنی ہیں" "سورج آج دوپہر پوری شان سے طلوع ہوا۔ ماں اور بچے دونوں صحت مند ہیں اور خوش ہیں اور سمجھدار بھی۔"

بے چارہ انکت، ساتویں جماعت میں ابھی آیا ہے۔ کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ بولا "ممی اس سب کا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب بہت صاف ہے۔ تیری بوا کو دوپہر کے وقت ایک بیٹا ملا ہے جو بہت خوبصورت ہے۔ ماں اور بیٹا دونوں تندرست اور خوش ہیں۔"

"تو ممی، اب جب بوا آئے گی تو سن کو لے کر آئے گی۔ اس کا نام ہم رکھیں گے سنی۔"

"یہ تو اُن سے پوچھنا پڑے گا۔ لیکن چل پہلے تجھے کھانے کو تو دوں۔"

اور اُس نے پکارا، "کرن، تم کہاں ہو؟"

سامنے سے آتی ہوئی کرن نے جواب دیا، "یہ رہی، آنٹی جی۔ یہ آپ کی چائے ہے اور یہ بھیا کا ناشتہ اور یہ آپ کی ڈاک۔"

سمیتا نے فوراً ڈاک دیکھی۔ کتنے خطوط ــــ اجیت کا خط، شیاملا کا خط، دبھا کا خط اور ورتیکا کا بھی سب سے پہلے اس نے ورتیکا کا خط کھولا ــــ

پیاری بھابھی۔

تمھارا خط ملا تھا۔ میں تب شیراز چلی گئی تھی۔ دو دن قبل ہی لوٹی ہوں اور ہسپتال میں ہوں۔ اوپر سے سب کچھ پرسکون ہے، لیکن اندر ہی اندر آگ دہک رہی ہے۔ خمینی نے سامراجیہ شاہی سے تو نجات دلادی، لیکن مذہب اور شریعت کا شکنجہ جس تیزی سے کستا جارہا ہے اس سے تو لگتا ہے کہ ملک کو ہزار سال پیچھے دھکیلنے کی سازش ہے۔

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ یہاں بھی عورت ہی سولی پر چڑھ رہی ہے۔ وہی برقعہ، وہی نماز، وہی عبادت گاہ، جیسے دل بہلانے کا کھلونا ہو۔ نہ اس کے کوئی خیالات ہیں نہ اُسے سیاست میں دخل دینے کا حق ہے۔

پھر بھی میں دیکھتی ہوں، وہ دخل دے رہی ہیں۔ اپنی آزادی کے لیے دخل دے رہی ہیں۔ پکڑی جاتی ہیں اور انھیں بری طرح ستایا جاتا ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اُن حالات کو بیان کرنے کے لیے۔ لیکن لوٹ کر بتاؤں گی۔ ابھی تو ایک بوجھ کندھوں پر آ رہا ہے۔ لیکن تعجب مجھے وہ ایک سُکھ دینے والے احساس، اور تصور سے بھر رہا ہے۔ یہ ہماری زندگی کا کیسا المیہ ہے۔

اچھا، ماما کو میرا پرنام کہنا۔ اجیت کیسا ہے؟ اس پر ہمیشہ یقین کرنا اور دھیان رکھنا اس کا اور اپنا بھی نہ جانے کیوں۔ مجھے تم پر اعتماد بڑھتا جا رہا ہے۔ تم میں ماں کی ساری خوبیاں تو ہیں ہی مستقبل کے خاتون کا ایک تصور بھی تمھارے اندر روپ لے رہا ہے۔ انکت کو بہت پیار دینا۔ اُس کے لیے کچھ بھیجوں گی۔ نارائن آج ہی دو دن کے لیے آنے والا ہے۔ پھر بعد میں آئے گا۔

بہت بہت پیار کے ساتھ۔

تمھاری اپنی

ورتیکا

سمیتا دو پل کے لیے کہیں کھو گئی۔ خط کے الفاظ ذہن میں گونجنے لگے، 'لیکن تعجب! مجھے بھی وہ ایک سُکھ دینے والے احساس اور تصور سے بھر رہا ہے'۔ یہ سُکھ دینے والا تصور، احساسات ــــ بھی اگر سچ ہیں تو پھر عورت بدنام اور مظلوم کیوں ہوتی ہے؟ کیوں؟ اس کا صلہ کیوں نہیں؟ کہیں ایک دلفریب جال تو نہیں جس میں عورت جنم جنم قید میں رہتی ہے۔۔۔؟

اُس نے یکبارگی اپنے کندھے اچکائے۔ اُسے ابھی کئی خط پڑھنے تھے۔ انکت کپڑے بدل کر بابا کے پاس بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ کرن کچن میں تھی۔ اُس نے مطمئن ہو کر اجیت کا خط کھولا۔

'مائی ڈارلنگ' اسے شروع کر کے 'تمھارا ہی' تک سب ایک سانس میں پڑھ گئی۔ بار بار مسکرائی۔ نوجوان محبت کے سپنوں کی ہیجان انگیز زبان کو پڑھ کر؛ انسان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، ہمیشہ ایک

نوجوان، اس کے اندر زندہ رہتا ہے۔

وہ پھر مسکرائی اُسے ڈانٹ سکے، ایسا کچھ بھی نہیں تھا، اس لیے ہنس پڑی لیکن تبھی یکبارگی ایلبر ٹیڈ کے نیچے اس کا دھیان گیا ــــ مندر کی چھت کو کھمبے سنبھالے رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے جڑے نہیں رہتے، دور دور رہتے ہیں۔۔۔

جانتی ہے، یہ خلیل جبران کی ایک سطر کا خلاصہ ہے۔ لیکن کیا اجیت کے اندر یہ سوال ہمیشہ ہلچل مچائے رہتا ہے؛ ہلچل ہے تو اس کا حل بھی ہوگا۔ کیا ہلچل کا ہونا ہی اُس کی ایمانداری کا ثبوت نہیں ہے؛

سوچتے سوچتے اُس نے شیاملا کا خط اُٹھایا۔ خط طویل تھا۔ ڈرامہ کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ ”یہ سب میرے بھائی بھابھی کو پسند نہیں آیا۔ انھوں نے مجھے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ میں سڑک پر گر پڑی۔ ہوش آیا تو کیشون میرے پاس تھے۔ بھابھی، اگر اس دن کیشون نے میری حفاظت نہ کی ہوتی تو کیا میں یہ خط لکھ پاتی؟“

پھر جذبات سے پُر الفاظ میں کیشون کی قابلِ رحم حالات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا تھا۔

”ایک دن اُس نے تجویز رکھی، کیوں نہ ہم شادی کرلیں؟ پہلے تو دل نہیں مانا دو دو بار دھوکہ کھا چکی ہوں۔ کیا کہے گا سماج اگر اس نے بھی۔۔۔؟

”لیکن بھابھی میرا تو دل کہتا ہے کہ یہ سچا ہے۔ ہم دونوں فنکار ہیں۔ ہم ایک سے کرب سے گزر رہے ہیں۔ مل کر کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔ اس لیے میں نے اس کی تجویز قبول کرلی اور کل باقاعدہ شادی بھی کرلی۔

”آشیرواد دو بھابھی۔ تم مہان ہو۔ تمھارا آشیرواد مجھے کامیاب کرے گا۔ بھیا کو بھی لکھ رہی ہوں۔ آپ دو ہی تو ہیں میرے اس دنیا میں۔۔۔؛

پڑھتے ہوئے سمیتا کتنی بار ہنسی، کتنی بار غصے کی آگ میں دہکی۔ بے چاری شیاملا وہی قدیم سہارے کی غلام۔ ایک بار پھر پھنس گئی چھلیا مرد کے پیار کے ریشمی بندھن میں۔ مرد کے طاقت کی کشش سے نجات نہیں پاسکی۔ کیا عورت اسی طرح چھلی جاتی رہے گی اپنے آپ سے۔۔۔؟

نہیں، نہیں، میں یہ کیا سوچ گئی۔ سبھی ایک جیسے کہاں ہوتے ہیں؟ کیشون کو بھی تو سہارا چاہیے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں۔ اُس کا کرشن اس کی حفاظت کرے۔ میں کیوں سوچوں اُن

کے برے کی بات ؟ میں تو آشیرواد ہی دوں گی ۔ وہ سکھی رہیں۔ اس نے جو خواب بنے ہیں وہ پورے ہوں۔ ہم بیکار ہی سنسکاروں کی غلامی کی وجہ سے اُس کے تیسرے شوہر کی بات سُن کر پریشان ہو اُٹھے ہیں۔ مغرب میں عورت بہ آسانی کہہ سکتی ہے ،" ابھی جو ملے تھے وہ تیسرے شوہر تھے۔"

لیکن کیا وہ سکھی ہیں ؟ کیا ہے سکھ کی تعریف ؟ کیا شیاملا کے ساتھ بار بار بلاتکار ہی نہیں ہوا ہے ؟ یہ دوسری بات ہے بلاتکار کرنے والے کو شادی کی شکل میں بلاتکار کی اجازت کا لائسنس مل گیا تھا ۔ ۔ ۔

وہ جانے کیا سوچتی رہتی اگر اُسے وبھا کا خط نہ پڑھنا ہوتا ۔ اُسے لے کر دل میں ایک انجانا خوف تھا ، اس لیے خط کھولتے ہوئے ہاتھوں میں لغزش ہوئی ۔ خط طویل تھا ۔ دل کھول دیا تھا وبھا نے ۔ جیسے جیسے سطریں اُس کی آنکھوں میں تیرتی تھیں وہ ایک انوکھے تجربے سے گزرنے لگتی تھی ۔ جیسے لفظ لفظ اپنے اندر انڈیل رہی ہو ۔ جیسے کوئی ایک ناقابل بیان سکھ دینے والی تصویر ابھر رہی ہو ۔ حادثے کی معمولی سے معمولی بات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اُس نے لکھا تھا ۔

" ۔ ۔ ۔ میں جانتی ہوں بھابھی کہ محبت کے بغیر بھی ملن ہو سکتا ہے ۔ اُس میں ایک دوسرے کے لیے آپسی احترام و عزت اور ایک دوسرے کے لیے غرض کو چھوڑنا ہوتا ہے ۔ اس طرح کے ملن سے زندگی اچھی طرح گزاری جا سکتی ہے ۔ بہت سے لوگ ایسا کرتے بھی ہیں ، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اُن میں سے کسی ایک کے دل میں کسی اور کے لیے محبت پنپ جائے تو اور سب کو راستہ چھوڑ دینا چاہیے ۔ مجھے یقین ہے ، وہ دونوں ــــ انیتہ اور ان کی بھابھی ــــ ایک دوسرے کو سچ مچ پیار کرتے ہیں ۔ ۔ ۔

" ۔ ۔ ۔ اس دن جب میں نے انھیں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ بھابھی جی کی آنکھیں کسی ڈرامہ کے یہ جملے بول رہی تھیں ــــ میں محسوس کرتی ہوں تم میرے لیے سب کچھ ہو اور میں ہمیشہ تمھاری تھی اور تمھاری ہوں ۔ تمھارا سایہ مجھے ہمیشہ گھیرے رہے گا ۔ ۔ ؛

پڑھ چکی تو لگا کہ سب کچھ سچ ہو کر بھی ناقابل تصور ہے غیر ارادی ہے ۔ اس نے سحر زدہ جذبے سے خط کو سینے سے لگا کر آنکھیں بھینچ لیں ۔ خاص طور سے شیاملا کا خط پڑھنے کے بعد وبھا کے خط نے اُسے فخر اور مسرت سے لبریز کر دیا ۔ بچپن میں دادی سے سنا تھا کہ جب بیٹی کی ڈولی اٹھتی تھی تو ماں باپ اُس سے کہتے تھے کہ ' اب تیرے شوہر کا گھر ہی تیرا گھر ہے ۔ تن من سے شوہر کی ہو کر رہنا ' وبھا نے یہی کیا ، لیکن اُسے کیا ملا ؟

وہ چونکی، میں غلط سوچ گئی۔ اُسے تو وہ ملا جس کی عورت کو ضرورت ہے، وہ سوچ ملا جو بیباک بناتا ہے۔ میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ ڈرپوک لڑکی تجربوں کے عمل سے گزرتی ہوئی اس طرح خوف کو جیت لے گی۔ میں کہوں گی، مجھے آج اپنے عورت ہونے پر فخر ہے...

وِبھا اُس کے سامنے ہوتی تو وہ اُسے چھاتی میں بھر کر اتنا پیار کرتی... اتنا پیار کرتی...

کتنا...؟

اتنا کہ...؟

اپنے ہی سوال پر لاجواب اپنے آپ میں ڈوبی ہوئی سمیتا سارے خطوط لے کر پتاجی کے پاس پہنچی اور بولی، "پتاجی، وبھا کا خط ذرا پڑھیے..."

پتاجی نے سمیتا پر نگاہیں جما کر کہا، "تو سمجھتی ہے، اُس نے مجھے نہیں لکھا۔ اُس کا خط پڑھ چکا ہوں، یہ دہی وبھا ہے۔"

"سچ پتاجی! اُس نے عورت ذات کو آسمان سے بھی اونچا اٹھا دیا۔"

"اونچا تو تو نے بھی اُٹھایا تھا۔"

سمیتا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پتاجی ہی بولے، "لیکن سماج نام کا یہ جانور..."

"پتاجی! اپنے آپ کو حیران کرتی سمیتا جیسے چیخ پڑی، "آپ بھی سماج کی فکر کرتے ہیں؟"

اسی شانت انداز سے وہ بولے، "تم نہیں کرتیں کیا؛ اور وبھا بھی تمھاری حالت میں ہوتی تو شاید..."

پھر وہ رُکے۔ دھیرے دھیرے بولے، "بدلے گی۔ رفتہ رفتہ سماج کی ذہنیت بھی بدلے گی۔"

سمیتا نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں کے درمیان ایک گہری خاموشی چھائی رہی۔ آخر میں پتاجی نے ہی اُسے توڑتے ہوئے کہا، "سب اچھی خبریں ہیں۔ لیکن جہاں وبھا کی قربانی پر ناز ہے وہیں شیاملا کے اتفاق میں مجھے کسی بڑی مصیبت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اُسے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں پتاجی۔ اُسے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی، اس لیے نہیں کہ میں شادی کے خلاف ہوں بلکہ اس لیے کہ اُسے آدمی کی پہچان نہیں ہے۔ اُس نے مجھ سے خود کہا تھا کہ شادی کروں گی۔

تو کیرل سے باہر، کسی پنجابی، گجراتی کسی سے بھی، لیکن کیرل والوں سے نہیں، لیکن . . .!"

وہ آگے کچھ کہہ پاتی کہ انکت اُسے پکارتا ہوا آ پہنچا۔ کرن بھی آواز دے رہی تھی۔ وہ انکت کے ساتھ اوپر چلی گئی۔ اُسے سبھی کو خط لکھنے تھے۔ اس بار ناری من کا ایڈیٹوریل بھی اُسے ہی لکھنا تھا اور طویل مضمون بھی جس کا اعلان وہ کر چکی تھی۔ یکبارگی اس نے سوچا۔ کیوں نہ اس بار شیاملا دیکھا اور خود اپنے آپ کو لے کر ایڈیٹوریل لکھوں . . .؟

'ناری من' کے نئے شمارہ کو بازار میں آئے ابھی تین ہی دن ہوئے تھے کہ سمیتا کے پاس فون آنے شروع ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے نظریہ کے مطابق اس مضمون کو دیکھا۔ بیشتر فون خواتین دوستوں کے ہی تھے اسی لیے تعریفی تھے۔ لیکن ابھی ایسے ہمدرد بھی تھے جنھوں نے پرخلوص الفاظ میں کہا تھا، "کاش، آپ نے وہ سب نہ لکھا ہوتا۔ سماج ابھی بھی آپ کو شہادت کا جام پلانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ متوسط طبقہ کے لوگ آپ کے مُنہ پر تعریف کے دو جملے کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اندر سے وہ آپ سے نفرت ہی کریں گے اور آپ سے بچ کر رہنے وا پنے گھر والوں کو آپ سے بچا کر رکھنے کی بھی کوشش کریں گے۔ . .!"

ایک فون یہ بھی تھا۔۔ "تم کیا سمجھتی ہو، تم نے یہ سب قبول کر کے خود کو پاک دامن ثابت کیا ہے؟ جہاں مرضی شامل ہو وہاں بلاتکار نہیں ہوتا؟ اور میں تو ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ عورت کے ساتھ بلاتکار ہو ہی نہیں سکتا۔ عورت کا اصل روپ دیکھنا ہو تو گوتا ڈھیبہ کی ابر ہت کتھا، پڑھو۔ انھیں خواتین میں سے تم بھی ایک ہو۔ . .

"آپ تو کسی کی بھی عصمت بچانے کے لیے خود سے اپنی عصمت داؤں پر لگا سکتی ہیں۔ میری عصمت خطرے میں ہو تو آؤ گی اُسے بچانے؟ دوں پتہ؟ سُنا ہے آج کل آپ کے شوہر بھی یہاں نہیں ہیں؟"

تعجب یہ آواز کسی عورت کی تھی اور یہ کہتے ہوئے وہ خباثت سے کھل کھلا پڑی تھی...

اُن میں ایسے خط بھی کم نہیں تھے جن میں بے شمار عورتوں نے اپنی دبی ہوئی تکلیف کو بیان کیا تھا۔ وہ تکلیف مختلف شکلوں میں تھیں۔ بلاتکار کی شکار ہوئی کئی بہنوں میں سے ایک نے لکھا تھا "آپ کی خود اعترافی نے بہت ہمت مجھے دی۔ میرا ڈر دور ہو گیا اور کہتے ہیں۔ جو ڈر کو جیت لیتا ہے اس کا کوئی بال بھی بانکا نہیں کر سکتا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ چاہے جو کچھ بھی ہو میں اپنی کہانی سب کو بتا دوں گی۔ میں

آپ سے متفق ہوں نام نہاد پاکیزگی سے زندگی کہیں اہم ہے؟"

سمیتا نے اُسے جواب دیا، "میری بہنا، تمھارا خط پاکر مجھے بہت خوشی ہوئی، لیکن اعتراف کرنے سے قبل آپ مجھ سے ضرور ملیں۔ جلدی نہ کریں۔ اچھا۔۔"

سمیتا نے ایڈیٹوریل صفحہ پر شائع اس مضمون میں لکھا تھا۔۔۔

ہم بہت جلد اکیسویں صدی میں داخل ہونے والے ہیں۔ صدی بدلتی ہے، اس کا مطلب صرف زمانہ، بدلنا نہیں ہے۔ قدریں بھی بدلتی ہیں۔ ذہنیت بھی بدلتی ہے، حالات بھی اُسی کے مطابق بدلتے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ انیسویں صدی میں ہمارے ملک میں ہر میدان میں ایک سے بڑھ کر ایک ذہین لوگ پیدا ہوتے تھے۔ ان کے نام عالمی شہرت کے حامل ہیں۔ انھوں نے ملک کی شکل ہی بدل دی۔ کیا یہ کہنا زیادہ مدلّل نہیں ہوگا کہ وہ عظیم شخصیتیں بدلتے حالات کا نتیجہ تھے۔ زمانہ نے خود ان کی تخلیق کی تھی۔ ملک کے کمزور طبقے نے بالخصوص عورت نے اسی صدی میں اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن بیسویں صدی میں جس کا اختتام قریب ہے ایسی قابل تعظیم ہستیاں ابھری نہیں۔ ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ عوامی بیداری کی آواز خود ہی بلند ہو رہی تھی۔ سائنس کی دنیا میں جو نئے نئے ایجادات ہوئے انھوں نے انسان کے اندر وہ حوصلے پیدا کر دیے کہ وہ خالق کو چنوتی دے سکے۔ شاعر کل گورو رویندر ناتھ ٹیگور نے لکھا تھا کہ "ہر آنے والا نیا بچہ یہ اعلان کرتا ہوا آتا ہے کہ خالق نے ابھی انسان سے ہار نہیں مانی ہے۔" لیکن اب لگتا ہے کہ اس صدی میں نہیں تو اگلی صدی میں خالق کو ہار ماننی ہی ہوگی۔ اُسے انسان کے لیے اپنی نشست خالی کر دینی ہوگی۔ روبو اور کمپیوٹر کا جنم اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

لیکن بڑا عجیب ہے یہ ملک۔ اس صدی میں ہوئی ترقی کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک مبصر نے لکھا تھا کہ جب ہم اکیسویں صدی میں چھلانگ لگا رہے ہوں گے تب ہماری پونچھ ہمیں واپس مل جائے گی۔ یعنی ہم پھر سے آدم زمانہ کے حیوانی شکل میں پہنچ جائیں گے۔

ٹھیک لکھا تھا انھوں نے۔ نام نہاد ترقی اگر انسانی اقدار اور انسانی احساسات کی قیمت پر ہوتی ہے تو انسان جانور بن سکتا ہے۔ ایٹم کا ایجاد کر کے آئنسٹین اسی لیے تو رویا تھا۔ تہذیب اگر مٹ گئی تو انسان جانور ہی بن سکتا ہے اور میں سمجھتی ہوں مفکر اس بھیانک سچائی کو قبول کریں گے۔ سائنس کی بے مثال

ترقی کے باوجود انسان بونا ہو رہا ہے۔ صرف سڑکوں پر ناچنا گانا ہی تہذیب نہیں۔ آرٹ تہذیب نہیں ہے، تہذیب کا باعث ہے۔ تہذیب ہے، ہو رہنا۔ بغیر درد کے انسان جانور ہی ہو سکتا ہے۔ انسانی احساسات درد کے بغیر ممکن نہیں۔

لیکن میں بھٹک گئی۔ 'ناری من' میں عورت کو مرکز میں رکھ کر ہی ہم لکھ سکتے ہیں۔ اوپر سے دیکھنے پر لگتا ہے کہ عورت ہر میدان میں آگے ہے۔ کل تک جو کام صرف مرد کے حصے میں تھے۔ ان میں عورت بھی کامیابی کے ساتھ داخل ہو چکی ہے۔ وہ ٹرین چلاتی ہے، ہوائی جہاز اڑاتی ہے، ملک پر حکومت کرتی ہے۔ سائنس، جنگ — ہر طرف آگے ہے وہ۔ لیکن کیسا عجیب و غریب ہے یہ ملک مخلوط وجود اس کی طرز زندگی کا اصل ہتھیار ہے۔ ساری صدیاں ایک ساتھ جیتی ہیں۔ یہاں ماقبل وجود کی مٹی اور لفظ کی رفتار سے اڑنے والا سپر سونک دونوں ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ بھارت میں انسان ایک ساتھ زمانۂ آدم اور اکیسویں صدی میں جیتا ہے۔

عورت کی حالت بھی یہی ہے۔ وہ مرد کی جاگیر بھی ہے، ماں بھی ہے۔ ایک طرف ذہانت کے آسمان میں اس کی کامیابی کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ دوسری طرف لاعلمی، اندھی عقیدت، ظلم، جبر سب اُسے گھٹی میں گھول کر پلائے جاتے ہیں۔ ہر ظلم جو مرد اُس پر کرتا ہے۔ اس کی سزا اُسے ہی بھوگنی پڑتی ہے۔ وہ ظلم بھی سہتی ہے اور سزا بھی برداشت کرتی ہے۔ کن اقدار پر اس قانون کی بنیاد ہے کہ وہ ایک ساتھ ویشیا بھی بنے اور ستی بھی؛ وہ سماج کے اعلیٰ ترین مقام پر بھی رہے، محبت کا آئینہ ماں بن کر اور ہر لمحہ اُسی مرد کی ہوس کا شکار ہو، رکھیل بن کر یا کمزور طبقہ میں جنم لے کر۔ وہ مرد کی ماں بھی ہے اور بھوگیا بھی۔ وہ مرد کی جاگیر ہے جیسے زمین۔

انسانی سماج نے ابھی مخلوط زندگی کا مطلب نہیں سمجھا ہے۔ اس کا مطلب عورت کا مرد میں کھو جانا نہیں ہے — صرف خود سپرد کرنے والی نہیں بننا ہے اُسے۔ مخلوط زندگی کا مطلب ہے عورت مرد دونوں کا بے خوف ہو کر ایک دوسرے کی آزاد حیثیت قبول کر کے ایک دوسرے کو پانا۔

یہ مخلوط زندگی ممکن کیوں نہیں ہو پا رہی ہے؛ کیوں کہ مرد کے دل میں صرف عورت کے جسم کا لالچ ہے یعنی جنسی زندگی ہی اس کا مقصد ہے، اس کو وہ اپنا پیدائشی حق مانتا ہے اور عورت اُس سے اُسی لیے ڈرتی ہے۔ ماں بھی تو وہ مرد کے ذریعہ ہی بنتی ہے اور 'ماں' بننا عورت کا نجات مانا گیا ہے۔ خود

اُس نے بھی اسے ہی زندگی کی معراج مان لی ہے۔ اُسے خوش قسمتی اور ممتا دونوں ہی خواہشوں سے نجات پانا ہوگی۔ اس کا مطلب جبر اور لاقانونیت کو پناہ دینا نہیں ہے۔ خوف اور لالچ سے بے پروا ہونا ہے۔ کیوں کہ جب تک ایسا نہیں ہوتا، عورت 'انسان' کا نام نہیں پاسکتی۔ کیسا المیہ ہے کہ مرد نے ہی عورت کی آزادی کا سوال اٹھایا اور وہی اب اس کے آزاد اقتدار کو قبول نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی ذہنیت اسی تناسب سے نہیں بدلی... رشتوں کو لے کر ابھی بھی گھبراتا رہتا ہے۔

اور مرد نے عورت کے لیے جو کیا وہ حالات کے دباؤ کے تحت کیا۔ وہی دباؤ آگے عورت کے آزاد اقتدار کو مخلوط زندگی کے لیے لازم بنادے گا۔ ایک اور وہم دور کرنا ہوگا۔ عورت پر ظلم کا تعلق صرف معاشی کمی پر منحصر نہیں ہے۔ معاشی کمزوری اور خوشحالی — دونوں طرح کے سماج میں وہ برابر مظلوم رہی ہے۔ مغرب اور امریکہ میں کیا کم بلاتکار ہوتے ہیں؟

'ناری من' کے اگلے شماروں میں ہم انھیں سارے موضوعات پر تفصیل سے تذکرہ کریں گے۔ ابھی ہم تین مثالیں دے کر آج کی عورت کا المیہ اور طاقت کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں جس سے آپ سوچ سکیں اور سمجھ بھی سکیں۔ نام حقیقی نہیں ہیں۔ ہونا کسی کے لیے فائدہ مند بھی نہیں ہے۔

پہلی مثال کے طور پر اُس نے مرتیا کا نام دے کر شیاملا کی کہانی ہو بہو لکھی اور آخر میں لکھا۔ مرتیا تیسری شادی کے لیے راضی ہوگئی کیوں کہ وہ یہ مانتی تھی کہ عورت مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ خوش قسمتی اور ممتا، اتنی المناک زندگی کے باوجود اس کے لیے دلفریب بنے رہے۔

لیکن نہ اُس کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ تھا، نہ شوہر کے پاس۔ جو اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے وہ کیا ایک دوسرے کا پیٹ بھر سکیں گے؟ کیا عورت کے لیے اکیلے رہ کر سماج میں جینے کا ذریعہ نہیں ہوسکتا؟ دو تجربوں کے بعد کیا اس بات کا امکان نہیں ہے کہ تیسرا مرد بھی اُسے چھوڑ نہیں دے گا؟

یہی امکان زیادہ ہے۔ جذباتی جوش کی مدت بہت کم ہوتی ہے اور مرد عورت کو جاگیر مانتا ہے، جو فروخت بھی کی جاسکتی ہے اور گروی بھی رکھی جاسکتی ہے۔

اُسے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

دوسری عورت کا نام سریتا ہے۔ سریتا کی کہانی وبھا کی کہانی تھی جو اپنی مرضی سے شوہر کے راستے سے ہٹ گئی تھی۔ اُس کہانی کے آخر میں اُس نے لکھا — اُسے ذرا بھی دُکھ نہیں ہے۔ وہ

معمول کے مطابق، پوری ذمہ داری کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ وہ مانتی ہے اور ہم بھی مانتی ہوں کہ رشتے ٹوٹنے سے چوٹ لگتی ہی ہے۔ لیکن جب رشتے کے سارے امکانات ختم ہو جائیں تو ان سے چپکے رہنا کہاں کی سمجھداری ہے۔ اس 'چلنے' کو قبول کرنا ہی ہوگا، کیونکہ اس کے ساتھ زندگی تھوڑے ہی نہ رک جائے گی۔ یہ تو مسلسل چلتی رہے گی خاتمہ کے اعلان تک۔ اس لیے ہمیں خود رحم کے جذبہ سے نجات پانے کے لیے آخری لمحے تک چلتے رہنے ہوگا۔ پرانوں میں لکھا ہے نا، جو چلتا ہے وہ ست یگ میں رہتا ہے، جو کھڑا ہے وہ تریتا میں، جو بیٹھا ہے وہ دواپر میں اور جو لیٹ گیا ہے، رک گیا ہے، وہ کل یگ میں ہے۔

کیا اس علامتی کہانی کا مطلب بھی سمجھانا ہوگا؟

تیسری عورت کا نام...

ابھی نہیں، مضمون کے آخر میں اس کا نام بتاؤں گی۔ ابھی تو میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ وہ متوسط طبقے کی ایک فرد ہے۔ لیکن روایتی اقدار میں یقین رکھنے والی ہو کر بھی ایک حد تک نئے زمانے کی پیامبر بھی ہے۔

یہاں سمیتا نے اپنی کہانی کو اختصار سے بیان کرتے ہوئے سوال اٹھایا — انسان کیا وہی ہے جو دکھتا ہے، بالخصوص متوسط طبقہ کے خاندان؛ سنسکاروں کی جکڑن، عورت کی پاکیزگی کا نغمہ دو ہرے پیمانوں میں کھو یا۔ باطن سے چاہ کر بھی وہ اس عورت کو یہ اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ وہ خود کو بے نقاب کرے۔ اور سماج اُسے 'شہید' کے لقب سے نوازے۔

بالکل الٹی حالت تھی اس کے شوہر کی، جو نہ چاہ کر بھی اپنی بیوی کو دوسرے کی باہنوں میں دیکھ کر ایک عظیم افسوس سے وہ بھر اُٹھے تھے اور پھر ایک ایسی نفسیاتی فضا بنتی گئی جس میں پھنس کر وہ مانتے رہتے اور کسی دوسری عورت کی باہنوں میں آزادی کی سانس لیتے...

دل میں بار بار سوال کوندھ جاتا — کیا وہ اپنی مرضی سے اُن غنڈوں کے ساتھ گئی، صرف اپنی ننھی کی عصمت کی حفاظت کے لیے، کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ انجانے میں اُس کے اندر جنسی ناآسودگی کا جذبہ جڑ پکڑ رہا تھا اور اُس دن اُسے آسودگی کا موقع مل گیا ہو؟ ماہرین نفسیات کی رائے میں کبھی کبھی ایسا واقع ہو جاتا ہے جس کا متعلقہ شخص تصور تک نہیں کر پاتا۔

خود اُس عورت نے موقع آنے پر سخت الفاظ میں اس بات کی مخالفت کی کہ اُس کے ساتھ ایسا کچھ واقع ہوا ہے۔ وہ حیران تھی کہ وہ کیسے خود دوہرے تہرے قدروں کو جی رہی ہے۔ وہ شوہر کے باطنی کشمکش سے جوجھتی تھی۔ انھیں جھنجھوڑتی تھی۔ خود کو لہولہان کرتی تھی، پھر بھی سماج کی نگاہ میں ایک سیدھی سادی اور کامیاب زندگی گزار رہی تھی۔

میں نے شروع میں ہی کہا تھا کہ میں اُس عورت کا نام آخر میں بتاؤں گی۔ وہ وقت اب آگیا ہے۔ اِسے یوا، ابھی کہتی ہوں کہ اپنی سہولت کے لیے میں نے ایسا کیا ہے، کیوں کہ وہ عورت میں خود ہوں۔ اور آپ سب جانتے ہیں میرا نام ہے سمیتا۔

سویرے جب چائے لے کر وہ پتاجی کے پاس پہنچی تو وہ جیسے کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ اُس وسیع خلا کے گوشہ میں نہ جانے کیا تلاش کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کر سمیتا نے پکارا۔ "پتاجی چائے لیجیے۔"

وہ چونکے۔ پھر سمیتا کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ہاتھ کے اشارے سے اُسے پاس بلایا۔ اُس کا مُنہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور ماتھے کو چوم لیا، بولے۔ "ابھی تیرا مضمون پڑھ کر پورا کیا ہے۔ جس عورت کی تلاش میں ساری عمر بھٹکتا رہا وہ تو میرے گھر میں ہی بیٹھی تھی۔ سچ بیٹی! تو نے میرے خواب کو پورا کر دیا۔ اپنے کو اس طرح کھلے ڈھنگ سے بے لباس کرنے والی عورتیں اس ملک میں نہ ہوں، ایسا نہیں ہے۔ اس میں فلمی دنیا کی اداکارائیں ہیں، ان کے لیے اخلاقیات کا مطلب کچھ اور ہے۔ ان میں وہ عورتیں بھی ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی میدان میں بے مثال کامیابی حاصل کی ہے اور وہ چاہیں تو جس طرح مرد بیویاں بدل سکتا ہے، اُسی طرح وہ شوہروں کو بدل سکتی ہیں۔ اُن کے لیے رشتوں کے معنی بدل جاتے ہیں۔ میں نہ تو اُن کو قصوروار ٹھہرانا چاہوں گا اور نہ ان کے حقوق کو چنوتی دوں گا۔ پھر بھی میری نگاہ میں ان کی دنیا میں یہ سب آسانی سے واقع نہیں ہوا بلکہ یہ سب اُن کے زخمی انا کے دھماکے کے طور پر آیا ہے۔ وہ عظیم ہو سکتی ہیں، اُن کے تعاون سے بھی کوئی انکار نہیں کرے گا۔ بھارت کی عورت اگر واقعی اپنا حق لینا چاہتی ہے تو اُسے اس راہ کا راہی ہونا ہوگا جس راہ پر و بھا اور تم نے چلنے کی ہمت کی ہے۔"

سمیتا نے سادگی سے جواب دیا۔ "مجھے خوشی ہے، آپ ناراض نہیں ہوئے۔"

"ناراض، وہ کیوں؟"

"کیونکہ وہ مضمون چھپنے سے پہلے میں آپ کو نہیں دکھا سکی۔"

"یہ تو اور بھی اچھا لگا۔ تمھیں اب اور کسی کے بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوتی بھی نہیں چاہیے۔"

"پھر بھی آپ میرے پتا اور استاد، دونوں ہی ہیں۔ اماں جی نے قوت برداشت دی اور آپ نے سمت دی۔"

"اور اجیت نے کچھ نہیں دیا؟"

"پتا جی، انھوں نے تو جانے انجانے بہت کچھ دیا۔ اپنے آپ سے جوجھنا اور لہولہان ہونا تو میں نے انھیں سے سیکھا ہے۔ اور پتا جی، اُن عظیم عورتوں کی طرح میرے پاس تو ایسا کچھ نہیں ہے جس پر میں یا میرا ملک ناز کر سکے۔ میں کسی راہ کی موجد بھی نہیں ہوں۔ میں تو بس اپنی ایک آزاد حکومت چاہتی ہوں۔ سچ مچ پیار کرنا چاہتی ہوں۔ کسی کو اور پیار یقین کے بغیر نہیں ہو سکتا۔"

پتا جی نے نگاہ اٹھا کر اپنی بہو کی طرف دیکھا۔ کئی پل دیکھتے رہے، لیکن وہ کچھ کہہ پائے کہ 'بھابھی بھابھی، کہاں ہو' پکارتی شاہدہ وہاں آکھڑی ہوئی۔ اسی وقت کرن بھی وہاں آئی یہ بتانے کہ چائے اوپر لگا دی گئی ہے۔ انکت تیار ہو کر ہوم ورک کر رہا ہے . . .

شاہدہ نے ادھر بالکل دھیان نہیں دیا، بولتی رہی، "سچ بھابھی! بڑا جگرہ ہے تم میں۔ تم نے ایک بھرپور طمانچہ جڑا ہے سماج کے منہ پر۔ پانچوں انگلیاں ابھر آئی ہوں گی۔"

شمیتا اُسے کھینچتی ہوئی اوپر لے گئی، یہ کہتی ہوئی، "تو اس کا گال سہلانے گئی تھی کیا؟"

"میری جائے بلا۔ میری چلے تو گلا ریت دوں اُس کا۔"

"سماج کا کوئی گلا ہوتا ہے کیا؟ اس کی اتنی شکلیں ہیں کہ وہ غیر متشکل ہو گیا ہے۔"

"ہو گیا ہوگا۔ لیکن ہمارے انڈر سکریٹری تو بڑے کٹّھن بُھنا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے، 'میں نے کہا تھا نا کہ تمھاری دوست مرضی سے اُن غنڈوں کے ساتھ گئی تھی۔ ہمارے بزرگوں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ عورت کا کردار ناقابل عبور، بے پناہ ہے، یوگی کے لیے بھی ناقابل عبور ہے۔' میں نے ان سے یہی کہا، 'اُن سے ملے بغیر آپ انھیں جان ہی نہیں سکتے۔' ویسے تو ایک بار جی میں آیا تھا کہ کہہ دوں کہ انھیں دیکھتے ہی شرم سے سر جھک جائے گا تمھارا، لیکن میرے استاد ہیں اس لیے کہہ نہیں سکی۔ وہی بولے، 'تو پھر ایک دن لے چلو مجھے ان کے گھر . . .'"

"سمیتا نے بات کاٹ دی،" نا، نا، وہ کیوں آئیں گے، ایک دن میں خود ہی اُن کے گھر جاؤں گی۔"

اور واقعی وہ ایک دن، جب اندھیرا ہو رہا تھا، بازار سے لوٹتی ہوئی اُن کے گھر پہنچ گئی۔ وہ اوپر کی منزل میں رہتے تھے اور یہ وقت ان کے مستی کے عالم میں کھوئے رہنے کا تھا۔ اس لیے سمیتا کو اپنے یہاں آیا دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔ انھیں کئی لمحے لگے اپنے کو سمیٹنے میں۔ سمیٹ چکے تو دیکھا کہ بخنگی کی جانب بڑھتی ایک عورت اُن کے سامنے کھڑی ہے۔ مانگ میں سیندور کی سنہری لکیر چمک رہی ہے، ماتھے پر منگل گرہ جیسی بندیا ہے۔ آنکھوں میں سادگی کی چمک۔ وہ کہہ رہی ہے — "نمستے، چاچاجی، شاہدہ کہہ رہی تھی کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے گھر آئیں، ہماری خوش بختی۔ پتاجی کی وجہ سے بڑی بڑی ادبی ہستیاں ہمارے غریب خانے پر تشریف لاتی رہی ہیں۔ لیکن چاچاجی، پہل تو چھوٹوں کو ہی کرنی چاہیے نا۔ میں آپ کی بیٹی ہوں، میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے آپ کے گھر آنے کا موقع ملا۔"

پان سپاری مُنہ میں دبا کر وہ مسکراتے ہوئے بولے، "سچ بیٹی، تمھارا وہ مضمون پڑھ کر دل باغ باغ ہو اُٹھا۔ لیکن بیٹی۔ ہماری سنسکرت زبان میں وہ کیا کہا ہے۔۔۔"

سمیتا ایک دم بولی: "ستیم وِد، پریَم وِد، اپریَم ستیم نہ وِد۔"

"ہاں، ہاں وہی کہ سچ تو بولو لیکن ناخوشگوار سچ نہ بولو۔ ایک بار تو لگا تم نے سچ بول کر بہت بڑی غلطی کی ہے، لیکن وہ مضمون پھر پڑھا، پھر۔۔۔ پھر پڑھا۔ زبان تھوڑی مشکل ہے نا۔ جب سمجھ گیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ کسی میں ہمت ہے کڑوا سچ کہنے کی اور وہ بھی اپنے بارے میں، دوسروں کے بارے میں تو سبھی بڑھ چڑھ کر بول لیتے ہیں۔۔۔"

تبھی اُن کی بیوی آگئیں۔ بالکل ایک گھریلو خاتون۔ بولیں، "اری بٹیا، تو نے تو غضب کر دیا۔ سارے محلّے میں سبھی تیری چرچا کرے ہیں۔ مُنہ بچکا بچکا کر نام دھرے ہیں تجھے۔"

سُمیتا اُسی سادگی سے بولی، "چاچی، جس کے پاس جو ہوتا ہے وہی تو وہ دیتا ہے گالیاں بھلے ہی دیں، لیکن کچھ دیتے تو ہیں۔"

اُس جملے کا مطلب سمجھے بغیر چاچی بڑے ڈرامائی ڈھنگ سے بولیں "اری بٹیا، کیا بتاؤں، وہ جو تمھارے سامنے رہتی ہے نا، اس بوڑھیا نے اپنے بیٹے بیٹیوں، بہوؤں، پوتے پوتیوں، سب سے کہہ دیا کہ وہ تمھارے گھر نہ آویں، اُن کی نگاہ میں تو بدکردار ہے — بری۔"

"ارے چاچی، کیا فرق پڑتا ہے، وہ پہلے ہی کون روز ہمارے گھر آتے ہیں؛ شہروں میں پڑوس ہوتا ہی نہیں۔ لیکن ایک بات ہے چاچی، جب سے وہ مضمون چھپا ہے میں اکیلے پن کو ترس گئی۔"

اور کھل کر ہنس پڑی۔ وہ دونوں بھی ہنس پڑے اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

وہاں سے لوٹتے وقت رات اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ بتیاں ہمیشہ کی طرح ٹمٹا رہی تھیں۔ وہ اپنے ہی قدموں کی آواز سن سکتی تھی۔ تبھی محلّے کے اس کونے پر رہنے والا ایک نوجوان ڈیوٹی سے لوٹ رہا تھا۔ اس نے اسے دیکھا۔ آگے بڑھ گیا تھا لیکن پھر پیچھے لوٹا۔ پاس آکر بولا "معاف کیجیے، آپ سمیناجی ہیں نا؟"

"جی ہاں... اور آپ؟"

"جی، میں آخری مکان میں رہتا ہوں۔ ابھی بدلا ہے۔ پہلے جنک پوری میں تھا، نام ہے شو ناتھ۔ پس ماندہ ذات کا ہوں اور آکاشوانی میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہوں۔"

"ذات اور عہدہ تو میں نے آپ سے نہیں پوچھا۔"

شو ناتھ ہنس پڑا۔ "دوہرے پیمانے پر ہی تو ٹکا ہے آپ کا یہ سماج۔ بار بار یہی باتیں پوچھتے ہیں لوگ، اس لیے معمول کے مطابق کہہ گیا۔ ملتے ملتے اس سے نجات ملے گی۔ لیکن آپ کے ہمّت کی تعریف کروں گا۔"

"میری ہمّت۔"

"جی ہاں، آپ کا وہ مضمون میں نے پڑھا ہے اور پڑھ کر یہ بھی جان گیا ہوں کہ انقلاب بندوق سے نہیں آتا، نہ بندوق سے اس کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ آپ نے جو تین عورتوں کی کہانی بیان کی ہے وہ چیلنج ہے آج کے سماج کے لیے کیا مبارکباد دوں آپ کو۔"

"آپ نے اُسے پڑھا، واقعی پڑھا۔ یہی میرے لیے مبارکباد اور یہی میرا انعام ہے۔"

"کیا آپ کسی دن آکاشوانی سے نشر ہونے والے مذاکرے میں حصّہ لے سکیں گی؟ موضوع ایسا ہی کچھ ہوگا۔"

"ضرور آؤں گی۔ لیکن آپ کسی دن ہمارے گھر آئیے نا۔ اجیت بھی پرسوں جاپان سے آرہے ہیں اور پتاجی..."

"یعنی مہندرجی۔ وہ تو آتے رہتے ہیں آکاشوانی میں۔ مجھے جانتے ہیں۔"

سمیتا گھر پہنچی تو انکت بابا کے پاس لیٹے لیٹے سو گیا تھا۔ کرن بھی لیٹی ہوئی پڑھ رہی تھی۔ اس کے امتحان ہو چکے تھے۔ پتا جی بھی پڑھ رہے تھے۔ اتنا ہی کہا "بڑی دیر کر دی، بیٹی۔"

"پتاجی، وہ جو شاعر ہیں نا، انڈر سکریٹری بھی ہیں، شاہدہ کی غزلیں ٹھیک کرتے ہیں۔ اُن کے گھر گئی تھی، وہیں دیر ہو گئی۔"

"بیٹی، اجیت کا کیبل آیا ہے۔ پرسوں سویرے دو بجے پہنچ رہا ہے اُس کا ہوائی جہاز۔"

"جی ہاں، میرے پاس بھی اُن کا خط آیا ہے۔ میں پہنچ جاؤں گی۔"

"میں بھی چلوں گا۔"

سمیتا ہنس پڑی، "ضرور چلیے، انکت بھی جائے گا۔"

"نا، نا، میں نہیں چلوں گا۔ میں کیسے جا سکتا ہوں؟ کرن کیسے اکیلی رہے گی؟ اس اکیلے گھر میں۔"

کسٹم سے ٹرالی پر سامان رکھے جیسے ہی اجیت باہر آیا تو دیکھا، سمیتا مسکراتی ہوئی سامنے کھڑی ہے، بولی، "تمھارا سفر کیسا رہا؟"

"بہت اچھا! تم کیسی ہو؟ پتاجی، انکت، دیبھا، کرن، شاہدہ؟"

"سب ٹھیک ہیں۔"

"مارولس، اسپلینڈڈ، تم نے تو کمال کر دیا۔"

سمیتا اس وقت یہی سننے کو ترس رہی تھی۔ اُس نے ٹرالی پر اجیت کا ہاتھ دبا دیا۔ پھر مسکرا کر بولی، "تم ناراض تو نہیں ہونا؟"

"کیوں؟ ناراض کیوں ہوں گا؟"

"تم سے پوچھا جو نہیں پہلے۔"

"کیوں پوچھتیں؟ یہ تو تمھارا حق تھا۔ مجھے تو ناز ہے۔ تم مقلّد بن کر آئی، پھر ساتھ چلنے والی نہیں، اب بن گئیں میری استاد۔ آگے تو اب بھگوان ہی بلے۔ اُس میں میرا وشواس نہیں۔"

سمیتا ہنستی ہوئی اس سے سٹ گئی، بولی، "ادھر چلو، ڈاکٹر پرمیلا کی کار لائی ہوں۔"

اجیت ہنس پڑا۔ "تو اب کار خریدنی ہی ہوگی۔ لیکن ہمارا بیٹا انکت نہیں آیا؟"

"آنے کو کہہ تو رہا تھا، لیکن پھر گہری نیند میں سوگیا۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں جگایا۔"

"کیوں؟"

"تمہارے ساتھ رہنا چاہتی تھی اکیلے، ان کچھ لمحوں میں۔ اسی لیے کار ہے۔"

"تو چلو کہیں اسی کار میں بھاگ چلیں۔"

سمیتا زور سے ہنس پڑی اور اتنے ہی زور سے ایک تھپکی دی۔ "ہمت ہے مجھے بھگا لے جانے کی؟"

"میں کیوں بھگاؤں گا؟ تم خود دوڑو گی میرے ساتھ ساتھ۔"

"اسی دوڑ کے لیے تو ترس رہی ہے اس ملک کی عورت۔"

"یہ ملک کی عورت، کہاں سے آگئی ہم دونوں کے درمیان؟"

"اوہ، ساری، معاف کردو۔ چلو، اسی بات پر آج ساری رات تم سے باتیں کروں گی۔"

"رات رہے گی تب نا۔ چار بجنے والے ہیں۔ گھر پہنچتے ہی پتاجی کے سوالوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اور انکت نہ جانے کیا کیا پوچھے گا؟"

"نہیں اجیت، اب نہ تو پتاجی ہی بہت بولتے ہیں، نہ انکت، وہ اچانک بڑا ہوگیا ہے۔ بولتا کم ہے، سنتا سوچتا زیادہ ہے۔"

"یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔"

"شاید ہم دونوں کو اس طرح ایک دوسرے سے دور بھاگتے دیکھ کر اس کے ذہن پر اثر ہوا ہے۔ تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ جب وہ کھلاڑی تھا تب بھی تمہاری غیر موجودگی کو محسوس کرتا تھا۔ پھر میں چلی گئی، میں آئی تو تم چلے گئے۔ وہ کیا..."

سمیتا نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اجیت کے منہ سے ایک لمبی 'ہوں' نکلی اور وہ بھی خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی کار دوڑاتے رہے۔ پھر یکبارگی سمیتا نے جھک کر کہا، "کہاں چلے گئے اجیت، لوٹو۔"

"جاؤں گا کہاں، تمہارے بندھن سے آزاد ہوکر؟ لاؤ اب میں ڈرائیو کروں۔ تم میرے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلو۔"

سمیتا پھر ہنس پڑی۔ یہ چھایاوادی مکالمہ کافی لمبا ہوگیا۔ ہم گھر کے پاس پہنچ گئے ہیں لیکن اس

سے پہلے ایک بات کہتی ہوں۔ تم چلے گئے، اچھا ہوا۔ محویت سے نجات ملی۔ اس نجات نے مجھے وہ مضمون لکھنے کی طاقت دی۔ اگر اس محویت سے سب آزاد ہو جائیں تو باپا انکار ہو ہی کیوں؟ حیوانیت سے اوپر اُٹھ کر اس داخلی دنیا تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے۔ داخلی دنیا غلامی سے نہیں، آزاد اقدار سے ایسی یقین سے پیدا ہوتی ہے۔

حیران و پریشان اجیت کچھ کہہ پائے کہ سُمیتا نے کار کو دائیں طرف موڑ دیا۔ دو سو گز آگے۔ پھر دائیں جانب ایک موڑ تھا، اس کے بعد بائیں طرف۔ آخر میں پھر دائیں طرف مڑ کر اس نے کار اپنے گھر کے آگے روک دی۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ بتّیاں کبھی کبھی کانپ اُٹھتیں یا دور پالتو کتے کے بھونکنے کی آواز گونج اُٹھتی۔ پھر تو کئی کتے ایک ساتھ بھونکنے لگے۔ سمیتا نے اترتے ہی گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔ پھر اجیت کے ساتھ سامان اٹھا کر دروازے کے سامنے آ کھڑی ہوئی کئی لمحے بعد دروازہ کھلا۔ سامنے کرن کھڑی تھی۔ اشتیاق سے بولی" نمستے انکل۔"

"نمستے بٹیا! کیسی ہے تو؟ کس نے جگایا تجھے؟"

"بھیّا نے۔ آپ کو پوچھ رہے تھے۔ اب باباجی کے پاس بیٹھے ہیں؟"

"غصہ تو نہیں کیا؟"

"جی نہیں، بس اتنا ہی کہا، مجھے نیند آ گئی، نہیں تو میں بھی جاتا۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا کہ انکت دوڑا چلا آ رہا ہے۔ پہلے تو وہ سیدھے اجیت سے چمٹ گیا" میں سو گیا تھا، اس لیے نہیں آ سکا۔"

اجیت نے بیٹے کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا" آ کر کرتے بھی کیا؟ کار میں بیٹھے رہتے۔"

پھر اور سب تو سامان رکھنے ڈرائنگ روم میں گئے، اجیت انکت کے ساتھ پتا جی کے کمرے میں پہنچا۔ ان کے پیر چھوئے۔ پتا جی بولے" کیسا رہا سفر تمھارا؟"

"بالکل ٹھیک۔"

"اچھا، اب کچھ دیر سو لو۔"

"جی، ہندی پڑھنے والے طلبا نے آپ کے لیے کچھ تحفے بھیجے ہیں۔"

"سویرے دیکھ لوں گا۔"

سویرا تو ہو گیا، باباجی۔" انکت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوہ، ہاں، سویرا تو واقعی ہو گیا بیٹے۔ پھر بھی تھوڑا آرام کر لینے دو اپنے پاپا کو۔"

سمیتا چائے رکھ گئی تھی۔ سامان اوپر پہنچ گیا تھا۔ لیکن تینوں اوپر پہنچے تو دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی اور فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اجیت نے کہا، "سمی، دیکھو تو کون ہے؟ کہہ دینا صاحب سو رہے ہیں۔"

سمیتا نے ہنستے ہوئے فون اٹھایا، "نمسکار، میں سمیتا بول رہی ہوں۔"

جواب کسی خاتون نے دیا، "سمی، بیٹی! میں پرمیلا ورما ہوں۔ یاد ہے نا؟ بمبئی سے آج ہی لوٹی۔ معاف کرنا اتنی سویرے تکلیف دی۔"

سمی خوشی سے جیسے چیخ پڑی، "تکلیف کیسی آنٹی؟ میں تو بہت خوش ہوں آپ کی آواز سن کر۔ آپ بھولیں نہیں مجھے۔ اجیت ابھی ابھی جاپان سے آئے ہیں۔ آپ آئیے نہ ہمارے گھر۔"

"اسی لیے تو فون کیا ہے بیٹی! تمھارا مضمون پڑھا تھا۔ اپنی بہادر بیٹی کو مبارکباد دینے ضرور آؤں گی۔"

"اماجی، آپ تو مجھے آشیرواد ہی دیجیے...."

"مبارکباد، آشیرواد — سب ایک ہی تو ہے، بیٹی۔ اچھا کل سویرے آؤں گی۔"

"ضرور ضرور، آپ سب ٹھیک ہیں نا؟"

"سب ٹھیک ہیں، بالکل ٹھیک ہیں۔ سب آئیں گے۔"

سمیتا نے فون رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس بار ریگا رے تھا۔ وہی بے تکلف، بے دھڑک آواز — "تم دیدی ہی ہو نا؟ نمستے۔ ابھی آیا بمبئی سے۔ شالنی جی اب دہیں ہیں نا۔ وہ بھی آئی ہیں۔ بہت خوش ہیں ہم دونوں۔ کب آ دیں؟"

"یہ بھی میں بتاؤں گی، اور وہ بھی تمھیں۔ تمھارے بھائی صاحب ابھی سویرے کی فلائٹ سے جاپان سے آئے ہیں۔"

"تب دیدی، کل سویرے آئیں گے۔ آج کا دن آپ کے لیے۔ ہاں تمھارے مضمون کا مراٹھی ترجمہ 'جنم بھومی' کو بھیج دیا ہے۔ تم سے پوچھا بھی نہیں۔ منع تو نہیں کرو گی نا، اتنا حق...؟"

سمیتا زور سے ہنس پڑی، "ریگا رے، تم کبھی نہیں بدل سکتے۔ اچھا، آنا، جاپانی رس گلے کھلاؤں گی۔"

''کیا جاپان رس گلّے بھی بنانے لگا؟ اب دنیا کی خیر نہیں۔''

سمیتا فون رکھ چکی تھی۔ اجیت بڑی توجہ سے انکت کو ایک کھلونے کی میکنک ڈیوائس سمجھا رہے تھے۔ سمیتا پاس آکر بیٹھ گئی۔ بولی ''اجیت، کل صبح تو طوفان آنے والا ہے۔ شریمتی پرمیلا درما، شالنی دیدی، ایگارے، سبھی آرہے ہیں۔ آج میں کسی کو نہیں آنے دوں گی۔''

وہ اپنا جملہ پورا کر پاتی کہ زینے میں سے شاہدہ کے قدموں کی آواز سے سمیتا کانپ گئی۔ وہ چیخ اٹھی۔ ''ساری رات نہیں سوئی ہوگی یہ شاہدہ، کیسی ہے یہ لڑکی۔''

شاہدہ نے آخری جملہ سن لیا تھا، بولی ''کس لڑکی کی بات کر رہی ہو، بھابھی جی۔''

''تیرے سوا کوئی لڑکی ہے اس دنیا میں؟''

''آداب عرض بھائی جان! سن لی آپ نے بھابھی کی بات۔ کہو تو کل سے آنا بند کر دوں۔''

''کل سے کیوں، ابھی لوٹ جانا۔ دیکھوں تو تیری ہمت۔''

''ارے، ارے۔ آپ تو واقعی ناراض ہوگئیں۔ بھیاجی، آپ نے کچھ کہہ دیا کیا؟''

''میں کچھ کہوں گا اور وہ بھی آج۔''

''اچھا، اچھا، کافی ہوگیا یہ ڈرامہ۔ کرن غسل خانے میں گرم پانی رکھ گئی ہے۔ تم دونوں ناشتے کے لیے منہ ہاتھ دھولو اور شاہدہ، تم چلو میرے ساتھ باورچی خانہ میں۔''

شاہدہ کچھ کہنے کو تھی کہ سمیتا اُسے کھینچ لے گئی۔

سمیتا کے مضمون کے 'ناری من' میں اشاعت کے بعد اُس کی زندگی جیسے اُس کی نہیں رہ گئی۔ بہت ساری ڈاک، بہت سارے فون، تعریف، تنقید، دھمکیاں ـــ ایک پل کے لیے کبھی وہ ڈر بھی جاتی، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ فخر سے سر اونچا کر لیتی۔ جس سماج میں وہ رہتے ہیں، وہاں پڑھنے کی عادت بہت کم تھی، لیکن وہ مضمون تو غیر معمولی تھا۔ ایک نے پڑھا تو دس کو پڑھنے کی ترغیب دی۔ دس نے پڑھا تو سو نے سنا۔ اس میں افواہ پھیلانے کا کافی مواد تھا، لیکن جن کے ذہنوں کو جھنجھوڑا ایسے افراد بھی کم نہیں تھے۔ حالانکہ اُس مضمون میں بیان کیے گئے حادثات کی مختلف شکلیں چلن میں آگئی تھیں، لیکن پورے ملک سے جو خطوط اُسے ملے تھے وہ اس بات کی علامت تھے کہ لوگ نئے اقدار کی تلاش میں ہیں۔ وہ خود تو کچھ نہیں

کر سکتے، لیکن انھیں ہمت ضرور دے سکتے ہیں جو کچھ نیا، کچھ قابلِ تعظیم کرنا چاہتے ہیں۔"

رات میں سمیتا نے اجیت سے پوچھا "کیا سماج واقعی بدل سکتا ہے؟"

اجیت نے اُس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا، "منزل کی فکر تم کیوں کرتی ہو؟ تمھارا کام تو بس چلتے چلے جانا ہے۔" اور سمیتا نے جیسے نیند میں کہا ہو "اور میں چل رہی ہوں، چلتی رہوں گی۔" اُسے واقعی نیند آ گئی تھی۔ اُس کا داہنا ہاتھ اجیت کے سینے پر تھا۔ اجیت نے اُسے ہٹایا نہیں۔ اُس نے کروٹ بدلے بغیر ہی آنکھیں بند کر لیں۔

صبح سویتا نیچے اتری ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اُسی نے جاکر دروازہ کھولا، وبھا کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ارے تو کہاں سے نازل ہوگئی بغیر کسی اعلان کے۔ تیرے بھائی تو بہت فکر مند تھے۔ نہ چھٹی نہ پتری۔"

"جب خود ہی آنا تھا تو خط کیا لکھتی؟ تم تو جانتی ہو میں الہ آباد آ بسی ہوں۔ روزنامہ 'امرت' میں مقامی نمائندہ کا کام مل گیا ہے۔ ابھی تو ٹرینی ہوں، پھر بھی کوشش کر کے ادھر کا ایک پروجیکٹ لے لیا ہے۔ تمھارے مضمون کو لے کر مجھے لکھنا ہے۔ بھیا سے جاپان کی عورت کے بارے میں بات کرنی ہے۔ اس طرح کم سے کم ایک ہفتہ تم لوگوں کے ساتھ رہوں گی۔"

یہ سب جان کر اجیت اور پتاجی بہت خوش ہوئے۔ اجیت نے اُسے سینے سے لگا کر اُس کا ماتھا چوم لیا۔ بولے "میری چھوٹی بہن نے مجھے بہت پیچھے چھوڑ دیا۔"

وبھا نے جواب دیا، "پیچھے والے ہی تو آگے والے کی طاقت ہوتے ہیں، بھیا راستہ بہت لمبا ہے اور پتھریلا بھی۔ میری کوشش آگے بڑھنے کی ہی رہے گی۔ صرف اتنا ہی میرا ہے۔"

"اچھا اچھا وبھا، تو جلدی سے تیار ہو جا۔ آج بہت سے لوگ آ رہے ہیں صبح کی چائے پر۔"

"تب تو اور بھی اچھا ہے۔ کچھ اور ہی مواد ملے گا۔"

واقعی نو بجتے بجتے اُن کا گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ سمیتا، شاہدہ، وبھا اور کرن — سب نے مل کر ایسا انتظام کیا کہ کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ اور لو اور انکت بھی سب سے آگے

بڑھ کر سب کا استقبال کر رہا تھا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔

پگارے، شالنی، پرمیلا ورما، شوناتھ، اجیت اور سمیتا کے معاون ہندر جی کے بناز منر مداح ۔۔ سبھی دانشور طبقے کے لوگ تھے۔ تقریباً سبھی سمیتا کے مضمون سے پیدا صورت حال کے مد نظر خوش تھے۔ سبھی تعریف کر رہے تھے، لیکن سمیتا اس بارے میں کچھ زیادہ ہی محتاط تھی کہ کسی کو پرمیلا ورما کا اصل تعارف نہ ملے۔ پتا جی کی مدّاح کے طور پر ہی ان کا تعارف کرایا گیا۔ دوسری عورت کے روپ میں وبھا کا تعارف بھی اُس نے نہیں دیا۔ لیکن جس عورت کے لیے سمیتا نے اپنی عصمت داؤں پر لگائی وہ وبھا ہی ہے، یہ سب سمجھ گئے تھے۔ شوناتھ اور پگارے جانتے تھے کہ اپنے شوہر کو ان کی معشوقہ کو سونپنے کی ہمت وبھانے ہی دکھائی ہے...

چائے کی یہ نشست دو گھنٹے تک قہقہوں اور چہل بازی کے ساتھ چلی۔ بیچ بیچ میں فلسفیانہ اقوال سے لپٹی سنجیدہ بحث بھی ہوئی۔ شاہدہ کی غزل اور شوناتھ کی کویتا نے بھی سماں باندھا جب چائے خاتمہ پر تھی تبھی سب کو حیران کرتی وبھا اٹھی اور گہری اور سنجیدہ آواز میں بولنا شروع کیا۔۔ "ساتھیو، دوستو، آج کی ملاقات معمولی ملاقات نہیں ہے۔ یہ چیلنج ہے سب کے لیے۔ میں الہ آباد کے ایک روزنامہ کے ہفتہ وار ضمیمہ سے وابستہ ہوں۔ سمیتا بھابھی کے مضامین سے ایک کھلبلی مچ گئی ہے، بہت سارے خطوط آرہے ہیں، اتفاق اور اختلاف کے ہمارے پاس روایتی قدروں پر زوردار، لیکن اصل حملہ ہوا، ایسا میں مانتی ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کیا مانتے ہیں، آپ کے خیال جاننا چاہوں گی۔ شاہدہ جی تو روز آتی ہی ہیں، شوناتھ اسی لین میں رہتے ہیں۔ اُن سے وقت لے کر کبھی بھی مل لوں گی۔ اس وقت محترمہ پرمیلا جی شالنی جی اور پگارے جی۔۔۔"

"نانا، جی، نہیں، میں خالص پگارے ہوں۔"

ہنسی کے بیچ وبھا نے کہا، "ٹھیک ہے، مسٹر پگارے۔"

"جی اور مسٹر میں کچھ فرق ہے کیا؟ آپ شری اور جناب بھی کہہ سکتی ہیں، لیکن میں چاہتا ہوں لوگ مجھے یعنی پگارے کو جانیں۔ ویسے میرا نام وجے پگارے ہے۔ مجھے آپ صرف وجے کہیں۔"

"ٹھیک ہے وجے! میں چاہوں گی، آپ اس سلسلے میں اپنی رائے لکھ کر مجھے دے دیں یا میرے پاس ٹیپ ریکارڈ ہے، اُس کے لیے بول دیں۔"

پرمیلا جی بولیں، "میں اتنی بیدار تو نہیں ہوں، پھر بھی یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس لیے میں دو چار دن میں کچھ لکھ کر دے دوں گی سیمنا بہن کو۔"

"ٹھیک ہے آنٹی۔ آپ شالنی جی؟"

شالنی شیوڑے اور وجے پگارے فوراً انٹرویو کے لیے تیار ہو گئے۔ "ہم ابھی سات آٹھ دن دہلی میں ہیں۔ کبھی بھی انٹرویو لے سکتی ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ آپ کا۔" وبھا نے خوش ہو کر۔ "میری دوسری تجویز بہت پیچیدہ لیکن اتنی ہی اہم اور چیلنج سے پُر ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر سماج کو واقعی بدلنا ہے تو اس تجویز کو سنجیدگی سے لینا ہوگا۔"

وہ دو پل کے لیے رُکی، پانی پیا، سب کی طرف دیکھا۔ اس دو پل کی مبہوت خاموشی میں سب کے چہروں پر تجسس اور حیرانی کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ اُس نے کہنا شروع کیا، "ہمارے سماجی ڈھانچہ کی بنیاد صدیوں پہلے کے آئین اور دستور پر ہے۔ ہندو سماج میں جو قدیم زمانہ میں آریہ یا بھارتیہ سماج تھا۔ چوتھی یا چھٹویں صدی کے بعد نیا آئین نہیں بنا۔ جین سماج بہت قدیم ہے، لیکن اُن کی ایسی کوئی یادگار نہیں۔ بودھوں میں بھی اپنی کوئی خاص روایت نہیں ہے۔ عیسائی، مسلمان ان اقلیتی سماج کی اپنی روایت ہے، وہ بھی دو ہزار، ڈیڑھ ہزار سال پرانی ہے۔ آدی واسیوں کے اپنے غیر تحریری قوانین ہیں۔ سکھ، برہم سماج، آریہ سماج، جدید بھارت کی دین ہیں، لیکن ان کے قاعدے قانون میں کچھ خاص نیا نہیں ہے۔ اب جب ہم سب منظم سماج کے طور پر جینا چاہتے ہیں تو ہمیں جدید اقدار کی بنا پر ایک مشترکہ سماجی دستور کی تشکیل کرنی ہوگی۔"

وہ پھر رکی۔ میز کے چاروں طرف بیٹھے لوگ مبہوت تھے۔ بس پتا جی کے کمرے سے اُٹھتی کبھی کبھی زور کی آواز ان کے سینے سے بج اُٹھتی تھی۔ وبھا نے پھر کہنا شروع کیا، "تو سا کچھ تو اد دستور کی تشکیل تو ایک لمبا پروگرام ہے۔ لیکن ایک بات میں واضح کر دوں کہ کسی بھی سیاسی پارٹی یا شخص سے میری نئی سوچ کا کسی بھی طرح سے تعلق نہیں ہے۔ میں نے اپنا ایک خاکہ تیار کیا ہے۔ وہ میں بتاتی ہوں۔ تین حصے ہیں اس سوچ کے۔ پہلے حصے کا تعلق مذہب سے ہوگا۔ ہر شخص کو پورا حق ہوگا کہ وہ کسی بھی مذہب اور مذہبی رسوم کی تقلید کرے۔ دوسروں کی جوازیت کی تنقید کرنے کا حق نہیں ہوگا

اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس کا مذہبی نظام کسی دوسرے نظام والے کے آڑے تو نہیں آرہی ہے۔ کسی کے اعتماد کو ٹھیس تو نہیں پہنچ رہا۔ بھان، روح مطلق، جنت دوزخ، تناسخ وغیرہ ماورائی اور فلسفیانہ موضوع اسی کے تحت ہوں گے۔

اس دستور کا دوسرا حصّہ بہت ہی اہم ہے۔ کسی وقت یہ ضرور رہا ہوگا کہ وہ سارے کام جو صرف کسی شخص سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ سماجی زندگی کا حصّہ ہیں جیسے زندگی موت جائداد، کھان پان، گود لینا، وراثت، تعلیم، شادی بیاہ وغیرہ سماجی نظام کو مذہب اور مذہبی رسوم سے جوڑ دیا جائے۔ مذہب تب عبادت نہیں تھا طرز زندگی کا ہی دوسرا نام تھا۔ اس لیے یہ مذہب کا حصّہ مانے گئے لیکن اب جب مذہب عبادت میں سمٹ گیا ہے، طرز زندگی سے اُس کا کوئی رشتہ نہیں ہے، تو ان سماجی دستور کے لیے صرف انسان کے لیے ایک مساوی دستور ہونا لازمی ہے۔ ہم نہیں، ہم، میرے لیے نہیں سبھی کے لیے اُس کا مقصد ہوگا۔

تیسرا حصّہ سیاست اور حکومت کے موضوع طے کرے گا۔ ان اصولوں کا اس مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا جو مسلک خلاف ملک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سیاست کا اپنا مذہب اپنا قانون ہے۔ اُس میں عبادت کی مداخلت کسی بھی سطح پر قابل ترجیح نہیں۔ مندر، مسجد، گوردوارے، گرجا، ماورائی مذہب کے مقام ہوتے ہیں، سیاست کے اکھاڑے نہیں۔"

وہ پھر رکی۔ دو پل کے لیے خود اس خاموشی کا حصّہ بنی رہی۔ پھر بولی، ابھی یہ صرف ایک خیال ہے اس کی وضاحت کر کے منطقی شکل دی جاسکتی ہے، لیکن میں آپ کے خیال جاننا چاہوں گی۔ چاہوں گی کہ اس پر تفصیل سے کھل کر بحث ہو۔"

اور وہاں خاموش ہوگئی۔ اس بار بھی واقعی مسحور تھے۔ سب سے پہلے وجے نے بولنا شروع کیا، "واقعی یہ تو بہت ٹھوس، ساتھ ہی ایک انقلابی پروگرام ہے۔ میں اس پر کھلے دماغ سے غور کرنے کے حق میں ہوں۔ میں جانتا ہوں اقلیتی فرقے والے اس پروگرام کی مخالفت کریں گے اور ووٹوں کی طاقت پر جینے والی سرکار اسے غیر عملی کہہ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دے گی لیکن ہمیں اس سے مایوس نہ ہو کر، اقلیتی فرقہ میں جو کھلے ذہن کے لوگ ہیں انھیں منظم کرنا ہوگا۔ ہماری راہ آسان نہیں ہوگی، لیکن قوت برداشت اور لگن کے ساتھ ہمیں اپنی بات سمجھانی ہوگی۔

شالنی شیوڑے نے بھی اس پروگرام کی تائید کی، حالانکہ ان کی رائے میں اس پر جلدبازی میں کوئی فیصلہ نہیں لیا جانا چاہیے۔ لیکن شوناتھ نے کھلے دل سے اس کی تعریف کی، کہا" آج جو ہندو سماج کا زوال ہو رہا ہے اس کی صرف وجہ یہی ہے کہ اس کی طرزِ زندگی صدیوں قبل جہاں ایک دن ٹھہر گیا تھا وہاں سے پھر آگے نہیں بڑھا۔ جن مفکرین نے کوشش کی، اُن کی وہ کوشش ایک محدود مسلک بن کر رہ گئی۔ ہندو سماج کی دو بڑی خطا مذہب کی ڈھال پہن کر طرزِ زندگی کا حصہ بن گئے۔ عورت جو ماں تھی اُسے ہندو سماج نے جاگیر مان کر ہمیشہ اس کے ساتھ بلاتکار کیا اور اپنے ہی ایک بڑے حصے کو اچھوت بنا کر اپنے سے کاٹ کر الگ کر دیا۔ ایسا نہ ہوتا تو کیا مختلف مسلک اور غیر مسلک، مختلف ذاتیں یہاں تک کہ مختلف قوم اس جزیرے میں دکھائی دیتے؟

" میں ایک اور بات کی تنبیہ کرنا چاہوں گا کہ اپنے نظام کو منواتے ہیں ہمیں چاہے کتنا ہی وقت لگے، ہمیں اسے ایک محدود مسلک کا روپ نہیں لینے دینا ہے۔ ہمارے مفکرین نے یہی غلطی کی۔ انھوں نے اپنے معتقد بنائے یا بننے دیے۔ وہی معتقد ان کے خیالات کے دشمن بنے۔ اس معنی میں کہ خیال نہ تو کہیں ٹھہرتے ہیں، نہ جامد ہوتے ہیں۔ موسموں کی طرح بسنت میں پھلتے پھولتے ہیں۔ پت جھڑ میں جھڑ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جو بہار اور خزاں ایک ساتھ آتے ہیں، وہ صرف اتفاق نہیں ہے۔ پرانے کو چھوڑنے اور نئے کو قبول کرنے کا مطلب ایک ہی ہے۔ یہی وہ ہمیں مطلع کرتے ہیں کہ زندگی بس چلتے رہنے کا نام ہے..."

شوناتھ جتنی دیر بولتا رہا، ربھا اتنی دیر بے خبر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ انجانے انجانے سمیتا نے اس نگاہ کا مطلب سمجھا۔ شوناتھ کے بیٹھنے کے بعد اس نے کہا" خیالات میں سے خیال کیسے پیدا ہوتے ہیں، کیسے وہ بوند بوند جھرتی دھارا بن جاتے ہیں، لیکن وہ رکتے نہیں۔ تب بھی نہیں جب ندی بن کر سمندر میں اپنے کو کھو دیتے ہیں۔ پھر سے ابر بن کر دھرتی کی پیاس بجھاتے اور ندی میں مل جانے کے لیے خیالات کا نہ آغاز ہوتا ہے نہ انجام۔ وہ مسلسل رواں رہتے ہیں۔ جو قوم اس حقیقت کو قبول کرتی ہے وہ کبھی پرانی نہیں پڑتی۔"

ایک بار پھر سب خاموش تھے۔ ربھا نے اچانک اجیت کی طرف دیکھا، بولی " بھیا آپ کیا کہتے ہیں؟"

"جو تو نے کہا وہ میں نے ہی تو کہا ہے۔ پتا جی نے تو بہت پہلے اپنے ایک مضمون میں اس طرف واضح اشارہ کیا ہے۔"

"وہیں سے تو میں نے یہ نکتہ اٹھایا ہے۔"

"میں تیرے ساتھ ہوں، ندی بن کر سمندر میں غرق ہو جانے کے لیے اور پھر ابر بن کر لوٹ آنے کے لیے پھر سے دھرتی کی پیاس بجھانے کے لیے۔"

سمیتا چہک اُٹھی، "تو آپ مذاق بھی کر لیتے ہیں۔"

"لو بھائی، اس میں مذاق کیا ہے۔ ندی کو پھر سے ندی بننے کے لیے ابر کا روپ لینا ہی ہوگا۔"

"اور ابر کی تقدیر ہے کہ وہ پھر سے ندی بنے اور سمندر میں کھو جائے۔"

"میں تو مانتا ہوں بوند، دھارا، ندی، سمندر، ابر — سب ایک ہیں اور ایک بات کہتا ہوں جس کی طرف شاید آپ کا دھیان نہیں گیا۔ سمندر ندی کے میٹھے پانی کا انتساب قبول کرتا ہے، خود کھارا ہے لیکن جب اُس پانی کو وہ ابر کی شکل میں لوٹاتا ہے تو اُسے اور بھی میٹھا کر دیتا ہے۔"

سُمیتا اُسی سرعت سے بولی، "یعنی میٹھے پانی کے ساتھ کھارے کا ملن ہو جائے تو پانی کی مٹھاس اور بھی بڑھ جاتی ہے۔"

"جی ہاں، سورج کی کرنیں یہ جادو کرتی ہیں، وہ گہرے کھارے سمندر کے بیچ سے میٹھے کو بھاپ بنا کر اڑا لے جاتی ہیں۔"

جواب تک چپ بیٹھی تھی وہ شاہدہ اچانک چہک اٹھی، "پہلے قانون بنانے والے نقاد، پھر شاعر، پھر سائنس داں کہاں پہنچ گئے۔ ہم اصل میں نقاد، شاعر، سائنس داں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی سطح پر ایک نہیں ہیں کیا؟"

"ہاں، یہ بھی سچ ہے۔" اس بار ریگکارے بولا، نہ جانے کہاں سے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے۔

اور شاہدہ اسی لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی "آپ نے 'اقلیتوں' کی بات کی۔ میں اقلیت مسلم ذات کی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ کسی بھی شرط پر نئے دستور کی بات نہیں مانیں گے اور آج سرکار انھیں کے ساتھ ہوگی کیونکہ سرکاریں انصاف کی نہیں، اقتدار کی بھوکی ہوتی ہیں۔ اس لیے آپ کو ہمیشہ چوکنّا رہنا ہوگا۔ میری ذات میں بالخصوص نوجوانوں میں جو اہل علم اور ترقی پسند شخص ہیں انھیں ساتھ لینا ہوگا۔"

ویبھا بول اُٹھی، "تم کرو گی یہ کام؟"

"حکم دے رہی ہو یا پوچھ رہی ہو؟"

"بس، گزارش کر رہی ہوں۔"

"گزارش قبول کی جاتی ہے۔"

اور وہ سب کھل کھلا پڑے اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پرمیلا اور ماہیت پہلے شوہر کے ساتھ مہندرجی کے پاس چلی گئی تھیں۔ اُن کے بیٹے بیٹی اور بہو داماد چپ چاپ وہیں بیٹھے تھے اور اُن کی باتیں سُن رہے تھے۔ جب سب رخصت ہو رہے تھے تب وہ ودیھا کے پاس آئے۔ بیٹی بولی "دیدی، ہم چاروں آپ کے ساتھ ہیں، جو کام ہمیں سونپیں گی ہم کریں گے۔"

بیٹے نے کہا "آپ نے بالکل صحیح کہا، سماج کی ذہنیت بدلے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ودیھا خود مسحور تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی باتوں کا اس طرح استقبال کیا جائے گا۔ اُس نے اُن کو اپنے پاس کھینچ کر اتنا ہی کہا "آپ لوگ جو مناسب سمجھیں کریں۔ میں اس پروگرام کو ایک شکل دے کر آپ کے پاس بھیج دوں گی۔"

ودیھا نے کو مڑیں کہ مہندرجی کے کمرے سے زور زور سے آوازیں آنے لگیں۔ سبھی اُسی طرف بھاگے۔ مہندرجی پرسکون انداز میں گاؤ تکیے کے سہارے ادھ لیٹے ان نوجوانوں کی طرف دیکھ رہے تھے جو کسی دہشت گرد ہندو تنظیم کے رکن تھے۔ اُن کے کوئی رشتہ دار اُسی لین میں رہتے تھے۔ اُن میں سے ایک نوجوان بے حد پرجوش آواز میں بول رہا تھا "دیکھیے مہندرجی، ہم چاہتے تھے کہ آپ کو وارننگ دے دیں۔ آپ سمجھدار ہیں سمجھ جائیں گے۔ لیکن دیکھتے ہیں، دو کتابیں کیا لکھ لی ہیں آپ کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا ہے۔"

مہندرجی نے سادگی سے کہا "ادیب تو ہمیشہ خلاف ورزی کرتا ہے۔ آپ کی اطلاع کے لیے گزارش ہے کہ میں اب آٹھویں آسمان پر رہتا ہوں۔"

"آپ مذاق کرتے ہیں۔" دوسرا نوجوان چیخا۔

"ہاں بیٹا، ابھی مذاق کر سکتا ہوں اس لیے زندہ ہوں۔"

"بہت ہو گیا۔" پہلا نوجوان آپے سے باہر ہو رہا تھا "آپ سماج کو بھرشٹ کرنے پر تلے ہیں۔ آپ کی اس شانت مورت کے پیچھے بھیڑیے کے پنجوں کے تیز ناخن اور نکیلے دانت صاف دکھائی دے

رہے ہیں۔ آپ نے اپنے گھر میں مسلمان اور بھنگی کی لڑکی ۔ ۔ ۔"

"برخوردار کسی کو بھنگی کہنے پر آج کل چھ ماہ کی جیل ہوتی ہے۔"

نوجوان نے اُسی اکھڑپن، اُسی بدتمیزی سے جواب دیا، "آپ کی بہو غنڈوں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ایسی بے حیا اس لین میں فخر سے سر اونچا کر کے چلتی ہے اور آپ کی بیٹی نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا ہے۔ آپ کے گھر میں کیرل کی ایک عورت آتی ہے جو اب تک دو خصموں کو چھوڑ کر تیسرے کے ساتھ رہتی ہے۔ کیا بتانا چاہتے ہیں اس پوتر ہندو دھرم کو ــــ رشیوں کی پوتر دھروہر کو چکلایا ۔ ۔ ۔ یا ۔ ۔ ۔؟"

جب وہ اِس طرح الفاظ کے لیے چھٹپٹا رہا تھا، اس کا چہرہ پوری طرح تمتما گیا تھا۔ تبھی سمیتا ایک ٹرے میں دو پیالے چائے اور ایک پلیٹ میں مٹھائی لے کر وہاں آئی اور بولی ــ "ہمارے گھر آئے ہو۔ پہلے چائے پی لو، پھر سکون سے باتیں کر لیں گے۔ غصے میں آدمی ہوش کھو بیٹھتا ہے۔"

اس نوجوان نے آتشیں نگاہوں سے سمیتا کی طرف دیکھا، "ہم تمھاری جیسی بدکردار کے ہاتھ کی چائے پئیں گے، لعنت ہے ہم پر۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا، وہ ٹرے سے ٹکرایا، دوسرے ہی لمحے جھن جھن کرتے پیالے فرش پر کرچ کرچ ہو کر بکھر گئے اور اُسی وقت دو کانسٹبل وہاں آکر کھڑے ہو گئے۔

انہیں دیکھتے ہی اُن نوجوانوں کے پیروں تلے کی زمین کھسک گئی۔ پیالے ٹوٹنے سے وہ پہلے ہی پریشان تھے۔ چیختے ہوئے فوراً وہاں سے چلے گئے۔

کرن، ودبھا اور سمیتا نے فوراً سب کچھ معمول کے مطابق کر دیا، تب تک وہ دونوں سپاہی بیٹھ چکے تھے۔ مہندر جی نے پوچھا، "ان نوجوانوں کے بارے میں آپ کو کس نے اطلاع دی؟"

اُن میں سے ایک نے جواب دیا، "جی نہیں ہم اس لیے نہیں آئے ہیں۔ ہمیں تو سمیتا جی اور ماسٹر انکت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے۔ انھوں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی ہے نا؟"

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اطمینان کی سانس لی۔ ڈرامہ کا خلاصہ سب کو تناؤ سے نجات دلا گیا اور وہ جانے کے لیے اُٹھے۔ سمیتا اور راجیت نے سبھی کو پھر آنے کی گزارش کرتے ہوئے رخصت کیا۔

انکت کے دل کی تھاہ کس کے پاس تھی، حالانکہ سبھی نے اُس سے باتیں کیں۔ ورما خاندان

شانتی اور ریکھا رے اس کے لیے بہت کچھ لائے تھے۔ وہ بہت خوش تھا۔ لیکن گھر میں جو واقع ہو رہا تھا اُسے لے کر اُس کے نوجوان دل میں سوالوں کا ایک ہجوم جنم لے رہا تھا اور وہ اس کا حل چاہتا تھا۔ اجیت دن میں تو گھر میں رہتے نہیں تھے۔ رات کو وہ انھیں سوال پر سوال کر کے تنگ کر دیتا۔ وہ ہر ممکن اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے، لیکن پھر بھی بہت کچھ تھا جو ان کہا رہ جاتا۔ وہی ان کہا نوجوان من کو بے چین کر جاتا ہے، وہ سوچتا۔ کیا ہے بلاتکار، کیا ہے طلاق، کیا ہوتے ہیں عورت مرد کے رشتے ۔ ۔ ۔؟

اجیت اور سمیتا دونوں باخبر تھے اس بارے میں۔ ایک رات جب اجیت کو لوٹنے میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا، سمیتا نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا، "اجیت، انکت بہت سوال کرتا ہے۔"

"اس عمر میں سبھی کرتے ہیں۔"

وہ اچانک بول اٹھی، "اجیت ایک بات سنو! تم انکت کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں نہیں جا سکوں گی۔"

"کیوں؟"

"دیکھتے تو ہو، میرا پروجیکٹ ابھی پورا نہیں ہوا۔ ایک سال بھی نہیں رہا۔ تمھارے جاپان سے لوٹنے کے تین مہینے بعد ہی تین سال پورے ہو جائیں گے۔"

"ہو جانے دو۔ سب پورا ہو جائے گا، تمھارے لیے کچھ بھی کرنا ناممکن نہیں۔"

"نہیں، نہیں اجیت، میں نہیں جاؤں گی۔ پتا جی کہاں رہیں گے؟ دیبا بھی تو ابھی پوری طرح اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو پائی۔ میں جانتی ہوں، وہ ہم سے مدد نہیں چاہتی۔ لیکن ہمیں تو اس کے پاس رہنا ہوگا۔ دور سے ہی وہ ہماری طرف دیکھے گی ضرور۔ اور کون ہے اس کا؟"

"کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ سب کے مفاد جڑے ہیں اس' ہوتے ' ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن انکت کے بارے میں کیا سوچا؟ لے جاسکو گے؟"

"تم بھی کبھی کبھی نہ جانے کہاں کھو جاتی ہو۔ لے تو جاسکتا ہوں، لیکن چھ مہینے وہ رہے گا کیسے؟"

"ارے ہاں، میں بھی کبھی کبھی ۔ ۔ ۔ تم ٹھیک کہتے ہو، وہ تو ایک مہینے ہی رہ سکتا ہے۔ اچھا اجیت!

تمھارا کوئی دوست وہاں نہیں ہے جو ایک ماہ بعد آرہا ہو؟"

"ابھی تو کوئی نہیں ہے۔"

"ہو تو بہت اچھا ہے۔ کتنا خوش ہو گا وہ۔"

"دیکھوں گا، کچھ ہو سکے تو۔" پھر ایک لمحے رُک کر بولے، "تم دس دن کے لیے ہی آجاؤ۔ میں اُسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"دس دن کے لیے اتنا خرچ۔"

"اُس کی تم فکر مت کرو۔ اپنے بیٹے کے لیے۔۔۔"

"اچھا سوچوں گی۔ رینا جی وبھا کے پاس رہ لیں گے۔" سمیتا نے بات کاٹ دی۔

اجیت نے کروٹ بدل کر سمیتا کو اپنے پاس کھینچ لیا، بولے "کیسی عجیب بات ہے، جتنا ہم نے ایک دوسرے سے بھاگنا چاہا اتنا ہی پاس آنے کی چاہت بڑھی۔"

سمیتا مسکرائی، "من کی بات کہہ رہے ہو یا شیا ملا کا سکھایا ہوا بول رہے ہو؟"

"دونوں ہی ہیں۔ تم سے میں نے کبھی نفرت نہیں کی۔ کلپنا نے کیسا بھی جال بچھایا ہو، یہ طے تھا۔ میں تمھیں چھوڑ کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میں تمھیں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

سمیتا نے اپنا سر اُس کے سینے پر رکھ دیا اور پیار سے اُس کا سینہ سہلاتی ہوئی بولی، "اسی یقین کے سہارے تو میں بار بار لوٹی ہوں۔"

تو پھر آج کے بعد اس بارے میں کوئی بات نہیں۔"

"وعدہ۔۔۔ لیکن اگر کبھی غصہ میں کچھ کہہ جاؤں۔۔۔"

اجیت یکبارگی زور سے ہنس پڑا، "یہی بات میں کہنے والا تھا۔ بس اب کوئی ڈر نہیں۔ تم اپنے راستے پر چلو، میں اپنے راستے پر۔۔۔"

سمیتا بھی ہنسی تھی۔ ہنسی رکنے پر اُس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "شاعری، ڈرامہ ہر شخص کی زندگی میں پیوست رہتے ہیں۔"

"ہاں، وہ ہر شخص کی زندگی کا حصہ ہیں۔ کبھی طربیہ اور کبھی افسردہ۔"

اور ادب کے عالم کہتے ہیں، بڑا ادب المیہ میں ہی ہے۔"

"ادب پیدا ہی المیہ سے ہوتا ہے۔"

"ہاں اجیت! سچ کا جھنڈا لہرانے کے بعد بھی رامائن اور مہا بھارت کا اختتام المناک ہی ہوتا ہے۔ یہ دو رزمیہ نظمیں زندگی کی رزمیہ کے طور پر ہی قائم ہوئے ہیں۔ الفاظ کے حدود میں رہتے ہوئے بھی المیہ بھوگنا پڑتا ہے۔ الفاظ کے حدود سے نجات پاکر بھی۔ اور جس کرشن نے سب کو آزاد کیا اُسے کیسی المناک موت ملی۔"

"نہیں سمیتا، وہ المناک موت نہیں تھی۔ وہ پشیمانی تھی ان نام نہاد ہوش مند آزاد انسانوں کی طرف سے جنھوں نے نجات کا مطلب بے لگامی میں ڈھونڈنا چاہا تھا۔"

"تو اس کا مطلب ہے کہ المناک خاتمے سے بچا جا سکتا ہے۔"

"یقیناً، نجات کا صحیح مطلب سمجھ کر۔ نجات سے بڑا بندھن، بڑی ذمہ واری اور ہوتی ہے کیا؟ وِبھا نے جس نئے انقلاب کی تمہید ہمارے سامنے اُس دن پیش کی تھی، وہ ترقی کی راہ پر ایک اور نیا پڑاؤ ہے۔ اتنا بھٹکنے کے بعد میں نے یہی سیکھا ہے۔"

"اور امریکہ میں میں نے جو کچھ دیکھا اور سہا تھا، اس کا مطلب بھی شاید یہی تھا۔ تب نہیں سمجھ سکی تھی۔"

"اب سمجھ گئی ہو؟"

"ہاں، میری جان!"

"تب میں مطمئن ہوں اور تمھیں اطمینان دلاتا ہوں۔ یقین دلاتا ہوں جب تک تم خود جانے کو نہیں کہو گی..."

"نیند آرہی ہے اجیت۔"

"اچھا، سو جاؤ۔"

"دس دن کے لیے سہی، میں جاپان جاؤں گی انکت کے لیے۔ اُسے تم ساتھ لے جانا۔"

"اچھا..."

پھر کئی لمحے گزر گئے۔ خاموشی شور مچاتی رہی اور وہ دونوں نیند آنے کی راہ دیکھتے رہے کہ یکبارگی اجیت کو چونکاتی سمیتا اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "اجیت، کبھی سوچا تم نے، جتنا ہمیں ملا ہے اتنا کسی

کو ہی ملتا ہے۔ آدھے سے زیادہ ہمارے ننگے ہم وطن بھوکے ہی سو جاتے ہیں۔ نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گی، انکت بھی نہیں جائے گا یہیں رہ کر۔۔۔"

اجیت کو بھی نیند آنے لگی تھی۔ اس اچانک دھماکے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ جھنجھلا پڑا، "تم کب کیا چاہتی ہو۔ کب کیا کروگی، میں تو سمجھ ہی نہیں پاتا ہوں۔ اب سو جاؤ، کل فیصلہ کریں گے۔"

"نہیں اجیت! میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ جاپان کوئی نہیں جائے گا۔"

"میں بھی نہیں جاؤں؟"

"نہیں، تمھیں تو جانا ہے لیکن یہ کام پورا کرنے کے بعد نہ تم کہیں جاؤ گے، نہ میں۔ بھاگنا بزدلی ہے۔ انکت کو ہم دونوں کی ضرورت ہے۔"

اجیت ویسے ہی بولا، "اچھا بابا، اچھا، اب تم سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔"

سمیتا نے اچانک اپنا منہ اجیت کے سینے میں چھپا لیا اور سسکیاں بھرنے لگی ــــ "مجھے معاف کردو اجیت، مجھے معاف کردو۔"

"اب سو جاؤ جانِ من، سو جاؤ" کہتے ہوئے سمیتا کی زلفوں کو سہلاتا رہا اور جماہی لیتا رہا۔ کچھ لمحے بعد دونوں سو گئے ــــ دو خود سے لڑتی، لہولہان ہوتی روحیں۔

رات دونوں اپنے باطن سے جوجھتے رہے تھے۔ سویرا اس سے بھی المناک خبر لے کر آیا۔ وہ سب چائے پی چکے تھے کہ تار گھر کے نمائندے نے گھنٹی بجائی۔

لندن سے ورنکا کا تار تھا ــــ 'نارائن میدانِ جنگ میں بم پھٹنے سے شدید طور پر زخمی ہو گئے تھے۔ داہنا پیر گھٹنے کے نیچے سے کاٹ دینا پڑا۔ اب خطرے سے باہر ہیں۔ فکر مت کرنا۔ نارائن کے چھوٹے بھائی نکنج اور ان کی بیوی میدھا دونوں آگئے ہیں۔'

سمیتا کو جیسے لقوہ مار گیا ہو۔ ٹپ ٹپ آنکھیں ٹپک پڑیں، روندھے گلے سے بولی، "پتاجی کیا میں لندن نہیں جا سکتی؟"

پتاجی نے سادگی سے کہا، "کیا فائدہ، وہ بہت جلد یہاں آئیں گے۔ تم نے پڑھا نہیں، ایران سرکار نے ان کے ڈسپیچوں سے ناراض ہو کر انھیں ایران چھوڑنے کا حکم دے دیا تھا۔ تبھی وہ لندن گئے ہیں۔

مجھے ڈر ہے، اب تم جاپان نہیں جا سکو گی۔"

"کیسا اتفاق ہے،" پتاجی، رات میں نے اجیت سے کہہ دیا تھا کہ نہ میں جاپان جاؤں گی، نہ انکت۔"

"اتفاق کبھی بے مطلب نہیں ہوتے۔ ہر اتفاق کا مطلب ہوتا ہے۔"

سمیتا جیسے اپنے آپ سے ہی کہتی ہو "کتنا سہا ورنکا جی نے اور اب۔۔۔"

پتاجی نے اُس آپ بیتی کو سنا، بولے۔ "یہ کیوں بھولتی ہو بیٹی، اس سپنے نے ہی اُسے وہ زندگی دی جس کے لیے دیوتا بھی ترستے ہیں۔ کیا الفاظ کے گھیرے سے نجات نہیں دلائی اپنے کو ورنکا اور نارائن نے، اور یہ حادثہ، پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑ سکتا ہے، بلکہ یہ ضروری ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ نارائن یہ کبھی قبول نہیں کرے گا کہ اس نے کچھ کھویا ہے۔"

سب کچھ سُن کر بھی وہ جیسے اپنے آپ سے ہی کہہ رہی تھی "سماج کی نگاہ میں باپ کی راہ سے پیدا ہوا یہ مجذوب آدمی کتنا پاک، کتنا طاقت ور ہے۔"

تبھی اُس کے اندر کہیں دور کونے میں گھنٹیاں بج اُٹھی تھیں اور وہ کانپ گئی تھی۔ کیا واقعی وہ طاقت ور ہے۔۔۔؟

دو ماہ بعد ورنکا کا تار ملا۔ "ہم سب دہلی پرسوں سویرے پہنچ رہے ہیں۔ کچھ دن تمھارے پاس رہیں گے۔"

اُس کے بعد دو دن تک سمیتا جیسے پاگل ہو گئی ہو۔ سارے گھر کی شکل بدل ڈالی۔ کرن یہاں تک انکت بھی اُس کے ہر لمحے بدلتے احکام سے پریشان ہو اُٹھے۔ "دیکھو کرن، نارائن بھائی صاحب نیچے ہی رہیں گے اور انکت، تم چلو اوپر میرے کمرے میں۔۔۔ ہاں کرن، تم باورچی خانہ کو اس طرح سجاؤ کہ بہت کھٹر پٹر ہو۔ اور انکت بیٹے، ایک بات سمجھ لو۔ تم تو اب بڑے ہو گئے ہو۔ اپنے پھوپھا جی کو طرح طرح کے سوال پوچھ کر تنگ مت کرنا۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔"

انکت نے آہستہ سے کہا، "نہیں پوچھوں گا، لیکن پھوپھا جی نے پوچھا تو؟"

اس مصروفیت میں بھی سمیتا نے غور سے بیٹے کو دیکھا، کہا، "تو بس۔۔۔ کچھ بھی کہہ دینا۔ بہت نہ بولنا۔"

"اچھا ممی! نہیں بولوں گا، لیکن ممی، جیسے باباجی کے دانت ٹوٹ ٹوٹ گئے تو انھوں نے نئے لگوا لیے، ویسے ہی پھوپھاجی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو انھوں نے نئی لگوائی؟"

"ہاں بیٹا!"

"آنکھ بھی نئی لگ سکتی ہے؟"

"ہاں بیٹے! مرنے سے پہلے بہت سے آدمی اپنی آنکھیں خیرات کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وہی آنکھیں نکال کر رکھ لیتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ کسی دوسرے شخص کو لگائی جا سکتی ہیں۔"

"اور کسی کی آواز چلی جائے تو؟"

ٹھٹھک گئی سمیتا۔ خوش قسمتی سے وہ تب چائے پی رہی تھی۔ سوال سُن لیا، لیکن جواب کیا دے؟ اس سوال کا ذریعہ اُسے معلوم ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے وہ اُس کے ساتھ معروف تخلیق کار اور مفکر جینندر کمار کے گھر گئی تھی۔ وہ تصویر اس کی آنکھوں میں ابھر آئی ان کے جسم کا پورا بایاں حصہ فالج نے بے جان کر دیا تھا، لیکن آنکھوں میں پہچان باقی تھی اور وہی بے پناہ درد کا باعث بن گئی تھی۔ آنے والے کو دیکھتے رہتے... دیکھتے رہتے... پھر رونے لگتے... داہنے ہاتھ میں ہاتھ لے کر زور زور سے مسلتے رہتے۔ ہاتھوں کی بھی ایک زبان ہوتی ہے، وہ پورے باطن کو چیر جاتی ہے۔ کیسی بے چینی ہے جو عروج پر پہنچتے پہنچتے، غوں غوں کی شدید جذباتی چیخوں میں پھوٹ پڑتی اور آنے والے کے تن من کو جھنجھوڑ کر جاتی، پوری بیداری کو... احساس ابھی زندہ ہے۔ تبھی یہ درد برداشت کرنے کی اذیت ہے...

'بغیر آواز کا آدمی درندہ صفت ہو جاتا ہے، لیکن بنا احساس کا شخص...'

خود ہی اُس نے جواب دیا، وہ تو جانور بھی نہیں رہتا۔ کیسی بدقسمتی ہے، سائنس کے میدان میں ہماری کامیابیاں آسمان کو چھو رہی ہیں لیکن آنکھوں کا پانی سوکھتا جا رہا ہے۔ سائنس کیا انسان کو جانور سے بھی کمتر جاندار بنا دیتا ہے — روبو... میسائل... رفتار کی حدود پار کرتے جیٹ...

'نہیں... نہیں... سائنس کچھ نہیں کرتا۔ سائنس تو توانائی ہے۔ تخلیقی صلاحیت کی بہترین شکل۔ طویل خاموشی میں بھی پُرنور مدھر سنگیت سائنس دان ہی سنتے ہیں۔ کوئی شخص ہی ضمیر کھو کر اس کا غلط استعمال کرتا ہے۔ وہ نہیں جانتا۔ وہ کہاں جانا چاہتا ہے، بس طاقت بٹورتا چلتا ہے۔'

اچانک انکت نے جھنجھوڑا، "ممی، تم بتاتی کیوں نہیں؟ کسی کی آواز چلی جائے تو کیا وہ بھی واپس

اُسکتی ہے۔"

"اوہ" سمیتا چونک پڑی ___ "پل بھر میں میں بھی کہاں چلی جاتی ہوں!" اور وہ مسکرائی۔ انکت کو پاس کھینچ کر بولی، "نہیں بیٹے، آواز چلی جائے تو وہ نہیں لوٹتی۔ ہاں، اشاروں اور انگلیوں کی ایک زبان ہوتی ہے۔ اُس سے گونگے بھی باتیں کر سکتے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے، سائنس داں آگے چل کر آواز لوٹانے کی بھی ترکیب ڈھونڈ لیں۔ آدمی سب کچھ کر سکتا ہے، ہاں، کچھ بھی کرنے سے پہلے اُسے سوچ لینا چاہیے، وہ جانا کہاں چاہتا ہے۔"

انکت کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا، لیکن وہ برابر ممی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا کہ یکبارگی اُسے یاد آیا، "ارے ممی، بُوا کے ساتھ وروَن بھی آرہا ہے نا؟"

سمیتا ہنس پڑی، "وہ کیوں نہیں آئے گا؟ وہ ابھی ممی کو چھوڑ کر کہیں نہیں رہ سکتا۔"

"میں رکھوں گا اُسے اپنے پاس۔" انکت نے فخر سے کہا۔

"ضرور، ضرور، لیکن پہلے میرے ساتھ آ۔ تیرے پھوپا جی کا کمرہ ٹھیک کر دیں۔ انھیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے اور ہمیں صبح انھیں لینے ہوائی اڈّے بھی تو چلنا ہے۔"

نارائن کے استقبال کے لیے گرین چینل کے سامنے جو افراد دکھائی دیے ان میں افرادِ خانہ کے علاوہ کئی صحافی اور دوسرے افسران بھی تھے۔ سمیتا کے ساتھ پتا جی، انکت، کرن تو تھے ہی، وبھا صبح کی فلائٹ سے لکھنؤ سے آگئی تھی۔ شاہدہ اردو اکادمی کے صدر کو سی آف کرنے آئی تھی، جان بوجھ کر سمیتا سے اُس نے کہا تھا، "میں کیوں نہیں آتی؟ آپ کی دیدی میری بھی تو استاد ہیں۔"

گرین چینل سے سب سے پہلے باہر آنے والی ورتکا تھی جو دوڑتی ہوئی آئی اور ماما جی سے لپٹ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور گود میں وروَن تھا۔ ماما نے اُسے پیار سے تھپ تھپایا اور وروَن کو اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا، "بالکل تیری شکل ہے۔"

نارائن کو ڈھونڈتی سمیتا کی آنکھوں نے دیکھا، نارائن تو اپنے پیروں سے چلے آرہے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ ہاتھ میں خوبصورت سی چھڑی ہے اور وہ ہمیشہ کی طرح بھاگ نہیں رہے۔

سمیتا دوڑ کر اُن سے لپٹ گئی، "ارے بھائی صاحب! آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا! آپ

تو اچھے خاصے اپنے چاروں پیروں پر چل کر آ رہے ہیں۔"

"چار نہیں، پانچ،" نارائن نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر ماتھا چوم لیا، "چھڑی دیکھ رہی ہو نا، اگلے ہفتے اسے ضرور چھوڑ دوں گا . . . ارے، ارے، ماما بھی ہیں! انھیں کیوں تکلیف دی۔"

اور آگے بڑھ کر پیر چھو لیے۔ پھر تو اس مبارک ملن پر دیوتاؤں نے بھی پھول برسائے۔ (زندہ آباد) کے نعرے لگاتے صحافیوں نے، دوستوں نے نارائن اور ورلکا کو ہاروں اور پھولوں سے لاد دیا۔ شاہدہ اور وبھا دوڑ دوڑ کر انھیں سمیٹتی رہیں۔ وبھا بولی "بڑکپن کا کچھ حصہ ہمیں بھی تو ملے۔" شاہدہ نے چٹکی لی، "اُس کے لیے ٹانگ تڑوانی پڑے گی۔ اتنی ہمت ہے؟ چلوگی میدان جنگ میں؟"

سب کا اپنا اپنا میدان جنگ ہے بہن۔"

شاہدہ وبھا کو دیکھتی رہ گئی۔ خود پر پشیمانی بھی ہوئی، لیکن اس گہماگہمی میں کچھ نہ بول سکی۔ اتنا ہی کہا، "تم میرے ساتھ چلنا۔ اکادمی کی کار ہے۔ چھوڑتی چلی جاؤں گی۔"

نارائن صحافی دوستوں کے ساتھ منی بس میں گئے۔ ورلکا اور سمیتا ماما کے ساتھ تھیں۔ انکت اس سارے وقت ورون کو لے کر مصروف رہا۔ اُسے ایک بنا چابی کے چلنے والا کھلونا مل گیا تھا۔ کار میں بھی وہ اُسے چپکائے رہا۔

سمیتا نکنج اور رمیگھا کو نہیں بھولی تھی۔ برابر انھیں اپنے ساتھ رکھا اور چلتے ہوئے وبھا سے کہا، "انھیں اپنے ساتھ بٹھا لو۔ وہیں سے گھر جائیں گے۔"

نکنج نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہاتھ سے ورلکا نے منع کر دیا، "نکنج بھیا، ہمارے گھر میں سمیتا بھابھی کی حکومت چلتی ہے۔"

دن نکلنے والا تھا۔ کرن، وبھا اور رمیگھا کے ساتھ رسوئی میں مصروف ہو گئی۔ انکت تو بس ورون کو چپکائے پھرتا رہا جو طرح طرح کی آواز نکالتا تھا یا سوتا تھا۔

انکت نے پوچھا، "بُوا، دیکھو یہ سوتے سوتے ہنستا ہے۔ خواب میں کسی پری سے کھیل رہا ہوگا۔ بُوا، یہ کھاتا کیا ہے؟"

"ابھی تو بیٹیا! دودھ پیتا ہے۔ اب مسلا ہوا دال یا کیلا کچھ دیں گے۔"
"دیکھو دیکھو، پھر ہنسا، بڑا گورا رنگ ہے اِس کا، آپ کے جیسا۔"
"تم بھی تو گورے ہو بیٹے، ماں جیسے۔"
"بوا، اِس کے پاپا تو گورے نہیں ہیں۔"
تبھی وبھا نے آواز دی، "دیدی، آؤ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ انکت تو بھی آ۔"
انکت بولا، "نہیں، نہیں بُوا، تم جاؤ، میں وردن کے پاس بیٹھا ہوں۔ اُسے لے کر آؤں گا۔"
اور دس منٹ بعد وہ واقعی وردن کو گود میں سمیٹے چائے کی میز پر آ پہنچا، "تم دیکھو، اس نے شو شو کر لی، اب بھوک لگی ہے، تبھی رو رہا ہے۔"
سمیتا نے پیار سے انکت کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے ورنکا سے بولی، "بے چارہ، برابر اکیلا رہا ہے، اب اسے چھوڑ کر اسکول بھی نہیں جائے گی۔"

چائے کے بعد سارے دوست چلے گئے۔ پتاجی اپنے تخت پر جا بیٹھے۔ نارائن کو سخت حکم ملا کہ وہ دو گھنٹے کے لیے سو جائے۔ اُس نے چپ چاپ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے اپنا نقلی پیر کھول دیا، گوڑے کے نیچے گوشت کا ایک لوتھڑا سا لٹک رہا تھا۔ انکت تجسس سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُسے چھو کر بولا، "پھوپھاجی، اس میں درد ہوتا ہے؟"
"نہیں بیٹے، وہاں نہیں، لیکن اوپر جہاں شکنجہ کستے ہیں وہاں کچھ کچھ درد ہوتا ہے۔ دس پندرہ دن میں وہ بھی جاتا رہے گا۔ پیر دیکھا تم نے، بنا ہے نا اصلی جیسا؟"
"ہاں پھوپھاجی! بالکل نہیں لگتا کہ یہ نقلی ہے۔ ایسے ہی سارا جسم بن سکتا ہے پھوپھاجی؟"
"ہاں سائنس والوں نے روبو نام کا مشینی آدمی بنایا ہے۔ وہ سب کام کرتا ہے۔ لیکن تبھی تک جب تک چابی بھری رہتی ہے، کھلونوں کی طرح۔"
سمیتا نے پکارا، "انکت بیٹے، تمھیں اسکول نہیں جانا کیا؟"
"جانا ہے، ضرور جانا ہے۔"
اور اُس کے اسکول جانے تک نارائن سو گئے تھے۔ ماما بھی سو رہے تھے۔ تب ورنکا اور وبھا کو لے کر

سمیتا اوپر چلی گئی۔ بہت کچھ تھا اُن کے پاس ایک دوسرے کو سنانے کے لیے، بہت کچھ فخر کرنے لائق بہت کچھ جو سماج کی بیمار ذہنیت کی علامت ہے۔۔۔

اجیت کے آنے تک نارائن ماما کے پاس ہی رہے۔ پہلے کی طرح وہ دوڑ نہیں سکتے تھے لیکن مصروفیت میں کوئی کمی نہیں آئی وہ کب کیا کریں گے، یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ ورنکا انھیں پالتو نہیں بنا سکی، در اصل اُس نے بنانا چاہا ہی نہیں۔ وہ اب بھی ایک ایک ہفتہ تک بنا بتائے باہر چلے جاتے۔

ورنکا نے 'ناری من' میں معاون ایڈیٹر کا عہدہ قبول کرلیا۔ وبھا الہ آباد سے بمبئی چلی گئی۔ وہ ابھی کسی اخبار ورسالہ سے نہیں جڑی تھی۔ لیکن جب تب خاص پروجیکٹ ہاتھ میں ضرور لے لیتی تھی۔ چہروں سے نقاب اتارنے اور پوشیدہ راز ڈھونڈ نکالنے کی وجہ سے وہ تیزی سے ایک بے باک صحافی کے طور پر جانی جانے لگی تھی۔ اِدھر ریگارے سے اس کی خوب بنتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس آرہے تھے۔

تبھی ایک دن ششیا ملا کے شوہر کیشون کا تار آیا— "ہمارے گھر میں ایک بیٹے کی آمد ہوئی ہے۔"

سمیتا نے ورنکا سے پوچھا "کیوں دیدی، خوش قسمتی اور اولاد سے عورت کو کبھی نجات مل سکے گی؟"

"خوش قسمتی اور اولاد سے نجات ممکن نہیں ہے، تم شاید اِن کی فریفتگی سے نجات کی بات کہتی ہو۔"

"جی ہاں، دیدی، میں وہی بات کہہ رہی ہوں۔ اس سوال کو لے کر اپنے آپ سے کتنی الجھی ہوں، آپ سے، اجیت سے، ششیا ملا سے بھی، اب آپ ہی بتائیے، معاشی نگاہ سے جب وہ کسی کی دست نگر نہیں ہے تو کیوں اُس نے ایک نااہل مرد کو قبول کیا؟ کیوں تیسری جان کو اپنے نہایت ہی مفلس سنسار میں آنے دیا؟ اتنی بیدار، سمجھدار، حساس! پھر بھی کیسی ہے یہ مایا جال؟"

"اس نے یقیناً غلطی کی" وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولی "غلطی میں نے بھی تو کی ہے، بھابھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ معاشی انحصار کی دلیل دے کر میں اپنا بچاؤ کر سکتی ہوں، لیکن فریفتگی سے نجات تو میں بھی نہیں پاسکی۔۔۔؟"

"دیدی، میں بہت سوچتی ہوں اس بارے میں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اگر عورت ان دونوں سے واقعی نجات پائے تو کیا وہ عورت رہے گی؟ کیا یہ کائنات ختم نہیں ہو جائے گی؟"

"ہو جائے۔ کیا مل رہا ہے انسان کو اس کائنات کے چلنے سے؟"

سمیتا نے اچانک جواب نہیں دیا۔ بار بار یہ اُس کے اندر ہلچل پیدا کرنے لگا — ہاں کیا مل رہا ہے۔ انسان کو اس کائنات کے چلنے سے؟ ہاں کیا مل رہا ہے؟ کیا ہم کسی دیوتائی حکومت کے ہاتھ کا کھلونا تو نہیں ہیں۔ کیا ہم قدرت کے ہاتھوں مجبور نہیں ہیں — کہاں ہے جواب؟ کہاں ہے سوال کا جواز... کیوں ہم زبان اور خیالوں کے مایا جال میں پھنسے ہیں؟ کیوں ہم نے سچ کی تلاش کے پس پردہ اس فریفتگی کو چھپایا؟ مسلسل چلتے رہنے کا غرور کیا اُسی فریفتگی کی چاہت کو سالم رکھنے کے لیے نہیں ہے؟

اچانک ورتکا نے پکارا — "کہاں کھو گئی، بھابھی میری! انکت آنے والا ہوگا۔ آج تو اس کا ریزلٹ آنا ہے۔"

اسی لمحے گھنٹی بجی اور انکت خوش کن لہجے میں یہ کہتا ہوا — "ممی، ہم پاس ہو گئے، چوتھا نمبر ہے۔" باباجی کے کمرے میں گھس گیا۔ "دیکھنا باباجی! ہمارے اسّی فی صد نمبر آئے۔ تھوڑے کم ہیں، تبھی چوتھا نمبر آیا ہے۔"

باباجی نے اُسے پیار سے تھپ تھپایا۔ "بہت اچھے نمبر ہیں بیٹے، اگلی بار اور اچھے آئیں گے۔"

انکت اُسی سنجیدگی سے ممی کی طرف مڑا۔ "دیکھو ممی، کتابوں کی فہرست ہے، یہ کاپیوں کی اور یہ ڈریس اور فیس کی۔ دس دن میں فیس جمع کرانی ہوگی۔"

سمیتا نے انکت کو پیار سے اپنے پاس کھینچ لیا، بولی — "تم نے بہت اچھا کام کیا ہے، چلو پہلے کچھ کھا پی لو۔ میں تمھارے سارے کام کر دوں گی۔"

"سنو ممی! پاپا نے سائیکل دلوانے کا وعدہ کیا تھا، وہ پورا کرنا ہوگا۔"

ورتکا بولی۔ "وہ ہم پورا کریں گے بیٹے۔"

انکت چہکا۔ "بوا، اب ہم بڑے ہو گئے نا۔ ورون ذرا بڑا ہو جائے تو اُسے پیچھے بٹھا کر لے جایا کریں گے۔"

"ضرور ضرور، وہ تو تمھارا چھوٹا بھائی ہے۔"

"بہت چھوٹا ہے۔ ہمارے ساتھ کرکٹ نہیں کھیل سکتا۔"

"تو ہم کھیلیں گے،" کہتی ہوئی شاہدہ وہاں آکھڑی ہوئی۔

"ارے آنٹی، آپ بہت بڑی ہو، ہیں تو... آپ نے ہمارا ریزلٹ دیکھا؟ چوتھا نمبر آیا ہے۔"

"اچھا!" شاہدہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اور بھی بڑی کرتے ہوئے کہا، "شاباش! اگلی بار اوّل آنا۔"

"امید تو ہے،" بڑے بزرگوں کی طرح انکت ایسے بولا کہ سب کھل کھلا پڑے اور سمیتا اُسے کھینچتے ہوئے اندر لے گئی۔ چائے پیتے ہوئے اچانک شاہدہ بولی، "ایک بہت اہم خبر ہے۔ آپ کے سامنے والے ڈپٹی سکریٹری ہیں نا..."

سمیتا بولی، "ہاں، میں نے انھیں دیکھا ہے۔ اُن کی ایک بہن بمبئی میں ہے۔"

"ہاں، اُن کی ایک بیٹی ہے۔ ایم۔ ایس۔ ڈبلیو کر کے ایک ہسپتال میں ذہنی طور سے معذور بچّوں کا مطالعہ کر رہی ہے۔"

"تو؟"

"اس نے پچھلے ہفتہ چپ چاپ ایک مسلم نوجوان سے شادی کر لی۔"

اچانک جیسے کچھ عجیب واقع ہو گیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی ہو گئی۔ زندگی میں ایک نہ ایک مقام ایسا آتا ہی ہے، جہاں ہم وہ ہو جاتے ہیں جو ہم ہوش میں رہنے پر ہونا نہیں چاہیں گے۔ اس خاموشی کو سب سے پہلے ورنکا نے توڑا۔ "تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ یہ خبر کیوں بنی؟ لڑکا آدمی تو ہے نا؟"

شاہدہ ہنس پڑی، "آدمی ہی نہیں، پکا سوشلسٹ ہے اور لڑکے کی ماں بھی ہندو ہے، ہریانہ کی جاٹنی ہے، اور ان کے خاندان ہیں..."

تبھی پتاجی نے پکارا۔ سمیتا فوراً "آئی پتاجی" کہتی ہوئی وہاں پہنچی۔ ان کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اُس میں وبھا کی ایک تفصیلی خبر پر تبصرہ چھپا تھا۔ پتاجی بھی بولے، "اِسے پڑھو بیٹی۔"

سرسری نگاہ ڈالتے ہی وہ سمجھ گئی کہ یہ تو وہی کہانی ہے جو شاہدہ سنا رہی تھی۔ ورنکا جانے والی تھی۔ انھیں روک کر سمیتا نے تجسس سے اس تبصرہ کو پڑھا۔ وبھا نے اپنے نام سے لکھا تھا—

تعجب ہے، سکھ بھی آج اپنے کو الگ قوم، الگ ذات، الگ مذہب کا مانتے ہیں لیکن اُن میں اور ہندوؤں میں شادی بیاہ ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے ہندوؤں میں، لیکن ہندو مسلمانوں میں نہیں ہوتے، قوم، ذات مذہب اُن کی بھی الگ، سکھوں کی بھی الگ، تب یہ بھید بھاؤ کیوں؟

تاریخ میں اس کے اسباب ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ اُن کے پیچھے کچھ منطق بھی ہو سکتا ہے، لیکن پہلے تو دلیل کسی مسئلے کا مستقل حل نہیں ہے۔ دوسرے، ہم قدیم تاریخ کی عزت کر سکتے ہیں، وہاں اپنی جڑیں ڈھونڈ سکتے ہیں، لیکن اس میں جو کچھ بلا مطلب ہے اُسے کب تک اپنے کندھوں پر ڈھوتے رہیں گے؟ یہ تو لاش کو ڈھونے جیسا ہے۔

وقت کیا رکتا ہے؟ تب سماجی طور طریقے، سماجی اقدار کیسے ٹھہرے رہیں گے؟ ہمارے جانے انجانے چاہے انچاہے، وہ ویسے ہی بدلیں گے جیسے سائنسی تصورات بدلتے ہیں۔ زمین چپٹی سے گول ہو جاتی ہے، زمین سورج کے گرد نہیں بلکہ سورج زمین کے گرد چکّر کاٹتا ہے۔ زمین اپنی دُھری پر ہی گھومتی رہتی ہے۔ کشش ثقل نہیں، ریلیٹویٹی کا اصول سہی ہے۔

تب اگر کوئی ہندو عورت پرانے قاعدے قانون کو چھوڑ کر ایک اپنے من چاہے نوجوان سے شادی کرتی ہے تو ہم پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ کیوں اسے توقیر اور ذات کا، انا کا سوال بناتے ہیں؟ ڈاکٹر اندو بجا ایک پچیس سال کی بالغ خاتون ہیں۔ مدرس ہیں۔ تاریخ پڑھاتی ہیں۔

ایک دن انھوں نے اُسی کالج کے سائنس کے لکچرر ڈاکٹر اسد انصاری سے چپ چاپ شادی کر لی اور اُن کے ساتھ جا کر رہنے لگیں۔ میں مانتی ہوں، انھوں نے یہ غلطی کی، انھیں اپنے والدین کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔ اگر وہ مخالفت کرتے تو تھوڑا انتظار کرنا چاہیے تھا، لیکن یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو دشوار ہوتا۔ انھوں نے اپنے حق کا استعمال کیا، اس کا انھیں حق تھا۔ سبھی سہی سوچ والوں کی نیک خواہشات اُن کے ساتھ ہیں۔ جنون انھیں چھو بھی نہیں گیا ہے۔ وہ اپنے کو ہندوستانی بھارتی مانتے ہیں۔ خود اندو جا کا خاندان اتنا تنگ نظر نہیں ہے۔ وہاں بہو بنگالی ہے تو داماد مراٹھی۔ کیرل، پنجاب، گجرات سبھی صوبے اس خاندان میں شیر و شکر ہیں۔ ایک بہو سکھنی بھی ہے۔ تب ایک داماد مسلمان ہو گیا تو بُرا کیا؟ اسے سونے پر سہاگہ کیوں نہ مانیں؟ سارا ہندوستان ایک جھنڈے کے نیچے۔ اندو جا کے والدین، بھائی ـــ سبھی سے میں ملی۔ سب کا کہنا تھا کہ ہم خود تنگ نظری میں یقین نہیں رکھتے،

لیکن مسلمان...

جانے دیجیے، اس نکتے کو، میں نے اندو جا سے کہا کہ " میں تمھاری مکمل تائید کرتی ہوں۔ تم دونوں کو دلی مبارکباد دیتی ہوں۔ تمھاری نئی زندگی ایسی محبت اور ذمہ داریوں سے ہمیشہ جگمگاتی رہے۔ لیکن میں جاننا چاہوں گی کہ تم نے اپنے خاندان کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟"

" کیوں کہ میں جانتی تھی، وہ مجھے اجازت نہیں دیں گے۔"

" اگر تمھیں ایسا یقین تھا تو کیا تمھیں انھیں سمجھانا نہیں چاہیے تھا؟ اگر پھر بھی وہ راضی نہیں ہوتے تو کیا تمھیں تھوڑی دیر رکنا نہیں چاہیے تھا؟"

" مجھے ایسا نہیں لگا۔"

" کیوں نہیں لگا، کیا اس لیے کہ تمھارے دل میں مرد کے لیے یا کہوں مرد کی طاقت کے لیے ایک فریفتگی، ایک کشش جاگ گئی تھی؟"

" کیا مطلب؟" اُس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔

" میرا مطلب ہے، سوال انقلاب یا بغاوت کا اتنا نہیں تھا جتنا مرد کو پاتے کا۔ اُس مرد کو جس کی طاقت کے لیے تمھارے اندر کشش تھی۔"

" میں اس فرہنگ کو نہیں سمجھ سکتی۔ میں اُس سے محبت کرتی ہوں اور وہ مجھ سے، میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔"

" میں اس پر شک نہیں کرتی۔ لیکن کیا کچھ دن اور رک کر اُسے گنجان نہیں ہوتے دیا جا سکتا تھا؟ کیوں جلدی کی جائے شادی کے بندھن میں بندھنے کی؟ کیوں نہ اپنے آپ کو آزاد رکھا جائے ہر طرح کی فریفتگی اور بندھن سے؟ تب کچھ وقت بعد اس کی کوئی مقررہ میعاد نہیں ہے (ہو سکتا ہے، وہ محبت بجھ جاتی یا پھر اتنی شدید ہو جاتی کہ تم اُس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ تب شاید تمھارے والدین بھی راضی ہو جاتے۔ ایک بات اور کہتی ہوں، ایک دوسرے میں کھو جانے کا رومانی جذبہ آزاد شخصیت کا انکار ہے۔ عورت کی آزاد شخصیت کے بغیر شادی کا مستقبل دھندلا ہے۔"

میرے آخری جملے پر وہ تھوڑا چونکی۔ کئی پل خاموش خود سے الجھتی رہی۔ پھر بولی، " میں دیکھتی ہوں، آپ جو کہنا چاہتی ہیں اس میں اصلیت ہے۔ شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ایسا ہو سکتا تو...

اور آزاد شخصیت... بہت سوچنا ہوگا۔"

ایک لمحے کے لیے رک کر وہ بولی، "لیکن میں جانتی ہوں، ہم ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ہماری محبت ہمیں دھوکہ نہیں دے گی۔"

"میری بھی خواہش رہے گی، ایسا نہ ہو۔ پھر بھی کشش، محویت، یہ سب بے معنی ہیں، خاص طور سے اس ضمن میں۔۔۔ ایک بار پھر اپنی اور اپنے ہم خیال والوں کی طرف سے تم دونوں کو دلی مبارکباد اور خلوص۔"

میں چلی آئی، لیکن میں نے دیکھا اُس کے چہرے پر سوال جیسا کچھ ابھر رہا ہے۔ میں یہی چاہتی تھی۔

بڑھ چکی تو وہ تینوں کئی لمحے تک گم حواس باختہ خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر ورتکا نے اُٹھتے ہوئے کہا، "یہ دیکھا تو واقعی بہت گہرائی میں چلی گئی، لیکن کیسی سیدھی سادی زبان، تعجب، یہ وہی وکیا ہے..."

سمیتا بولی، "مجھے خوشی ہے کہ وہ عورت کی ایک آزاد شخصیت کو شکل دے رہی ہے۔"

شاہدہ کچھ نہیں بولی، "ورتکا کو جاتے دیکھتی رہی، بس ایک بار ورون کو پیار کیا۔ جب وہ چلی گئی تو پوچھا، "بھابھی، ورون کا کیا مطلب ہے؟"

"ورون جل کے دیوتا کو کہتے ہیں۔ یہ آریوں کے شروع کے دو تین دیوتاؤں میں ایک تھا اور ایران کے پارسیوں کے ایک دیوتا کا نام بھی ورون ہے۔ پورا نام 'منترا ورون'، لیکن دیدی کو 'ورون' نام ہی اچھا لگا۔ سیدھا اور خوبصورت۔"

"کرن نہیں دکھائی دے رہی آج؟"

"وہ ایک ہفتہ کے لیے نانی کے پاس گاؤں گئی ہے۔ اب کالج میں آگئی ہے۔"

"تب میں آجایا کروں؟"

"زہے قسمت، نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

تبھی دروازے کی گھنٹی بجی۔ اجیت تھے اور ان کے پیچھے تھے سامنے کے مکان میں رہنے والے ڈپٹی سکریٹری ڈاکٹر رام کشور استھانا۔ وہ بڑے پریشان تھے۔ مہندر جی نے انھیں دیکھا تو بولے، "آیئے، آیئے استھانا جی، کیسے مزاج ہیں؟"

استھاناجی نے کچھ تلخی سے جواب دیا، "مزاج تو آپ نے آج کے اخبار میں دیکھ ہی لیے ہوں گے۔ دیکھا تو آپ کی بیٹی ہے جس نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا ہے۔"

"جی نہیں، چھوڑا نہیں، آزاد کیا ہے۔ دراصل شادی سے قبل وہ کسی اور سے محبت کرتے تھے۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"اپنی اپنی رائے قائم کرنے کے لیے سب آزاد ہیں۔ میری نگاہ میں تو اُس نے وہی کیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا۔ بے جان رشتے سے کب تک چپکی رہتی؟"

وہ ایک لمحے خاموش رہے، پھر بولے "یہ سب وہ نہ لکھتی تو اچھا تھا۔"

"صحافی ہے وہ۔ اُس کا کام یہی ہے۔ پھر، استھاناصاحب، مہندرجی نے حتی الامکان نرم لیکن مستحکم آواز میں کہا، "آپ اپنے ذہین ہیں۔ آپ کی بہن کے خاندان میں بھی کتنی رنگارنگی ہے۔ اندو بٹیا تھوڑا اور آگے بڑھ گئی تو میری نگاہ میں کچھ بُرا نہیں ہے۔ ہاں، جیسا وہ بھانے لگا اُسے ماں باپ سے پوچھنا چاہیے تھا۔ لڑنا چاہیے تھا، وہ زیادہ اچھا ہوتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن مسلمانوں کی بات ہے۔ ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔ دونوں کے من نہیں ملتے۔"

"لیکن خاندان میں تو بٹیا کی ساس بھی ہندو ہے۔ وہ اُس خاندان میں پوری طرح سے گھُل مل گئی ہے۔ بیٹی کا نام اندرانی رکھا ہے۔ مذہبی رسومات میں بھی ان کا بہت اعتقاد نہیں ہے۔ اسد کا تو بالکل نہیں۔ اور میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ رام جنم بھومی کے معاملے میں اُس نے اپنے ہم خیالوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے اپیل کی کہ حقیقت چاہے کچھ بھی ہو لیکن چونکہ رام ہندوؤں کے قابل عبادت دیو ہیں، بھگوان ہیں اس لیے اچھا ہوگا کہ مسلمان دوست وہی مقام پوری فراخ دلی کے ساتھ انہیں سونپ دیں۔"

"ایسی حالت میں میں تو اس بندھن میں کوئی برائی نہیں دیکھتا۔ کاش! اس جذبے کو ہم نے اور مسلمانوں نے بھی پچھلی صدی میں قبول کرلیا ہوتا تو ملک کے ٹکڑے کبھی نہ ہوتے۔۔۔"

"بھائی صاحب،" استھاناصاحب نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا، "آپ سے کہتا ہوں، جب سنا تو بہت غصہ آیا، لیکن تھوڑا سوچنے سمجھنے پر میں بھی اُسی نتیجے پر پہنچا جس پر آپ لیکن ماں تو سنتی نہیں روتے روتے ادھ مری ہوگئی ہے۔ میں لڑکے اور اُس کے گھروالوں سے بھی مل آیا ہوں۔"

"سچ!"

"جی ہاں، لیکن آپ ذرا بٹیا کو سمجھا دیجیے کہ اخباروں میں نہ لکھیں۔"

"میں کہوں گا۔" مہندر جی نے کہا۔ استھانا صاحب اُٹھنے لگے تو انھوں نے کہا۔ "بیٹھیے نا چائے آرہی ہے۔"

"پھر کسی دن پیوں گا، آج نہیں۔"

اور وہ چلے گئے۔

اُس دن چائے کی میز پر سمیتا اور اجیت ہی تھے۔ سمیتا نے کہا۔ "چھٹیاں ہونے ہی والی ہیں۔ انکت کو کہیں لے چلیں۔"

"تم جانتی ہو، میں تو جا نہیں سکوں گا۔ پروجیکٹ رپورٹ دینی ہے۔ جاپان سے کچھ شاعری اور کچھ کہانیاں لے آیا ہوں، اُن کا ترجمہ بھی چل رہا ہے۔ تمھاری رپورٹ بھی چھپ کر آنی ہے۔"

"ہاں، وہ تو ہے، لیکن . . ."

"ایسا ہے کہ تم کچھ دن کے لیے کیرل چلی جاؤ۔ تین ہفتے کا پروگرام بنالو۔ میرے دوست ہیں، تمھیں سر آنکھوں پر رکھیں گے۔"

"سوچوں گی۔"

سوچوں گی نہیں، بس ابھی سے تیاری شروع کر دو۔"

سمیتا ہنس پڑی۔ "تم تو اجیت، اب ہمیشہ گھوڑے پر سوار رہنے لگے ہو۔ تجویز اچھی ہے لیکن ابھی تو چھٹیاں ہونے میں پندرہ دن ہیں۔"

تبھی دروازے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ سمیتا نے دروازہ کھول کر دیکھا تو سامنے بندیا کھڑی تھی۔ بری طرح کانپتی روتی۔ پریشان سمیتا بول اُٹھی۔ "کیا بات ہے، کیا ہوا؟"

تیزی سے بندیا اندر آئی۔ بولی۔ "آپ ابھی چلو میرے ساتھ۔"

"ہوا کیا، بتا تو، کرن تو ٹھیک ہے؟"

بندیا کا باندھ ٹوٹ گیا۔ ٹوٹے ادھورے جملوں میں اتنا ہی بولی۔ "رات دو غنڈے کھینچ لے گئے اسے گاؤں والے گھر سے۔ پھر اُسے باندھ دیا اور اس کی رنچکیاں، عزت . . . لوٹ لی . . ."

لگا جیسے بے ہوش ہو جائے گی۔ سمیتا سب کچھ سمجھ گئی۔ غصّہ سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "کہاں ہے وہ اب؟"

"پولس اُسے ہسپتال لے گئی ہے۔"

"تو رونا بند کر، میں ابھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔"

سمیتا پہلے پتاجی کے پاس گئی۔ انھیں سب کچھ بتایا اور بولی "میں ابھی تو بندیا کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

"لیکن بیٹی، اجیت کو ساتھ لے جا۔"

"نہیں پتاجی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، ہسپتال ہی تو جا رہی ہوں۔"

"پھر بھی بیٹی، پولس ہوگی وہاں. . ."

"اگر اب بھی میں پولس کا سامنا نہیں کر سکتی تو کیا فائدہ میرے پڑھنے لکھنے اور سکول آف سوشل ورک میں لکچرر رہنے کا؟"

"میں یہ نہیں کہتا۔ وہ تو سب کرے گی، لیکن دوسرے فرد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، پتاجی۔"

وہ اجیت کے پاس گئی، اور کچھ ہی پل میں وہ دونوں تیار ہو کر بندیا کے ساتھ ہسپتال پہنچے۔ تب تک ڈاکٹر جانچ کر چکے تھے۔ سمیتا کو دیکھتے ہی کرن کا باندھ ٹوٹ گیا۔ سمیتا نے اُسے سینے سے لگا کر اتنا ہی کہا، "تجھے رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو ہوں تیرے ساتھ۔ ابھی گھر چلتے ہیں۔"

پھر ڈاکٹر سے اس نے پوچھا، "میں اسے گھر لے جا سکتی ہوں۔"

"ضرور لے جایئے، اسے آرام اور اچھے ماحول کی ضرورت ہے۔ اِس نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اور میں مہندر جی کے ناٹکوں کا فین ہوں، لیکن کیا پولس میں باقاعدہ رپورٹ کرانا چاہیں گی؟"

"ضرور کرانا چاہوں گی، میں چاہوں گی کہ وہ زانی پکڑے جائیں۔"

پولس والے پاس ہی کھڑے تھے۔ ایک نے کہا، "آپ کو پولس اسٹیشن چلنا ہوگا۔"

"کس لیے؟ کیا آپ نے رپورٹ درج نہیں کی؟ نہیں کی تو یہاں کیسے لائے؟"

"وہ تو سب کیا۔۔۔"

"کرن کا بیان لیا؟"

"وہ بھی لیا۔"

"تب؟"

"ایس ایچ او صاحب آپ سے بات کرنا چاہیں گے۔"

"تب ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ اجیت، تم کرن کو گھر لے جاؤ۔"

کانسٹیبل نے پھر کہا، "لیکن لڑکی۔۔۔"

"نہیں، لڑکی اب پولس اسٹیشن نہیں جائے گی۔ رپورٹ تمھیں مل گئی ہے اور جو کچھ کہنا ہوگا میں کہوں گی۔ چلو، میں اس کی سرپرست ہوں۔"

اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اجیت کرن کو لے کر گھر چلے گئے۔ انھوں نے راستے میں ہی کرن کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اب نہ تو روئے گی، نہ کسی بات کی فکر کرے گی۔ نہا دھو کر کچھ دیر آرام کر سکتی ہو، چاہو تو ورنہ اپنا کام دیکھو۔ اسکول کھلنے میں ابھی دو ہفتے ہیں۔

کرن جس سماج سے آئی تھی، وہاں ان باتوں کو لے کر ذہنی طور سے ویسی پریشانی نہیں ہوتی تھی جیسی نام و نہاد خاندانی گھروں میں۔ پھر وہ سمیتا کے ساتھ رہ کر بہت بدل گئی تھی۔ کم بولتی تھی، لیکن گھمڑتی بہت تھی۔ اس لیے وہ دو دن میں ہی پہلے والی حالت میں آگئی۔ یہاں تک کہ اس نے سمیتا سے کہا، "دیدی میں اس سے بدلہ لوں گی۔"

"کیسے؟"

"وہ میں نے طے کر لیا ہے۔ میں اُن کے پوشیدہ جسم کاٹ کر رہوں گی۔"

سمیتا کرن کو دیکھتی رہ گئی۔ پاس کھینچ کر بیٹھ تھپ تھپائی۔ بولی، "شاباش، ایسی ہی ہمت چاہیے۔"

اُدھر اس نے پولس کو بھی پورا یقین دلایا کہ ملزموں کو پکڑوانے میں پوری طرح سے تعاون کرے گی۔ لیکن کرن وہاں نہیں آئے گی۔ اس سے کچھ پوچھنا ہوگا تو خاتون پولس میرے گھر آئے گی۔

لیکن جتنا آسان تھا پولس کو سمجھانا اتنا ہی مشکل ہو گیا افواہ پھیلانے والوں کو روکنا۔ دوسرے

دان ہی سے فون آنے شروع ہوگئے۔" آپ نے ایک درج فہرست ذات کی لڑکی کو اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ بلاتکار تو بہانہ ہے۔ وہ بدفعل ہے ایسی کہ اس ذات کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اُسے فوراً نکال باہر کرو، نہیں تو۔۔۔"

"نہیں تو کیا ہوگا؟"

"ہم بتاتے نہیں، کرتے ہیں"

"کر کے دیکھو،" وہ کہتی اور فون رکھ دیتی۔

دس دن بعد اچانک خط ملا۔ مقام، تاریخ، بھیجنے والے کا نام کچھ نہیں لکھا تھا۔ حروف بھی آڑے ترچھے تھے جیسے جان بوجھ کر کیے گئے ہوں۔ اس میں سمیتا کو تنبیہ کی گئی تھی "تم ہند سماج کو بھرشٹ کرنے پر تلی ہو۔ خود تو بدکردار ہو ہی۔ اپنی مثال سے اوروں کو بھی اُسی راہ پر چلنے کو اکسا رہی ہو۔ کرن نام کی ایک صفائی ملازم کی بیٹی بھی یہی بُرا کام کرتی ہے۔ اُسے تم نے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے اور۔۔۔"

خط پڑھتے ہوئے جیسے وہ چونک اُٹھی۔" ہوں۔۔۔ تو یہ اُن لوگوں کا کام ہے۔۔۔"

وہ خود اپنی رائے کے ساتھ اسے متعلقہ پولس افسر کو دے آئی۔ اُس کے ساتویں دن اُسے اطلاع ملی کہ کرن کے ساتھ بلاتکار کرنے والے دونوں نوجوان گرفتار کیے جا چکے ہیں۔ انھوں نے اپنا جرم قبول کر لیا ہے۔ آپ کو ذلیل کرنے کے لیے ایک کٹر پنتھی گروپ کے ایک ممبر نے انھیں یہ کام سونپا تھا۔ انھوں نے یہ کام پورا کرنے پر دو ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا، اور دے بھی دیئے ہیں۔

سمیتا دکھی بھی تھی اور حیران بھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کام انھیں نوجوان کا ہے۔ پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ اُس کا شک غلط ہو۔

اُس کے بعد حادثات تیزی سے واقع ہونے لگے۔ ٹائمس آف انڈیا کے عہدیداروں نے نارائن کو بمبئی ایڈیشن کا ریذیڈنٹ ایڈیٹر مقرر کر دیا تھا تین سال کے لیے۔ اُس کے بعد وہ آزاد ہوں گے، کہیں بھی جانے کے لیے۔

اور جلد ہی نارائن، ورنکا اور رورون بمبئی چلے گئے۔

ان کے پیچھے کی لین میں کیرل کی ایک عورت رہتی تھی۔ غیر شادی شدہ، اکیلی، سانولی لیکن خوبصورت
وسیبی ہی شانت، مہذب، عمر پینتیس کے لگ بھگ۔ صبح نوکرنے اگر جب گھنٹی بجائی تو کوئی رد عمل
نہیں ہوا۔ بار بار بجانے پر بھی کوئی آہٹ نہیں۔ اُس نے پڑوسی کو اطلاع دی۔
ایک گھنٹے بعد پولس نے آکر دروازہ توڑا۔ وہ اپنے خواب گاہ میں مری پڑی تھی۔
جسم پر لڑائی کے نشان تھے۔ بالنکار کے بعد دہشت گردوں نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

سمیتا جہاں پہلے رہتی تھی، اُسی کے پڑوس میں پرجاپتیوں کا ایک خاندان رہتا تھا۔ اُن کی ایک
بے حد خوبصورت بیٹی تھی۔ بڑے شوق سے انھوں نے اس کی شادی ایک اچھے خاندان میں
کی۔ لڑکا خوبصورت صحت مند اور تعمیری ڈپارٹمنٹ میں ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا۔ شادی کے
بعد اُس کی بیوی کو پتہ لگا کہ اُس کے شوہر کے تعلقات کسی اور عورت سے ہیں۔ اُس نے شروع
میں اُسے بہت سمجھایا، اپنی محبت کی دہائی دی۔ یہاں تک کہا، "میں کیا کم خوبصورت ہوں
جو تو۔۔۔؟"
شوہر شراب میں دُھت تھا۔ اُس نے اس کے گال پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔ بولا "حرام زادی
خصم سے زبان لڑاتی ہے۔ مرد خوبصورتی نہیں کچھ اور بھی چاہتا ہے۔"
اُس کے بعد ان کی گرہستی میں ایک طوفان سا آگیا۔ اس کا انتقام ہوا اندر آتش میں۔
ایک دن اس ٹھیکیدار نے سوتے میں مٹی کا تیل چھڑک کر کنچن سی جسم کو کوئلہ بنا ڈالا۔

اجیت کے ایک دور کے رشتہ دار تھے مشہور عوامی لیڈر اور قابل۔ اُن کے بیٹے نے فخر سے
ایک ایسی لڑکی سے شادی کی جس کے ساتھ شاید کبھی بلاتکار ہو چکا تھا یا ایسا ہی کوئی تہمت جڑا
تھا۔ سُنا اب بیس سال بعد اُس نے اپنی اس بیوی کو چھوڑ کر ایک دوسری عورت سے شادی
کرلی ہے۔
اس بیس سال کی زندگی میں کبھی شگاف پڑا ہو ایسا انھوں نے نہیں سُنا شاید سب کچھ مُن
میں گھٹتا رہا۔ ان کی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ بیٹا محکمہ خارجہ میں تعینات ہے۔ آج کل امریکی سفارت خانہ

واشنگٹن میں ہے۔

اس دن سمیتا اور اجیت دونوں اکیلے بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ انکت بابا کے ساتھ کہیں گیا تھا۔ بہت دیر تک چپ چاپ دیکھتے رہنے کے بعد اچانک سمیتا بولی، "اجیت، ان دو تین ہفتوں میں کتنے حادثے ہوگئے۔ کیا یہ صرف اتفاق ہے کہ ہر بار عورت کو ہی سہنا پڑا؟"

اجیت نے سمیتا کی طرف صرف دیکھ لیا، کوئی جواب نہیں دیا۔ سمیتا پھر اچانک بولی، "اجیت! تمھارے اس رشتہ دار نے اپنی بیوی کو بیس سال بعد چھوڑ دیا۔ کتنی اور کیسی اذیت میں جیتے ہوں گے وہ دونوں؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تم بھی بیس سال بعد مجھے چھوڑ دو؟"

جیسے ایک بھیانک دھماکہ ہوا ہو۔ اجیت نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ وہ بولا، ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے "بیس برس تو کیا، تم چاہو تو تمھیں ابھی چھوڑ سکتا ہوں، ابھی!"

اور وہ پھٹ پڑا، "تم اپنے کو عظیم ثابت کرنے کے لیے مجھے کوستی رہتی ہو۔ کیوں، آخر کیوں؟ تمھیں بہت غرور ہے . . ."

سمیتا واقعی سہم گئی۔ فوراً اٹھی۔ اجیت کے پاس آکر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اجیت نے جھٹک دیا لیکن وہ کہتی رہی، "اجیت، مجھے معاف کردو۔ واقعی میری غلطی ہے۔ میں تمھارے پیر چھوتی ہوں، اجیت! میرے پیارے، میری طرف دیکھو میری جان، مجھے معاف کردو۔"

اجیت اسے پرے جھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ سمیتا نے اسی طرح کہا، "اجیت، تمھیں میری اور ہمارے انکت کی قسم، تم کہیں نہیں جاؤ گے۔"

اجیت جیسے کھڑا ہوا تھا ویسے ہی بیٹھ گیا۔ اپنا سر پیچھے صوفے پر ٹکا دیا۔ کئی پل تک خاموشی بکھری رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اجیت نے سمیتا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبا دیا۔ "مجھے اتنا کمزور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں تمھاری بات سچ ثابت کرنے جا رہا تھا۔"

سمیتا کی آنکھوں میں واقعی آنسو تھے درد کے بھی، پیار کے بھی۔

تبھی ٹی وی پر کنزیومر تہذیب کی علامت اشتہار آنے لگے۔ پہلا اشتہار ناریل کے کسی ٹریڈ مارک کا تھا۔ عورت کے بالوں کو لمبے، گھنے، کالے کرنے والا تیل۔ اسے ثابت کرتی

ایک دوشیزہ اپنے لمبے بالوں کو لہراتی اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اُس کے بالوں کو تعریفی نگاہوں سے گھورتا مرد۔

دوسرا اشتہار جلد کو ملائم، نازک کرنے والے صابن کا تھا۔ اُس کو لگاتے ہوئے اپنے جسم کی نمائش کرتی، نہاتی اور پھر مسکراتی عورت، اُس کی آنکھیں بھی مرد سے جا ملتیں جو اُس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے اور فریفتہ ہے اس کی جلد پر۔

تیسرا اشتہار فیر اینڈ لولی کریم کا تھا جسے لگا کر سانولی عورت گوری ہو گئی ہے اور وہاں بھی مرد ہی ہے جس کی طرف تشنگی مسکان لیے وہ دیکھ رہی ہے اور مرد کی آنکھوں میں اُس کے روپ کے لیے بے پناہ تحسین ہے۔

دونوں نے ایک ہی وقت معنی خیز نگاہیں اُٹھائیں اور دوسرے ہی پل دونوں کے درمیان ایک پل بن گیا جس میں سوال بھی تھا اور جواب بھی۔

اُس رات اُس پل نے انھیں کتنا جھنجھوڑا۔ تم ایک دوسرے کا پیالہ بھرو، ایک دوسرے کے پیالے سے پیو مت۔ ایک دوسرے کو اصل روپ میں پانے کے لیے فریفتگی سے نجات ضروری ہے۔

لیکن کیسے . . . کیسے؟ کیا یہ صرف مردوں کا سماج ہونے کی وجہ سے ہے کہ ایسے اشتہار ٹیلی کاسٹ کیے جاتے ہیں؟ کیا عورت واقعی روپ اور خوبصورتی کے لیے فریفتہ نہیں ہے، کیا وہ اپنے ہی روپ پر فریفتہ نہیں ہوتی، کیا اُس موہ کی آسودگی مرد کی کوشش میں نہیں دکھتی مکڑی کی طرح اُسے اپنے موہ جال کے لیے مسحور نہیں کرتی؟ کیا مرد کے بغیر اُس کا حسن اور خوبصورتی لائق ستائش ہو سکتی ہے؟ کیا اُس عورت نے جسے للکار پیارا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ شوہر کو بیوقوف بنانا بہت آسان ہے؟

"نہیں، نہیں" سیتا نے اپنے آپ کو اچانک خیالوں کے جال سے آزاد کرنے کی کوشش میں کہا: "یہ خالق کا پھیلاوہ ہے کائنات میں کو پھیلانے کا۔"

لیکن اُسے پھیلاوہ اور لذت کی ضرورت کیوں ہو؟ وہ تو اپنی مرضی سے بغیر مجامعت کائنات خلق کر سکتا ہے۔

باطن میں ہی کسی نے جواب دیا، 'خالق ہے کہاں جو کچھ کرے گا؟ یہ تو قدرت ہے جو بار بار تعدیل بدل بدل کر خود کو ہی مختلف شکلوں میں خلق کرتی رہتی ہے۔

لیکن اُس تخلیق کے لیے نر اور مادہ عناصر کا ہونا ضروری کیوں ہو؟

اپنے آپ سے اس طرح الجھ رہی تھی کہ اچانک اُس نے دیکھا، اجیت زور سے ہنسے جا رہا ہے، ہنسے جا رہا ہے۔

"کیا ہے اجیت؟ کیا بات ہے... اجیت؟"

"......"

"اجیت!" وہ چونکتی ہوئی زور سے بولی۔

"او، او...!" اجیت سانس لینے کو ہانپ رہا تھا۔ کئی پل لگے اُسے اپنے آپ کو سمیٹنے میں۔ بولا، "سُمی، اس دن چڑیوں کی دنیا' کتاب پڑھ رہا تھا۔ بے شمار ذاتیں، بے شمار طرح کے برتاؤ۔ ایک ذات میں ملن کے موسم میں نر سفر پر نکلتا ہے۔ ایک مادہ کے گھر آتا ہے، اُس کے بچے ہونے تک اُس کے پاس رہتا ہے، پھر دوسری مادہ کے پاس چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک ذات ہوتی ہے جس میں مادہ گھر سے نکلتی ہے۔ پہلے بچے تک ایک نر کے گھر میں رہتی ہے۔ بچے ہوئے کہ دوسرے نر کے پاس پہنچ جاتی ہے... سُمی عورت آج مرد کے پاس رہے، پھر دوسرا پسند کرے، پھر تیسرا، چوتھا، دسواں... ہو جائے گی نہ وہ خوش قسمت اور اولاد دونوں کی فریفتگی سے آزاد... بس یہی سوچتے سوچتے میری ہنسی پھوٹ پڑی۔ بے چارہ نر چڑیا۔"

سُن کر سمیتا کا من نہ جانے کیسا کیسا ہو گیا۔ کیا یہ ممکن ہے، کیا یہ واقعی فریفتگی سے نجات ہے؟ کیا یہ نظام صرف مشینی نہیں؟ دو لمحے میں نہ جانے کتنے خیال ایک دوسرے میں الجھ گئے۔ کسی طرح اپنے آپ کو سمیٹ کر اُس نے کہا، "اجیت، ہم پرندے نہیں، انسان ہیں۔"

"تو کیا انسان ہونا عذاب نہیں ہے؟"

"مشین ہونا کیا دعا ہے، اجیت؟ پرندہ تخلیق کر کے بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ خالق ہے۔ مشین ہے۔ ایک ہی دائرے میں گھومنے والا۔ انسان کے پاس ایک ضمیر ہے۔ وہ دائرے

توڑتا ہے۔"

"اور نئے بناتا ہے۔"

"ہاں، بناتا ہے۔ تبھی تو اُسے خالق ہونے کا احساس ہے۔ تبھی وہ مسلسل آگے بڑھتا رہے گا، سارے المیے کے باوجود۔"

اجیت پھُسپھُسایا جیسے اُس کے کان ہیں۔ "یہی سچ ہے سیمنا، یہی شاید۔"

اجیت نے تروینڈرم کے سفر کا پورا انتظام کرنے کے بعد، ٹکٹ دیتے ہوئے کہا "سیمنا، اسٹیشن پر میرے دوست رویندرن تمھیں ملیں گے۔ وہ یہاں آچکے ہیں۔ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اُن کے ساتھ رہ کر انکت بہت خوش ہو گا۔ کرن کی طبیعت بھی بہل جائے گی۔"

"ہاں، یہ تو ہے، لیکن تمھیں بہت مس کرے گا، اجیت۔"

"ہو سکتا ہے، میں بھی آجاؤں۔ ہندی پرچار سبھا کا سالانہ جلسہ ہے۔ انھوں نے بلایا تو جہاز سے آسکتا ہوں۔ لوٹوں گا تمھارے ساتھ اور ہاں، وہاں ہمارے علاقے کے ایک آئی۔ اے۔ ایس افسر ہیں، ڈپٹی سکریٹری ہیں۔ بہت سیدھے اور محبت کرنے والے ہیں۔ وہ بھی ملیں گے۔ اور وہاں کی قدرت۔۔۔"

کیرل کی سرحد میں داخل ہوتے ہی وہاں کی قدرت نے ان کا دل موہ لیا۔ سبزہ زار زمین مخملی جیسے دھان کے کھیت، مختلف قسم کے پیڑ پودے، کاجو، لونگ، الائچی، کھجور کے درخت، انکت پوچھتے نہیں تھکتا تھا۔ سیمنا تھک جاتی تھی۔ جیسا کہ اجیت نے کہا تھا، ڈاکٹر رویندرن اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کی بیٹی بھی ساتھ تھی۔ وہ خوب ہندی جانتی تھی۔ کرن کی ہم عمر تھی۔ سیمنا نے پوچھا "کیا نام ہے تمھارا، بیٹی؟"

"گیتا۔"

"بہت اچھا نام ہے۔ جب میں تمھیں پکاروں گی، گیتا کے اُپدیش یاد آجائیں گے۔"

گیتا شرما گئی۔ رویندرن نے کہا، "بھابھی جی، میں نے بھیّا کو آج ہی تار بھیجا ہے۔ وہ ہمارے سالانہ جلسہ میں مہمان خصوصی ہوں گے۔ وہ دس دن بعد آئیں گے۔ آپ پانچ دن ساتھ رہ سکیں گے۔

ابھی ہم ہوٹل چلتے ہیں۔ وہاں آپ کے لیے ایک کمرہ ریزرو ہے۔ نہا کر کچھ دیر آرام کیجیے، شام کا کھانا ہمارے گھر پر ہوگا۔"

سمیتا گاڑی سے اترنے کے بعد بار بار چاروں طرف دیکھ لیتی تھی۔ رویندرن سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پوچھا، "کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں آپ؟"

"ہاں، بھائی صاحب! ہماری واقف ایک عورت ہے یہاں، شیاملا۔ کویلون کے پاس ایک گاؤں میں رہتی ہے۔ اُسے تار دیا تھا۔ شاید آئی ہو، لیکن دکھ نہیں رہی۔۔۔"

تبھی ایک گول مٹول سانولے شخص نے اُن کے پاس آکر پوچھا "آپ دہلی سے آرہی ہیں؟ اجیت بھائی صاحب۔۔۔"

"ہاں، ہاں، بھائی! تمھیں ہی ڈھونڈ رہی تھی۔ شیاملا کہاں ہے؟"

"وہ تو نہیں آسکی۔ بیٹا ابھی چھوٹا ہے نا۔ مجھے بھیجا ہے کہ آپ کو لے کر آؤں۔"

تب تک وہ کار میں بیٹھ چکے تھے۔ کرن گیتا سے باتیں کر رہی تھی۔ انکت کبھی ان سے کبھی سمیتا سے باتیں کرنے لگتا۔ سمیتا نے کیشون سے کہا، "ہوٹل چل کر دیکھتے ہیں، کیسے پروگرام بنتا ہے۔ اجیت بھی آرہے ہیں۔ ایک دن اُن کے ساتھ آنا ہی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کیا؟"

تبھی کیشون نے انھیں ایک خط دیا۔ شیاملا نے لکھا تھا ۔۔۔

میری پیاری پیاری بھابھی!

میرے گھر آرہی ہو اور میں اسٹیشن بھی نہیں آرہی۔ آپ سے کیا چھپاؤں؟ لکھ نہیں سکی تھی۔ ہاتھ میں ایک پیسہ نہیں ہے۔ دو گائے تھیں۔ اُن کا دودھ بیچ کر پیٹ بھر رہے تھے۔ ہماری قسمت، ایک کو سانپ نے کاٹ کھایا۔ ایک بچی ہے، یہی ہمارا سہارا ہے۔

ساری باتیں ملنے پر بتاؤں گی۔ اب تو جیسے بھی ہو، دو دن میرے ساتھ رہنے آنا ہی ہوگا۔

تمھاری بہت بہت پیاری

شیاملا

سمیتا کے ذہن میں نہ جانے کتنے منظر اُٹھے اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ اُسے ساری

بات سمجھ میں آگئی۔ بولی، "آپ ابھی لوٹ جائیں اور شیاملا کو کل میرے پاس چھوڑ جائیں۔ وہ میرے ساتھ رہے گی، جب تک میں یہاں ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے رویندرن کی آنکھ بچا کر پچاس کا ایک نوٹ کیشون کی مٹھی میں تھما دیا۔ وہ وہیں اتر گیا۔ بس اڈہ آگیا تھا۔

اگلے دن دوپہر سے قبل ہی شیاملا آگئی۔ دیکھ کر سمیتا کانپ گئی۔ شیاملا واقعی رو رہی تھی۔

"کیا حال کر لیا تو نے اپنا؟"

"بھابھی، میں نے غلطی کی، سچ مچ غلطی، بتاؤں گی سب۔"

اتنا کہہ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ بیٹے کو بھابھی کی گود میں دے کر انکت کو اپنے پاس کھینچ لیا۔ انکت بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "بُوا، تم تو بہت کالی ہوگئیں۔"

شیاملا ہنس پڑی۔ "یہاں دھوپ بہت تیز ہوتی ہے۔"

"یہاں تو کل سے پانی پڑ رہا ہے۔"

حیران شیاملا نے بات کاٹ دی۔ "تو نے یہاں کے کیلے کھائے ہیں؟ بڑے میٹھے ہیں، لے کھا۔"

اس نے لال کیلا چھیل کر ایک اُسے دیا، ایک کرن کو، ایک بھابھی جی کے لیے تھا۔ کچھ نمکین بھی لائی تھی۔ سمیتا بولی۔ "بیٹے کا کیا نام ہے؟"

"سکمارن۔"

"رنگ تمہارے جیسا ہے نا، صورت باپ جیسی۔ لے سلا دے ابھی۔"

"تبھی دروازے پر آہٹ ہوئی۔" "میں آسکتا ہوں؟"

اور رویندرن کے ساتھ آئے ڈاکٹر ستیویر ورما۔ عمر تیس کے آس پاس، سرخی مائل رنگ چیچک کے کہیں کہیں گہرے داغ، آنکھیں خلوص سے منور۔ بولے "بھائی صاحب نے میرے بارے میں بتایا ہوگا۔"

"جی نمستے، بتایا تھا۔ آپ یہاں ڈپٹی سکریٹری ہیں۔"

"اچھا یہ بتایا — بڑے خراب، آنے دو۔"

سمیتا ہنس پڑی، "نہیں، نہیں، بہت کچھ بتایا۔ آپ انھیں روٹی بنا کر کھلاتے رہے۔"

"باپ رے۔۔۔"

وہ سبھی کھل کھلائے۔ ستیہ ویر جی نے کہا، "میں نے آپ کے لیے ایک کار کا انتظام کر دیا ہے۔ آج تو سمندر کی ساحل پر گھومیں۔ کل کنیا کماری چلیں گے۔ پرسوں دوپہر تک لوٹیں گے۔ اگلے دن کو ولم پیچ چلیں گے۔"

روندرن بولے۔ "ایک دن ہمارے اسکول میں بھی آپ آئیں گی اور تقریر بھی کریں گی۔"

"میں تقریر کروں، کس موضوع پر؟"

"اپنے موضوع پر، ذہنی طور سے کمزور بچوں پر یا جو آپ چاہیں، ہندی زبان و ادب پر۔"

اگلے چار دن کہاں سے آکر کہاں چلے گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ادھر اس کے سسر ڈاکٹر مہندر کی اتنی عزت ہے۔ اجیت بھی کافی مشہور تھا۔ اُسے اچھا لگا۔

وہ سب کے لیے کچھ نہ کچھ لائی تھی۔ پھر اپنی بات چیت سے اُس نے سب کا دل جیت لیا۔ کیشون اگلے دن لوٹ گیا۔ دو دن بعد گائے کا انتظام کر کے لوٹے گا۔ گیتا، شیاملا ستیہ ویر جی، کرن، انکت اور وہ ــــ سات لوگ ایک کار میں آرام سے بیٹھ جاتے۔ جہاں پیار ہوتا ہے وہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔

انکت تو وہاں کی ہریالی، وہاں کے لمبے لمبے پیڑ، لال مٹی ــــ سب کچھ دیکھتا اور خوش ہو جاتا۔ ستیہ ویر جی سے اُس کی خوب پٹتی تھی۔ سمندر کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا ــــ "انکل، یہ اتنا پانی کہاں سے آیا؟"

"تم نے پڑھا ہوگا بیٹے، زمین پر دو تہائی پانی ہے اور ایک تہائی زمین۔"

"اس کا پار کہاں ہے؟"

"ہے تو، لیکن اتنی دور کہ ہم دیکھ نہیں سکتے۔"

"کتنی تیزی سے آتا ہے اور پھر ویسے ہی لوٹ جاتا ہے۔"

"ایسا ہے بیٹا، دور بہت دور، بڑی تیز ہوائیں چلتی ہیں، اسی لیے اُمڑتا گھمڑتا رہتا ہے۔"

تبھی ایک لہر تیزی سے اس کی طرف آئی، وہ پیچھے لوٹے لیکن تب تک وہ اُسے بھگو کر لوٹ گئی۔ سب ہنس پڑے۔ ستیہ ویر جی نے کہا، "دیکھا، سمندر نے کیسے تمہارا استقبال کیا، پہلی بار آئے ہو نا۔ یہ تمھیں شنکھ سیپیاں بھی دے گا۔"

کنیا کماری، کووِلم، سب جگہ سمندر، ستیہ ویر جی کے ساتھ گھومتے گھومتے وہ بہت ہی چٹانیں پار کر سمندر کی ریت پر کھیلنے لگا۔ پھر اندر تک جاکر بہت سی سیپیاں شنکھ جمع کر لایا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کرن تو جیسے گیتا کی جنم جنم کی سکھی ہو۔ سیتا خوش تھی۔ لیکن شیاملا کو لے کر اُس کا ذہن گھوم گھوم جاتا۔ کیا کرے گی وہ ابھاگن بار بار ٹھگی گئی، لیکن قصور تو اُس کا بھی ہے۔

اُس کا یا اُس کے سنسکاروں کا؟

شیاملا اپنی کہانی سناتے سناتے بار بار رو پڑتی۔ "میں نے کتنی بڑی غلطی کی، لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے؟ ساری کہانی آپ کو لکھ چکی ہوں۔ کتنا اعتماد تھا کیشون کے الفاظ میں، لیکن وہ کچھ اور ہی نکلا۔ آمدنی کا کوئی ٹھوس ذریعہ نہیں۔ میں کہتی ہوں تو غصہ کر کے کہتا ہے۔ "تیری ماں نہیں دے سکتی روپیہ؟"

"میں نے کہا" میری ماں کہاں سے دے گی؟ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

"تو تو بھی وہاں جاکر مر، اور اُس نے مجھے دھکا دیا، مارا، میرا سر پھٹ گیا، پانچ دن ہسپتال میں رہی۔ قرض سا قرض، اندھیرا ہی اندھیرا۔ بس بھیا ہیں، آپ ہیں، آپ ہی میرے بھگوان ہیں۔ میں نے غلطی کی۔ میں بھوگوں گی۔ میں پھندا لگا کر مر جاتی، لیکن یہ بیٹا ہے۔ یہ مرنے بھی نہیں دیتا۔

"اخبار میں پڑھتی ہوں، ایک عورت دو بچوں کو لے کر کنویں میں کود گئی۔ مجھے لگتا ہے، میں ہی کودی ہوں۔ کبھی ناؤ میں آتے لگتا ہے کہ کود پڑوں بیٹے کو لے کر۔

"لیکن میں تو زندہ ہوں، زندہ لاش ہوں، لات گھونسے کھانے کو، بھیک مانگنے کو۔ جب تک ہاتھ میں پیسہ نہیں ہوگا کوئی نہیں پوچھے گا۔" وہ ایک لمحے کے لیے رُکی، پھر بولی۔ "بھابھی میں

نے ایک خواب دیکھا تھا کہ عورت مرد ایک ہو سکتے ہیں لیکن اب لگتا ہے کہ وہ خواب اب کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ پیسہ، صرف پیسہ۔۔۔"

اور وہ پھپھک پڑی۔

سمیتا نے کہنا چاہا، خواب دیکھا ہے تو پورا بھی ہوگا۔ خواب آتا ہی اُس کا ہے جو یا تو تھا یا آگے ہوگا، لیکن کہہ نہ سکی۔ اُس کی نگاہ آسمان پر تھی جہاں گھٹا تھی، کہیں کہیں تارے تھے۔ نیچے گھنے اندھیرے میں بھوت جیسے پیڑ ہی پیڑ تھے۔ سب بنا رنگ، بنا ذات۔ کتنا دکھ ہے ان سب کے اندر، کون جانتا ہے؟

سمیتا اُن سب کے لیے کچھ کپڑے لائی تھی، کھلونے بھی۔ پھر بھی لگتا تھا کب تک، آخر کب تک بھیک مانگتی رہے گی عورت یا طوائف بنے گی یا خودکشی کرے گی۔

اجیت کے ساتھ دو دنوں تک اُس کے گھر رہی تو اُسے غربی سے سامنا کرنا پڑا۔ چھپانے کی ہر ممکن کوشش اُسے اور بھی ننگا کر جاتی۔ اپنے ساتھ وہ اتنی چیزیں لے آئی تھی کہ کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ اپنی ہی لائی چیزوں کو شیاملا کے ہاتھوں سے پا رہے تھے۔

شیاملا جانتی تھی، لیکن ہنستی تھی۔ کیسی بے بسی، کیسی قابل رحم تھی وہ ہنسی۔

یہاں سے بیریار لیک گئے تو شیاملا سے رخصت ہوتے وقت وہ واقعی رو پڑی۔ تین سو روپے اس کے پلّو میں باندھ دیے۔ پچاس پچاس تینوں کو سب کے سامنے دیے۔

راستے میں سمیتا نے سنجیدہ آواز میں کہا، "کیرل کی عورت کتنی تعلیم یافتہ کتنی ذہین ہے۔ مشہور ادیبہ کملا داس اسی صوبہ کی ہیں۔ پی ٹی اوشا نے اسی سرزمین پر جنم لیا ہے۔ لیکن یہیں پیدا ہوئی ہیں وہ نرسیں جو گھر سے دور ملک در ملک جانے کی اذیت برداشت کر رہی ہیں۔ یہیں ہیں شیاملا جیسی ذہین عورتیں جو زندہ لاش بن کر رہ گئی ہیں۔"

کار سے ترونتدرم چھوڑنے سے قبل اجیت شیاملا کے شوہر کے ساتھ بڑے پادری سے ملنے گیا تھا۔ وہ طنز سے ہنسے تھے، "وہ تو بڑی لکھنے والی ہے، اُسے کیا پریشانی ہے؟"

"تحریر سے پیٹ نہیں بھرتا۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ۔۔۔"

بات کاٹ کر بشپ بولے، "دیکھوں گا کیا کچھ ہو سکتا ہے۔"

"وہ معافی مانگتی ہے اپنی ساری جانی انجانی غلطیوں کی۔"

لبشپ اٹھ گئے۔ دلی لوٹنے کے پندرہ دن بعد اُسے لبشپ کا خط ملا، لکھا تھا "اُس نے جو کچھ کیا، کمیٹی اُس کے لیے معاف نہیں کرے گی۔ وہ مجبور ہے۔"

سرسبز پہاڑیوں کے درمیان بیر بار لیک کے شفاف پانی میں ہاتھیوں کے جھنڈ کی پرچھائیں اُس نے دیکھی تھی۔ یہ خط پڑھ کر اُس نے محسوس کیا کہ وہ ہاتھی پہاڑیوں سے نیچے اتر کر راہ میں آنے والے ہر گھر، ہر شخص کو روندتے چلے جا رہے ہیں۔ روندتے چلے جا رہے ہیں، چنگھاڑتے چیختے۔

کاش، ایسا ہوتا! ایسا ہی ہوتا!

وبھا کا خط سمیتا کے نام

پیاری اور قابلِ احترام بھابھی۔

کیسی ہیں آپ؟ ہمیشہ کی طرح شانت۔ لیکن باطن میں کہیں دور بہت دور بھٹکی ہوئی۔ مجھے بھی آپ کی چھوت لگ گئی۔ نہ جانے کہاں کہاں پہنچ جاتی ہوں، راہ نہیں ملتی تو وجے سے الجھ پڑتی ہوں۔

تم جان ہی گئی ہوگی بھابھی، کہ وجے ان دنوں میرے بہت پاس آگیا ہے۔ جب وہ میرے آس پاس ہوتا ہے تو ہم میں ایک خمار آلود مہک بھر جاتی ہے۔ اُسی نے تو میرا تعارف کئی ہفتہ وار اخباروں سے کرایا ہے۔ اُن میں سے میں دو کے لیے پابندی سے کالم لکھ رہی ہوں، وقتی موضوعات پر، فکر کے لیے پتاجی کی تخلیقات میں بہت کچھ مل جاتا ہے۔ اُن کے ہر خیال سے میں متفق نہیں ہو پاتی۔ لیکن انکار کا جواز تو ملتا ہی ہے۔

کبھی کبھی وجے سے چخ چخ ہو جاتی ہے، لیکن عجیب آدمی ہے وہ۔ کسی بات پر غصہ آتا ہے تو فوراً کبھی نہ آنے کی دھمکی دینے لگتا ہے، لیکن دو پل بعد اگر پہلے کالم کا میٹر مانگے گا، پھر چلئے...

ایک دن بولا، "وبھا! تمھاری میری تو راشی ایک ہے۔ تم وِ۔ بھا اور میں وِ۔ جے۔"

میں نے کہا "وِ، حروف سے بے شمار نام اس دنیا میں ہیں، تو کیا سب ہم مذہب برابر مذہب ہو سکتے ہیں؟"

"نہیں، نہیں، اور بھی اسباب ہیں ــــ تمھارے نام میں 'بھا' یعنی بھاسکر یعنی روشنی اور میرے نام میں 'جے' ۔ جہاں روشنی ہے وہیں جے ہے ۔"

میں خوب ہنسی اس کی دلیل کی صلاحیت پر ۔ میں نے کہا "تم کیا کہنا چاہتے ہو، وہ میں جانتی ہوں، لیکن میں اب کسی اور کو طلاق نہیں دینا چاہتی ۔"

وہ حیران میری طرف دیکھنے لگا، بولا "طلاق کا کیا مطلب ؟"

"مطلب بہت صاف ہے ۔ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو، لیکن وجے، کیا ہمارا تعارف اتنا قریبی ہو سکا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں ؟ بہت سخت ہے یہ پہچان ۔ اس کی کمی سے شادی محبت کے لیے ایک فریفتگی ہو کر رہ جائے گی ۔ ہم مزاج نہ ہو سکیں گے ؟"

"محبت ہم مزاج ہونے سے روکتی ہے کیا ؟ سچ ہے کہ محبت ہوتی ہی ہے ہم مزاج والوں میں ۔"

"میں نے محبت نہیں، محبت کے لیے فریفتگی کہا ہے ۔ ہم فریفتہ ہیں ایک دوسرے پر محبت کہاں ہے ہم دونوں کے بیچ ؟ انیتہ اور مجھ میں بھی یہی بات تھی ۔ تبھی طلاق میں نجات چاہی ہم دونوں نے ۔"

"تب کیسے ہو ؟"

میں اس کا مایوس انداز دیکھ کر ہنس پڑی، پھر مجھے اچانک سرت بابو کی یاد آ گئی ۔ بولی "ان سے کسی نئے نئے لکھنے والے نے پوچھا تھا 'ہم آپ کی طرح خوبصورت لکھنا چاہتے ہیں ۔ کیا کریں ؟"

ان کا جواب تھا ــ 'نہ لکھنا سیکھو ۔'

"نیا لکھنے والا گھبرا گیا 'یہ کیا بات ہوئی، ہم تو آپ جیسا اچھا لکھنا چاہتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ نہ لکھنا سیکھو ۔"

"جی ہاں، میں کہتا ہوں اور یہ بھی کہتا ہوں کہ جس دن آپ اس جملے کا مطلب سمجھ جائیں گے، اس دن یقیناً ادیب بن جائیں گے ۔"

وجے بے یقینی سے ہنسا "تم کہنا چاہتی ہو کہ محبت نہ کرنا سیکھوں ؟"

"بے شک۔"

"کیسے؟"

" بہت آسان سا نسخہ ہے۔ جیسے ہی محبت کا بخار چڑھے، تم میرے پاس آنا چھوڑ دو۔ آؤ تو میری طرف دیکھو بھی نہیں۔ اپنے دل میں بار بار کہو، میں دبھا سے محبت نہیں کرتا۔ میں دبھا کو بالکل نہیں چاہتا۔ بالکل پسند نہیں کرتا۔"

"اور؟"

"اور میری برائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کرو۔ مجھے بے نقاب کردو۔"

"نا، نا، یہ تو میں نہیں کر سکوں گا۔"

"تب محبت نہیں کر سکو گے۔"

وجے نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنا مضمون تیار کرنے چلا گیا۔ میں اپنا کالم لکھنے لگی۔ مجھے خود پر حیرانی ہو رہی تھی۔ میں نے اُس دن کے لیے جو کالم لکھا تھا۔ ہمیں صرف ہاں کرنا ہی نہیں 'نا' کرنا بھی آنا چاہیے۔ خاص طور سے تب جب کچھ خاص کرنے کے لیے ہماری فریفتگی عروج پر پہنچ رہی ہو۔

تین دن بعد وجے نے مجھے خط لکھا ____

پیاری دبھا،

تمھارے کہنے کا مطلب میں سمجھ گیا ہوں۔ وہی کرنے کی کوشش کروں گا۔

بہت بہت شکریہ تمھارا۔

مخلص

(وجے دیگارے)

سچ بھابھی جی۔ خط پڑھ کر لگا کہ میں سیدھے اس کے پاس جاؤں اور کہوں میں تمھاری زندگی کی ساتھی بننے کو تیار ہوں۔ ابھی، اسی وقت، لیکن وقتی جوش سے مجبور ہونا میں کبھی کا بھول چکی تھی۔ میں نے خط کا جواب تک نہیں دیا۔ زندگی کے مسائل کا حل کسی فارمولے کے سہارے نہیں ہو سکتا۔ بہت پیچیدہ ہے وہ۔ لیکن اسے سلجھانے سمجھانے کے لیے ہم مسلسل کوشش

تو کرتے رہ سکتے ہیں۔ کرنا بھی چاہیے۔ کسی دوسرے میں خود کو کھو کر نہیں، اپنے آزاد وجود کو قائم رکھ کر۔

اچھا بھابھی، یہ سب دماغی خرافات ہے۔ تمھارے کیا حال چال ہیں؟ بھیّا کیسے ہیں؟ مجھے خوشی ہے کہ آپ دونوں مل کر اُلجھتے ہیں۔ تمھارے اوپر پتا جی کا مطمئن کرنے والا سایہ ہے۔ ممّا کی چھاؤں کے لیے بے چین انکت ہے۔ تم خوش قسمت ہو۔ کتنے سنبھالنے والے ہیں تمھیں۔ جب کوئی سنبھالنے والا پاس ہو تو گرنے کا بھی من کرتا ہے۔

سمیتا نے وہ خط ادھورا ہی پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا۔ اتنے گہرے مشاہدے کے بعد بھی فریفتگی، کسی کا ہونے، کسی کو اپنا بنانے کی چاہت۔ فریفتگی اور خواہش یہ دو دِکھ کر بھی بالآخر ایک ہی ہیں۔ کیا وِبھا نہیں جانتی کہ اکیلا چلنے والا سب سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے... ہائے رے، انسان سیکھ سیکھ کر بھی پیچھے لوٹتا ہے۔ پھر آگے بڑھتا ہے۔

اسے چونکاتے ہوئے کسی نے کہا 'یہی تو انسان ہے۔ یہی رویّہ تو اسے مسلسل تجربہ کرنے کی، چلنے کی تحریک دیتا ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود مجھے خوشی ہوگی اگر وِبھا اور روِ جے ایک دوسرے کے پاس آسکیں، اتنے پاس کہ...'

اس نے تیزی سے اپنے سر کو جھٹک دیا اور دوسرا خط اُٹھا لیا۔

ورتِکا کا خط سمیتا کے نام

سمّی بھابھی،

"دعائیں! بڑی ہوں نہ اس لیے کبھی کبھی رعب جمانے کا جی کرتا ہے خوش ہونا اور ہمارا انکت بیٹا کیسا ہے؟ اس سے کہنا ورون اب اس کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کو تیار ہو رہا ہے۔ سچ بھابھی جی! اس نے تو مجھے باندھ لیا۔ لیٹا لیٹا ہاتھ پیر پھینکتا رہتا ہے اور طرح طرح کی آوازیں نکالتا رہتا ہے اور میں خوش ہوتی رہتی ہوں۔

ناراین اس سے کہتا ہے "بدمعاش! تو جتنا پیارا پیارا دکھتا ہے اتنا ہی شریر ہے۔ باندھ دیا نا دو آزاد پرندوں کو۔ لیکن میں تیری سازش ناکام کر دوں گا۔ میں... میں... میں پھر بھاگ جاؤں گا اور تیرے ہاتھ نہیں آؤں گا..."

ایسے ہی نہ جانے کیا کیا بولتا چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی صبر بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ ایک دن حضرت مجھ سے بولے "وَتی! تجھے نہیں لگتا کہ ہم بہت دن ساتھ رہ لیے، اس لیے اب الگ ہو جاؤ؟"

"تمھیں کیا ہو جاتا ہے ناراین؟"

"بس یہی کہ لگتا ہے کہ ہم اب کافی دن ساتھ رہ لیے۔"

"کہیں ٹھکانہ ڈھونڈ لیا ہے کیا؟ کسی ابھاگن سے آنکھیں لڑ گئی ہیں؟"

"ابھاگن؟"

"ہاں، اُس سے بھی تم اسی طرح کہو گے جیسے مجھ سے کہہ رہے ہو۔"

"لیکن تم ابھاگن کیسے؟ تم نے تو میری قسمت بنائی ہے۔"

"تم مانتے ہو؟"

"ہاں۔"

"تو اُسے بگاڑنا کیوں چاہتے ہو؟"

"یہ تم کہتی ہو! تم نے جس کی قسمت بنا دی اُسے کوئی بگاڑ سکتا ہے؟"

"تو آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"یہی سوال تو میں کبھی کبھی خود اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، آخر میں چاہتا کیا ہوں اور خود ہی جواب دیتا ہوں ـــــ یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ میں کیا جاننا چاہتا ہوں۔ اسے جاننے کے لیے حال سے چھٹی چاہتا ہوں، مستقبل میں چھلانگ لگانے کے لیے۔ اسی لیے میں ریذیڈنٹ ایڈیٹر کے عہدے سے استعفیٰ دے کر خوب گھومنا چاہتا ہوں اکیلے، بے لگام، بے روک۔"

"میں کبھی مشکل بنی ہوں؟"

"تم بن ہی نہیں سکتیں، لیکن یہ پاجی..."

"یہ پاجی کیا..."

اُس نے ایک دم تیکھی آواز میں کہا "اس کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے غلطی کی' میں نے نہیں سوچا کہ میرے جیسے غیر پسندیدہ شخص..."

"تم غیر پسندیدہ نہیں ہو' یہ تم اچھی طرح جانتے ہو"

"لیکن میرا نام نہاد باپ تو غیر پسندیدہ اور پاپی تھا۔ اُس کا خون کیوں نسل در نسل بہتا رہے اس سماج میں؟ کیوں... کیوں...؟"

میں جانتی تھی کہ نارائن کے من میں یہی کرید لگی رہتی تھی۔ یہ جرأت کی عادت، یہ اودگھڑپن اُسی کا انجام ہے، یہ سب ردّ عمل ہیں۔ میں نے کئی پل اسے اپنے آپ سے اُلجھنے دیا۔ پھر بولی، ایک ایک لفظ پر ضرب کرتی ہوئی "دیکھو نارائن! جس درد کو تم جھیل رہے ہو اسے ایک حد تک میں نے بھی جھیلا ہے۔ میں نے بھی بہت کچھ کیا ہے ___ ردِ عمل کے طور پر سماج سے بدلہ لینے کے لیے۔ تمھاری ساری زندگی اُسی ردِ عمل سے حرکت میں ہے، لیکن کیا اسی سے ہمارا انتقام پورا ہوگیا؟

"نہیں نارائن! یہ تو شروعات ہے۔ اصلی انتقام تو وردن کو لینا ہے۔ اس کے جسم میں تمھارے پاکھنڈی، پاپی باپ کا خون ہوسکتا ہے، لیکن اس سے زیادہ تو وہ تمھاری نسوں میں بہہ رہا ہے۔ کسی بھی لمحے وہ تمھیں وہ سب کچھ کرنے کو مجبور کرسکتا ہے جو تمھارے باپ نے کیا تھا، میں یہ سب نہیں مانتی۔ اگر یہ سچ بھی ہو تو تمھاری نسوں میں تمھاری ماں کا خون، تمھاری ماں کا کرب زیادہ بہہ رہا ہے۔ اُسی نے تمھیں اتنا بھولا، اتنا معصوم بنا دیا ہے۔ یتیموں کے بیچ پلتے ہوئے جو شرارت تمھارے اندر داخل ہوگئی تھی اسے منیجر صاحب کے شفاف خلوص نے اودگھڑپن میں بدل دیا۔ اور خون تو توانائی ہے، اس کا جائز اور ناجائز استعمال تو اصل میں ہم کرتے ہیں۔ وردن کے جسم میں میرا اور تمھارا خون بھی تو ہے، بلکہ وہی زیادہ ہے۔ ہمارا اصلی انتقام تو اب شروع ہوگا۔ وہ غرور نہیں میرا خواب ہے۔ ہمیں وردن کو ایک نیا سماج بنانے کی سمت اور تحریک دینی ہے اور گلے سڑے اقدار کو بے نقاب کرکے

ان کی جگہ پر نئے اور بامعنی اقدار قائم کرنا ہے۔

"بھاگنے سے نہیں لڑنے سے بدلہ لیا جاتا ہے۔"

سچ بھابھی جی! جتنی دیر میں بولتی رہی، نارائن چپ چاپ چمچہ گھماتے رہے، پھر اسی طرح چپ چاپ اُٹھ کر چلے گئے۔ سچ بھابھی جی، تب مجھے خود پر بڑی پشیمانی ہوئی۔ کیسی کیسی علمیت جھاڑ گئی میں۔ کب کی جمی پڑی تھی یہ انانیت۔ خیر اچھا ہی ہوا، خالی ہو کر میں بچ گئی۔

نارائن نزدیک مستقبل میں دہلی آویں گے، عہدیداران سے اگلا قدم اٹھانے کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے۔

لیکن بھابھی، یہ خط تو میں نے ایک خاص مقصد سے لکھنا چاہا تھا۔ تم تو جانتی ہی ہو نکنج اور میگھا کو۔ میگھا کے بارے میں شاید پوری بات نہیں جانتی۔ وہ اسی یتیم خانہ میں پلی ایک یتیم لڑکی ہے۔ اس کا ذات پات، صوبہ، کسی کا کچھ پتہ نہیں۔ نکنج کے باپ کے سایہ میں وہ پلی بڑھی۔ بڑی شرمیلی اپنے میں سمٹی سمٹی رہتی ہے، لیکن ویسے وہ بڑی سیدھی خدمت گزار ہے۔ ایم۔ اے، بی۔ ایڈ ہے۔ نکنج تو منیجر ہے۔ اکثر ٹور پر رہتا ہے۔ تب میگھا اکیلی رہتی ہے۔ میں نے اسے تمہارے پاس آنے جانے کو کہا ہے۔ تم ہی آؤ نہ ایک بار اسے بہت اچھا لگے گا۔

اچھا، نارائن آویں تو یکبارگی ان باتوں کا ذکر نہ کرنا۔ میرا ورون کلکاریاں مار رہا ہے۔ کاش انکت یہاں ہوتا۔

تو بند کروں۔ نیند آ رہی ہے۔ نارائن کلکتہ گئے ہیں وہیں سے دہلی پہنچیں گے۔ ویسے وہ سچ مچ مہان ہے۔

تمہاری اپنی دیدی

ورتی

خط پڑھ چکی تو اسے لگا جیسے تیز دھوپ کا تیکھا احساس آنکھوں میں چبھنے لگتا ہے ویسے ہی خیالوں کا تیکھا احساس اس کے دل میں چبھنے لگا ہے۔ مسئلے اور مسئلے۔ سب کچھ آسان اور سیدھا کیوں نہیں ہو جاتا؟ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔ گھنٹی بجنے پر ہی آنکھ کھلی

چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ کرن دروازہ کھول چکی تھی۔ مہندر، اجیت اور انکت ـــ تین نسلیں ساتھ اندر داخل ہوئیں۔

اُن خطوط کے آنے کے ایک ہفتہ بعد سمیتا دیکھتی ہے کہ نارائن اپنے ایک دوست کے ساتھ مجسّم حاضر ہے "ہائے بھابھی! کیسی ہو؟ ہلو میرے دوست سُریش کلینری سے۔ کبھی ہم ایک ہی ادارہ میں کام کرتے تھے۔ اب دس سال سے روس میں ترجمہ کا کام کرتے ہیں، دیکھتے بھی ہیں۔ اچھا، پہلے گرما گرم کافی پلاؤ۔ کرن ہے؟"

"ابھی آئی ہے کالج سے۔"

"اسی کالج میں پڑھ رہی ہے؟"

"نہیں، خاص طور سے کوشش کر کے سنٹرل کالج میں داخلہ دلوایا ہے۔ عیسائی ہیں اور..."

"سمجھ گیا۔"

"بہت روپیہ خرچ کرنا پڑا"

"تم بھی دُھن کی پکی ہو سمیتا بھابھی۔"

اور جب تک کافی آئے اُس نے سریش کو مختصر طور پر ساری کہانی بتا دی۔ وہ حیران تھا اس عورت کی اہلیت کو دیکھ کر۔ کافی پیتے ہوئے نارائن نے پوچھا "ماما کہاں ہیں؟"

"بھوپال گئے ہیں۔ گاندھی بھون ٹرسٹ کی میٹنگ ہے۔"

"اور کرن کے کیس کا کیا حال ہے؟"

"سنوائی ختم ہو چکی ہے۔ ثابت ہو چکا کہ یہ سب ایک طے شدہ منصوبہ تھا۔ کرن کے بعد شاہدہ کی باری تھی پھر..."

"کس کا منصوبہ تھا یہ؟"

"ہماری بیمار ذہنیت کا" سمیتا نے سادگی سے جواب دیا" اگلے ہفتہ جج فیصلہ سنا رہے ہیں۔"

"بھابھی جی، اب آپ بہت جلد ایک عظیم خاتون لیڈر کی شکل میں اُبھرنے والی ہیں"
سمیتا زور سے ہنس پڑی "گالی کیوں دے رہے ہیں بھائی صاحب، آجکل کسی کو
نیتا جی کہنا گالی دینا مانا جاتا ہے۔ میں تو بس جنتا بن رہنا چاہتا ہوں"
"آپ کی مرضی" نارائن نے کچھ اس انداز سے کہا کہ تینوں ہی ہنس پڑے۔ سریش کو
جانا تھا، چلے گئے۔ نارائن بولا "بھابھی جی، کلکتے کی اُڑان سے آرہا ہوں"
"مجھے معلوم ہے"
"ورتکا نے لکھا ہوگا"
"جی ہاں، یہ بھی لکھا تھا کہ آپ استعفٰے دے چکے ہیں"
"اور"
"اتنا کافی نہیں ہے کیا؟ ویسے چاہو تو بہت کچھ سنا سکتی ہوں۔ ادھر میگھا سے کئی بار ملنا ہوا"
"تو... ؟" نارائن نے نہ جانے کہاں سے جواب دیا۔
"سنو گے ؟"
"میگھا نے میرے بارے میں کچھ راز افشاں کیے ہیں کیا ؟"
"وہ بے چاری اپنا ہی راز نہیں جانتی، کسی دوسرے کا کیا کھولے گی ؟ پرسوں
اپنی سنا رہی تھی۔ یہیں بیٹھی جہاں تم بیٹھے ہو۔ اسی کہانی سے پتہ لگا کہ منیجر صاحب اس کی
شادی تم سے کرنا چاہتے تھے، لیکن تم نے کہا کہ تم شادی ہی نہیں کروگے"
"ہاں، کہا تو تھا، میں مانتا بھی تھا"
"رکو، رکو، تم نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ میگھا کی شادی کسی یتیم سے نہ کریں۔ کسی
مہذب، فراخدل اور تعلیم یافتہ گھرانے میں کرنے کی کوشش کریں۔ ایسی جگہ جہاں میگھا
کو پیار اور عزت دونوں ملے"
"تب انھوں نے جواب دیا تھا — اس مغرور ہندو سماج میں ایسے گھرانے کہاں ملیں گے؟"
سمیتا مسکرائی "تب تم نے کہا تھا کہ آپ نکنج سے ہی اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟ آپ
کی پیاری بیٹی آپ کے پاس ہی رہے گی"

"سچ مچ، سمی بھابھی"۔ نارائن نے خوشی سے کہا "میرے منیجر بابا بہت خوش ہوئے۔ بولے — تمھارا مشورہ بہت مناسب ہے، اور انھوں نے میگھا کو بڑی محبت اور عزت کے ساتھ اپنے ہی گھر میں سمیٹ لیا"۔

سمیتا بولی "ہاں نارائن بھیا، میگھا نے ساری باتیں بڑے اطمینان سے مجھے بتائی تھیں لیکن مجھے برابر لگتا رہا کہ وہ من ہی من تمھیں اپنا شوہر مان چکی تھی"۔

نارائن کہیں کھو گئے تھے۔ وہیں سے اقرار میں گردن ہلا کر کہا "جانتا ہوں بھابھی اور یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ اسی لیے میں نے منع بھی کیا تھا۔ میں کسی بھی طرح کی فریفتگی میں بندھنا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل یہ بھی محبت نہیں تھی، ایک دوسرے کے لیے ایک طرح کا 'رحم'، ایک طرح کا دفاع تھا جسے ادیب 'احساس' کہہ کر احترام کرتے رہتے ہیں"۔

سمیتا نے نارائن کی آنکھوں کو نشانہ بناتے ہوئے فوراً کہا "کیا ورتکا نے جو کچھ کیا اس میں یہ 'رحم' یا دفاع کا جذبہ نہیں تھا؟"

"شاید نہیں، کیونکہ اس نے اپنے کو کبھی قابل رحم یا کمزور نہیں مانا۔ میرے لیے اس کی کشش میرے نام نہاد بے بسی کی وجہ سے نہیں تھی جتنا اوگھڑپن کی وجہ سے، جسے وہ بغاوت کی ایک شکل مانتی تھی"۔

"اور بغاوت انھیں عزیز تھی"۔

"کیونکہ وہ خود بغاوت کرنا چاہتی تھی۔ میری بغاوت میں اس کی تائید شامل تھی اور..."

"اور جو نہیں ہونا تھا وہ ہو گیا"۔

"ہاں، میرے نہ چاہتے ہوئے بھی ہو گیا"۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر بولا "اسے دفاع نہیں چاہیے تھی لیکن مرد کی طاقت چاہیے تھی۔ آخر بنیادی طور پر ہم عورت مرد ہی ہیں"۔

"ایک دوسرے کی کشش کے لیے ملعون"۔

نارائن پھر کھو گیا "کشش بری نہیں ہے، کشش کی محویت بری ہے۔ اس محویت کے شکار ہو گئے ہم دونوں"۔

"تمھیں دکھ ہے اس بات کا؟"

"تب نہیں تھا، اب ہے۔"

"سچ مچ ہے؟" سمیتا نے ایک بار پھر اپنی نگاہ اس کے مریل افسردہ ہوتے چہرے پر گڑا دی۔ نارائن نے اس نگاہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "ہاں سچ مچ ہے۔ میں نجات چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے باپ بن کر کوئی پاپ کیا ہے۔ شاید جو نہیں ہونا چاہیے اس کا ہونا پاپ ہے۔ یا ہیں، پاکھنڈیوں کا نسل نہیں چلنا چاہیے تھا... میں نجات چاہتا ہوں اس بندھن سے، بالکل نجات۔"

"نجات اگر ہے تو وہ بلا روک ہی ہے، لیکن بھائی صاحب اپنے نام نہاد گناہ کی ذمّہ داری سے بچ کر بھاگنا کیا اپنے آپ میں ایک اور پاپ نہیں ہے؟ نجات بندھن میں ہی ہے ـــ کامیاب، آلیسی بندھن میں۔ اپنی اپنی ذمّہ داری کو قبول کرنا، وہی کامیاب بندھن ہے۔"

پھر یکبارگی بول اٹھی "مجھے بھی دورے پڑتے ہیں اُپدیش دینے کے، معاف کر دیں بھائی صاحب۔ میں کون ہوں کسی کی ذمّہ داری کی یاد دلانے والی؟"

تبھی گھنٹی بجی۔ کرن نے دروازہ کھولا۔ انکت پیٹھ پر جدید تعلیم کا بوجھ لادے اندر آیا۔ سامنے نارائن کو دیکھا "پھوپھا جی نمستے! آپ اکیلے آئے ہیں، بُوا کہاں ہے اور وِرون؟"

سمیتا نارائن کی طرف دیکھ کر مسکرا اٹھی۔ نارائن بولے "ہم تو بیٹا کلکتے سے آرہے ہیں۔ وہ سب بمبئی میں ہیں۔ ورون آجکل تمھارے ساتھ کرکٹ کھیلنے کی تیاری کر رہے ہیں، ایسی تیزی سے ہاتھ پیر پھینکتے ہیں جیسے گیند پھینکتے ہیں اور پھر خوشی سے ایسے چلّاتے ہیں جیسے بلّے بازوں کے سارے وکٹ اُڑا دیئے ہوں..."

"تب تو بہت اچھا ہے، لیکن پھوپھا جی، ابھی تو وہ بہت چھوٹا ہے۔ دوڑ کیسے سکتا ہے؟"

"ارے انکت صاحب! یہ آجکل کے بچّے بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ دیکھتے رہنا، ایک ہی سال میں تمھیں پیچھے نہ چھوڑ دیں۔"

"دیکھنا تو پڑے گا ہی۔ لیکن وہ مجھے جیت نہیں سکے گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں بڑا ہوں۔ کافی دن سے کھیل رہا ہوں لیکن مجھے تو ساتھی چاہیے۔ ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے۔"

اچانک سمیتا اور نارائن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، سمیتا کی نگاہ کہہ رہی تھی 'دیکھ لیا!'

اور نارائن کی نگاہ میں وہی احساس تھا جو سیزر کی نگاہ میں تب تھا جب بروٹس نے اس کا خون کیا تھا۔ اس کے منہ سے نکل پڑا "تو بھی بروٹس!"

کرن نے آکر پوچھا "کھانا لگاؤں دیدی؟"

"ہاں، لگاؤ۔ اور بھائی صاحب! آپ فوراً نہالیں۔ آپ کو دفتر جانا ہے۔ اور انکت بیٹے، تم بھی منہ ہاتھ دھولو"

"ابھی جا رہا ہوں" یہ کہتے ہوئے نارائن غسل خانہ کی طرف لپکے۔

"ابھی آ رہا ہوں" یہ کہتے ہوئے دو لمحے بعد انکت سمیتا کے پاس پہنچا۔ بولا "ممی! ہم نے بتایا نہیں، آج میتھ کے ٹسٹ کا پرچہ ملا تھا۔ پچاس میں سے چوالیس نمبر آئے۔ ہم سے ایک غلطی ہو گئی۔ جواب ٹھیک آتا تھا۔ بس لکھنے میں ۱۵۲۵ کی جگہ پر ۵۲۵ لکھ گئے۔ ایک چھوٹ گیا اور ہمارے چھ نمبر بھی غائب ہو گئے۔"

سمیتا نے پیار سے اسے اپنی باہوں میں کھینچ لیا۔ چوم کر بولی "کوئی بات نہیں۔ اگلی بار ٹھیک کرنا۔ غلطی کر کے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔"

وہ لوگ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ دروازہ کی گھنٹی بجی۔ حیرانی سے سمیتا نے دیکھا بولی "پتاجی، آپ! آپ تو کل آنے والے تھے۔"

"ہاں بیٹی، آنا تو کل ہی تھا، لیکن اتفاق سے ہوائی سفر کا انتظام ہو گیا۔"

"اچھا ہوا۔ آپ نہانے وغیرہ..."

"سب کچھ کر آیا ہوں۔ کھانا بھی ہوائی جہاز میں کھا لیا تھا۔ راج سبھا شاد بھاگ کے ڈائرکٹر ساتھ تھے۔ وہی چھوڑ گئے ہیں۔ ہاں دیکھو، یہ اخبار دیکھ لیا؟ ودھا اور دو جے کے

دو مضمون چھپے ہیں۔ کمال کر دیا ان دونوں نے۔ بہت جوکھم اٹھایا ہے، لیکن کیسے بھرشٹ نظام میں ہم رہ رہے ہیں۔ اوپر اوپر کتنی کتنی کامیابیاں، اندر اندر کیسی کیسی سڑاندھ!
"میں تو حیران ہوں ان دونوں کی ہمت پر۔"

سمیتا وہی مضمون پڑھ رہی ہے ——
کافی عرصے سے اس بات کو لے کر اخبار میں بحث ہو رہی تھی کہ فلاں صاحب نے، جو ہمارے نظام کا ایک اہم حصّہ ہے۔ اپنی بیٹی کو ایک فردِ خاص سے شادی کرنے کو مجبور کیا یا نہیں۔ اُس فردِ خاص کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ اس کے باپ نے جہیز میں بے پناہ جائداد دینے کا وعدہ کیا تھا —— کچھ دے چکے ہیں، کچھ دیں گے۔ ان کی بیٹی نے معزز جیون ساتھی کو کبھی نہیں دیکھا۔ عمر میں بھی وہ شادی کے لائق مقررہ عمر سے ایک سال چھوٹی ہے، یعنی وہ سترہ سال کی ہے۔
شادی جس دھوم دھام سے ہوئی سبھی جانتے ہیں۔ لگ بھگ ایک لاکھ مہمان آئے تھے۔ اُن کی خاطر مدارات میں شاہی عیش و عشرت کا کھلے طور سے استعمال کیا گیا تھا۔ مختلف طرح کے پنڈال، مختلف طرح کے گیت، مختلف طرح کی روشنی کی سجاوٹ مختلف قسم کی موسیقی، عورت مرد جنت کے دیوتاؤں اور اپسراؤں کی نقل تھے۔
عیش، شان و شوکت، امارت —— سارے حدود پار کر گئے تھے۔ ادھر بیٹی کی گھُٹی گھُٹی چیخ بھی حد پار چکی تھی۔ سنا تو یہ بھی گیا کہ ان سارے شاہی تذبذب کے درمیان نیتاجی کی بیٹی گھر سے غائب ہو گئی تھی، کیونکہ اسے پتہ لگا تھا کہ اس کا ہونے والا شوہر کسی موذی مرض میں مبتلا ہے۔
لیکن شادی ہوئی۔ لڑکی ملبوسات میں دبی دبی دولہے کے بائیں طرف کھڑی تھی۔ سب کے سامنے سارے رسومات پورے ہوئے، سب کے سامنے محبت سے چھلکتے، ہنسی خوشی کے بیچ بیٹی کی ڈولی بھی اٹھی۔
سچ کہاں ہے؟ اسے تلاش کرنا صحافی کی ذمہ داری تھی۔ اس ذمہ داری کو میں نے قبول

کی۔ میں عورت ہونے کی وجہ سے اپنے حدود جانتی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ میں ایک خطرناک راستے پر چل رہی ہوں۔ یہی خطرہ میرے لیے چیلنج بن گیا۔ اور میں نیتاجی کی صاحبزادی سے ملنے کا راستہ ڈھونڈنے لگی۔

میں نے فیصلہ کیا، میں پہلے اس کے باپ سے ملوں گی۔

اور میں ملی۔ ان تک پہنچنے میں خاص دشواری نہیں ہوئی، لیکن پہنچنے کے بعد ضرور ہوئی۔ وہ دیوان خانے میں کئی لوگوں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے۔ میں نے پرنام کرکے گذارش کی

"کیا آپ سے تنہائی میں ملنا ممکن ہو سکے گا؟"

"نہیں!" انھوں نے سخت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ کیا میں آپ کی بیٹی سے مل سکوں گی؟"

"وہ اپنی سسرال میں ہے۔"

"ان کی عمر کیا ہے؟"

"آپ کو اس کی عمر سے کیا لینا ہے؟"

"سوال میرا نہیں، اصول کا ہے۔ آپ تو قانون بنانے والوں میں خاص رہے ہیں۔ اخباروں میں چھپا ہے کہ آپ کی بیٹی کی عمر سترہ سال ہے۔"

وہ ایک دم اُبل پڑے۔ "اخباروں میں جو چھپتا رہتا ہے اس کے لیے میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ وہ تو نہ جانے کہاں کہاں سے جھوٹی جھوٹی خبریں لاکر چھاپتے ہیں۔ وہ خود جھوٹے، مکار اور دغاباز ہیں۔ ان کا واحد مقصد بھلے لوگوں پر کیچڑ اُچھالنا ہے۔"

میں نے بہت سکون سے جواب دیا "آپ تو گاندھی جی کے بہت قریب کے ساتھی کے لڑکے ہیں۔ آپ کی ایسی زبان..."

"کیسی زبان! گاندھی جی نے جھوٹ کی مخالفت کرنے کی سیکھ ہمیں دی ہے تمھیں دی ہے کیا؟"

"جی ہاں، دی ہے۔"

"وہی میں کر رہا ہوں۔ میں ان سبھی اخبار والوں کو ننگا کر دوں گا۔ وہ ہمارے پاس

آکر طرح طرح کی امداد مانگتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور مجھ ہی کو بلیک میل کرتے ہیں"

"شراب پلانا جائز ہے کیا؟"

"دیکھیے، آپ عورت ہیں، میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ میرے اور میری بیٹی کے بارے میں جو کچھ چھپا ہے وہ حسد ہے، جھوٹ ہے۔ میں اس کا بدلہ لوں گا۔ میں عدالت میں جاؤں گا... میں..." وہ الفاظ کے لیے چھٹپٹا رہے تھے۔

ان کے ایک ساتھی نے میری طرف دیکھ کر کہا "وقت پورا ہو گیا، اب آپ جا سکتی ہیں"

نیتا جی بھی بولے "ہاں، آپ جا سکتی ہیں۔ اور دیکھیے میری بیٹی سے ملنے کی کوشش نہ کیجیے"

میں چپ چاپ اُٹھی، پرنام کیا اور چلی آئی۔ مجھے بیٹی سے ضرور ملنا تھا اور میں ملی۔ یہ سب سچ ہے کہ وہ شادی سے پہلے ہی گھر چھوڑ چکی تھی اور اُس صوبہ سے باہر ایک دوسرے نیتا کے پاس ٹھہری تھی۔ وجے پگارے اُن نیتا جی کو جانتے تھے۔ مجھے لے کر ان کے گھر گئے۔ ایک پروگرام کے متعلق بات کرنی تھی۔ جب تک وہ دونوں بات کرتے رہے، میں پگارے جی کی ایک خاتون دوست کے ساتھ اس سے بات کرتی رہی۔

وہ ایک شانت، معصوم لڑکی تھی۔ اس نے کانگریس کے جنرل سکریٹری کو خط لکھ کر ساری باتیں واضح کر دی تھیں اور امید ظاہر کی تھی کہ اس کی دردناک کہانی نظام کا دل تبدیل کر سکے گی۔

لیکن نظام کا انحصار تو اقتدار پر ہوتا ہے، دل کی تبدیلی پر نہیں۔

میں نے پوچھا "کیا یہ سچ ہے کہ تمھاری عمر سترہ سال ہے؟"

"جی ہاں، یہی سچ ہے"

"لیکن تمھارے پتا جی..."

"انھوں نے پنڈتوں کو منہ مانگی دکشنا دے کر جھوٹی جنم پتری بنوائی ہے"

"تمھاری شادی جہاں طے کی گئی ہے، کیا تمھیں اس کے بارے میں کوئی جانکاری تھی؟"

"پتا جی نے کوئی بات مجھ سے نہیں کی۔ میری ایک سہیلی تھی، اُسے اپنی ماں سے پتہ لگا تو وہ میرے پاس آئی۔ ایک سال بڑی تھی۔ اس نے ساری باتیں بتائیں۔ میں نے ماں سے پوچھا، وہ رونے لگی۔ میں پتا جی کے پاس گئی۔ انھوں نے ڈانٹ دیا۔ میں رونے لگی تو انھیں

غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے پیار سے تھپ تھپا کر بولے۔ 'بیٹی تو کیوں پریشان ہوتی ہے' ہم کیا تیرے دشمن ہیں؟ جو کریں گے' تیرے بھلے کے لیے کریں گے؟"

"تم نے خود پتہ لگانے کی کوشش کی؟"

"جی ہاں کی' اور مجھے پتہ لگا کہ میرا ہونے والا شوہر کل سولہ سال کا ہے۔ اسے دورے پڑتے ہیں۔ وہ بہت کمزور ہے۔ لیکن وہ کسی وقت اقتدار کے بہت پاس تھے۔ اُن کے پاس بڑی جاگیر ہے۔"

"تم نے پتا جی سے اپنی عمر کے بارے میں پوچھا تھا؟"

"جی ہاں، انھوں نے کہا اسکول میں تمھاری عمر ایک سال کم لکھائی تھی۔ سبھی لکھاتے ہیں جنم پتری ٹھیک ہے۔"

"تو ساری باتیں جان کر یہاں آنے کا فیصلہ تم نے کیسے کیا؟"

اس نے دھیرے سے کہا "یہ بات کسی سے کہیے گا نہیں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا "نہیں کہوں گی۔"

اس نے سب کچھ مجھے بتا دیا، لیکن میں زبان سے بندھی ہوں۔ یہاں نہیں لکھ رہی۔ لیکن اس سے کہانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں یہی جاننا چاہتی تھی کہ جو کچھ اخباروں میں چھپا ہے' وہ سچ ہے یا نہیں؟ اور میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ سچ ہے۔ میرے پاس اُس لڑکی کا انٹرویو ٹیپ پر ریکارڈ ہے۔

لیکن جب میں یہ تفصیل لکھ رہی تھی میں نے اخباروں میں پڑھا وہ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ ایک پریس کانفرنس میں موجود تھی اور اس نے کہا کہ "اُس کے پتا نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میری عمر دراصل اٹھارہ سال تین ماہ تھی، شادی کے وقت۔"

اس کے پتا بولے تھے "آپ اخبار والوں نے کیا کیا اٹر گل باتیں لکھ ماریں۔ کردار کشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب دیکھ لو سچ کہاں ہے۔"

تیسرے دن اخباروں میں پھر چھپا کہ نیتا جی کی وہ بیٹی امریکہ میں پڑھنے چلی گئی ہے۔

اس کے شوہر بھی جانے والے ہیں۔

تین ماہ بعد پھر چھپا۔ بٹیا کے شوہر اچانک بیمار ہو گئے اور ایک ماہ کے اندر تین بار ہارٹ اٹیک ہوا۔ بالآخر حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔

ایک ماہ بعد پھر خبر نشر ہوئی، شوہر کے رنج میں بیوہ بیٹی بھی چل بسی۔

کہانی ختم ہو گئی۔

لیکن نہیں، کہانی تو اب شروع ہوتی ہے۔

کیا صوبائی حکومت میں یہ ہمت ہے کہ وہ اس پورے حادثے کی خفیہ جانچ کرائے؟

کیا دنیا کے بہت بڑے جمہوریت کی جماعتوں میں اتنی بیداری ہے کہ وہ سرکار کو مجبور کر دیں سچ پر سے پردہ ہٹانے کے لیے؟

میں یقین دلاتی ہوں، میں اور میرے ساتھی آپ کے ساتھ ہیں۔

سمیتا جتنی دیر پڑھتی رہی اتنی دیر جیسے وہ وہاں تھی ہی نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ مسحور ہے یا خوش یا نازاں۔ اس نے فوراً وبھا کو فونو گرام کیا "بہادر لڑکی، اسی طرح آگے بڑھتی رہ۔ ڈیڈی کو پرنام۔ وردن کو ڈھیر سا پیار۔ نارائن یہیں ہیں —— سمیتا۔"

اس کے بعد اس نے دیکھا، انکت اور کرن دونوں گہری نیند میں سوتے ہیں۔

اُسے بھی نیند آنے لگی۔ اُس نے فیصلہ کیا۔ وجے کا مضمون وہ رات میں پڑھے گی۔

وجے کا مضمون نیتاؤں کے جنسی تعلقات کو لے کر تھا۔ اس نے بار بار سوال اٹھایا تھا کہ آزاد ہندوستان میں الگ الگ وقت پر الگ الگ جنسی بدعنوانیوں کی گونج عوام کو پریشان کرتی رہی ہے، لیکن ان میں جو عورتیں ملوث تھیں۔ ان میں سے کچھ نے خودکشی کر لی۔ کچھ حادثے کا شکار ہو کر چل بسیں۔ لیکن جو مرد تھے وہ ویسے ہی ملک کی باگ ڈور سنبھالے ہیں اور مونچھوں پر تاؤ دیتے امپورٹڈ کاروں میں گھوم رہے ہیں۔ ہمارے

ہی شہر میں دیکھو وہ جو کارپوریٹر تھے ... جنھوں نے جھگی جھونپڑی کی کملا سے بلاتکار کیا اور پھر اُسے جلا دیا جھونپڑیوں کے ساتھ ساتھ۔ اور وہ حکمراں گروہ کا سربراہ جنھوں نے کس طرح پھانسے دے کر ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی ایک ڈائرکٹر، اپنی ہی ساتھی کی بیوی کو رسوا کیا اور پھر چار منزلہ عمارت سے کود کر خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا...

یکبارگی نہ جانے کیا ہوا، اُس نے جیسے نفرت سے بھر کر رسالہ دور پھینک دیا اور چیخ اٹھی "کیوں دھوتے ہیں لوگ گندے پوتڑوں کو بازاریں، کیوں بکھیرتے ہیں بدبودار کیچڑ گندے نالوں سے نکال نکال کر سڑکوں پر؟ کیا یہ بات بھی بار بار بتانی پڑے گی کہ کیوں ہر بار عورت کو ہی سولی پر لٹکنا پڑتا ہے؟ اپنی عصمت کا امتحان دینا پڑتا ہے؟ اپالا ہو، شکنتلا ہو، دروپدی ہو، انھیں ہی بھوگنا پڑا عورت ہونے کی اذیت۔ سرخرو ہی ہوئیں جنھوں نے اپنے شوہروں کو اپنے سر پر بٹھا کر ان کی محبوباؤں کے گھر پہنچایا۔ تاریخ، پوران، کہیں بھی کوئی مثال ہے کسی مرد کی جس نے اپنی بیوی کو عزت کے ساتھ اس کے عاشق کے گھر پہنچایا ہو.....؟

دنیا میں کہانیوں کی جو سب سے پہلی تخلیق مانی جاتی ہے اس 'برہت کتھا' میں اودین واسودتا کا لڑکا نرواہن دت لاکھ لاکھ شادیاں کرتا ہے۔ ہر گاؤں، شہر کی حسینہ، عالمہ، لطیف اور ذہین پر اُس کا حق ہے۔ اس کے برعکس اگر عورت شوہر کے علاوہ دوسرے کسی بھی مرد کے ساتھ جڑتی ہے تو کُٹنی ہے، فاحشہ ہے، بدکردار ہے، اسلیے ناپاک ہے...

اور آج کے مہذب اور سائنسی دور میں تعلیم یافتہ عورت جب عوامی زندگی میں مرد کے برابر کھڑی ہے ادبا واضح الفاظ میں یہ کہہ کر اُن کے جنسی کشش کا دلفریب تجزیہ کرتے ہیں کہ جب چتر ہار میں دوردرشن کے اشتہاروں میں عورت کے جسم کا ایک چیز کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو ادب میں کیوں نہ ہو! عورت آخر ہے تو بھوگیا ہی۔

کیا یہ ذاتی ملکیت کے مفروضہ کی ہی شکل نہیں ہے؟ عورت کی ساری زندگی' معاش' سے ہی جڑی ہے؟ کیا ملکیت اور معاشی حالت کے غلط مفروضہ کے خلاف جنگ کا اعلان نہیں کر دینا چاہیے؟ کیا عورت کی آزاد حکومت انسانی حقوق کا اول مدعا نہیں ہونا چاہیے؟

کیا مجھے اور مجھ جیسی عورتوں کو اس سچ کو ثابت کرنے کے لیے قلم نہیں اٹھالینا چاہیے؟ کہانی، شاعری، ناٹک جیسی عوام تک پہنچانے والی اصناف کے ذریعہ فن کو تعلیم یافتہ نہیں کرنا چاہیے؟ بغاوت سب سے پہلے من میں ہی تو شروع ہوتی ہے۔ من ہی میں اُسے توانا کیا جا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ فوراً نہیں ملتا، لیکن ہوتا ہے اور مستقل ہوتا ہے....

اپنے آپ کو حیران کرتی وہ پھر چیخ پڑی 'میں یہی کروں گی، یہی کروں گی۔ پھر دو پل کے لیے وہ جیسے تیز رفتار سے اونچی، بہت اونچی آواز میں بھاشن دیتی رہی۔ گویا پڑھتی رہی...

پھر جیسے وہ جاگ اُٹھی ہو اور زمین پر لوٹ آئی ہو۔ آنکھیں مَل مَل کر دیکھا، اُس کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا، بالوں کو سنبھالا۔ پھر سرگوشی کی' مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ کیوں خود پر سے قابو کھو بیٹھتی ہوں؟ یہ تو تلاش کی راہ نہیں ہے۔ یہ ردّعمل ہے۔ ردّعمل میں انسان صرف غصہ اور بے قابو ہوتا ہے۔ سائنس کے اس نایاب کامیابیوں کے دور میں احتیاط ہاتھ سے چھوٹا تو بچے گا کیا؟ سائنس کو احتیاط اور ضمیر ہی قوت اور سمت دے سکتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ سب سے پہلے من ہی پیدا ہوتا ہے۔ مستقبل میں کیا ہے، اس کی مجھے فکر کیوں ہو؟ مجھے تو بس چلتے چلنا ہے، تجربہ کرتے رہنا ہے، تب تک جب تک سائنس انسان کے جرم کرنے کی عادت کو ہی ختم نہ کر دے....'

کیا کبھی ایسا ہوگا؟ کیا ایسا ہو بھی سکتا ہے؟؟ کیا تب تک انسان مجرم بن کر نہیں رہ جائے گا؟ اگر سائنس میں اتنی طاقت ہے تو کیوں نہیں یہ مرد اور عورت دونوں کو مساوی طور پر انسان ماننے کی عادت پیدا کر سکتا...؟

تبھی دروازہ کی گھنٹی بج اُٹھی۔ وہ کانپ کر اُٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی پہنچی دروازے پر اجیت تھے اور پیچھے کھڑا تھا انکت۔ اوپر آنے سے پہلے کمرے میں گیا۔ پھر باباجی کے پاس بیٹھ گیا۔ اجیت اوپر چڑھتے ہوئے بولے ''شاہدہ اور شوناتھ کے تعلقات کو لے کر شاہدہ کے گھر میں اور آس پاس کافی چرچا ہے۔ مجھے ڈر ہے...''

سمیتا تب تک اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال چکی تھی۔ بات کاٹ کر بولی ''ڈر تو مجھے

بھی ہے۔ شاہدہ خود کہہ رہی تھی۔"

"کوئی خاص بات تو نہیں ہے ؟"

"اس کی ماں مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ ..."

"کیا سوچ لیا ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گی ؟"

"تم تو اجیت، بس ... ابھی آپ کو ہی تو بتا رہی ہوں۔ میں نے ان دونوں سے کہا ہے کہ انھیں ابھی جلدی نہیں کرنی ہے۔"

"یہ تو مناسب فیصلہ ہے۔"

مصنوعی فخر سے اکڑ کر سمیتا بولی "میں کبھی غلط فیصلے نہیں کرتی۔"

تب تک کرن چائے لگا گئی تھی۔ بتاتے ہوئے سمیتا بولی "میں نے شاہدہ سے بھی بات کی تھی۔ شروع شروع میں شادی کے نام سے کتنا بدکتی تھی، اس کا ذکر آتے ہی ہمیشہ بھڑک اٹھتی تھی 'نہیں بھابھی جی نہیں' میں شادی نہیں کروں گی۔ میری تقدیر میں لکھا ہی نہیں ہے شادی بیاہ۔ میں تو زندگی بھر کنواری رہوں گی، کنواری ہی مروں گی۔"

"میں نے کہا' تب تیرا آخری رسم کون ادا کرے گا؟"

"میں اس کی ضرورت ہی نہیں رہنے دوں گی۔ میں اپنا جسم ہسپتال والوں کو خیرات کر جاؤں گی۔ کسی کے کام تو آوے گا"

"باپ رے، تو نے تو سب کچھ طے کر لیا ہے۔"

دو پل کے لیے رکی۔ چپ چاپ چائے کے دو گھونٹ بھرے اور بولی "اب وہی شاہدہ کہتی ہے بھابھی جی! آپ تو تجربہ کار ہیں، کون عورت نہیں چاہتی کہ اس کا اپنا ایک گھر ہو صرف اس کا اپنا؟ وہاں کوئی ہو جس کے سامنے اپنا دل کھول سکے۔"

"اور وہ مجھے مشہور رقّاصہ پرتما بیدی کی کہانی سنانے لگی۔ کیسی کھلی بے پردہ زندگی جی اس نے، کتنی معروف و غیر معروف ہستیوں سے اس کے تعلقات رہے، لیکن آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ شادی شدہ زندگی سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے۔ عورت مرد دونوں مل کر گھر بناتے ہیں، گھر کا مطلب چہار دیواری نہیں ہے، مرد اور عورت دونوں انسان ہیں۔ دونوں ...

"باپ رے، کتنی دیر بولتی رہی وہ۔ لیکن وہ برابر خاموش اور محتاط آواز میں بول رہی تھی۔ میں نے اُس سے اتنا ہی کہا' میں پوری طرح تم سے اتفاق کرتی ہوں، تیرے ساتھ ہوں، لیکن شادی ابھی نہیں۔ تھوڑا اور رچ بس لینے دے اس کشش کو۔ کہتے ہیں کہ ایک میان میں دو تلوار نہیں رہ سکتیں، ویسے ہی دو شاعر ایک گھر میں نہ رہ سکے تو...؟'

"وہ ہنسی نہیں، نہ جانے کہاں سے بولی" تلوار بے جان ہے، آدمی اور عورت جاندار ہیں۔ انھیں سوچنے کی طاقت ملی ہے۔"

"اسی لیے کہتی ہوں، کچھ دن اور سوچ لو اور کم ملا کر دشونا تھ سے"۔

اجیت نے ستائش بھری نگاہ سے سمیتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے بالکل ٹھیک کہا، لیکن وہ لوگ آئے تو..."

سمیتا بولی "آنے تو دو، نپٹ لوں گی اُن سے بھی، لیکن تم بھی رہنا۔ ہاں وبھا اور وجے کل آرہے ہیں۔ اور ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی۔ وہ اپنے سامنے استھانا صاحب رہتے ہیں نا، آج صبح اُن کی بھانجی آئی تھی۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ بہت خوش ہے، بتاؤں گی۔ اُسے بھی بلا لوں گی"۔

"تو قلعہ بندی بہت سوجھ بوجھ سے تیار کی جارہی ہے"۔

"نہیں کرنی چاہیے؟ جناب یہ گوشت پوست کی دنیا ہے، بے جان پروجیکٹ نہیں جن میں ہمارے پروفیسر صاحب اُلجھے رہتے ہیں"۔

اجیت نے دھیرے سے کہا "کیا پروجیکٹ اور قلعہ بندی میں کچھ فرق ہے؟"

پھر دونوں ہنس پڑے۔

لیکن صورت حال اتنی نازک نہیں تھی جتنا وہ سمجھ بیٹھے تھے۔ سمیتا جب بھی اس ملاقات کا تذکرہ کرتی ہے تو کہتی ہے — میں تو واقعی ڈر گئی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ وہ بڑے غصے میں ہوں گے، کچھ جلی کٹی، کچھ مذہبی تعصب کی باتیں سنائیں گے، لیکن ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوا

چائے کا انتظام میں نے کر ہی رکھا تھا۔ وبھا اور وبے کسی کام سے آئے۔ وہ کچھ دیر اُن کے ساتھ رہے، پھر چلے گئے۔ ڈاکٹر اندوجا برابر دہیں رہیں، اجیت تھے ہی۔

شاہدہ کی امّی جان تھیں، چچا جان تھے، چھوٹا بھائی تھا۔ لیکن اس کا ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، پورے وقت وہ انکت کے ساتھ کیرم اور کرکٹ کھیلتا رہا۔ ایک پڑوس میں رہنے والے نوجوان تھے۔ شاہدہ کی بیوہ بھابھی تھی اور ایک نوجوان تھا جو بھابھی جان کے رشتے میں بھائی لگتے تھے۔

میں نے چائے پیتے ہوئے پوچھا "تو بتائیے، کیا حکم ہے آپ کا؟"

امّی جان مسکرائی تھیں "حکم تو بیٹا تیرا چلے ہے ہمارے گھر میں، ہر بات میں تیری دُہائی دیوے ہے۔ شاہدہ بھابھی یوں کہہ رہی تھی، بھابھی جی کی رائے ہے..."

میں ہنس پڑی "نہیں اماں جی، آپ، آپ ہیں، ہیں ہیں شاہدہ تھوڑی نادان ہے..."

"ارے نہیں بیٹیا، تمھارے یہاں جب سے آنے لگی ہے تب سے بہت سمجھدار ہوگئی ہے۔ آپ اُسے اپنے ساتھ کہاں کہاں لے گئیں، ہمیں ذرا بھی فکر نہیں ہوئی۔ لیکن بیٹی..."

وہ کچھ رکیں، پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی بولیں "لیکن بات یہ ہے وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر شونا تھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

فضا میں کچھ گھٹن سی ہونے لگی تھی۔ میں نے کہا "کہا تو اُس نے مجھ سے بھی تھا۔ میں نے یہی جواب دیا ۔ یہ تیری اپنی زندگی کا مسئلہ ہے، تو امّی جان سے بات کر۔ لیکن اس سے بھی پہلے سوچ سمجھ لے اچھی طرح تجھے اپنی تقدیر کا فیصلہ آپ کرنا ہے، لیکن والدین اور دوسرے بڑے سے بھی مشورہ کرنا چاہیے۔ ٹھیک ہے، تو بالغ ہے، خود مختار ہے، لیکن ہمارے بڑے ہم سے زیادہ تجربہ کار ہیں۔"

چچا جان نے مجھے بڑے پیار سے دیکھا "یہ تو تم نے بڑی مناسب اور نیک صلاح دی۔ اس نے پوچھا بھی مجھ سے، لیکن دیکھو صاف بات ہے، ہندو مسلمان میں شادی اتنی آسانی سے ہوتی نہیں۔ جو کرے ہیں وہ بڑے لوگ ہیں۔"

یکبارگی ڈاکٹر اندوجا بول اُٹھیں "سبھی بڑے لوگ نہیں ہیں۔ میرے شوہر

ڈاکٹر اسد انصاری ہیں۔ ہم تو متوسط طبقے کے لوگ ہیں، یعنی درمیانہ طبقے کے لوگ"

"لیکن بیٹی، آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں، تہذیب یافتہ ہیں۔ وہ جو معمولی لوگ ہیں، جہاں علم اور تہذیب کی روشنی ابھی نہیں پہنچی، وہاں ان باتوں کو بُرا مانا جاتا ہے"

نوجوان جس کا نام انیس بتایا گیا تھا، اس نے کہا "میں آپ سے کہتا ہوں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ایسی شادیاں ہوں، لیکن ابھی اس کے لیے ماحول کہاں بنا ہے؟"

اجیت نے فوراً جواب دیا تھا "وہ تو بنانے سے ہی بنے گا۔ اپنے آپ تو کچھ ہوتا نہیں۔ آپ کو ویسے کوئی اعتراض نہ ہو تو..."

"اعتراض کی بات نہیں ہے، جہاں ہم رہتے ہیں وہاں کا ماحول ایسی بغاوت کرنے کے لیے ابھی تیار نہیں ہے۔ وہاں مذہبی پیشواؤں کا حکم چلتا ہے اور وہ اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ ایک مسلمان لڑکی ہندو گھر میں جاوے، ہندو جو ہم سے نفرت کرتے رہے، جو... جو..."

اچانک چچا جان نے اسے ٹوک دیا "وہ بات نہیں بیٹے، اب وہ بات نہیں"

اجیت نے فوراً انھیں روکا "نہیں چچا جان! انیس بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ دونوں ذاتیں پاس پاس رہنے پر بھی گھُل مِل نہیں سکیں، اس کی ایک وجہ مذہبی کٹرپن بھی ہے، معاشی وجہ بھی ہے۔ بہت سی باتیں ہیں انھیں گنانے کا کیا فائدہ۔ فائدہ اس میں ہے کہ ہم ان باتوں سے اُوپر اُٹھ کر ایک دوسرے کے پاس آنے کی کوشش کریں"

انیس نے ایک دم جیسے اچھل کر کہا "آپ نے بالکل میرے دل کی بات کہی۔ میں متفق ہوں آپ سے"

میں بڑے غور سے ماحول کو پرکھ رہی تھی۔ کچھ شرارت کرنے کو جی کر رہا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "آپ شاید نہیں جانتے۔ شونا تھ ہمارے جیسا ہندو نہیں۔ شیڈیولڈ کاسٹ ہے۔ اس کے بھائی بودھ ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے ساتھ بودھ مسلک قبول کیا تھا۔ شاہدہ اگر ان کے گھر جاتی ہے تب اقلیت کے نام پر وہ دونوں ہم سے مورچہ لے سکتے ہیں۔ ہمارے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں"

سن کر وہ سب ہنس پڑے۔ تعجب، اس کے بعد ماحول ایک دم بدل گیا۔ وہ بجھا جاتے جاتے نئے تہذیب کی بات ان کے کان میں ڈال گئی تھی۔ تبھی دیکھتی ہوں، امّی جان میرے پاس آئیں "ایک بات کہنا چاہتی ہوں"۔
میں اُٹھ کر ان کے ساتھ نیچے چلی گئی۔ انھوں نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا "سب کچھ ٹھیک ہے، وہ جو چاہے کرے، لیکن میرا کیا ہوگا؟ بیٹا تو ابھی بچّہ ہے۔ بیٹیاں اپنے گھر گئیں، دیور تو دیور ہے۔ شاہدہ نے ہی بہنوں کی شادی کی ہے۔ اُس کی جی توڑ محنت سے ہی یہ گھر بنا ہے۔ وہ چلی گئی تو...؟"
میں نے یہی سوچا تھا۔ اور میں اس کے لیے تیار تھی۔ میں نے کہا "امّی جان، آپ بھی میری امّی ہیں۔ شاہدہ آپ کو نہیں چھوڑے گی۔ شونا تھ سے یہ بات اس نے صاف کہہ دی ہے۔ پھر میں ہوں، میں انتظام کروں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اور شاہدہ ابھی کہاں جا رہی ہے؟ جائے گی تبھی، جب آپ کا مکمل انتظام ہو جائے گا"۔
امّی جان نے مجھے گود میں بھر کر میرا ماتھا چوم لیا۔ "اللہ تعالیٰ تجھے سدا خوش رکھے"۔
باتیں اور بھی بہت ساری ہوئیں۔ رہن سہن کے طور طریقے عبادت وغیرہ کی، لیکن ان میں کچھ مطلب نہیں تھا، پھر بھی یہ کام آسان نہیں تھا اور اسی لیے اس سے بچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اگر شاہدہ، شونا تھ کے ساتھ جانا ہی چاہے گی تو میں اُس کا ساتھ دوں گی، لیکن ابھی بہت چلنا ہے، بہت دور جانا ہے۔ مجھے خوشی اسی بات کی تھی کہ انھوں نے چلنے سے انکار نہیں کیا تھا اور جو چلتا ہے اس کی جانگھوں میں پھول کھلتے ہیں، وہ ست یگ میں رہتا ہے۔
کہاں ہے یہ ست یگ؟ کیا معنی ہے ست یگ کا؟ فلسفہ، ادب، سائنس سبھی اس سوال سے جوجھ رہے ہیں، کیا یہی جوجھنا سچ نہیں ہے؟
سمیتا اُس رات نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی، اُلجھتی رہی کہ تبھی اجیت نے نیند میں ہی اس کی طرف کروٹ لی اور اس کا ہاتھ سمیتا کی چھاتی پر آ گیا۔ لیکن اس نے ذرا بھی جنبش نہیں کی۔ ہاتھ اسی طرح رہنے دیا اور پھر خود بھی اسی دنیا میں پہنچ گئی۔

وجے رات کی فلائٹ سے بمبئی لوٹ گیا۔ وبھا کو اگلے دن شام تک رکنا تھا۔ تنہائی پاکر میں نے اس پوچھا "کہیے کیا خبر ہے تم دونوں کی ؟"

ایک لمحے کے لیے وبھا سمیتا کی طرف دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ بولی، ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی ـــ "سنو بھابھی! ہم بار بار گھوم پھر کر تعلقات پر ہی کیوں آجاتے ہیں؟ ہمارا احساس کیا اتنا محدود ہے؟ میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ میں اس بارے میں بالکل نہیں سوچوں گی"۔

سمیتا ہنس پڑی۔ بولی "میری وبھا رانی، میں تم سے اتفاق کرتی ہوں لیکن..."

"کیا یہ 'لیکن' کچھ دن کے لیے ملتوی نہیں ہو سکتا؟ میں تعلقات سے انکار نہیں کر رہی ہوں۔ صرف ان کی غلامی سے نجات چاہتی ہوں۔ روحانی قوت کیا ہے میں نہیں جانتی، لیکن وہ الفاظ جن کا آپ نے مجھ سے بار بار تذکرہ کیا ہے ایک روحانی طاقت کے پرتو ہت کے ہی ہیں ـــ 'جب تک عورت مرد کی طاقت کی کشش سے آزاد نہیں ہوتی تب تک وہ آزاد نہیں ہو سکتی'۔"

"ہاں، میں نے یہ کہا ہے، اب بھی کہتی ہوں"

"پھر میرے اور وجے کے تعلقات کے بارے میں جاننے کو اتنی بے چین کیوں ہیں؟"

سمیتا کا وجود تیز رفتار سے کانپ گیا۔ اسے صاف نہیں دکھ رہا تھا، سب کچھ ڈول رہا تھا، ڈولے جا رہا تھا۔ کسی طرح اپنے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے سمیتا نے صرف اتنا ہی کہا "اس لیے کہ آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت مرد اپنی اپنی خصوصیات کھو دیں۔ کشش فطرت ہے"۔

وبھا نے متحکم آواز میں لیکن خلوص کو بنائے رکھتے ہوئے کہا "بھابھی، میں نے آپ کی بات پر بہت سوچا ہے۔ میں غرور سے نہیں کہہ رہی، میں سوچنے پر مجبور ہوتی ہوں۔ اپنے آپ سے ہی اُلجھتی رہی ہوں اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جب عورت مرد کی طاقت کے لیے متوجہ نہیں ہوگی تب وہ اپنے ساتھی کا انتخاب صرف طاقت کے کسوٹی سے نہیں مزاج، دلچسپی، باطنی میل، اعلیٰ آدرش ـــ ان مساوات کی بنا پر درندہ صفت سے اوپر اٹھ کر کرے گی"۔

جتنی دیر وبھا بولتی رہی، سمیتا خوشی سے اسے دیکھتی رہی۔ وبھا نے آگے کہا "ویسے ہی جب وہ گھریلو زندگی اور حفاظت کی خواہش سے آزاد ہوگی تب آجکل جیسے دو نوجوان ایک دوسرے کے لیے یا برابر کے کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے ساتھ رہتے ہیں ویسے ہی عورت مرد بھی رہیں گے اور تب عورت کے لیے ممتا کی خواہش ایک مجبوری نہ رہے گی"

سمیتا بے ساختہ مسرت کے لہجے میں بول اٹھی "تونے تو وبھا، آج مجھے حیران کر دیا۔ اسی زبان کی تو تلاش تھی مجھے، لیکن..."

وہ اچانک سنجیدہ ہوگئی۔ وبھا نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "لیکن کیا بھابھی؟ بتاؤ نا..."

"بتاؤں گی، لیکن آج نہیں۔ آج تو نہیں سمجھے گی، لیکن میں تیری طرف سے پوری طرح سے مطمئن ہوں۔ بڑی ہوں اس لیے آشیرواد دینے کی حقدار ہوں۔ تیری راہ ہمیشہ تجھے آگے سے آگے لے جاتی رہے"

پھر ہنس پڑی "کبھی کبھی بورژوائی رسمیں بھی کتنی پیاری لگتی ہیں..."

"نہیں بھابھی، آشیرواد، نیک خواہشات ہی تو ہے۔ بڑے چھوٹوں کے لیے نیک خواہشات کریں تو یقیناً اُن کا مبارک ہونا ہے"

"اور اُن کا مبارک ہونے میں اپنا مبارک ہونا بھی تو شامل ہے"

کہہ کر دونوں قہقہہ لگانے لگیں۔

وبھا کے جانے کے بعد حالات اتنی تیزی سے اور اتنی شکلوں میں تبدیل ہونے شروع ہوئے کہ سمیتا بھی گھبرا گئی۔ وبھا کی تبدیلی سے وہ واقعی سرشار تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اُسے ایک ٹھیک ساتھی مل گیا ہے۔ اُس کے مضامین اور بھاشن دن بہ دن واضح اور قابلِ اعتماد ہوتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی تو تیز سماج سدھارک کے طور پر سماج کو کھلا چیلنج دیتی جان پڑتی تھی۔ وجے ہمیشہ اُس کے آس پاس رہنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کی تقریروں اور مضامین کو زیادہ سے زیادہ اہمیت اور امتیاز دیتا تھا۔ کبھی کبھی تو لگتا تھا وہ وبھا کا پی۔ آر۔ او ہے۔

وہ فخر سے کہتا بھی "ہاں، میں ہوں۔ مجھے وبھا پر ناز ہے۔ وہ میری کھوج ہے۔"

اس کے ایسا کہنے میں انا کا سایہ تک نہ ہوتا۔ بس اُس کا اپنا خاص لیکن سادہ سا چلبلا پن تھا۔ وبھا کو چڑھانے میں جیسے وہ مزہ لینا چاہتا ہو۔ وبھا نہ چڑھتی تھی نہ لطف لیتی تھی۔ وہ اپنے میں ہی اتنی اُلجھی رہتی تھی، اتنی کہ وجے کی طرف دیکھ کر بس مسکرا دیتی۔ اس دن کسی حوالے سے اُس نے پوچھا "وجے، آجکل تم مجھے بہت اہمیت دے رہے ہو کیوں؟"

وجے کا جواب تھا "پتہ نہیں، لیکن کہو تو چھوڑ دوں"

"تمہیں کچھ کہنے والی میں کون ہوتی ہوں؟"

"کہہ کر دیکھو تو..."

وبھا نے صرف مسکرا کر چائے کا پیالہ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا اور نکل پڑی اگلی منزل کی طرف۔ وجے گنگنا اٹھا۔

"نہ منزل ہے نہ منزل کا پتہ ہے

محبت راستہ ہی راستہ ہے"

وبھا نے سن لیا۔ کندھے پر تھیلا اور ہاتھ میں اٹیچی لیے وہ رکی، بولی "اتنے بڑے سچ تک تم پہنچ گئے ہو، جس دن ملاقات کرلو گے واقعی آزاد ہو جاؤ گے۔"

وجے نے فوراً جواب دیا "مجھے آزادی نہیں چاہیے، مجھے بندھن چاہیے۔ آمی مرتے چائی نہ سُندر بھونے، منش ما تھے آمی واچی ہارے چائی۔"

وبھا نے دور سے ہی جواب میں کہا "یہی تو میں بھی چاہتی ہوں، ہمیں اپنا اپنا راستہ خود چُننا ہے۔ خود ڈھونا ہے اپنا اپنا بوجھ۔"

وہ بہت کم ملتے تھے۔ خط بھی کبھی کبھار ہی لکھتے تھے، لیکن پنکھ پھڑپھڑانے کی آواز وہ دونوں یقیناً سن لیتے تھے۔ سمیتا مطمئن تھی اور بے فکر بھی۔

سمیتا اب شاہدہ کی طرف سے بھی مطمئن تھی، لیکن یہ اطمینان اسے ایک طویل وقفہ کے بعد مل سکا تھا۔ اُس دن جب اس کی والدہ اس کے گھر آئی تھیں اور ایک خوشگوار ماحول میں لوٹی تھیں۔ وہ بس ایک چھلاوہ تھا۔ سات دن بعد شاہدہ جب اس کے پاس آئی تو بے حد اداس

تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں پانی میں تیر رہی تھیں۔ سمیتا نے دیکھا تو گھبرا گئی۔ بولی "خیر تو ہے"۔

"خیر ہو یا نہ ہو، مجھے اس کی فکر نہیں، لیکن لوگ دوہری زندگی کیوں جیتے ہیں؟"

"بس! بڑی فارورڈ بنتی تھی، لیکن دیکھتی ہوں، ابھی تک زندگی کی کتاب کا پہلا ورق بھی ٹھیک سے نہیں پڑھا۔ دوہری زندگی ہماری قسمت ہے، لیکن ہوا کیا؟"

"ہونا کیا! اور ہو بھی تو میں ڈرتی ہوں کسی سے؟"

"وہ تو میں جانتی ہوں تو کتنا ڈرتی ہے، کتنا نہیں۔ وہ تو ہی تھی جو ایک دن شادی کے نام سے بھڑکتی تھی جیسے سانڈ لال کپڑے سے"۔

"بھابھی جان، بھابھی جان میرے زخموں پر نمک مت چھڑکو"۔

"اچھا اچھا بیٹھ، چائے پی اور پھر بتا"۔

اور اس نے کرن کو پکار کر کہا "دو چائے تو لانا کرن"۔

"آپ تو ہوٹل کی طرح آرڈر دے رہی ہیں"۔

"ارے شاہدہ، یہ دنیا سرائے ہے تو گھر اپنے آپ ہی ہوٹل ہو گیا"۔

آدھے گھنٹے بعد چائے پیتے ہوئے شاہدہ نے جو کچھ بتایا اس سے سمیتا کو ذرا بھی حیرانی نہیں ہوئی۔ بولی "میں جانتی تھی، یہی ہونے والا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو مجھے حیرانی ہوتی۔ وہ تو مجھے تو لنے آئے تھے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کب، کیا اور کیسے کرتی ہو"۔

"میں تو جو کچھ ٹھان چکی ہوں کروں گی ہی، لیکن مجھے دکھ یہی ہے کہ جن کے لیے میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، وہی میرے راستے کا روڑہ بن رہے ہیں۔ ایک کے میاں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میں نے رشونا تھ سے شادی کی تو وہ میری بہن کو طلاق دے دیں گے"۔

"چہ چہ چہ! یہ تو بہت بری خبر ہے"۔

"خاک بری خبر ہے۔ دے کر تو دیکھیں۔ چھٹی کا دودھ یاد نہ دلا دیا تو شاہدہ نام نہیں"۔

سمیتا بڑے زور سے ہنسی ــــ "عشق پر زور نہیں ہے، یہ وہ آتش غالب، کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے"۔

"بھابھی جان، تم تو... میں نہیں آؤں گی آپ کے گھر"۔

اور وہ تیزی سے نکل چلی گئی۔ سمیتا نے اُدھر دیکھا تک نہیں۔ جانتی تھی، اسے کام پر جانا ہے۔ کل پھر آئے گی اور واقعی دوسرے ہی دن پھر آئی، بے حد سنجیدہ، بے حد فکرمند انداز میں۔ سمیتا نے ہمیشہ کی طرح مسکرا کر پوچھا "کہیئے، کیا خبر ہے؟"

"سب نے مل کر جینا مشکل کر رکھا ہے، لیکن میں بھی ہار نہیں مانوں گی، لیکن بھابھی..."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ سمیتا نے آہستہ سے تسلی کے الفاظ میں کہا "کیا بات ہے، کہو نا۔"

شاہدہ نے سمیتا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا "بہت مشکل کام ہے، خطرہ ہے۔"

"تم کہو تو۔"

"اگر مجھے... ماں کا گھر چھوڑنا پڑے تو کیا تم مجھے اپنے گھر میں رکھ سکو گی؟"

ایک بار تو سمیتا کا وجود کانپ گیا۔ ایک لمحے میں ہزاروں خیال اٹھے۔ ہزاروں منظر آنکھوں میں اُبھرے۔ اُس نے خود کو سمیٹنے میں ایک پل لیا۔ پھر مستحکم آواز میں بولی "شاہدہ! میں سمجھ نہیں پا رہی کہ کون سی شاہدہ اصلی ہے ـــــ وہ جو میری نند کی شاگردہ تھی یا وہ جس نے اپنے گھر کے لیے اپنے کو مٹا دیا اور فخر سے سر اونچا کیے رہی یا یہ جو میرے سامنے کھڑی گڑگڑا رہی ہے ڈرامائی انداز میں؟"

"بھابھی..." شاہدہ چیخ پڑی۔

"مجھے شرم آرہی ہے۔ اتنے دن سے تم جس گھر میں ایک صبر کے طور پر آتی رہیں اور اسی گھر میں آج تمھیں یہ سوال پوچھنا پڑ رہا ہے۔ اتنی کمزور ہو تم؟ پناہ مانگو گی؟ جب تک عورت اپنی طاقت پر جینا نہیں سیکھے گی تب تک وہ اسی طرح بھٹکتی رہے گی، ستائی جاتی رہے گی۔ میں کہتی ہوں کیوں پاگل ہو رہی ہو تم اس شادی کے لیے؟ نہیں ہو گی تو دنیا برباد ہو جائے گی کیا...؟"

"بس، بس بھابھی، بس میں جا رہی ہوں۔"

وہ مڑی ہی تھی کہ سمیتا نے آگے بڑھ کر اُسے باہوں میں سمیٹ لیا۔ "کہاں جا رہی ہو؟ ادھر بیٹھو اور ابھی شادی کی بات بھول جاؤ۔ تمھیں ایک خبر دینی تھی، لیکن تم نے تو آتے ہی پرانے عاشقوں کی طرح ڈرامہ کرنا شروع کر دیا۔"

"شاہدہ ملزموں کی طرح کھڑی ہی رہی، ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ سمیتا نے بغیر کسی تمہید کے کہا "شونا تھ اگلے ہفتے لندن جا رہے ہیں۔"

"کیا؟" شاہدہ انجان سی بولی "کیا کہہ رہی ہیں آپ ...؟"

"ہاں، اُن کی تقرری بی بی سی میں ہوگئی ہے۔"

شاہدہ اب بھی اپنے آپ کو سمیٹ نہیں پا رہی تھی ــــ "تقرری ہوگئی، لیکن مجھ سے تو انھوں نے کچھ نہیں کہا۔"

"آج ہی تو آرڈر آئے ہیں۔ تو کب ملی تھی؟"

"ایک ہفتہ ہوگیا۔ اُس کے بعد وہ اپنے گھر گئے تھے۔"

"اب تو پتہ چل گیا۔ میری مانے تو شادی کی بات بھول جا کچھ دنوں کے لیے۔ شونا تھ سے بات کر چکی ہوں۔ تو بھی یہی کہنا" پھر ہنس پڑی "محبت کا رنگ ذرا گہرا ہونے دے ابھی۔"

شاہدہ بھی ہنس پڑی۔ وہ اب تک شانت ہو چکی تھی۔ سیدھے سادے خوش کن لہجے میں بولی "یہ تو آپ نے بہت اچھی خبر سنائی۔ میں ابھی فون کرتی ہوں۔"

فون فوراً مل گیا۔ شاہدہ نے کہا "میں شاہدہ ہوں۔ بہت بہت مبارکباد قبول کرو۔"

"بہت بہت شکریہ۔ کہاں سے بول رہی ہو؟"

"بھابھی جی کے گھر سے۔"

"تو تم ادھر آجاؤ نا۔ تمھارے ساتھ ہی نکل پڑوں گا۔ بھابھی جی نے تمھیں سب کچھ بتا ہی دیا ہوگا۔"

"بتایا ہی نہیں، ڈانٹا بھی بہت۔"

سمیتا نے ہاتھ سے فون چھین لیا ــ "سنو شونا تھ! میں پھر کہہ رہی ہوں بے وقوفی مت کرنا۔ اِسے بھی سمجھا دینا۔ دونوں آزاد ہو، بالغ ہو، ڈر کیسا اور ڈر ہے تو اپنے آپ سے ہے۔ سمجھ گئے نا؟ وہ آرہی ہے، میں فون رکھ رہی ہوں۔"

فون رکھتے ہوئے بولی "کہا ہے تو جایئے، لیکن میری بات یاد رکھیے۔"

سات دن بعد شونا تھ لندن چلے گئے۔ اجیت، سمیتا اور شاہدہ ـــ تینوں انھیں چھوڑنے ہوائی اڈے پر گئے۔ تب شونا تھ نے شاہدہ سے کہا تھا " ایک دن تمھیں لندن آنا ہے۔ اس لیے نہیں کہ شادی کرنی ہے، بلکہ اس لیے کہ تم میری دوست ہو۔ شادی کروں گا تو یہیں آکر۔"

شاہدہ پورے وقت بہت کم بولی بس دیکھتی ہی رہی، لیکن چلتے وقت اس نے مستحکم آواز میں کہا " تمھاری دوستی پر میں ہمیشہ ناز کروں گی۔ شادی ہو یا نہ ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمھیں کوئی اور من کا میت مل جائے تو مجھے بتا ضرور دینا ـــ میری غزل اُسے بھی سنا دینا۔"

اور وہ ہنس پڑی۔ شونا تھ نے بھی اُسی طرح ہنستے ہوئے اُس کا ہاتھ دبا دیا۔ کہا " اور میرے گیت تم کسے سناؤ گی؟"

" میں تو اپنی بھابھی اور بھیا کو ہی سنا سکتی ہوں۔"

" مجھے تو وہ خوش بختی نصیب نہیں ہوئی، میں تو خود ہی گنگناتا ہی رہوں گا۔۔۔"

اعلان ہو رہا تھا ـــ لندن جانے والے سبھی مسافر فوراً سیکورٹی چیک کے لیے پہنچیں۔

اجیت نے کہا " شونا تھ! تمھیں اب جانا چاہیے۔"

شونا تھ فوراً مڑا، ہاتھ ہلایا اور بھاگتا ہوا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

راستے میں سمیتا نے شاہدہ کو اپنے پاس کھینچ کر کہا " اب من کو ایک طرف لگاؤ اور اپنا کام کرو۔ میں چاہتی ہوں تمھاری غزلیں عوام کی زبان پر ہوں۔"

شاہدہ بس اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکائے رہی۔ کچھ بولی نہیں۔ تب بھی اس نے کچھ خاص نہیں کہا جب ماں نے پوچھا " شونا تھ گئے؟"

" ہاں، امّی جان!"

" کب لوٹیں گے؟"

" وہ تو اب وہیں بی بی سی میں کام کریں گے۔ پندرہ بیس جتنے بھی سال لگیں۔ ہو سکتا ہے وہیں بس جائیں۔"

" اچھا ہے، بے چارے کی زندگی سدھر جائے گی۔ یہاں تو ان ہندوؤں نے ان لوگوں کو آدمی ہی نہیں سمجھا۔ جانور سے بدتر زندگی تھی ان کی۔" کہتے ہوئے انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔

شاہدہ نے اچانک پوچھنا چاہا کہ ''انھیں شونا تھ سے ہمدردی ہے یا اس بات کی خوشی ہے کہ آفت آرہی تھی ٹل گئی؟'' لیکن اتنی ہی جلدی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ بس اتنا ہی کہہ سکی ''امی جان! میرے بھائی اجیت اور بھابھی سمیتا بھی تو ہندو ہیں۔''

امی جان بولیں ''اب دس پانچ بھلے آدمی تو ہر کہیں مل ہی جاتے ہیں لیکن پوری ذات کے رسم ورواج تو نہیں بدل جاتے۔''

''زمانہ بہت تیزی سے بدل رہا ہے امی جان! اب کل کے اچھوت راج کر رہے ہیں۔ انھیں کوئی بھنگی چمار کہہ کر تو دیکھے، اسی وقت جیل میں ٹھونس دیئے جائیں گے۔''

یہ کہتی ہوئی شاہدہ دفتر جانے کی تیاری کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جاتے جاتے یہ جملہ اور کس گئی ـــــ ''کبھی سوچا تھا آپ کی امی جان یا اُن کی امی جان نے کہ ایک دن ہمارے خاندان کی بہو بیٹیاں دفتروں میں نوکری کریں گی اور غیر مردوں کے ساتھ مُنہ کھول کر باتیں کریں گی؟''

انجانے ہی شونا تھ کے جانے سے اجیت اور سمیتا دونوں کو لگ رہا تھا کہ نزدیک مستقبل میں ایک مصیبت آسکتی تھی جو اب بہت دور مستقبل کے آغوش میں جا چھپا ہے۔

لیکن مصیبت سمیتا کے سامنے اب بھی تھی، حالانکہ سطح پر اُس کے ہونے کے نشان واضح نہیں تھے۔ نارائن انھیں اطلاع دیئے بغیر ایک لمبے پروجیکٹ پر امریکہ چلے گئے تھے کم از کم تین سال انھیں وہاں رہنا ہی تھا۔ بیچ میں آنے کا انتظام تھا۔ ورنکا کو اپنے جانے کی اطلاع انھوں نے تین دن قبل ہی دی تھی۔

ورنکا پھٹ پڑی تھی ''کبھی کبھی تو حد کر دیتے ہو، نارائن! تین دن میں ساری تیاری کیسے ہوگی؟''

''کیوں، پہلے تو تم ایک دن میں سب کچھ کر لیتی تھی۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔''

''اوہ سمجھا، تب وہ دن مہاشے کہاں تھے؟ بس ہم تھے اور اب ہم ماضی بن گئے ہیں۔

تمھیں حال یعنی وردن کی فکر ہے۔ سب کو ہوتی ہے۔۔۔"

"نارائن!۔۔۔" ورتکا جیسے چیخ اٹھے گی۔

"آئی ایم ساری۔ آئی ایم ریلی ساری۔ آدھا تیار تو میں ہمیشہ رہتا ہوں۔ باقی مل کر کرلیں گے۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ۔"

"کچھ کیا ہے جواب کروں گی۔ بتاؤ، کیا کچھ خاص کرنا ہے؟"

اور وہ تین دن کیسے بیتے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اسے ہوائی اڈے پر چھوڑنے جاتے ہوئے ورتکا نے پوچھا "میں بھی ادھر آنا چاہتی ہوں۔"

"استقبال ہے آپ کا آیئے نا؟"

"نارائن، آئی ایم سیریس۔ بات یہ ہے کہ اس بار عالمی ہندی کانفرنس امریکہ میں ہو رہی ہے۔ ماما جی کو منسٹری آف ایجوکیشن کا دعوت نامہ ملا ہے۔ میں انھیں کے ساتھ آنا چاہتی ہوں۔"

"میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ چاہو تو میں تمھارے وہاں ٹھہرنے کا بھی انتظام کر سکتا ہوں۔"

"چاہو تو کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ اپنے بارے میں فیصلہ تو تمھیں ہی کرنا ہے نہ۔ ہم تو حضور کی نظر دیکھتے ہیں۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ نارائن یو آر اِن کوریجبل۔ ہاں انتظام تم کرکے رکھنا۔ ماما جی سے پوچھوں گی کہ وہ بھی رکنا چاہیں گے۔"

ایرپورٹ سے لوٹ کر جب اس نے وردن کی کلکاری سنی تو اُسے یکبارگی نارائن کی یاد آگئی۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ نارائن کا ردِ عمل فطری تھا۔ اس کا دل جیسے ایک پل کے لیے پشیمانی سے بھر اٹھا ہو۔

لیکن وردن تو اُسے دیکھ کر کھلکھلا رہا تھا بس دوسرے ہی لمحے سب کچھ بھول کر وہ بھی اُس

کے ساتھ کھیلنے لگی۔

سب کچھ کتنا فطری... کتنا سادہ... پیار بھی، حسد بھی، پھر...

یہ ساری باتیں ورتیکا نے سمیتا کو تفصیل سے لکھتے ہوئے آخر میں ایک جملہ لکھ دیا تھا جیسے وہی بنیادی سوال تھا "قدرت سے کیسے لڑا جا سکتا ہے؟"

سمیتا نے ہمیشہ کی طرح جواب دیا تھا "لڑنا کسی سے نہیں ہے، بس آزاد کرنا ہے — وہ بھی اپنے آپ کو اپنے آپ سے"۔

کیسے ملے خود کو، خود سے نجات؟

تبھی کرن نے ایک اور تماشہ کر ڈالا۔ اُس کے ساتھ بلاتکار کرنے میں تین نوجوانوں کا ہاتھ تھا۔ دو پکڑے جا چکے تھے، تیسرا فرار تھا۔ کرن دل ہی دل میں اس کے حلیے کو یاد کر کے اُسے ڈھونڈتی رہتی تھی۔ اس متعلق اُس نے کسی سے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

ایک دن ایک دکان پر اُس نے ویسے ہی نوجوان کو دیکھا۔ کئی دن تک دیکھتی رہی۔ اُس کے گھر تک جانے کے راستے پر اس کا پیچھا کرتی۔ بیچ میں تھوڑی سی سنسان سی جگہ تھی، وہیں ایک دن وہ چھپ گئی۔ جب وہ نوجوان وہاں سے گزر رہا تھا تو اُس نے ایک بڑا سا پتھر اُٹھا کر پوری طاقت سے اس کے پیروں کا نشانہ کر کے پھینکا۔ نشانہ اچوک تھا۔ نوجوان چیخ کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ چیخ سن کر کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ کرن سیدھے پولس چوکی پہنچی۔ اس نے سارا حال بتا کر فوراً اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

وہ واقعی فرار ملزم تھا۔ فون پر خبر پاتے ہی اجیت اور سمیتا وہاں آئے۔ کرن ضمانت پر ہی گھر آ سکی، لیکن سبھی نے اس کی بیٹھ تھپ تھپائی۔ اگلے دن اخباروں میں بھی یہ خبر سرخیوں میں شائع ہوئی۔

ایک بار پھر گھورتی ہوئی آنکھوں والے اُس لین میں اس گھرانے کو لے کر طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ گونج کبھی کبھی بڑی پیاری لگتی ہے، موسیقی کا احساس دیتی ہوئی سی...

اس دن جمعہ تھا۔ سمیتا، اجیت اور انکت — تینوں ایک ساتھ بیٹھے دوردرشن پر بہت کا پروگرام دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک نشست کی تفصیلی رپورٹ میں وبھا دکھ پڑی۔ اس نے ہی ادب

میں روحانیت موضوع پر تقریر کی۔ سب کو بہت ہی اچھا لگا۔ انکت تو ایک دم اُچھل پڑا۔ ممی، ممی!
بُوا، پاپا دیکھو، بُوا بیٹھی ہیں۔ دیکھو وہ بُوا اُٹھ کھڑی ہوئیں اور لکچر دے رہی ہیں۔"

ناظم کہہ رہے تھے "اب آپ کے سامنے جانی مانی صحافی اور ادیبہ شریمتی وِبھا اپنے خیال پیش کریں گی۔"

وبھا نے بغیر کسی جھجک کے سامعین کی طرف دیکھا اور بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز میں اثر تھا اور وہ کہہ رہی تھی — میں قبول کروں گی، میرا مذہب اور تصوف میں کوئی خاص دخل نہیں ہے، پھر بھی میرے کچھ خیال ہیں۔ سچ کی تلاش ازل سے ہو رہی ہے، یہی تلاش کیا روحانیت نہیں ہے؟ آخری کچھ نہیں ہے ہمیں جاننا ہی جاننا ہے۔ آخر، آخر جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ کتنا تھوڑا ہے اور ہم جو نہیں جانتے، وہ کتنا زیادہ ہے۔

کبھی ایک انگریزی نظم پڑھی تھی۔ اس کا خلاصہ تھا کہ انڈے کو توڑ کر جب چوزہ باہر آتا ہے تو ان بوجھ سا دیکھ کر رہ جاتا ہے کہ اب تک وہ اپنے کتنے چھوٹے سے آکاش کے نیچے رہ رہا تھا۔ باہر یہ کتنا طویل آسمان ہے۔ اس منظر کو دیکھنے والے انسان نے سوچا میں جس طول و ارض آسمان کے نیچے رہ رہا ہوں کیا اس کے باہر اس سے بڑا آسمان بھی ہوگا؟ کس انڈے کو پھوڑ کر میں اُس آسمان تک پہنچوں؟ یہ باہر نکلنے کا احساس، یہ سوالیہ بے چینی، یہ مسلسل تلاش کا اور بھی ہے، اور بھی ہے کی صورت حال کیا روحانیت نہیں ہے؟ اس کے مرکز میں ہے سچ، وہی ایشور ہے۔ گاندھی جی نے یہی تو کہا تھا۔ منو کا عقیدہ بھی یہی ہے۔ عقیدہ کی تلاش کی راہ میں ہی جنت ہے۔ عقیدہ اور جنت دونوں مل کر مکمل ہوتے ہیں۔

سائنس بھی تو یہی کرتا ہے۔ سائنس داں مبہوت خاموشی میں منور سنگیت سنتا ہے۔ اس کے لیے سائنس حسن ہے، تخلیقی ذہانت کی معراج ہے۔ وہ مسلسل تلاش ہی تو ہے، تقلیل میں ارض کا سفر۔

ہم نے دیکھا، سائنس کا تصوف سے اختلاف نہیں ہے۔ جو اختلاف دکھائی دیتا ہے وہ اس لیے ہے کہ ہم نے اسے غارت گری کی طاقتوں اور صارف تہذیب سے جوڑ دیا ہے۔ اس لیے سائنس کی بے مثال کامیابیوں کے باوجود ہمارے دل خالی کے خالی ہیں۔ ہم نے 'لفظ' پر زور دیا۔ معنی ہم سے چھوٹ گیا تبھی تباہی ہوئی۔ ادیب لفظ نہیں معنی خلق کرتا ہے، وہ خود اعتقاد ہو کر بھی قدیم

کے اُس پار دیکھتا ہے۔ فلسفی اور سائنس داں کی طرح اس کی بنیاد بھی وہی سوالیہ اضطراب ہے۔ کلّیت کی تلاش میں سبھی ہیں، کلّیت کی چاہ ہے تو تفریق کیسی؟

ایک بات اور ہے۔ یہ جو مسلسل تلاش ہے۔ یہ کلّیت کے ساتھ خود نظم کی لازمیت پر بھی زور دیتا ہے۔

جو بڑا ادب ہے اس میں یہی کلّیت ہے، خود نظم ہے۔ سچ کی تلاش ہے۔ ہمارے اور آپ کے ذریعے تخلیق کیے گئے ادب سے کہیں زیادہ مشاہدہ ہے لوک ادب میں۔ جتنا اور جیسا سچ وہاں نمایاں ہوا ہے ویسا عظیم فلسفی بھی نہ کر سکے۔ وہاں علم ہے، لوک ادب میں تجربہ۔

وہ ایک لمحے کے لیے رُکی ایک انوکھے اعتماد کے ساتھ پھر بولی، یہ سب ہم نہ جانتے ہوں، ایسا نہیں ہے، لیکن ہمارا علم صرف لفظ تک محدود رہ گیا، معنی کی فکر ہم نے نہیں کی۔ اسی لیے ہمارا مسلسل زوال ہوتا گیا۔ ہم نے ماں کو سب سے اوپر مانا، سماج میں سب سے اوپر۔ الیشور کے سامنے یہ ہوا لفظ۔ لیکن عملی دنیا میں وہ بیوی پہلے ہے۔ مرد کی خادمہ، دوزخ کا دروازہ۔ رام بن جانے سے قبل جب ماں کے پاس اجازت لینے جاتے ہیں تب وہ رام سے سوال کرتی ہے ——

"سماج میں سب سے اوپر کون ہے؟"

رام کہتے ہیں 'ماں!'

'تو مَیں ماں تمھیں اجازت دیتی ہوں کہ تم بن مت جاؤ!'

رام کہتے ہیں —— 'سوچ لو ماں!'

کوشلیا پل بھر کے لیے رُکتی ہے اور پھر فوراً کہتی ہے 'تم بن جاؤ رام، کیونکہ تمھیں بن جانے کی جس نے اجازت دی ہے وہ میرا پتی پرمیشور ہے!'

تو پتی پرمیشور یعنی مرد عورت کا حقیقی مالک ہے۔ وہ زمین ہے، مرد کی جاگیر۔ الوس پریسلی کے الفاظ میں 'تتلی'، اور نطشے کے مطابق 'ایشور دوسری غلطی'۔

بہت سی مثالیں دے سکتی ہوں لیکن آپ سبھی جانتے ہیں، آج سماج میں عورت کی، آپ کی ماں کی کیا حالت ہے۔ اسے کسی نے بھی قریبی دوست کے طور پر کیوں نہیں پہچانا؟

یہ کیسی روحانیت ہے اور یہی کیوں سماج کے ایک اور حصے کو اچھوت قرار دے کر آپ نے

انسان کو انسان سے نفرت کرنا نہیں سکھایا گیا؟ ایک پورا سماج دلت، اچھوت۔ اپنے پیروں کی جوتی کی بھی آپ کیسی دیکھ بھال کرتے ہیں، لیکن اپنے ہی سماج کے گوشت پوست کے بنے انسانوں کا سایہ پڑنے پر آپ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ ان کی عورتوں پر آپ اپنا پیدائشی حق مانتے ہیں، یہ کیسی روحانیت ہے؟ یہ کیسا سچ سے سامنا ہے؟ یہ کیسی تلاش ہے مسلسل سچ کی...؟

وہ سب خاموش سن رہے تھے دور ممبئی سے آئی اس بینا کو جو آواز تو دے رہی تھی و بھا کی آواز میں، لگتا تھا جیسے خود جگدمبا (دیوی) اس کی زبان پر آ بیٹھی ہوں۔ اس کے دوردرشن کے اسکرین پر سے ہٹتے ہی سب کی نگاہ نم ہو کر یکساں ہو گئیں۔ کئی پل تک کوئی کچھ بول نہیں سکا۔ اس خوبصورت خاموشی کو انکت نے توڑا ـــ "پاپا بوا کتنی اچھی لگ رہی تھیں، ہے نا؟"

سمیتا نے اسے اپنے پاس کھینچتے ہوئے کہا "سچ بیٹے، تمھاری بوا بہت خوبصورت ہے، کیونکہ وہ سچ بولتی ہیں۔"

"ہاں دیدی! وہ سچ مچ ہی سچ بول رہی تھیں۔ اتنے بڑے سچ کو آپ کے بزرگ کیوں نہیں دیکھ سکے؟" پاس آتے ہوئے کرن نے پوچھا۔

اور اس نے میز پر تین پیالے کافی کے گرم گرم رکھ دیے۔ خود بھی بیٹھ گئی۔ بولی ـــ "سچ کو دیکھنے کے لیے جو ہمت چاہیے وہ ان میں نہیں تھی۔"

اجیت نے مسکرا کر کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جس سچ کی بات تم کر رہی ہو وہ اس نوجوان کا نہیں تھا۔ پھر بھی کسی نے سچ کو دیکھا نہ ہو، ایسا نہیں ہے، لیکن بے شمار وجوہات سے جس میں اقتدار کی خواہش سب سے اوپر ہے، یہ سچ بار بار ریت کی طرح ہاتھ سے پھسل پھسل گیا ہو۔ بڑی پیچیدہ تاریخ ہے سچ کی اور اس کے پھسلنے کی، لیکن اب..."

اسی لمحے ادھر فون کی گھنٹی بجی، ادھر کال بیل بھی بج اٹھی۔ فون پر ممبئی سے وجے تھا اور دروازے پر پتاجی۔

سمیتا نے فون اٹھایا۔ وجے بول رہا تھا "میں وجے ہوں، سمیتا دیدی ہیں؟"

بے پناہ خوشی سے سمیتا بولی "ارے وجے، میں سمیتا ہی ہوں۔ کیسے ہو؟ و بھا کہاں ہے؟"

وُہی تو بات کرنا چاہتی ہے، آپ نے اس کی مہان تقریر سُنی؟"
اپنے مزاج کے مطابق وجے نے مذاق کیا تھا۔ سمیتا ہنس دی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بولی" وبھا! ارے ابھی ہم تجھے دیکھ رہے تھے، سُن رہے تھے۔ بہت بہت مبارک۔ ہائے کتنا خوبصورت بولی تو"
وبھا نے خوش اور شائستہ آواز میں صرف اتنا ہی کہا" آپ ہی تو میری اس میدان میں اُستاد ہیں۔ لیکن بھابھی، اس وجے کو مبارکباد دیجیے نا۔ ہفتہ وار 'سُوربھ' کا آج ایڈیٹر تقرر ہوا ہے"
فون وجے کے ہاتھ میں تھا" ویدی، مبارکباد وبھا کو دو، روزنامہ 'جن مت' کی خصوصی نامہ نگار بن گئی ہے۔ اور ہاں تھوڑا ڈانٹ بھی دیجیے"
"بس، بس" وبھا نے فون چھین لیا" بھابھی، ڈانٹ تو وجے کو پڑنی چاہیے۔ میں کیوں رہوں اس کے ہفتہ وار میں؟ میں تو خوب گھومنا چاہتی ہوں"
سمیتا نے ہنستے ہوئے کسی طرح کہا" ارے بابا، تم دونوں کو ہم سب کا بہت بہت پیار۔ اس پیار کو ہی ڈانٹ بھی مان لینا۔ لو ذرا بیٹے سے بات کر لو۔ کب سے چھٹ پٹا رہا ہے"
انکت نے رسیور ہاتھ میں لیتے ہی کہا"بُوا، ہم نے آپ کو دیکھا، آپ سُندر لگ رہی تھیں"
وبھا کھلکھلا پڑی — " ارے انکت، تُو بمبئی آجا۔ اب تو میرا فلیٹ ہے۔ میں تجھے بھی ٹی۔ وی پر لے چلوں گی۔ تُو بھی بہت سُندر لگے گا"
تب تک پتا جی بھی آ گئے تھے۔ انھوں نے وبھا سے کہا" بہت اچھا لگا بیٹی۔ پڑوس میں سنا تجھے۔ سبھی نے تجھے مبارکباد دی"
وبھا بولی" ٹھیک ہی تو کیا انھوں نے۔ آپ کے مضامین ہی سے تو لیا سب کچھ۔ آپ کی بیٹی ہوں اور سمیتا بھابھی کی شاگردہ۔ میرا اپنا کیا ہے...."
انکت تو اتنا خوش تھا کہ فوراً دوڑ کر دوسرے کونے پر اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ بولا" تم نے میری بُوا کو ٹی۔ وی پر دیکھا؟"
" دیکھا، لیکن سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں"
اُس کی بُوا، یونیورسٹی میں ایم۔ اے کی طالبہ گایتری نے انکت کی طرف دیکھا" لیکن میں سمجھ رہی

تھی، وہ بہت سندر بول رہی تھیں اور بہت سچ بھی۔ وہ تمہاری بُوا ہیں؟"

"جی ہاں"

"تمہارے گھر آتی ہیں؟"

"جی ہاں"

"اب آئیں تو مجھے بتانا۔ میں ان سے ملوں گی اور انھیں اپنی یونیورسٹی میں بلاؤں گی"

انکت بہت خوش ہوا۔ ویسے ہی دوڑا دوڑا گھر آیا اور جو گایتری نے کہا تھا وہ ہانپتے ہانپتے سب کو بتایا۔

اُس دن اس گھر کے باغیچے کے سارے پھول مہک اُٹھے۔ رات کو اجیت کے پاس لیٹے لیٹے سمیتا کو لگا کہ گھنے اندھیرے میں ایک ٹمٹماتا دیپ بھی کیسا اُجالا کر دیتا ہے۔ سب کچھ روشن ہو جاتا ہے۔

اس نے پکارا "اجیت"

"ہوں" اجیت نے کہیں بہت دور سے کہا۔

"اُٹھو اجیت! اوپر چھت پر چلتے ہیں"

"اس وقت کیوں؟"

"تم سے باتیں کرنی ہیں"

اجیت ہنس پڑا "اتنے نوجوان نہیں رہے ہم بھی..."

"تو اتنے بوڑھے بھی نہیں ہوئے ہیں کہ آزاد آکاش کی چھاؤں سے ڈریں۔ تم مرد ہو"

اجیت نے ایک گہری نگاہ سمیتا پر ڈالی اور اُٹھ کھڑا ہوا "تم ساتھ ہیں ہو تو میں شیر کی ماند میں بھی جا سکتا ہوں"

اُٹھتے ہوئے سمیتا ہنس پڑی "میرے ساتھ، اکیلے کیوں نہیں؟"

"تم اکیلی نہیں جا سکتی تھیں اوپر؟"

سمیتا ایک دم چونک گئی۔ لیکن مسکرا کر بولی "یہی مسئلہ تو مجھے پریشان کر رہا۔ کہاں ہے اس کا حل؟ کیا یہ بھی ایک زندہ جاوید تلاش ہی نہیں ہے؟"

وہ اوپر آگئے تھے۔ اکتوبر کا آخری تھا اور تریودشی کا چاند تقریباً غروب ہونے والا تھا۔ فضا میں ایک خوشگوار مہک تھی جو موسم سرما کے آنے کا احساس دے رہی تھی۔ دونوں دیوار کے ساتھ بنے سیمنٹ کے دیوان پر آس پاس بیٹھ گئے۔ اجیت نے دھیرے سے کہا "کتنی پرسکون، کتنا مبہوت کر دینے والا لفظ کے بنا سنگیت..."

سمیتا نے ایک دم کہا "کویتا سننے کے لیے نہیں آئی ہوں۔"

"کہانی سناؤں — ایک تھی سمیتا۔"

"اوہ اجیت! سمیتا تھی نہیں، ہے، مسٹی اِز دیر پُری ہیر۔"

"تو۔"

دو پل کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔ سمیتا سوچ رہی تھی، کہاں سے شروع کرے؟ پھر اچانک بولی "اجیت! ودھا کا بھاشن سنا ہم نے، مسرور ہوئے۔ سچ کی چمک تھی اس میں جو کبھی کبھی غصہ میں بدل جاتی تھی، پھر بھی میں مطمئن ہوں۔ ودھا نے ایک راہ چن لی ہے اور وہ اس پر چل سکتی ہے۔ میں جانتی ہوں وہ وجے سے ابھی شادی نہیں کرے گی، لیکن ایک دوسرے کا ساتھ بھی نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن..."

"تم کہنا چاہتی ہو۔ ورنکا جی اور نارائن کی طرح بنا شادی کی رسم پوری کیے ساتھ ساتھ رہیں گے؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ شادی کرتے ہیں یا نہیں کرتے، یہ بات ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتی۔"

"تو کیا بات اہمیت رکھتی ہے؟"

"عورت مرد کے رشتے اور اولاد کے لیے ماں کی مقناطیسی کشش..."

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم اتنے نادان نہیں ہو اجیت، کہ میری بات نہ سمجھ سکو۔"

"یہ کیوں بھولتی ہو سمی! نادان بن کر زیادہ سیکھا جا سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہارے اندر کے کرب کو، لیکن اپنے مَن کو کھول دو نا ایک بار، شاید..."

"اجیت" سمیتا نے بات کاٹ دی "واقعی میں ایک اذیت میں مبتلا ہوں۔ باہر سے جو ایک عورت چاہ سکتی ہے وہ سب میرے پاس ہے۔ تم ہو میرے بہت ہی اپنے۔ پتا کی طرح جنھوں نے پیار دیا ویسے سسر ہیں۔ وبھا جیسی نند ہے، کیا سے کیا ہو گئی۔ درد سہنے کے عذاب نے اسے کندن بنا دیا۔ مجھے اپنا استاد مانتی ہے۔ ورتکا جی جی اور نارائن بھائی صاحب کے لیے کیا کہوں؟ کن الفاظ کا استعمال کروں ؟ یہ شاہدہ، یہ کرن اور وہ تمھاری شیا ملا — سب مجھ سے جڑے ہیں جیسے آسمان کے تارے جڑے ہیں۔ کیسی ہے یہ انوکھی جاذبیت، پھر بھی..."

اس نے ایک بار اوپر کی شفاف تاریکی کو چھیدتے تاروں بھرے آکاش کو دیکھا اور اپنی آواز میں بے ساختہ پختگی بھرتے ہوئے بولی — "پھر بھی میں بے چین ہوں، غیر ساکن ہوں، وہ چاہتی ہوں جو شاید کبھی نہیں ملے گا۔ تم نے من کھولنے کو کہا ہے۔ میں جانتی ہوں، تم مجھے غلط نہیں سمجھو گے یقین کرو، میں نے تم سے شادی ہی نہیں کی۔ پیار بھی کیا ہے۔ میں آج اپنے ایک گناہ کا اقرار کر رہی ہوں تمھارے سامنے۔ نہیں نہیں، دو گناہ..."

اجیت ایک لمحے کے لیے تو کانپ سا گیا، لیکن دوسرے ہی لمحے دھیرے سے کہا "تم کبھی گناہ نہیں کر سکتیں۔"

"سنو تو — امریکہ جانے سے پہلے جب نارائن بھائی صاحب یہاں آئے تھے تو بہت بے چین تھے۔ اتنے بے چین تھے کہ اپنے جانے پہچانے نارائن بھائی صاحب کو ڈھونڈ ہی نہیں پا رہی تھی ان میں۔"

"اس بے چینی کی کوئی وجہ تھی ؟"

"ہاں وجہ تھی۔ وہ تھا درد ن۔ وردن کو لے کر ورتکا جی جی وہ نہیں رہ گئی ہیں جو پہلے تھیں۔ نارائن بھائی صاحب نے بتایا تھا کہ ان میں اولاد کی خواہش مسلسل حاوی ہوتی جا رہی تھی۔"

طویل سانس لے کر اجیت نے جیسے خود سے کہا ہو "یہ تو قدرت کا دستور ہے۔"

"سنو تو۔ دستور نے اپنا کام کیا۔ جی جی ماں بنیں اور اس کے بعد جو ہوا وہ بھی تو قانونِ قدرت ہے۔ ماں کی اپنی ذات کے لیے اتنی عمادی کردہ سب ثانوی ہو رہے۔ وہ ہر لمحے نارائن

سے وروِن کی بات کرتی ۔ خط لکھتی تو اس میں وروِن چھایا رہتا ۔ مجھے جو خط انھوں نے لکھے ہیں، ایک بار پھر پڑھنا، کیا کیا نہیں لکھا — کیسی کیسی کلکاریاں مارتا ہے ۔ مجھے دیکھ کر ایسے ہاتھ پاؤں پھینکتا ہے اُٹھانے کو۔ میں نہیں اٹھاتی تو رو پڑتا ہے، اُٹھا لیتی ہوں تو ٹھمک ٹھمک کر ہنستا ہے ... کبھی لکھتی ہیں — حضرت جاگ گئے ہیں اور آسمان کو پکڑنے کو مچل رہے ہیں ... ذرا بھی تو کام نہیں کرنے دیتا ۔ کہتے ہیں اس عمر میں بچے بہت سوتے ہیں، لیکن وروِن ہے کہ نہ سوتا ہے نہ سونے دیتا ہے ... سچ بھابھی، جب بھی اُٹھا کر بھینچتی ہوں تو لگتا ہے تینوں لوک میری گود میں ہے ... بھابھی! ایسا لگتا ہے جیسے اس سنسار میں بس ہم دو ہی ہیں، میں اور میرا وروِن ... نارائن بس ہنستے ہیں لیکن بھابھی! اس ہنسی میں پانے سے زیادہ کچھ کھونے کا احساس ہے۔

''اس بات کو اس دن میں نے اتنی شدت سے محسوس کی کہ باتیں کرتے کرتے اپنے تاثرات کو چھپانے کی بے پناہ کوشش میں اوگھڑ دانی نارائن بھائی صاحب میرے پاس آئے اور میں جب تک کچھ سمجھوں تب تک انھوں نے مجھے اپنی باہوں میں سمیٹا اور ماتھے پر ایک بوسہ جڑ دیا۔ اُن کے ہم آغوشی میں میں جیسے پس گئی ۔ وہ کہہ رہے تھے ''ساری بھابھی! میں ٹوٹ گیا ہوں' کیوں، کیوں ...؟ کاش، تم میری بیوی ہوتیں، تم مہان ہو ...''

''میں حیران پہلے تو ان بوجھ پریشان سوچوں، سوچوں کہ نارائن بھائی صاحب رو پڑے بہت دھیرے دھیرے ۔ مرد بھی اتنے آہستہ سے رو لیتے ہیں، درد کے سمندر میں تیرتے ہوئے۔

''یکبارگی انھوں نے اپنے کو سنبھال لیا، میں معافی چاہتا ہوں بھابھی جی، واقعی میں نے اپنے آپ کو کھو دیا تھا ۔ میں کتنا بے وقوف ہوں ...

''تعجب، میں اپنی کرسی سے اُٹھی، ان کے پاس گئی اور جنیندر کمار کے ناول 'ڈ شارک' کی رنجنا کی طرح ان کی کمر سہلانے لگی ۔ کندھوں کو دبایا ۔ وہ مشینی انداز میں بیٹھے رہے سارا وقت اور میں سہلاتی رہی ۔ سر دباتی رہی، کندھے، کمر ...

''تبھی کرن آگئی ۔ دیکھ لیا بولی سر میں درد ہو رہا ہے، لائیے میں دبا دیتی ہوں ...''

''اجیت! سچ مانو کیسی بے بسی اُبھر آئی تھی اُن کے اس چہرے پر جس پر کبھی الھڑ ہنسی کے سوا میں نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا ۔ اُس الھڑ پن کے پیچھے یہ کون سا پیاسا نارائن چھپا رہتا تھا؟''

اجیت سمیتا کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "تم اسے گناہ کا نام دو گی؟"

"نہیں اجیت! گناہ یہ نہیں ہے۔ گناہ اس کے بعد ہوا۔"

"کیا؟"

"میں نے یہ بات تمھیں کبھی کیوں نہیں بتائی؟ کیوں... اس لیے ناکہ میں ڈر گئی تھی کہ شاید تم..."

"اس حادثہ کے بعد کی کہانی یاد کرکے؟"

"شاید۔"

"شاید نہیں سمیتا! سچ یہی ہے۔ ہم سنسکاروں کے غلام ہیں۔ سنسکار اس ظالم کی طرح ہے جو راجکماری کو ہمیشہ اپنے قلعے میں بند رکھتا ہے۔ تمھیں لگا کہیں میں تمھیں غلط نہ سمجھ لوں۔"

"خوف کی کوئی واضح شکل میں نہیں بتا سکتی۔ لیکن وہ تھا ضرور۔ لیکن اب کچھ نہیں ہے۔ اب میں آزاد ہوں۔"

"اچھا راجکماری جی، اب دوسرے پاپ کی بات بھی کہہ ڈالو۔"

"وہ... وہ تو اجیت! واقعی پاپ ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن اجیت جب کر چکی تو مجھے ایک ایسے راز کا پتہ لگا۔ احساس اس کا مجھے تھا، لیکن اس دن اس نے مجھے نئی روشنی دی..."

"تب بھی تم اسے پاپ کہو گی؟"

"کسی کی ذاتی ڈائری چھپ کر پڑھنا کیا پاپ نہیں ہے؟"

"کس کی ڈائری پڑھی تم نے؟"

"پتا جی کی۔"

اجیت پر ایک لمحہ کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ جیسے ذہن میں طوفان بھر گیا ہو۔ پھر دھیرے دھیرے بولا "ہاں، ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ واقعی پاپ ہے۔ لیکن اس میں وہ راز...؟"

"ہاں اجیت! پتا جی نے اپنے آپ کو بے نقاب کر دیا ہے اپنی ڈائری میں۔ انھوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے — شہوت مجھے اب بھی پریشان کرتی ہے۔ ڈھیلا تو جسم ہوا ہے من نہیں اور

شہوت جسم میں نہیں رہتی، من میں رہتی ہے اور من تو کبھی بوڑھا ہوتا نہیں۔۔۔ مجھے بھی لگتا ہے، اس عمر میں بھی کہ کوئی ہو، میرے پاس بیٹھے، میرے کندھے پر اپنا سر رکھے، میرے جسم کو سہلائے۔ لمس کے احساس کو کیا کوئی لفظ دے سکا ہے؟"

یکبارگی محبت سے اجیت نے سمیتا کے کندھوں کو بانہوں میں گھیر لیا۔

"اوہ اجیت۔۔۔"

"سمیتا!۔۔۔ بولو، آگے بولو؟"

"سمجھ نہیں سکوگے اپنے آپ۔۔۔"

کئی پل، صدیوں جتنے وہ لمحے۔۔۔ تب پھر سمیتا بولی "ایک اور دن لکھا انھوں نے ــــ میں ذہین آدمی ہوں، غور و فکر کیا ہے میں نے۔ میرے چاروں طرف میری اولاد ہے۔ میں اپنے آپ کو شانت کر سکتا ہوں، حالانکہ وہ یوگ کی ریاضت جیسا مشکل ہے۔ ریاضت کرتا ہوں، لیکن کیا من میں شہوت کا رہنا ہی۔۔۔؟ پاپ میں اسے نہیں کہوں گا، کیونکہ یہ فطرت ہے، لیکن وہ بھی تو سچ ہے کہ من میں شہوت کے رہنے پر بھی ہم اس عمر میں نہیں پہنچ سکتے جس میں ہم جوانی میں رہتے ہیں۔ بالغ عمر میں بھی اس کا اثر رہتا ہے، لیکن اس ڈھیلے جسم کے ساتھ تب اس کا ریاض کرنا ہی ہوگا۔ نہیں تو۔۔۔"

"کسی عورت کی چرچا کی انھوں نے؟"

"کئی عورتوں کا تذکرہ کیا ہے انھوں نے، لیکن کوئی انھیں بے چین نہیں کر سکی۔ بس ایک عورت نے انھیں ہلا دیا۔ وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھی لیکن شوہر اسے 'بس ایک چیز' مانتے تھے۔ پیار کے لیے ترستی وہ تشنہ روح بس اسی آسودگی کے لیے بھٹکتی تھی۔ جسم کی بھوک اسے اتنی نہیں تھی۔ تعجب یہ کہ وہ شوہر کی بے عزتی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پتا جی نے لکھا ہے 'میں اپنی بیوی سے فریب نہیں کر سکتا۔ وہ دیوی ہے، میں نے اس عورت کا بیوی سے تعارف کرا دیا۔ وہ کبھی کبھی گھر آتی تھی۔ شاید اس نے میرے اس انداز کو بھانپ لیا۔ تعارف بنا رہا، لیکن وہ رشتہ نہیں بنا!' یہ سب پڑھ کر مجھے پھر 'درشاک' کی یاد آئی؟"

کئی لمحے پھر خاموشی چھائی رہی دونوں کے درمیان۔ جیسے ڈوبتی چندر کلا سے کچھ پوچھتے ہوں۔

ایک لمحے بعد یکبارگی سیمنتا نے پوچھا "تم اس عورت کو جانتے ہو؟"

"کچھ کچھ۔"

"ابھی ہے؟"

"ہاں!"

"مجھ سے ملاؤ گے؟"

"یہ خواہش کیوں؟ چھپا رہنے دو اس راز کو۔ سکون سے جینے دو اس شوہر کی محبت سے محروم کو۔"

"ہاں اجیت، تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے نہیں ملنا چاہیے اس سے۔ لیکن اس سچ کو ہم قبول کیوں نہیں کر لیتے؟"

"کس سچ کو؟"

"کہ شہوت کبھی مرتی نہیں۔"

"وہی، وہی تو اہم سوال ہے۔ ایک ہی بدھشٹر پیدا ہوا تھا جو یکش کے سوالوں کا جواب دے سکا تھا 'مہابھارت' میں۔"

"لیکن دراصل جو یکش سوال دروپدی نے پوچھا تھا اس کا جواب تو وہ دھرم دھرندھر بھی نہیں دے سکا تھا۔ بڑا چھلیا ہے یہ سچ۔"

"تبھی تو مہابھارت ہوا۔ ابھی بھی ہو رہا ہے۔ ہر یگ کا سچ اسی طرح چھل کرتا ہے۔"

"اسے روکا نہیں جا سکتا؟"

"کرشن نے روکنا چاہا تھا اس یگ میں، لیکن کیا روک سکے؟ پوری آریہ تہذیب میں ایک ہی تو نادر مرد تھا جو واقعی عورت کا دوست تھا۔ وہ بھی ناکام ہو کر مرے۔"

پھر ہنستے ہوئے کہا "وہی کام کرنے کی کوشش چل رہی ہے تمھارے اردو بھاگ کے اندر۔ دیکھتے ہیں کتنی کامیابی ملتی ہے تمھیں۔ لیکن چلو نیچے چلو۔ ساری رات جاگتی رہی ہو، کچھ سو لو۔"

"ٹھہرو اجیت! آج دل میں بہت کچھ ہے کہنے کے لیے۔ کیا یہ مسئلہ صرف پیسے اور پیار کا ہے؟ مارکس پیسے کی طاقت کو سب سے اوپر مانتے ہیں۔ جینندر کہتے ہیں، پیسے سے نجات چاہیے۔"

" مجھے لگتا ہے، نجات موہ سے چاہیے۔ کسی کے لیے اضافی لالچ نقصان دہ ہے۔ جبران جب کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کا پیالہ بھرو، ایک دوسرے کے پیالے سے نہ پیو مت، تب ان کا بھی یہی مطلب ہے۔"

" ہاں شاید یہ اضافی لگاؤ ہی تباہ کن ہے۔ لازمی طور پر ہم کچھ نہیں کہہ سکتے' درشاک' میں ایک جگہ پر مصنّف لکھتا ہے — 'مرد، پیسہ، بازار، مقابلہ اور تشدّد کی علامت ہے اور عورت، پیار، سکون، ایثار اور گھر کی'۔"

" میں نہیں مانتا۔ یہ ادھوری ملاقات ہے۔ عورت ہی کیوں گھر سے بندھے، قربانی دے، پیار کی مورت ہے؟ مرد کیوں نہیں؟"

" مانتی تو میں بھی نہیں، لیکن ادھر اولاد کے لیے ماں کی ممتا' اضافی ممتا کا منظر میں نے درِنکا جی میں دیکھا۔ اپنی بھی مجھے یاد ہے۔ تب مجھے لگتا ہے کہ اس اضافی لگاؤ کے ساتھ گھر جڑا ہے۔ اور اجیت، جب عورت ماں بن جاتی ہے تو شوہر مرد کے لیے اس کی کشش کم ہونے لگتی ہے۔ بس تجارتی جاذبیت برقرار رہتی ہے، تبھی مرد بھٹکتا ہے، پر تشدد بنتا ہے۔

" اور اجیت، پتاجی کی ڈائری پڑھ کر میرا یہ یقین بھی پکّا ہو گیا کہ مرد کے من میں عورت کی چاہ پاپ نہیں ہے۔ دونوں میں ایک سیدھی کشش ہے۔ اسے انھوں نے مزید کشش نام دیا ہے۔ بکھتروں کو یہ مزید جاذبیت باندھے ہے، نہیں تو کائنات بچے گی کہاں؟"

" لیکن عورت مرد کو یہ مزید جاذبیت کیوں نہیں باندھ پاتا؟"

" کیونکہ وہاں غیر توازن ہونے سے مزید کشش نہیں رہ جاتی۔ مرد اس کے لیے قصوروار عورت کو مانتا ہے، کیونکہ وہ پیسے کی حکومت کا مالک ہے۔ ملکیت کا یہ جذبہ ٹوٹے تو توازن بن سکتا ہے۔ کوئی کہیں محدود نہ ہو۔ مرد کو عورت کی خوبی چاہیے تو عورت کو پیسہ بھی۔ وہ اگر سکون، محبت اور ایثار کی علامت ہے تو پیسہ بھی اس کا لمس پاکر صرف تشدّد کی علامت نہیں رہے گا۔"

" ہاں، رہنا تو نہیں چاہیے، سچی۔ تم تو واقعی اس مسئلے کو لے کر کافی گہرائی تک اُتری ہو۔ مجھے ایک پوران سے متعلق ایک علامت کی یاد آرہی ہے۔ سوال صرف پیسے کا نہیں ہے اقتدار کا ہے، اقتدار کی مختلف شکلیں ہیں۔"

"تم اِس سوال کو کس علامت سے جوڑ رہے ہو؟"

"شیش شائی وشنو اور لکشمی سے"

"کیسے؟"

"بہت واضح ہے۔ ہزاروں پھن ہیں شیش ناگ کے۔ وہ حکومت کی علامت ہے۔ وشنو اُسی کو قبضے میں کر کے اس پر سوتے ہیں یعنی حکومت کی سبھی شکلوں کو قبضے میں کر لیا ہے انھوں نے اور جو حکومت میں سب سے اہم ہے پیسہ یعنی لکشمی، وہ ان کے چرن دباتی ہے۔ ان کی داسی ہے۔ جب سب اپنی اپنی جگہ پر آجاتے ہیں تو وشنو کی نابھ سے پیدا کمل پر بیٹھے برہما کائنات کی تخلیق کرتے ہیں۔"

"یعنی یہ علامت ثابت کرتا ہے کہ حکومت کیسی بھی ہو، انسان کے قبضے میں ہے، اس کی ملک نہیں ہے۔"

"ہاں کیا یہی سچ نہیں ہے؟ آج حکومت اپنے سبھی شکلوں میں سماج پر حاوی ہے۔ اس نے انسان کو اپنا غلام بنا لیا ہے۔ اس سے نجات پالیں گے تو سب کچھ اپنے مقام پر آجائے گا۔"

"لیکن اقتدار سے نجات کیسے ملے گی؟"

"اقتدار سے نجات نہیں، اقتدار کی غلامی سے نجات۔ اقتدار سے نجات کا مطلب اقتدار سے انکار نہیں ہے، اس کو انسان کی خدمت میں لگانا ہے، مالک نہیں بننا ہے۔"

"تمھاری بات کچھ پیچیدہ تو ہے لیکن جوہر ہے اُس میں۔ لیکن یکش سوال ابھی بھی باقی ہے۔"

"سوال تو باقی ہے، لیکن اُس کے حل کی طرف کچھ قدم تو چلے ہی ہم۔ لیکن اب چلو اٹھو..."

"اُٹھتی ہوں..."

وہ اُٹھتی ہے لیکن تب تک اجیت سیڑھیوں تک پہنچ چکے ہیں۔ سمیتا نے کہا "بھاگو نہیں، اجیت۔ میں آرہی ہوں۔"

اجیت نے وہیں سے جواب دیا "مندر کی چھت کو اُٹھانے والے کھمبے ایک دوسرے کا سہارا نہیں لیتے۔"

اُس رات کے بعد سمیتا کی مصروفیت کا ٹھکانا نہیں رہا۔ بار بار اجیت سے کہتی "اجیت پلیز، انکت کے ٹسٹ سر پر ہیں۔ وہ پریشان ہے، اُسے دیکھ لونا!"

"اور اجیت! وہ شاہدہ آئی تھی۔ اسے پاسپورٹ بنوانا ہے۔ تمھارے وہ دوست ہیں نا محکمۂ خارجہ میں۔ اُن سے کہہ کر اس کا کام کروا دو۔"

"کیوں؟ رشوناتھ کے پاس جانا چاہتی ہے کیا؟"

"جاتی ہے تو حرج کیا ہے؟ یہاں کی قید سے اُسے آزادی ملے گی!"

"قید کی بھی مختلف شکلیں ہیں۔ وہاں بھی قید ہے!"

"لیکن وہاں رشوناتھ بھی ہے، یہ کیوں بھولتے ہو؟"

اجیت ہنس پڑا۔ سمیتا بولی "کیوں، اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"یہی کہ آدم کے بغیر حوّا کا نجات نہیں!"

"جیسے آدم تو آزاد مرد ہیں!"

"تھا بے چارہ۔ حوّا نے سیب کھلا کر اُسے دھرتی کا آدمی بنا دیا..."

اور تب وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔

پھر سمیتا کہتی "اجیت، تم جانتے ہو، پتاجی کا امریکہ جانا طے ہے۔ انھیں کیا کیا چاہیے' یہ دیکھ لیا تم نے۔ تین ہفتے ہی تو رہ گئے ہیں۔ اور سنو، اِن دنوں یہاں بہت بھیڑ رہے گی۔ وبھا، وجے، ورنیکا، ورون سبھی آ رہے ہیں۔ راج کلی کا خط بھی آیا ہے۔ وہ بھی آنا چاہتی ہے۔ پتاجی کے نیازمند، مداح دوست ویسے ہی آتے رہتے ہیں تب تو... تم نے سوچا کچھ؟ سوچتی ہوں، میگھا کو بھی بلا لوں، کچھ دن میرے ساتھ رہ لے گی!"

"جب تم اتنا سوچ لیتی ہو تو میرے لیے باقی ہی کیا ہے؟"

"باقی ہے، تمھارے لیے بھی بچا ہے ایک مسئلہ — تمھاری شیالا کا پھر خط آیا ہے۔ ابھاگن نہ جانے کس نکشتر کی سایہ میں جنمی تھی، دُکھ ہی دُکھ ہیں اس کی قسمت میں۔ یہ تیسرا شوہر بھی نکھٹو ہے۔ خود تو کچھ کرتا نہیں، آسے ہی کہتا ہے — میں نے تیری گلو خلاصی کر دی۔ ایک بیٹا بھی دے دیا، اب تو کما اور کھا...! کیسے بے رحم ہوتے ہیں مرد!"

''اور کیسی معصوم ہوتی ہیں یہ عورتیں؟''

'' اجیت، اوروں کا تو مجھے نہیں معلوم۔ تم ہی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے پھرتے ہو سو تم جانو۔ لیکن یہ شیا لا معصوم ہے، بے وقوفی کی حد تک معصوم۔ اپنے پیروں پر خود اس نے کلہاڑی ماری۔ راشٹر کوی نے شاید ایسی ہی عورتوں کے لیے لکھا ہے ـــــ

' ابلا جیون ہائے تمہاری یہی کہانی
آنچل میں ہے دودھ اور آنکھوں میں پانی'

اور پرساد نے کن عورتوں کے بارے میں لکھا ہے ـــــ

' ناری تم کیوں شردھا ہو وشواس رجت نگ پگ میں
پیوش سروت سے بہا کرو جیون کے سندر سمتل میں'

کچھ بھی یہ ہو یہ کوی ان سے تو زیادہ ترقی پسند ہیں جنھوں نے ـــــ ' نر کسیہ دوارم ناری' یا لیکھنی پستکا ناری پر ہستے گتا گتا' یا ' استرش چرترم پورو شسیہ بھاگیم دیو دن جانا تی کو منشیاہ '۔''

پھر اچانک سمیتا ہنس پڑی '' ہم بھی کیا کم بے وقوف ہیں۔ اپنے مسائل کا ذکر کرتے کویوں اور فلسفیوں کے جال میں جا پھنسے۔''

'' یہی تو سچے مورخ ہیں اپنے وقت کے، لیکن خیر تم فکر نہ کرو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

تب وہ دونوں میز پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ رات کے علاوہ یہی کچھ لمحے تنہائی میں گھر گرہستی کی باتیں کرنے کے لیے ملتے تھے۔ کرن برتن اٹھانے آئی تو سمیتا چونک اٹھی '' اجیت لو میں تو بھول ہی گئی تھی، کرن کے مقدمے کا فیصلہ بھی تو پرسوں سنایا جائے گا۔''

کرن نے سن لیا '' دیدی، آپ فکر نہ کرو۔ وہ چھوٹ بھی گئے تو میں نہیں چھوڑوں گی انھیں۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اٹھ گئے۔ اجیت نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔

تیسرا دن بھی آگیا۔

عدالت کے کمرے میں اس دن کافی بھیڑ تھی۔ کرن کے سارے رشتہ دار آئے تھے۔ اجیت

اور سمیتا تو تھے ہی۔ دونوں طرف کے وکیلوں کے علاوہ کچھ اور وکیل بھی تھے۔ ناری کلیان سمیتی کی صدر اپنے گروپ کے ساتھ موجود تھیں، میگھا، شاہدہ کے غیر حاضر رہنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

مقرّرہ وقت پر جج صاحب آئے۔ سبھی حاضرین نے اُٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ دو منٹ بعد اپنے چالیس صفحات کے فیصلے کا آخری حصّہ پڑھتے ہوئے انھوں نے کہا "اس طرح واضح اور غیر واضح ثبوت کی بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ تینوں ملزموں نے جان بوجھ کر مدعی کماری کرن کے ساتھ بلاتکار کرنے کی سازش رچی اور اس کی مرضی کے خلاف اسے دھوکے سے باندھ کر اس کے ساتھ من مانی کی۔ تین میں سے دو نے تو اپنا جرم تبھی قبول کر لیا تھا، تیسرے ملزم کو مدعیہ کماری کرن نے بڑی ہمت اور دلیری کے ساتھ پکڑوانے کا جال پھیلایا اور اس میں کامیاب ہوئی۔ عدالت اس کی سوجھ بوجھ اور اس کے ہمت کی تعریف کرتی ہے۔ پولس نے اس پر تیسرے ملزم کو زخمی کرنے کا الزام لگایا ہے۔ عدالت کی رائے ہے اگر وہ ایسا نہ کرتی تو شاید تیسرا ملزم پکڑا نہ جاتا۔ اس لیے عدالت کماری کرن کو اس الزام سے باعزت بری کرتی ہے اور ملزم کو پکڑوانے میں مدد کرنے کے لیے اس کی تعریف کرتی ہے اور عدالت شریمتی ڈاکٹر سمیتا کمار اور اُن کے خاندان کی بھی تعریف کرتی ہے جنھوں نے کماری کرن کو اخلاقی اور معاشی تعاون دے کر ایک آدرش قائم کیا ہے۔

"عدالت تینوں ملزموں کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۷۶ کے تحت ملزم پاتی ہے تیسرے ملزم نے عدالت کو کافی پریشان کیا۔ کماری کرن ہمت نہ دکھاتی تو وہ خطرناک ملزم پکڑا بھی نہ جاتا۔ ساری باتوں پر غور کر کے عدالت اُسے دس سال کی سخت سزا سناتی ہے اور دس ہزار روپے جرمانہ بھی کرتی ہے جو وصول ہونے پر کماری کرن کو دے دیا جائے۔ نہ وصول ہو سکا تو ملزم تین سال اور جیل میں رہے گا۔

"باقی دو ملزموں نے چونکہ فوراً اپنا جرم قبول کر لیا ہے اس لیے پانچ پانچ سال کی سخت سزا دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن پر ایک ایک ہزار روپیہ کا جرمانہ بھی کیا جاتا ہے۔ وصول ہونے پر وہ مدعیہ کماری کرن کو دیا جائے گا۔ وصول نہیں ہو سکا تو ملزمان کو دو دو ماہ اور جیل میں رہنا ہوگا۔"

اگلے دن سارے اخباروں نے اس فیصلے کو سرخیوں میں شائع کیا۔ کرن کی تعریف کرتے ہوئے ایک نامہ نگار نے تو یہاں تک لکھا ــــ

"کرن اس ذات کی لڑکی ہے جسے ہندو سماج نے ہمیشہ دُتکارا ہے، نفرت کی ہے، اپنا میلا سر پر اُٹھانے کے لیے مجبور کیا ہے۔ ساری ترقی کے باوجود آج بھی ہندوستان کے ایک بڑے حصّے میں یہی صورت حال ہے۔ کتنے گھر ہیں ہندو سماج میں جہاں ادیب مہندر مینک کے خاندان کی طرح اس ذات کی عورت باورچی خانہ کی مالکن ہے۔ کرن اس گھر کے ایک اہم ممبر کے روپ میں رہتی ہے اور کرن ہی نہیں شاعرہ شاہدہ انجم کا بھی یہاں وہی مقام ہے۔ ایک آدی واسی گھرانہ بھی ان سے جُڑا ہوا ہے۔ کیرل کی ایک بے سہارا عورت کا بھی یہ گھرانہ سہارا ہے۔

"کیا آج کی گہری تاریکی میں ایسے خاندان روشنی کے ایک مینار کا کام نہیں کرتے؟ کیا ایسے بے شمار خاندان نہیں ہونے چاہییے اس ملک میں؟ قاری بھولے نہیں ہوں گے یہ وہی ڈاکٹر سمیتا کمار ہیں جنھوں نے اپنے مضمون میں بڑی دلیری کے ساتھ اعتراف کیا تھا کہ میں وہی سمیتا ہوں جس نے اپنے ساتھ بلاتکار ہونے دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا، بلاتکار سے نسائیت کہیں بڑی ہے..."

جیسا کہ ہو سکتا تھا ٹی۔وی سے پوری رپورٹ کے ساتھ ان کی تصویریں بھی ٹیلی کاسٹ ہوئیں۔ ریڈیو پر بھی سب سے ان کی ملاقات نشر کی گئی۔ ٹی۔وی پر کرن سے بات کرنے والی خاتون نے ایک سوال پوچھا "جب جج صاحب اپنا فیصلہ پڑھ کر سنا رہے تھے تب آپ اچانک اُٹھی تھیں، لیکن ڈاکٹر سمیتا نے آپ کو اپنے پاس بٹھا لیا تھا ــ آپ کچھ کہنا چاہتی تھیں کیا؟"

"جی ہاں، میں جج صاحب سے کہنا چاہتی تھی کہ جرمانہ وصول ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، مجھے ان کا پیسہ نہیں چاہیے جنھوں نے میرے ساتھ بلاتکار کیا۔ اور یہ میں نے انھیں لکھ کر دے دیا ہے۔"

"آپ سمیتا جی کے گھر میں ایک فرد کے طور پر رہتی ہیں، کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ آپ کسی چھوٹی ذات سے آئی ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ میں کبھی کوئی احساس کمتری کا جذبہ نہیں اُبھرتا؟"

"بالکل نہیں۔ میں نے جس ذات میں جنم لیا میں اس سے انحراف نہیں کرنا چاہتی۔ اُسی ــــ

کی رہ کر اُسے عزت دینا چاہتی ہوں"۔

"شکریہ، بہت اچھا لگا آپ سے بات کر کے"۔

"مجھے بھی اچھا لگا، مَن کی بات کہہ کر۔ نمستے"۔

اور تب اس نے مسکرا کر ایسے ہاتھ جوڑے جیسے وہ خاندان، ذات، نسل سب سے اوپر واقعی ایک عورت ہے۔

سمیتا کو کئی دن تک ہوش نہیں آیا۔ میگھا پہلے ہی آگئی تھی۔ شاہدہ از ممکن وہیں رہتی انھوں نے سنبھال لیا، نہیں تو نامہ نگاروں، دوستوں، کالج اور یونیورسٹی کے دوستوں کے فون سُنتے سُنتے، مہمانوں سے باتیں کرتے کرتے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ بے چارہ انکت تو سمجھ ہی نہیں پاتا تھا کہ اپنی خوشی کو کس کے ساتھ بانٹے۔ اخباروں میں اس کی تصویر بھی چھپی تھی۔ ٹی۔وی پر بھی اس کے دوستوں نے اسے دیکھا تھا۔ شاہدہ چائے پلاتے ہوئے مذاق کرتی "بھابھی، نیتا بنی ہو، قیمت تو چکانی ہی ہوگی۔ اور تو اور میں بھی پار ہوگئی تمھارے ساتھ۔ ایک نے تو میری غزل بھی چھاپ دی"۔

دیر رات جب وہ پلنگ پر لیٹی تو اس نے اجیت سے کہا "اجیت چلو کہیں بھاگ چلیں، نہیں تو میں مر جاؤں گی"۔

"سمی! شہرت میں ایک چبھن ہوتی ہے۔ اسے سہنا ہی ہوگا۔ لیکن عوام کی یادداشت وقتی ہوتی ہے۔ دو چار دن میں سب بھول جائیں گے"۔

ایک لمحے کے لیے رک کر اُس نے پوچھا "اچھا ایک بات بتاؤ، تمھیں اچھا نہیں لگتا؟"

سمیتا نے مڑ کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا، مسکرائی "نٹ کھٹ کہیں کے"۔

"سو جاؤ اب"۔

اور وہ تب تک اس کا سر دباتا رہا جب تک وہ گہری نیند میں نہیں چلی گئی۔ وہ واقعی تھک گئی تھی۔ انکت کو بھی بالآخر ساتھی مل گیا۔ وہ میگھا بوا کے کمرے میں سویا۔ اس کی چھوٹی سی خوبصورت سی بٹیا تھی، وہ اس کے ساتھ کھیلتا اور اُسے ساری خبریں سُناتا رہا۔ بیچ بیچ میں پوچھ لیتا "کیوں بوا، یہ پرچا سمجھ لیتی ہے میری بات؟"

"سمجھ تو لیتی ہے لیکن ابھی جواب نہیں دے سکتی۔"

"تبھی یہ چپ مسکراتی رہتی ہے آپ کی طرح۔"

میگھا اُس پل زندگی میں شاید پہلی بار کھُل کر ہنسی۔ اور اسی لمحے اس کے من میں وہ حادثہ کوندھ گیا جب وہ سب چائے کی میز پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ یکبارگی شاہدہ نے کہا تھا "بھابھی، تمھاری شکل میری بھابھی سے بہت ملتی ہے۔"

دھک سے رہ گئی تھی وہ یہ سُن کر اور اسے لگا تھا جیسے کوئی پکار کر کہہ رہا ہو تم مسلمان ہو۔

"مسلمان کیوں، میں جمادارن بھی تو ہو سکتی ہوں۔ عیسائی، ہندو، سکھ کچھ بھی ہو سکتی ہوں۔ لیکن کیا مطلب ہے اس ہونے کا؟ کیا اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ میں انسان ہوں؟" اور حیران کرتے ہوئے اس نے شاہدہ کو تقریباً سختی سے جواب دیا تھا "میں، میں ہوں، اس سے زیادہ میں اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتی، جاننا بھی نہیں چاہتی۔"

شاہدہ کے چہرے پر سیاہی پُت گئی تھی، کِرن حیران ہو گئی تھی۔ کئی پل فضا میں ایک دوسرے کو کاٹتے، خیالات اُبلتے رہے۔ لیکن تبھی اچانک میگھا نے شانت سخت آواز میں کہا تھا "ہاں میں تمھاری بھابھی ہوں، چائے دو مجھے۔"

فضا جیسے خاموش ہوئی تھی ویسے ہی یکبارگی پُر رونق ہو گئی۔ شاہدہ نے پیچھے سے آ کر اُس کے گلے میں باہیں ڈال دی تھیں اور پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا تھا "یہ ہوئی نہ میگھا بھابھی جیسی بات، ہم سب انسان ہیں، نہ ہندو، نہ مسلمان، نہ سکھ، نہ عیسائی ــ صرف انسان۔"

سمیتا بھابھی کی صحبت سے دھیرے دھیرے وہ اپنے کو کھول رہی تھی۔ اُس دن جیسے واقعی اس نے ان دیکھے ماضی سے نجات پانے کے لیے حال سے سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اسی لیے آج وہ کھل کر ہنس سکی تھی۔

سب سے بڑی تبدیلی آئی تھی لین کے لوگوں میں۔ دل میں کسی کے کچھ بھی ہو لیکن مہندر جی کو مبارکباد دینے آنے میں اُن میں بازی لگ گئی۔ "بلاتکار ایک مرض کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ آپ لوگوں نے اچھا کیا جو اوپر تک گئے اور سخت سزا دلوائی،" ایک معمر آریہ سماجی سجّن نے کہا "لیکن ..."

وہ آگے کچھ بولتے کہ ایک نوجوان بول اُٹھا "سخت سزا، یہ سخت سزا ہے؟ میں ہوتا تو جسم کا خاص حصّہ کاٹ دینے کا حکم دیتا۔ آپ نے وہ کہانی پڑھی ہے — 'فیصلہ' اس میں وہ لڑکی جس کے ساتھ ایک شخص گھات لگاکر بلاتکار کرتا ہے، وہ ماہر نرس ہے۔ وہ شرم کے مارے کسی سے کچھ نہیں کہتی لیکن وہ دل میں بدلہ لینے کا فیصلہ کرچکی ہے، اور ایک دن وہ بدلہ لیتی ہے۔ زانی کو پھسلاکر ویرانے میں لے جاتی ہے اور اس کے جسم کا پوشیدہ حصّہ کاٹ دیتی ہے۔ بالآخر پکڑی جاتی ہے تو کورٹ میں بڑے فخر سے سر اونچا کر کے کہتی ہے "ہاں' میں نے کیا ہے یہ کام' اور مجھے خوشی ہے میں ایسا کر سکی"۔

"جج نے اسے کرن کی طرح چھوڑ دیا ہوگا؟"

"پتہ نہیں، کہانی کار نے اتنا ہی لکھا ہے کہ اُسے سزا ہوئی یا وہ چھوڑ دی گئی، یہ اہم نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ وہ خود بدلہ لے سکی"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ گھر سے باہر آنا ہے تو انھیں خود ہمت کرنی ہوگی۔ کراٹے سیکھنا ہوگا۔ میں امریکہ کے اُن ججوں سے متفق نہیں جنھوں نے بلاتکار کے ایک کیس میں فیصلہ دیا تھا کہ لڑکی نے کپڑے ہی ایسے بھڑکیلے پہنے تھے کہ نوجوان کو خود پر قابو نہیں رہ سکا۔ یہ مرد اکثریت سماج کی بیمار ذہنیت کا ثبوت ہے، لیکن سچائی کا کچھ حصّہ تو اس میں ہے ہی۔ جسم کی پھوہڑ نمائش اتنی ہی نقصان دہ ہے جتنی چھوٹی موٹی گڑیا بننا"۔

اور یہ بحث مختلف زاویے بناتی ہوئی مسلسل دائروں میں گھومتی رہتی ہے۔

انار عورتیں بھی آکر آشیرواد دے گئیں جو منہ بچکاتی تھیں وہ سب سے پہلے آئیں۔ نئی بیاہتائیں، بالخصوص غیر شادی شدہ لڑکیاں تو واقعی حیرانی اور تعریفی نگاہوں سے انھیں دیکھتیں۔ دوردرشن پر جب انھیں اتنی اہمیت ملی تو اب تک جو اُن کے قصور تھے وہ بے مثال خصوصیات بن گئیں۔ ایک عورت تو یہاں تک بولی "ہمیں فخر ہے ہمارے لین میں ایسا ذہین خاندان رہتا ہے"

انکت کے ساتھ اس کے دوست کی وہ بُوا دوڑی دوڑی آئی، جس نے ٹی۔وی پر دیکھا کا بھاشن سُنا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہفتہ وار 'سوربھ' کا نیا شمارہ تھا۔ انکت نے دوڑ کر سمیتا

سے کہا" ممی ممی! یہ میرے دوست کی بُوا ہیں۔ اس دن انھوں نے ٹی۔ وی پر وِبھا بُوا کو دیکھا تھا۔ آپ سے ملنے آئی ہیں"۔

"آؤ آؤ بہن! کیا نام ہے تمھارا؟"

"گایتری!"

سمیتا ہنس پڑی "کتنا معقول نام ہے تمھارا! پتاجی ہر پوجا میں بس تین بار گایتری منتر پڑھتے ہیں۔ آج وہی مجسم گایتری ہمارے گھر آئی ہے"۔

گایتری شرما گئی ـــ "آپ نے تو بھابھی جی، پتھر کو بھگوان بنا دیا"۔

شاہدہ یکبارگی گنگنا اٹھی ـــ

"میرے ہاتھوں کے تراشے پتھر کے صنم
آج بُت خانے میں بھگوان بنے بیٹھے ہیں"

سمیتا ہنستی ہوئی بولی "شاہدہ! تو بڑی نٹ کھٹ ہے۔ بے چاری پہلی بار تو آئی..."

شاہدہ نے کہا "تبھی تو شعر سنا کر استقبال کر رہی ہوں"۔

منگھا تبھی کافی لے آئی "لو بہن، پہلے کافی پیو۔ شاہدہ تو آجکل پاگل ہو گئی ہے"۔

"لو، بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ ایک ہی بھابھی کافی تھی ڈانٹنے کو، دوسرے کے بھی پنکھ نکل آئے۔ مجھے جینے بھی دو گی یا نہیں؟"

"یہ تو اوپر والا نہیں لندن والا جانے"۔

ایسا قہقہہ لگا کہ ساری کافی چھلک گئی۔ سمیتا بولی "اب تیری خیر نہیں، تو لندن ہی بھاگ جا"۔

"جانا ہی پڑے گا"۔

پھر جیسے سمیتا اپنی بھول پر ندامت کرتی ہے "گایتری بہن بُرا نہ ماننا، یہاں تو سب ایسے ہی سر پھرے ہیں۔ تم کیا پڑھ رہی ہو ابھی؟"

"جی ہاں، ایم۔ اے فائنل میں ہوں۔ ہندی موضوع ہے۔ مہندر جی کا ایک ناٹک ہے ہمارے کورس میں۔ چاہتی تھی کسی دن آ کر بات کروں، لیکن ہمت نہیں ہوئی... اُس دن

بھیّاگیا تھا۔ وبھا جی کا بھاشن میں نے بھی سنا تھا، آج 'سوربھ' میں ان کا مضمون پڑھا۔ کیا کہوں، میں تو حیران ہوں۔ جس 'رامائن' اور 'مہابھارت' کو ٹی۔ وی پر دیکھ دیکھ کر سارا دیش خوش ہو رہا ہے اس کی کیسی خوبصورت تشریح کی ہے۔ وہ کب آ رہی ہیں؟ میں انھیں یونیورسٹی کے مذاکرہ میں مہمان خصوصی کے طور پر بلانا چاہتی ہوں۔"

'سوربھ' کا وہ شمارہ تو شاہدہ نے جھپٹ لیا تھا۔ اور بڑی بے چینی سے صفحات پلٹ رہی تھی۔ سمیتا نے ہی جواب دیا،" وِبھا آج یا کل میں ہی آنے والی ہے۔ پتاجی پندرہ دن بعد امریکہ جا رہے ہیں۔"

" پلیز، ایک بار مجھے ان سے ملا دو۔"

" ارے، اس میں ڈرنا کیا ہے؟ آؤ، آؤ، میں تعارف کرائے دیتی ہوں۔"

اور پتاجی کے کمرے میں جا کر بولی " پتاجی، یہ گایتری ہے، ایم۔ اے فائنل میں ہے۔ آپ کا ایک ناٹک پڑھا ہے، اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہے۔"

"تو بیٹی، کل صبح صبح آجانا، کہاں رہتی ہو؟"

" اس لین میں آخری مکان ہے۔"

" جہاں شونا تھ رہتے تھے؟"

" جی ہاں، وہ دو تلے پر تھے، ہم نیچے ہیں۔"

"تب تو بہت آسان ہے۔ جب سہولت ہو فون کر لینا۔"

"اس نے 'سوربھ' میں وبھا کا مضمون پڑھا ہے۔ ہمارے مہا کاویہ کی بہت تعریف کر رہی ہے۔ اس دن ٹی وی پر سنا بھی تھا۔"

" ارے ہاں، 'سوربھ' کا وہ شمارہ آج ہی آیا ہے۔ میں تبھی دینا بھول گیا اور دیتا بھی کیسے؟ تمھیں فرصت ہی کہاں ملتی ہے؟"

واقعی سمیتا خاموش ہو گئی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی، یہ سب معمول کے مطابق ہے یا صرف ایک اچانک فینومینا۔

سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ مہندر جی دوسرے نمائندوں کے ساتھ امریکہ کے لیے اُڑ گئے، لیکن ورنکا نہیں آسکی تھی۔ جانے کے دو دن قبل اس کا تار ملا تھا ـــ نارائن کے دوست کا تار آیا ہے۔ وہ چیک اپ کے لیے اسپتال میں ہے۔ میں کچھ جلدی پہنچ سکوں تو اچھا ہے۔ کل کی فلائٹ سے جارہی ہوں۔ ماماجی کو وہیں نیویارک کے ہوائی اڈے پر ملوں گی۔ سب ٹھیک ہے اور رہے گا بھی۔

پھر بھی سمیتا ڈر گئی۔ بولی "اجیت، کیا تم نہیں سمجھتے کہ کوئی گہری بات ہے؟"

اجیت نے جواب دیا "ہو بھی سکتی ہے، لیکن تم ہر چیز کے دوسرے ہی رُخ کو کیوں دیکھتی ہو؟"

"واقعی اجیت، مجھے نہ جانے کیا ہوتا جارہا ہے۔ قہقہے کے پیچھے چھپے غصے سے تمتماتا چہرہ کیوں دکھ جاتا ہے اتنی جلدی؟"

"بہت سوچنے لگی ہو اس لیے۔"

"شاید" کہیں دُور سے سمیتا نے جواب دیا۔ وہ تب کھڑکی کے اس پار دیکھ رہی تھی۔ نومبر کی سہانی دھوپ لان کے گھاس پر بکھری تھی، کچھ بھیگی سی اور وہ پہنچ گئی سات سمندر پار نارائن کے کمرے میں۔ تبھی اجیت کی آواز سنائی دی ـــ

"اے، کہاں کھو گئی؟ دیکھو، میگھا کیا پوچھ رہی ہے؟"

"ایں!" سمیتا چونکی، پھر ہنس پڑی "میں سچ مچ نیویارک پہنچ گئی تھی۔ یہ من بھی...."

میگھا نے پوچھا "کیا آپ نے نکنج کو فون کر دیا تھا؟"

"اوہ، میں تو بھول ہی گئی تھی۔ پلیز میگھا، تم کر دو نا۔"

میگھا چلی گئی۔ سمیتا نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرے اور پتاجی کے کمرے میں دوڑ گئی۔ وہ تب انکت کے سامنے دنیا کا نقشہ کھولے بتا رہے تھے ـــ "دیکھو بیٹا! یہ ہمارا بھارت ہے نا؟"

"ہاں" انکت نے سر ہلایا۔

اور یہ رہی ہماری دہلی، یہاں سے ہم اُڑیں گے۔ اور ادھر سے اڑتے ہوئے لندن پہنچیں گے۔ یہ دیکھو، یہ ٹاپو، یہی انگلینڈ ہے۔ یہ رہا لندن۔ یہاں سے ہم اٹلانٹک ساگر پار کریں گے اور پہنچ جائیں گے نیویارک۔"

نیویارک پہنچنے تک سمیتا رکی رہی، پھر بولی "پتاجی، آپ کو ڈالر لینے جانا ہے نا؟"

"ہاں جانا ہے۔ ابھینو آرہا ہے۔ محکمہ خارجہ میں ڈپٹی سکریٹری ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ وہ سب دیکھ لے گا۔ وہ کوئی بھی ہے۔"

اور واقعی اُس نے سب کچھ سنبھال لیا، بولا "ارے بھابھی جی، بے فکر رہیے۔ یہ تو میری خوش بختی ہے کہ اتنے بڑے مصنف کی خدمت کا موقعہ ملا ہے۔"

ادھر نکنج نے آکر بتایا "خاص کچھ نہیں ہے۔ کئی دن سے پیٹ میں درد تھا، کچھ دن ہسپتال میں رکھ کر ٹسٹ کریں گے۔ اتفاق سے مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ میگھا کو بھی لے جارہا ہوں۔"

پھر پاس آکر دھیرے سے بتایا "بھابھی، آپ نے مجھ پر جو احسان کیا وہ کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ میگھا اب اپنے آپ کو کھولنے لگی ہے۔ خوب ہنستی ہے اور...."

"اور.... ؟" شرارت سے سمیتا ہنسی پھر یکبارگی سنجیدہ ہوگئی "نکنج، تم تو سب کچھ جانتے ہی ہو۔ میگھا کو سب کچھ ملا، ماں نہیں ملی تھی۔ اس نے کچھ کچھ جھلک مجھ میں دیکھی۔ بڑی ہوں نا پھر پتاجی میں بھی اس نے تمہارے پتاجی کی جھلک دیکھی.... انسان بہت ہی عجیب و غریب جاندار ہے۔ پاس میں جاکر دیکھنے پر کبھی کبھی صفر ہی ہاتھ لگتا ہے اور پھر اچانک اپنے آپ ہی پھول کی پنکھڑیوں سا کھل اُٹھتا ہے۔ میگھا کو بس اپنا پن چاہیے اور تم ہو کہ بھاگتے پھرتے ہو...."

نکنج نے بے حد ممنونیت سے کہا "شاید مجھے بھی یہی مرض تھا۔ انجانے اپنی پہچان مل گئی۔ میں نے بھی ماں کو بہت جلد کھودیا تھا۔"

یکبارگی سمیتا کھلکھلا پڑی "نا نا، سب مل کر تم مجھے دادی اماں بنا کر چھوڑو گے۔ نا، یہ نہیں ہوگا۔ میں تمہاری بھابھی ہوں، بھابھی ہی رہوں گی، لیکن تم نے میری فکر دور کردی۔ پتاجی گھر والوں کے بیچ میں ہی رہیں گے۔ ہاں، نارائن کے بارے میں تفصیل سے فون پر بتانا۔"

لیکن سمیتا کی فکر کیا کبھی ختم ہوسکتی ہے؟ پتاجی چلے گئے تو انکت کی فکر ہے۔ اب وہ نیچے اکیلا تھوڑے ہی چھوڑا جاسکتا تھا۔ فیصلہ ہوا کہ اب سمیتا اور اجیت نیچے ہی سوئیں گے۔ کرن چاہے تو اوپر جاسکتی ہے۔

لیکن شاہدہ؟

وہ برابر آتی رہی۔ وبھا اور وجے بھی دو دن کے لیے آئے تھے۔ انٹرنیشنل ایرپورٹ پر پتاجی کے پیر چھوکر وہ پالم ہوائی اڈّے چلے گئے۔ وبھا کو اگلے ہفتہ پھر آنا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کا لکچر تھا۔

لیکن شاہدہ! پورے وقت وہ اُس کے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ اس کے پاسپورٹ کی بات وہ اس گہما گہمی میں بھی نہیں بھولی۔ اجیت کے دوست کے پاس وہ خود کئی بار گئی۔

آخر دو ہفتے بعد پاسپورٹ شاہدہ کے ہاتھ میں تھا۔

''دیکھ لے،'' سمیتا نے کہا ''تیری ہی تصویر ہے نا؟ شوناتھ کی تو نہیں لگ گئی غلطی سے؟''

''بھابھی!'' شاہدہ نے آزردہ لہجہ میں کہا ''آپ مجھے مار کر چھوڑو گی۔''

''کوئی نہیں مرتا آجکل۔ مرے ہوں گے لیلا مجنوں، شیریں فرہاد۔ آج نہ سہی شوناتھ، رام ناتھ آجائے گا۔ ڈیوڈ بھی ہے اور اقبال بھی۔ سب لائن میں لگے ہیں۔ فیملی پلاننگ نے آزاد کر دیا ہے عورت کو۔''

''کیا سوچ رکھا ہے آج آپ نے؟''

''یہی کہ لندن نہیں جا رہی، نہیں جائے گی۔'' ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سمیتا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ شاہدہ کے کاٹو تو خون نہیں۔ چہرہ سفید ہو گیا۔ حیران وہ اتنا ہی کہہ سکی ''کیوں نہیں جا سکوں گی؟''

''کیونکہ تُو شوناتھ کو پیار کرتی ہے۔''

''میں کبھی نہیں۔'' شاہدہ اب بھی حیران تھی۔

''پیار کرتی ہے اور سمجھتی نہیں، یقین نہیں کرتی۔''

ایک پل میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی شاہدہ۔ جانتی ہے اس بھابھی سے وہ بناوٹ نہیں کر سکے گی، اور وہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس میں...

اُس نے میز پر سر ٹِکا دیا اور دوسرے ہی لمحے پھوٹ پڑی چپ چاپ۔ تیز سے تیز ہوتی سسکیوں میں۔ سمیتا نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کچھ دیر رو لینے دیا۔ اس وقت

گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ آخر کئی پل کی گھٹن کے بعد شاہدہ نے سر اُٹھایا اور سرخ آنکھوں سے سمیتا کی طرف دیکھا "پھر آپ نے پاسپورٹ بنوانے میں اتنی پریشانی کیوں اُٹھائی؟"

سمیتا نے تیکھی آواز میں کہا "یہ بھی بتانا ہوگا مجھے۔"

شاہدہ نے پھر سر جھکا لیا۔ دل اس کا اب بھی بھرآرہا تھا۔ دھیرے دھیرے بولی "وہ میرا انتظار کر رہا ہے۔ سارے کاغذات بھیج دیئے ہیں۔"

"تبھی تو کہتی ہوں، تُو نہیں جائے گی۔"

شاہدہ اُٹھی اور باہر جانے کو مڑی کہ پھر سمیتا نے حکم دیا "کہاں جارہی ہے؟ میں اس وقت اکیلی ہوں۔ بیٹھ میں کچھ کھانے کے لیے لاتی ہوں، باتیں کریں گے۔"

شاہدہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ سمیتا پاس آئی۔ دونوں ہاتھوں میں اُس کا چہرہ لیتے ہوئے بولی "تو مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہے؟ ابھی تُو موہ میں پھنسی ہے؛ پیار ہونے دے۔ بھول مت، پیار پاس ہی نہیں لاتا دُور بھی کرتا ہے۔ شوناتھ اگر تجھے واقعی پیار کرتا ہے تو اتنی جلدی نہیں کرے گا۔ تیرے بھلے کے لیے تیری راہ دیکھے گا اور ضرورت پڑی تو راستے سے ہٹ بھی جائے گا۔ خیر، ویسے محبت کے دن تو لد گئے تھے۔ پتہ نہیں کبھی تھے بھی، لیکن جو میں کہتی ہوں وہ اتنا ہی ہے کہ تُو اپنے آپ کو مرد کی طاقت کی کشش سے آزاد کرلے۔ جس دن کرلے گی وہ خود تیرے پاس آئے گا۔ اُس دن کی راہ دیکھ۔ اور ابھی تجھے اپنے گھر خاندان کے لوگوں کے دل بھی جیتنے ہیں۔ ہوسکتا ہے۔ وہ قبول کرلیں۔"

"وہ نہیں کریں گے۔"

"لیکن تب تم بغاوت تو کرسکو گی۔"

"اب کیوں نہیں کرسکتی؟"

"کیونکہ ابھی تیرے پاؤں تلے کی زمین پختہ نہیں ہے۔ اور پھر بغاوت کے لیے لندن کیوں بھاگا جائے؟ شوناتھ یہاں آئے گا تب اُس کے ساتھ جانا۔"

تبھی گھنٹی بج اُٹھی۔ شاہدہ نے اُٹھنا چاہا، سمیتا بولی "تُو ٹھہر، میں دیکھتی ہوں۔"

دیکھا تو شاہدہ کی امّی جان تھیں۔ سمیتا نے مسکرا کر کہا "آؤ، آؤ امّی جان۔"

"شاہدہ یہاں ہے؟"

"ہاں، ہاں یہیں ہے۔"

"سنا ہے وہ لندن جا رہی ہے؟"

"نہیں تو، پاسپورٹ بن گیا ہے۔ کبھی ضرورت پڑ سکتی ہے، اکادمی کی طرف سے باہر جانے کی۔"

"میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔"

"کسی نے کچھ بتایا تھا کیا؟"

امی جان نے بہت آہستہ آہستہ کہا "اس سے کہنا نہیں، اس کی ایک دوست ہے۔ اُس نے مجھے کل بتایا کہ شاہدہ نے پاسپورٹ بنوا لیا ہے۔ اکثر وہ لندن کی بات کرتی، کہیں چلی نہ جائے۔ تبھی میں دوڑی آئی۔ اچھا میں چلتی ہوں اس سے کچھ مت کہنا۔ اور..."

سمیتا نے بات کاٹ دی "آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اس سے بھی کچھ نہ کہیں۔ وہ کہیں نہیں جائے گی۔"

"اچھا بیٹی، خدا تجھے سلامت رکھے، رحمت بخشے۔"

دیر ہوتے دیکھ شاہدہ نے پکارا "بھابھی، آؤ نا۔"

"آ رہی ہوں۔"

وہ دروازہ بند کر کے بھاگتی ہوئی آئی "گایتری یونیورسٹی جا رہی تھی۔ وبھا کو آنا ہے۔ وہاں اس کا لکچر ہے۔ وہی پوچھ رہی تھی کہ دیدی کب آ رہی ہیں۔"

"وبھا دیدی آ رہی ہیں؟"

"ہاں اگلے ہفتے اُسے آنا ہے۔"

لیکن اگلا ہفتہ آنا اِس سے قبل ہی ایک بار پھر بھونچال سا آگیا اس کی زندگی میں۔ وہ بھی تب جب وہ نارائن کی طرف سے کچھ مطمئن ہو کر اپنا پروجیکٹ مکمل کرنے میں جی جان سے جٹ گئی تھی۔

اُس وقت بھی وہ گھر میں اکیلی تھی۔ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اطمینان سے ریسیور اُٹھا کر

سمیتا نے کہا "میں سمیتا بول رہی ہوں، آپ؟"

"میں نکنج ہوں، نیویارک سے۔"

"نمستے نکنج بھیا! کیسے ہیں سارے لوگ؟ نارائن بھائی صاحب کیسے ہیں؟ پتاجی کب آرہے ہیں؟ میگھا، ورنکا دیدی، ورون اور تمھاری بٹیا...؟"

"ایک دم سب پوچھ لوگی؟ وہی سب بتانے کے لیے تو فون کیا ہے۔ کانفرنس کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ پتاجی بہت اچھا بولے اور سب ٹھیک ہی ہوا، جیساکہ ایسی تقریبات میں ہوتا ہے۔ کچھ دن یہاں کے لوگوں نے ہماری ہندی سُنی پھر سب کچھ شانت ہوگیا۔

اور نارائن بھائی صاحب کو تو آپ جانتی ہی ہیں، کتنے لاپروا ہیں۔ کبھی کبھی پیٹ میں درد ہونے لگتا تھا، لیکن کسی کو بتایا نہیں۔ بھابھی کو بھی نہیں۔ یہاں وہ بہت بڑھ گیا۔ تب ان کے دوست ہسپتال لے گئے۔ بھابھی جی کو تار دیا۔ جانچ ہوئی پتہ لگا پیٹ میں ٹیومر ہے۔ فوراً آپریشن ہونا ہے۔ سب گھبرا گئے۔ اس کی زیادتی سے کینسر ہوتا ہے۔ بھابھی کو پہلی بار میں نے روتے دیکھا۔"

"لیکن بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے، وہ ٹیومر کینسر نہیں تھا، معمولی سا تھا۔ ہاں اگر کچھ دن اور لاپرواہی کرتے تو ضرور وہ کینسر بن سکتا تھا۔ لو، میگھا سے بات کرو۔"

"بھابھی جی، آپ پریشان نہ ہوں، سب لوگ خوش ہیں۔ نارائن بھائی صاحب اپنے موڈ میں ہیں۔ بھابھی جی اور ورون بھی خوش ہیں۔ دل کرتا ہے کاش آپ یہاں ہوتیں۔ آپ کی نیک خواہشات اور آشیرواد کا پھل ہے کہ مشکل جو جان لیوا ہو سکتا تھا ٹل گیا۔"

سمیتا سنتی رہی۔ ان لمحوں میں بے شمار احساسات آئے اور گذر گئے۔ جواب میں اتنا ہی کہا "میں تو جی گئی میگھا، سب سن کر۔ نہ جانے کیا کیا سوچتی تھی۔ سب کو میرا پیار دینا۔ نارائن بھائی صاحب سے کہنا۔ میں بہت ناراض ہوں۔ اب ایسی غلطی نہ کریں۔ ورون کو اس کی گود میں بیٹھا کر میرا پیار دینا۔ خط لکھنا، میں بھی لکھوں گی۔ اجیت کو سب کچھ بتاؤں گی۔ پتاجی کب آرہے ہیں؟"

"انھیں کئی جگہ سے دعوت نامے آئے ہیں۔ آج کینیڈا گئے ہیں، ہوسکتا ہے ٹرینیڈاڈ

جائیں۔ میکسکو سے بلاوا ہے۔ ناروے اور لندن رُکیں گے ہی، پھر پیرس ہوتے ہوئے دہلی پہنچیں گے۔ وہاں سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں، سب ٹھیک ہے، وبھا خوب لکھ رہی ہے۔ شاہدہ تم لوگوں کو یاد کرتی ہے پتاجی سے کہنا، لندن میں شونا تھ سے ضرور مل لیں۔"

"اور دیدی، میں تو بتانا ہی بھول گئی۔ وہ لندن ایئر پورٹ پر آئے تھے، سب سے ملے تھے، انٹرویو بھی ریکارڈ کیا تھا۔ واپسی میں بھی کریں گے۔ شاہدہ کو یاد کر رہے تھے۔"

رات کو اجیت کے پاس لیٹے لیٹے سمیتا نارائن کو لے کر کافی حیران و پریشان تھی "میں نے کہیں پڑھا کہ اوپر سے جو کھلے دل سے قہقہہ لگاتا ہے اس کے باطن میں کرب اور درد کا سمندر کناروں سے سر پٹکتا رہتا ہے۔"

اجیت اُٹھ کر بیٹھ گئے "میں تمھیں پتاجی کے اُس بھاشن کا ایک ٹکڑا سناتا ہوں جو انھوں نے انسان سماج اور تہذیب پر دیا تھا۔ انھوں نے ایک روسی ڈاکٹر اور کینیڈا کے جسمانی سائنس داں کے تجربات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ بلڈ پریشر، ذیابیطس، دل کا مرض، کینسر، نشیلی چیزوں کا استعمال، خودکشی، دہشت گردی اور بے شمار پوشیدہ امراض تناؤ کی مشکل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ــــ

"تناؤ کب پیدا ہوتا ہے؟ جب کوئی انسان جو کچھ دراصل ہو رہا ہے اور جسے وہ معمول مان چکا ہے یعنی روایتی اقدار اور اب ہو رہی تبدیلیوں میں فرق دیکھتا ہے تو سماجی مطابقت کا انتظام اسے متحرک کرتا ہے کہ وہ حالات کو بدلنے کی کوشش کرے، لیکن اگر وہ اپنی مجموعی کوششوں کے باوجود حالات کو اپنی خواہش کے مطابق تبدیل کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو پریشانی پیدا ہوتی ہے۔"

"اُن کا کہنا ہے،' دوڑنے والا جو اسٹارٹر سے پستول کی آواز سنتے ہی دوڑ میں کود پڑتا ہے، اپنے اندر دوڑ سے قبل امنڈتے ہوئے اعصابی اور عضلہ کے تناؤ کو آزاد کر دیتا ہے۔ اس طرح کے صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے زندگی ایک توانائی جمع کرتی ہے جسے کہا گیا ہے 'تصرّف توانائی'۔ حالانکہ اسے ابھی ناپنے کا کوئی صحیح سائنسی طریقہ نہیں ہے

لیکن سائنس دانوں نے یہ پتہ ضرور لگالیا ہے کہ جاندار کی، کسی تناؤ (کھیل کا مقابلہ، کاروباری، سماجی یا جذباتی زندگی میں دباؤ یا جسمانی امراض) کی وجہ سے بالکل ایک سا ردعمل ہوتا ہے۔ لمبے وقت تک چلنے والے، تیزی سے ہونے والے یا زیادہ مانگ سے تصرف توانائی کے ختم ہو جانے سے سخت صدمہ پیدا ہوتا ہے جو تناؤ کی ایک بدشکل اور نقصان دہ صورت ہے۔

"اس تناؤ کے لیے کسی بھی شخص کا دو طرح کا ردعمل ہو سکتا ہے ۔ ایک یہ کہ حقیقت کو اپنے آدرشوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی جائے، سماج میں تبدیلی کی بات کہنا آسان ہے لیکن کرنا مشکل۔ جو انسان اِس راستے پر مستحکم رہتا ہے وہ یا تو سماج میں بغاوت لانے اور اسے سدھارنے کی کوشش کرے گا یا وہ غیر مناسب، قصوروار یا ملزم اور سماج کے لیے خطرہ بن جائے گا۔

"دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے آدرشوں کو بدل دے۔ یہ اوپر سے دیکھنے میں آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے اس کو ایک کے بعد ایک اپنے آدرشوں اور اخلاقی اصولوں سے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے اور ہر سمجھوتے میں تصرف توانائی ختم ہوتی ہے۔ اگر وہ اس مسئلے کا سامنا کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اپنے مرنے کو ختم کرنے کی کوشش میں نشیلی دواؤں اور شراب کی طرف بڑھتا ہے۔

"صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ دل کا مرض، کینسر، ذہنی توازن اور خودکشی جیسے امراض جہاں کافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مغرب میں جس نئی ہپی تہذیب کا عروج ہوا ہے وہ اسی تناؤ کا نتیجہ ہے..."

اجیت بہت آہستہ آہستہ پڑھ رہے تھے اور سمیتا توجہ سے سن رہی تھی۔ سن چکی تو حیران سی بولی "نارائن بھائی صاحب جو اتنے طاقتور دکھائی دیتے رہے، اتنے کمزور تھے، اتنے زیادہ تناؤ میں تھے اپنے باطن میں۔ سمجھوتہ کیا تو کتنا مہنگا پڑا۔ مسلسل کمزور پڑتے اپنے دل کے کرب کو اگر وہ کسی سے بانٹ سکتے تو شاید یہ نوبت نہ آتی..."

اجیت نے کہا "جس سے بانٹ سکتے تھے وہ تو کہیں اور مصروف ہو گیا تھا۔"

"کیا نارائن بھائی صاحب جیسا تجربہ کار شخص... ؟"

اجیت ہنس پڑا "تم بھی سمی، کبھی کبھی جان کر بھی انجان بنتی ہو۔ ہم دونوں کتنے تناؤ میں جیتے رہے ہیں"

"جیتے رہے ہیں کیوں ابھی نہیں جی رہے ہیں کیا؟"

"لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ ہم نے ان تناؤ کو جان لیا ہے۔ اس لیے ان کے زیر اثر نہیں رہے۔ خاص طور سے تم..."

سمیتا ہنس پڑی "تم خوشامد بھی کر لیتے ہو"

سمیتا اجیت کا ہاتھ سہلا رہی تھی۔

"کیسا نشہ آور ہے یہ لمس"

"یہی نشہ۔ یہی تو..."

"یہی تو..."

پھر سمیتا ہنسی لیکن بات کو پھر کشیدگی کے عمل سے جوڑتے ہوئے بولی "اجیت، مسئلہ ان کشیدگیوں سے جوجھنے کا ہے۔ مرض، دہشت، مختلف طرح کے نشے — یہ سب تو نتائج ہیں۔ اجیت ہم جو سماج کے بدلنے کی بات کرتے ہیں — ہمیں اس پر قائم رہنا چاہیے تبھی ہم انقلاب لا سکتے ہیں اور انقلاب دلوں میں جنم لیتا ہے۔ اگر ہم کامیاب نہ ہوئے تو سماج کے لیے خود خطرہ بن جائیں گے"

وہ بہت سنجیدہ ہو رہی تھی "ہم اپنے آدرشوں کو نہیں بدلیں گے، چھوڑیں گے بھی نہیں' ٹھیک کہا ہے ان سائنس دانوں نے: پیچھے ہٹنا سماج کے لیے اور بھی خطرناک ہے۔ اجیت کیا تم نہیں سمجھتے کہ سماج نے نارائن بھائی صاحب کے ساتھ، ورتکا جی جی کے ساتھ، میگھا کے ساتھ، میرے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے؟ نارائن بھائی صاحب کی غلطی یہ ہے کہ وہ خود سے الجھتے رہے، سماج سے نہیں جوجھے۔ ویبھا ہم سب سے اچھی رہی۔ وہ اپنے دل سے لڑی ضرور لیکن اس نے سماج پر حملہ کرنے کا فیصلہ بھی کیا۔ ورتکا جی بھی اس راہ پر چلی ضرور تھیں، لیکن کسی وجہ سے بھی، ان دونوں نے خوش قسمتی اور اولاد کے لیے سمجھوتہ کر لیا

اور بالآخر کشیدہ خاطر ہو گئے۔"

"بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے سمی! ضروری نہیں کہ یہ تجزیہ بھی صحیح ہو، لیکن مجھے لگتا ہے تم نے خود کو بے نقاب کر کے اور وبھا نے سماج پر سیدھے چوٹ کر کے خود کو تناؤ سے بچا لیا جب تک تم نے خود کو بے نقاب نہیں کیا تھا تب تک..."

سمیتا نے بات کاٹ دی "کسی تکبّر سے نہیں کہہ رہی ہوں۔ کیا تم ایک بات نہیں مانو گے کہ کشیدگیوں کے درمیان جیتے ہوئے بھی میں نے خود کو کبھی بے بس محسوس نہیں کیا؟ اُس نیگرو دوست کے سامنے ایک بار ضرور ہار گئی تھی لیکن اس کے بعد..."

"ماحول سمی! ماحول! میرے باوجود تمھارے چاروں طرف میری محبت اور پیار کی حرارت برابر تمھیں اعادہ کیے رہی۔"

"تم بھی کیا مجھے کم پیار کرتے تھے؟ سب سے زیادہ طاقت تو مجھے اسی نے دی۔"

"لیکن اس پیار کے ہوتے ہوئے بھی شیا ملا کی طرف مائل تو ہوا ہی تھا..."

سمی یکبارگی کہیں کھو گئی تھی۔ اس نے کچھ سنا، کچھ نہیں سنا۔ اجیت بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر دونوں کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اجیت نے ہاتھ بڑھا کر بتی بجھا دی تبھی اُس اندھیرے میں سمیتا نے آواز دی "اجیت!"

"کہو!"

"تمھیں یاد ہے، وبھا کی وہ تجویز۔ زمانے کے مطابق ایک نیا دستور بنانے کی ضرورت ہے۔ مجھے لگتا ہے، ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا۔"

"مجھے بھی یہی لگتا ہے، لیکن اب تم سو جاؤ۔ وبھا تین چار دن میں آ رہی ہے تب ہم ایک خاکہ تیار کریں گے۔"

"ٹھیک ہے" کہیں دور سے دھیمی سی آواز آئی۔ اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔"

اجیت نہ جانے کب تک بھٹکتا رہا۔ واضح غیر واضح خیالوں کی دنیا میں۔ خوابوں کی جادوئی دنیا کی طرح۔ پاس ہی پتا جی کے کمرے سے انکت نے بے چین آوازیں کسی کو

پکارا، شاید بابا جی کو، شاید ورون کو۔
پھر وہ بھی سو گیا۔

سمیتا اس صبح دیر سے اُٹھی۔ انکت کی چھٹی تھی، وہ بھی سو رہا تھا۔ اجیت... ارے، ارے، کچن میں یہ کیسی کھٹر پٹر ہے...
وہ فوراً اٹھی، کھلے بالوں کا جوڑا باندھا، منہ پر ہاتھ رکھ کر جماہی لی کہ دیکھا کہ اجیت آرہا ہے۔ دونوں ہاتھ میں دو پیالے لیے "چائے میم صاحب۔"
سمیتا حیرانی کے پہلے لمحے کو جھیل کر مذاق کے موڈ میں آگئی، بولی "کتنی دیر کر دی چائے لانے میں؟ کہاں تھے اب تک؟"
"گستاخی معاف ہو! آپ کی کرن کو آج سویرے ہی جانا تھا۔ این۔سی۔سی۔ کا دن ہے نا۔ چائے وہ لائی تھی لیکن میڈم سو رہی تھیں۔ ہم نے انھیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر میڈم کبھی ہمیں بھی خدمت کا موقع ملے۔"
ہاتھ میں چائے کا پیالہ لے کر سمیتا کھلکھلا پڑی۔ چائے چھلک پڑی۔ اس طرف دھیان دیئے بغیر وہ بیٹھ گئی اور چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی "اچھی بنی ہے۔"
"شکریہ" اجیت نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
پھر کئی لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرے میں ڈوبے وہ چپ چاپ چائے پینے لگے۔ کبھی کبھی ہنس پڑتے ایسے ہی خاموش رہتے ہوئے۔
"کیا ہی اچھا ہو، وقت ٹھہر جائے!" سمیتا نہ جانے کس دنیا کی مسرور ہیروئن سی بول اُٹھی۔
اجیت نے جواباً کوئی شعر پڑھنا چاہا کہ دروازے کی گھنٹی بجی "اس وقت کون؟"
سمیتا نے دروازہ کھولا۔ سامنے تار والا تھا۔ جلدی سے دستخط کر کے تار پڑھا — "فوراً آیئے شیاملا۔"
تب تک اجیت بھی وہیں آگیا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ اُسے پڑھا اور حیران سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کتنے خیالات ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو گئے۔ کچھ بھی سمجھ میں

نہیں آرہا تھا۔ آخر کسی طرح سمیتا نے خاموشی توڑی " اس کے خط سے میں سمجھ گئی تھی کچھ ہو کر رہے گا۔ کیسی ابھاگن ہے ..."

"کیا کہتی ہو، میں جاؤں؟"

"تم نہیں جاؤ گے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم نہیں جا سکتے۔"

"تم جاؤ گی؟"

"ہاں، میں جاؤں گی اور اُسے یہاں لے کر آؤں گی۔"

سمیتا نے فیصلہ سنا دیا۔ اس کے بعد اجیت کے پاس کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ کہنے کا کوئی مطلب بھی نہیں تھا۔ نہ جانے قسمت کے کس کھیل سے شیاملا اُن سے آجڑی۔ ذریعہ تو وہی تھا۔ پھر بھی کتنے قریب رہے اُن لمحوں میں اور کیسے شیاملا ہی نے اُسے بیدار کیا۔ اتنی ذہین لیکن اتنی بے بس۔ یہ بار بار مرنا... ایک بار مر جاتی تو..."

کسی نے آہستہ سے چٹکی لی ــــ وہ تو مر جاتی لیکن تم نے بچا لیا۔ خودکشی گناہ ہے، کیسے کرنے دیتا

اور جسم فروشی؟

وہ کانپ گیا، اتنی ہی تیزی سے کوئی ہنسا۔ وہ تلملایا۔ کیسی ہے یہ شیاملا۔ اسے دیکھ کر کوئی کہے گا کہ یہ مرد کے بغیر نہیں جی سکتی؟ سیدھی شانت، نہ جوانی کا جوش، نہ آوازیں، خلل کے بغیر بہاؤ... چپ چاپ تنہائی میں رہتی رہتی...

تار دینے کی ہمت کیسے جٹا سکی، وہ مرنے سے ڈرتی ہے نا۔ جینے کی چاہ، جینے کی طاقت نہ ہونے پر کتنے گناہ کرا لیتی ہے۔

سمیتا انکت کی انگلی پکڑے آئی "اب بیٹھے کیا ہو، جانا پڑے گا ہی۔ تار دیا ہے۔ کیسے ہمت ہوئی تار دینے کی۔ عورت ایسا قدم اٹھاتی ہے جب سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔"

"موت کا راستہ کبھی بند ہوتا ہے؟"

چونک اُٹھی — "یہ تم کہتے ہو؟"

تعجب، یہ صبح چائے پیتے وقت کی سمی ہے — بولی "جاؤ ہوائی جہاز سے ایک سیٹ بُک کروادو۔"

"ہوائی جہاز سے جاؤ گی؟"

"ٹرین میں پچاس گھنٹے لگیں گے۔ تب تک مر جائے گی۔ اُسے میں جانتی ہوں۔ کیسے بھی ہو، اب مرنے نہیں دوں گی۔"

اجیت نے کچھ جواب نہیں دیا، حیران سا تیار ہو کر چلا گیا۔ کرن آگئی۔ این۔ سی۔ سی کی ڈریس میں کیسی پیاری پیاری لگتی تھی۔ سمیتا بولی "مجھے ترونندرم جانا ہے کرن! مجھے سات دن لگ سکتے ہیں۔ تو سنبھال لے گی نا۔ ویسے پرسوں تک وبھا آجائے گی۔ شاہدہ سے بھی کہہ دوں گی۔"

نام لیا تھا کہ گھنٹی بجی، سامنے شاہدہ تھی — سیاہ چہرہ، آنکھیں ایسی جیسے ساری رات روئی ہو۔ سمیتا نے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"کوئی مر گیا ہے کیا؟"

"بھابھی! میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

ایک بار پھر اوپر سے نیچے تک دیکھا، بولی "تو جاؤ، یہاں کیوں آئی ہے؟ فیصلہ سنانے؟" شاہدہ مڑ گئی۔ سمیتا نے زور سے دروازہ بند کر دیا "بیٹے، تم ناشتہ کرلو، کرن نے رکھ دیا ہے۔ تمھاری بس آنے والی ہے۔ اور دیکھو میں کل صبح ترویندرم جا رہی ہوں۔"

"کیوں ممی؟"

"تمھاری شیاملا بوا بیمار ہیں۔ انھیں یہاں لاؤں گی۔ اور دیکھو تمھاری وبھا بوا پرسوں یہاں آجائیں گی۔ کل..."

تبھی دروازے کی گھنٹی نے کسی کے آمد کی اطلاع دی — باہر شاہدہ کھڑی تھی، آنکھوں میں آنسو بھرے۔ تیز آواز میں سمیتا بولی "اندر آکر نہیں رو سکتی، دنیا بڑی ظالم ہے۔"

"بھابھی! میں خودکشی کرلوں گی۔"

"ضرور کرو۔ زمین کا کچھ تو بوجھ کم ہوگا۔ آبادی..."

شاہدہ نے زور سے میز پر سر پٹک دیا اور سسک اُٹھی۔ انکت سب کو ٹاٹا کہہ کر جا چکا تھا۔ سمیتا نے کرن کو پکارا — "کرن، شاہدہ کے لیے کڑک چائے تیار کر۔ میں تب تک اوپر اپنا سامان تیار کرتی ہوں۔"

وہ اوپر سے لوٹی تب تک کرن نے شاہدہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسے کافی تکلیف ہو رہی تھی۔ سمیتا کو دیکھتے ہی وہ اس سے چمٹ گئی، "بھابھی میری! مجھے معاف کر دو۔"

"کر دیا، آگے بول۔"

"اب تبھی بولوں گی جب تم شیاملا بہن کو لے کر لوٹ آؤ گی۔"

"یہ ہوئی شاہدہ جیسی بات۔ صبح صبح نہ جانے کون مرگھلی آگئی تھی میرے دروازے۔"

"بھابھی! تم گالی بھی سیدھے نہیں دے سکتیں۔"

سمیتا زور سے ہنس پڑی۔ اس کے دونوں کندھے پکڑے اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "جو مزہ انتظار میں پایا وہ نہ وصل یار میں پایا۔ انتظار کر، رو رو کر اپنی آزاد حکومت کا مذاق نہ اُڑا۔ شطرنج کی بازی ہے، اتنی جلدی مات کھا گئی تو۔ سوچ سمجھ کر چال چل۔ اور رومانس کی ضرورت ہو تو اکادمی میں کئی مجنوں ہوں گے۔"

شاہدہ چیخ پڑی "بھابھی، کیا میں اتنی نادان ہوں؟"

"یہ میں کیا جانوں؟ میں تروندرم سے پانچ دن میں لوٹوں گی۔ وبھا آجائے گی، اسے کئی لیکچر دینے ہیں یونیورسٹی میں اور مہیلا کلیان سنگوسٹھی میں۔ تمھیں برابر آنا ہے اور اپنے بھائی صاحب اور بھتیجے کی دیکھ بھال کرنی ہے۔"

دوسرے ہی لمحے کرن کو پکار اُٹھی "کرن ہم سب کا ناشتہ تیار کر۔ تب تک میں نہالوں۔"

باتھ روم میں بھی اس کا ذہن چکر کاٹتا رہا، میں کیسے کبھی کبھی اتنی آپے سے باہر ہو جاتی ہوں۔ اسی طرح کبھی گھر سے باہر ہو گئی تو...

تو ہو جانا! چار دیواری گھر کی ہی نہیں ہوتی، اپنے اندر بھی ہوتی ہے۔ ان سے باہر تو ہونا ہی ہوگا۔ پاس و لحاظ ہمیشہ وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ بچپن میں ایک طرح کی دُوربین ہوتی تھی۔ اسے ہم ایک آنکھ کے آگے کر کے روشنی کے سامنے کھڑے ہو جاتے

اور گھماتے رہتے۔ تب اس کے اندر کانچ کے مختلف رنگ روپ کے ٹکڑے کبھی نیم دائرہ بناتے کبھی مربع کبھی سہ زاویہ۔ جیسے جیسے گھماتے ویسے ویسے روپ بدلتے اور ہر بار پہلے سے اچھے لگتے۔
لیکن بدلنے کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔ وہ ٹوٹی تو وضع ہی بکھر جائے گی...

تعجب، ناشتے پر وہ اتنی ہی خاموش رہی جتنی ابھی کچھ دیر پہلے باتونی اور رات میں تین بجے طوفانی سناٹے کے درمیان دوڑتی ٹیکسی میں جیسے وہ بھی اس میں سما گئی۔ لیکن سناٹا تو بہت زور سے بولتا ہے۔ اجیت نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا "اے، کتنی جلد غیر حاضر ہوجاتی ہو تم پکڑ میں ہی نہیں آتیں۔"

سیتا چونک پڑی "کیسے پکڑنے کی بات کر رہے ہو؟"

"تمھیں، اور کسے؟"

"میں نے تو اسی دن اگنی کو ساکشی کر کے گرنتھی بندھن کر دیا تھا۔"

"اس میں تو کبھی کی گراوٹ آگئی۔"

"میرے لیے نہیں آئی، اسی لیے کسی کو پکڑنے کا لالچ نہیں ہوتا۔ تمھیں کیوں ہوتا ہے؟"

"تم نہیں جانتیں؟"

"جانتی ہوں تبھی تو کہتی ہوں' اس موہ سے نجات پانا ہوگا۔ ہم دونوں کو۔"

"وہی تو کرتے رہے ہیں ہم۔"

"لیکن گھوم پھر کر وہیں آجاتے ہیں۔"

"خلیل جبران کی کہانی کی طرح۔"

پھر دونوں ہنس پڑے۔ وہ منزل تک پہنچ چکے تھے۔ اجیت تب تک رکے جب تک وہ سامان وزن کرا کر سیکورٹی چیک میں داخل نہیں ہوگئی۔

اجیت نے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجائی تو سامنے وبھا کھڑی تھی "ارے تم آج آگئیں۔ وجے بھی ساتھ آیا ہے؟"

"نہیں وہ تو ہنی مون منانے ہونو لولو چلا گیا۔"

اجیت بالکل حیران سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ وہی بولی" اس میں حیران ہونے کی کیا

بات ہے ؟ ساتھ کام کرتے تھے ، تو کیا شادی کرنا بھی ضروری تھا؟"

"وجے نے تو مجھ سے کچھ ایسا ہی کہا تھا۔"

"کہا تو مجھ سے بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا، میں فوراً شادی کرلوں، لیکن میں اپنا ذہن نہیں بنا پائی۔ اسے میں کیوں روکے رکھتی ؟ اس کے ساتھ رہنا اچھا لگتا تھا لیکن میں خود کو... اچھا چھوڑو میری بات۔ مجھے لے کر آپ کیوں پریشان ہیں؟ ہاں، بھابھی کو فوراً جانا پڑا، کیا واقعی حالت گمبھیر ہے؟"

"لگتا تو ہے۔"

شیاملا پڑھی لکھی ہے، ادیبہ ہے، پھر بھی دکھوں سے اُبھرنے کے لیے کیسے کیسے بے معنی سہارے ڈھونڈتی رہی ہے۔ عورت کی آزادی کی اس زمانے میں اس جیسی..."

اجیت نے بات کاٹ دی "عورت کبھی آزاد نہیں ہو سکتی۔ آزادی باہر والوں سے ہی نہیں اپنے باطن سے بھی پانا ہوتی ہے۔ اچھا، تم آہی گئی ہو تو انکت کی طرف سے میں مطمئن ہوا۔ مطمئن ہونا ہی تو آزادی ہے۔"

"وبھا نے چوٹ کھا کر کہا "بھیا، تم بھی اتنے تلخ ہو سکتے ہو۔"

"سچ ہمیشہ تلخ ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا؟"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔"

"تو تم اپنے لکچر تیار کرو، میں یونیورسٹی چلا۔"

وبھا کا پہلا لکچر آرٹس فیکلٹی میں ہوا۔ تہذیب کے مختلف اشکال کی تشریح قدیم گرنتھوں کے حوالے سے جونہی تشریح اُس نے کی، اس سے سبھی حیران تھے۔ گایتری خوش تھی کہ اُس کے اصرار کو وبھا جی نے بہت خوش اسلوبی سے حفاظت کی۔ صدر شعبہ بھی بہت متاثر ہوئے۔ پوچھا "اتنا سب آپ نے پڑھا ہوگا، یہ تو مان سکتا ہوں، لیکن اس طرح اس کو نئے معنی دینا معمولی بات نہیں ہے۔"

"مجھ میں اتنی ذہانت کہاں ہے سر؟ میں نے تو سب کچھ پتا جی کے چرنوں میں بیٹھ کر پڑھا ہے۔"

ساتھ چلتے ہوئے ایک طالبہ نے پوچھا "آپ خود تہذیب کی کس تعریف کو صحیح مانتی ہیں"۔

وبھا بولی "رکو، تمھیں ایک کہانی سناتی ہوں"۔

بس بہت سے طلبا گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ وبھا بولی "یہ کہانی خلیل جبران کی ہے۔ انھوں نے بہت سی چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی ہیں۔ 'اکھر اگیت ارتھ گھنیرے' والی کہانیاں۔ ایسی ہی یہ کہانی ہے ـــ

چار مینڈک ایک خاموش رات میں ندی کنارے پہنچے۔ اس دن پورنیما تھی۔ نیل گگن سے پورے چاند نے ندی کے سطح پر روشنی بکھیر دی تھی۔ مینڈک خوش ہو گئے۔ تبھی ان کی نگاہ کنارے سے لگی ایک کشتی پر پڑی۔ وہ اس پر چڑھ گئے۔ ان کے چڑھتے ہی کشتی چل پڑی۔ یہ دیکھ کر ایک مینڈک حیران سا بولا 'دیکھو، دیکھو کشتی چل رہی ہے'۔

'بے وقوف ہے تو تو'، دوسرے نے فوراً اسے ٹوک دیا 'کشتی نہیں، پانی چل رہا ہے یہ کشتی اس کے ساتھ بہہ رہی ہے'۔

تیسرا زور سے ہنسا 'تم بھی کم بے وقوف نہیں ہو، نہ کشتی چل رہی ہے نہ پانی۔ یہ تو رفتار ہے۔ اسی کی وجہ سے سب چل رہے ہیں'۔

دوسرے ہی لمحے وہ تینوں مینڈک ایک دوسرے کی بات کاٹتے ہوئے لڑنے لگے۔ لیکن تبھی اچانک ان کی نگاہ چوتھے مینڈک پر پڑی۔ وہ خاموش، حیران چاند کی روشنی کو دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنے اندر اتار رہا ہو۔ پہلے مینڈک نے کہا 'آؤ اس سے بھی تو پوچھیں، اس کی کیا رائے ہے؟'

اور وہ تینوں اس کے پاس گئے۔ اس نے بڑے سکون سے تینوں کی باتیں سنی اور اسی سکون سے جواب دیا 'آپ تینوں ہی ٹھیک ہیں'۔

تینوں مینڈک نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ـــ ان کی نگاہ میں وہ تو سب سے بڑا بے وقوف تھا۔ تین سچ کیسے ہو سکتے ہیں؟

اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورہ کیا اور چوتھے مینڈک کا سر کاٹ کر اسے ندی میں پھینک دیا۔

"تو دوستو! میں وہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔ ہاں، 'کل جمیع نگاہ' کے بارے میں آپ سے باتیں کروں گی۔"

اور ہنستے ہوئے وہ سب اپنی اپنی راہ پر چلے گئے۔

دوسرے دن اس کا لکچر سنٹرل ہال میں ہوا۔ تعجب، وہاں بھی تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہندستانی ادب میں کُلیت کی تلاش کرتے ہوئے اس نے کئی مثالیں دیں۔ ہزاروں پنکھڑیوں والے سترنگے کنول کا ذکر کیا۔ تفریق میں بلاتفریق کے فلسفے کی تشریح کی۔ رویندر ٹھاکر کی ان سطروں کی مثال دیتے ہوئے ایک اور جمع کی شکل کو سمجھایا ـــــ

'ریاضت کی طاقت سے 'ایک' کی آتش میں 'جمع' قربان ہو کر جاگ اٹھا تھا۔ ایک ہی عظیم دل سارے امتیازات کو بھول کر۔'

پھر بولی "لیکن میں اتنے پر ہی نہیں رکنا چاہتی۔ آپ سبھی جانتے ہیں کہ بالمیکی پہلے کوی تھے۔ چھند کے ایجاد کرنے والے، لیکن ویاس مہاکوی تھے جنھوں نے کویتا کے چھند کو یعنی زندگی کے چھند کو خود میں جذب کر لیا تھا یعنی کویتا کی پابندیوں کے جمود سے اوپر اٹھ کر عوامی زندگی کے خواب کو بیان کر سکتے تھے۔ یہ رام کے پاس و لحاظ سے کرشن کی لیلا یعنی یوگ تک کا سفر انسان کے لفظ سے معنی تک کا سفر ہے۔ سچ کی تلاش کا سفر ہے۔ سچ تو 'اتنا ہی نہیں، اتنا ہی نہیں' ہے۔ مسلسل سفر کرتا ہے۔ سفر کے اس ارتقائی سفر سے ہی سارا ادب، سارا سائنس، ساری تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ اس لیے ہر زمانے میں کویتا کے چھند بالمیکی سے ویاس تک زندگی کے چھند رام سے کرشن تک مسلسل سفر کرتے ہیں۔ رام الفاظ کے یعنی پابندیوں کے حدود میں بند ہے۔ کیونکہ پروان چڑھتے سماج میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی اخلاقیات ہے، لیکن لفظ جب معنی کھو کر جامد ہو جاتے ہیں تب کرشن آ کر الفاظ کی قید سے یعنی جامد اخلاقیات سے نجات کا پیغام دیتے ہیں۔

"پورانوں میں بیان کیے گئے دشاوتار کی علامت متسیاوتار سے لے کر کرشن اوتار کا سفر، 'رامائن' سے مہابھارت تک کا سفر اسی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ کرشن رام کے بعد آتے ہیں۔ وہ مریادا پرشوتم نہیں، لیلا پرشوتم ہیں۔ یہاں لیلا کے معنی یوگ ہیں۔ اخلاقیات

ہے اوپر اٹھ کر جمیع اخلاقیات کو قدر کی نگاہ دینے کی علامت ہے۔

"آپ نے دوردرشن پر 'رامائن' اور 'مہابھارت' دیکھی۔ پاگل ہو گئے پیش کرنے والے اور دیکھنے والے۔ آریہ تہذیب کی امرت ورشا میں بھیگ اٹھا سارا دیش' لیکن ہائے ری ہماری قسمت! ان مہاکاویوں کے معنی کوئی نہ سمجھ سکا۔ سبھی آکاش میں کھڑے دیوتاؤں، بے شمار قوت اور رفتار سے اڑتے تیروں اور ملکوتی ہتھیاروں کو دُم لگائے دانروں کو، بدصورت شکل ریچھ جام ونت کو، شیطانوں کو، سیتا کی مجروح شکل کو، لوکش کے دستی مہارت کو ـــ سب کچھ دیوی، کچھ بھی انسانی نہیں۔ جو ہے وہ بے ڈول ہے۔ وہی حال 'مہابھارت' کا تھا۔ لفظ بگڑے ہوئے ہیں معنی کوئی جانتا ہی نہیں۔ اسی طرح بیوقوف بنائے رکھنے میں ہی حکومت بنی رہ سکتی ہے۔ کیا یہ سازش نہیں تھی حکومت کی اور یہ دڈیوسرل کی؟ عوام رام اور کرشن کا نام جپتی رہے۔ وہ کس ترقی اور کن اقدار کے سفر کی طرف اشارہ کرتے ہیں ـــ اس راز کو آپ نہ جان سکیں، یہی کوشش تھی ان سیریلوں کے پیچھے۔ اگر آپ ان علامتوں کے مطالب سمجھ گئے تو حکومت کی ساری بدعنوانی عیاں نہ ہو جائے..."

آج ونھا بہ نسبت شدید صورت میں تھی۔ تفصیل سے اس نے کویتا کے چھند پیش کیے اور زندگی کے چھند کی یکسانیت کی' اخلاقیات اور غیر اخلاقیات ، رام اور کرشن کے علامت کو۔ جب اس نے یہ کہتے ہوئے ختم کیا کہ " اخلاقیات اور غیر اخلاقیات کی آج کے حوالے سے تشریح میں کل مہیلا کلیان سمیتی میں ہونے والے لکچر میں کروں گی، تو ہال کافی دیر تک تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونجتا رہا۔ باہر آنے سے کافی دقت پیش آئی، بالخصوص 'رامائن'، 'مہابھارت' کے علامتوں کی تشریح سے طلبا ہی نہیں ٹیچرز بھی مسرور تھے۔

گھر لوٹتے ہوئے اجیت نے اسے سینے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔" ونھا، تو نے آج میرے دل کی بات کہی۔ بہت اچھا کیا۔ کوئی تو ہمت کرے، یہ سب کہنے کی!"

کرن نے تو اپنا سر اُس کے کندھے پر رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔ پھر دھیرے دھیرے بولی، جیسے سپنے میں باتیں کرتی ہو" دیدی! اتنی ہمت، اتنا گیان کہاں سے پایا آپ نے؟"

" اپنی ہی زندگی سے اور اپنے استاد سے۔ جانتی ہے استاد کون ہے؟"

" جانتی ہوں، میری تو وہ استاد بھی ہیں اور ماں بھی "۔
تعجب، گھر پہنچتے ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وبھا نے ریسور اٹھایا تو سنا "میں سمیتا بول رہی ہوں، تم ... ؟"
"میں وبھا ہوں بھابھی، شیاملا کیسی ہے، کب آرہی ہو؟"
"شیاملا کا حال بہت اچھا نہیں ہے۔ ساری باتیں وہاں آکر بتاؤں گی۔ تو کیسی ہے؟ تیرے کل کے لکچر کی خبر ایک اخبار میں دیکھی تھی، بہت مختصر تھی۔ انکت کہاں ہے؟"
"یہیں تو کھڑا ہے، بات کرونا"۔
انکت نے ریسور کان سے لگا کر پوچھا "ممی، تم کب آرہی ہو؟"
"بیٹے، تین دن بعد پہنچوں گی۔ تو ٹھیک ہے نا؟"
"شیاملا بوا اور ان کا بیٹا، وہ بھی آئیں گے؟"
"ہاں بیٹا، وہ بھی آئیں گے۔ تو اپنے پاپا کے ساتھ اسٹیشن آنا"۔
"ضرور آؤں گا، کرن دیدی کچھ کہہ رہی ہے"۔
کرن نے کہا "دیدی نمستے! آج تو وبھا دیدی اتنا اچھا بولیں، اتنا اچھا کہ بتا نہیں سکتی"۔
"میری طرف سے پیٹھ تھپ تھپا دے اس کی۔ اجیت ہیں؟"
کرن نے ریسور اجیت کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے دھیرے سے کہا "بولو سمی!"
"کیسے ہو تم سب؟ شیاملا کے حال اچھے نہیں ہیں۔ پرسوں روانہ ہو رہی ہوں، ریزرویشن کرا لیا ہے۔ تریوندرم آگئی ہوں۔ کل رات کو فون کروں گی۔ تم بھی کر سکتے ہو، ہندی پرچار سمیتی کے گھر۔ وہ مجھے پیغام بھیج دیں گے۔ تلک ہوٹل کے تمھارے کمرے میں ٹھہری ہوں"۔
اجیت ہنس پڑا۔ سمیتا بھی ہنسی "اب رکھ رہی ہوں۔ سب کو میرا پیار۔ تمھیں بھی"۔
"تمھیں بھی" اور فون بند ہو گیا۔

مہیلا کلیان سمیتی نے وبھا کے لکچر کا انتظام ایک پبلک ہال میں کیا تھا۔ وہ بھی کھچا کھچ بھرا تھا۔ عورتوں کی تعداد فطری طور پر زیادہ تھی، لیکن مرد بھی کم نہیں تھے۔ کئی معروف سماج سدھارک

اور ادیب بھی تھے۔

خلاقیات کے مفروضے کو اور واضح کرنے کے مقصد سے وبھانے کہا" میں کسی غیر ملکی ادیب کی نہیں، اسی دیش کی کہانی کار کی ایک حکایت سے آج کا لکچر شروع کرنا چاہتی ہوں۔ کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ـــــ

" گاؤں میں ایک بیوہ تھی۔ دور کے رشتے میں میری بہن لگتی تھی۔ اپنا کہنے کو اُس کا کوئی نہیں تھا لیکن سارا گاؤں اسے اپنوں سے زیادہ پیار کرتا تھا، کیونکہ ان کے دکھ درد میں کھانا پینا بھول کر وہ جی جان سے ان کی خدمت کیا کرتی تھی۔ ایک بھی ایسا گھر نہیں تھا جو اس کے رحم اور کرم کے بوجھ سے دبا نہ ہو۔

" میں بچپن میں بہت شیطان تھا۔ طرح طرح کی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔ ایک دن سوچا کیوں نہ بہن کو ڈرایا جائے؟ گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ پاس میں جامن کا درخت ہے۔ اُس پر چڑھ کر بھوت کی بولی بولوں گا۔ بہت مزہ آئے گا۔ بس شام کو ویسا ہی کیا۔ ویسے ہی آواز گونجی، بہن کی کھاٹ پر سے ایک مرد جلدی سے اُترا اور اُسی کے نیچے چھپ گیا۔

" آپ کہیں گے وہ بہن ضرور بدکردار تھی، لیکن میں کہتا ہوں: کیا اس حادثے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی بیوگی میں اس کی نسائیت بھی گم ہوگئی تھی؟ انسان کے دکھ درد میں خدمت کرکے، غریبوں، بے سہاروں کو خیرات دے کر ساری زندگی جس عظمت کا ثبوت اس نے دیا اس کی کوئی قیمت نہیں طے کی جائے گی؟ عورت کا جسم ہی کیا سب کچھ ہوتا ہے؟ اس کا باطن کیا کچھ بھی نہیں؟ انسان کی سچی شکل ہمیں کس بات میں ملتی ہے ـــــ اس کے جسم کے برتاؤ میں یا اس کے باطن کے کردار میں؟

" اور ابھی کچھ وقت پہلے اسی ملک میں ایک حادثہ ہوا تھا۔ نام نہاد بیدار نوجوانوں نے پکنک پر گئی طالبات کو جسمانی طور سے رسوا کیا تھا۔ لیکن پرنسپل صاحبہ کو ان کے مستقبل کی اتنی فکر تھی کہ عوامی بیانوں میں وہ گندے جملوں اور حرکتوں کے ذکر تک ہی محدود رہیں۔ دوشیزگی کا جذبہ کس قدر شرمناک ہوسکتا ہے۔ ایک بے قصور، بے بس عورت کے ساتھ بلاتکار ہوتا ہے اور وہ عمر بھر کے لیے ذلیل ہو جاتی ہے۔ ویسے آپ شریف لوگوں کے گھر مبارک مواقع پر

ناچ گانے گاتی رہتی ہے اور اُس عورت کے لمس سے آپ کی نفس میں زہر گھل جاتا ہے اور یہ سب ہندو ہیں۔

"آج میں نے دیواروں پر لکھے دیکھا 'گرو سے کہو کہ ہم ہندو ہیں' لیکن مجھے تو شرم آتی ہے اپنے آپ کو ہندو کہتے، حالانکہ مَیں ہندو ہوں اور ہندو ہی رہوں گی۔ ہندو، آریہ یا ویدک کچھ بھی کہہ کر پکارو، اس کی خصوصیات میں گنا سکتی ہوں۔ پرسوں ان کا تذکرہ مَیں نے کیا بھی ہے لیکن جو سماج صدیوں سے ممتا کی طاقت کو اونچے مقام پر بٹھا کر اور لفظی پوجا کر کے بھی ذلیل کرتا آیا ہے، لفظ کو زینت بخشنے میں اس نے ذرا بھی بخیلی نہیں کی ہے لیکن معنی کی دنیا میں یعنی عمل میں 'ماں'، کو پتی پرمیشور کی جائداد ہی مانا جاتا ہے، زمین ہے وہ۔ اس لیے اُن پڑنا ہو کر بھی بے جان اور بے حس ہے۔ اُس کی کوئی آزاد حیثیت نہیں ہے۔ مرد کے گناہوں کی سزا اس نے بھوگا ہے، لیکن اُسے سزا دینے کا حق اُسے کبھی نہیں ملا۔

"پورے ادب میں صرف ایک کرشن ہے جس نے اخلاقیات کے اس مسخ شدہ شکل پر وار کیا ہے اور سبھی معنوں میں جو عورت کا ساتھی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے کہا تھا 'میں سمجھتا ہوں۔ عورت کہیں اگر مرد کے برابر ہوئی ہے تو برج میں اور کانہا کے پاس'۔ اس میں مَیں اتنا اور جوڑ سکتی ہوں کہ پانچ پانڈوں کی بیتنی دروپدی بھی اس کی سکھی ہے، اس کا کپڑا وہی تو بڑھاتا ہے۔

"میں پوچھتی ہوں کہ کسی نے سمجھا ہے اُس علامت کا مطلب؟ سمجھا ہوتا تو کیوں ہوتا ہوؤں پر ظلم اور بلاتکار کے بے شمار واردات اس ملک میں؟ کیا حق ہے مجھے یا کسی کو بھی فخر سے سر اونچا کر کے خود کو ہندو کہنے کا' جب تک اس کے اپنے ہی ایک طبقہ کو دلت، اچھوت کہہ کر ذلیل کیا جاتا ہے؟ اپنی گندگی سر پر اُٹھانے کو مجبور کیا ہے اُسے ہم نے۔ انسان کے ذریعہ ایک انسان کی اتنی بڑی بے عزتی ہو سکتی ہے کچھ؟

"ہم اپنے ماضی پر فخر کر سکتے ہیں۔ وہاں ہماری جڑیں ہیں، لیکن ہم اس زمانے کے اقدار کو اپنے حال اور مستقبل پر تھوپ نہیں سکتے۔ جڑ سے نکل کر ہم بڑھتے ہیں' شاخوں، ٹہنیوں میں پھیلتے ہیں، پھولتے پھلتے ہیں۔ جڑ بنے رہنے کا مطلب وقت کی رفتار کو روکنا ہے۔ تب ہمارے

اس زمانے کے مفکرین نے اس زمانے کے لیے جو قاعدے قانون بنائے تھے وہ آج ہم پر کیوں مسلط ہوں؟ ہمیں اپنے قاعدے قانون، اپنے زمانے کے دستور بنانے کا موقع کیوں نہ ملے؟ ایسا دستور جس میں عورت کی ایک آزاد حیثیت ہو۔ انسان انسان میں سماجی سطح پر کوئی تفریق نہ ہو۔ دلت کوئی نہیں ہوگا۔ مرد، مرد ہوں گے — عورت عورت۔

" عورت جب اپنی آزاد حیثیت کے طور پر اپنی طاقت اور مسائل کے ساتھ مرد کے برابر آکر کھڑی ہوگی تب سماج کی طاقت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ دو متبادل آزاد حیثیت کا ملن ایک دوسرے کی کامیابی اور کامرانی کو تیز رفتار عطا کرے گا۔

"کمیونزم کے مفکرین اور اروند درشن کے شارح دونوں کناروں پر ہوکر بھی عورت کی آزاد حیثیت کے مضبوط دعویدار ہیں۔ اروند درشن کے بانی سری نلنی کانت گپت نے یہاں تک کہا ہے 'سماج کے سلسلے وار رفتار کا انحصار صرف مرد اور عورت کے اتصال پر ہی نہیں بلکہ ایک گہرے اور وسیع تر تبادلہ خیالہ پر ہے'۔

" اور یہ الفاظ مغرب کی ایک خاتون کے ہیں، دماغ، ذہانت، ہمت خواہش اور جذباتی نرمی — یہ انسانی فطرت عورت مرد دونوں میں برابر ہیں۔ اگر وہ ان خصوصیات کو اپنے اپنے ڈھنگ سے الگ الگ روپ رنگ دے سکیں تو ہماری زندگی کتنی سکھی ہوگی'۔

" اس لیے جیسا کہ میں نے کہا کہ صدیوں پرانی روایتیں ہماری مدد نہیں کرسکتیں۔ ہم اپنے زمانے کی قدروں کی بنیاد پر اپنا ایک وسیع تر اخلاقی دستور کیوں نہ تیار کریں؟ روایتوں اور حدیثوں کی کیوں دہائی دیں؟ ایک چھوٹا سا خاکہ ہے میرے ذہن میں۔ تین حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے میں اپنے یقین کے مطابق کسی مذہب کو ماننے کا حق ملک کے ہر باشندے کو حاصل ہوگا، لیکن اس طرح کہ وہ دوسرے شخص کے عقیدے میں حائل نہ ہو۔ کوئی بہتر ہونے کا دعوا نہیں کرے گا۔ سب پیغ کے متلاشی ہوں گے۔

" دوسرے حصّے میں وہ سارے قاعدے قانون ہوں گے جن کا انسان کی سماجی زندگی سے تعلق ہے — جیسے شادی بیاہ، پیدائش، موت، جائداد کا حق، گود لینے دینے کا حق، طلاق، بلاتکار، زندگی کا حق، وراثت وغیرہ وغیرہ۔ ان کے متعلق جو بھی دستور بنے گا وہ ہر شخص پر

بلا کسی تفریق کے مساوی طور پر عمل میں آئے گا۔ مذہب، ذات، نسل، جنس — کسی بھی بنیاد پر کسی کو بھی اس سے آزاد ہونے کا حق نہیں حاصل ہوگا۔

"تیسرے حصّے میں سیاست اور نظام حکومت کا تجزیہ ہوگا۔ مذہب، مسلک کا یہاں کسی بھی طرح اور کتنا بھی دخل نہیں ہوگا۔ حکومت سیکولر ہوگی۔ اپنے آپ کو کسی طرح کسی آئڈیا، دھرم وشواس سے نہیں جوڑے گا، وہ بھلے ہی کمیونزم ہو، سماج وادی ہو، اگا ندھی وادی۔ مذہبی اعتقاد شخص تک محدود رہے گا۔ کسی بھی مذہب، مسلک کے مذہبی مقام سیاست کے اکھاڑے نہیں بنیں گے۔

اس خیال کو بہت سوچ سمجھ کر، پوری طرح غور و خوض کر کے، بیباک ہو کر شکل دینی ہوگی۔ میں دعوت دیتی ہوں کہ ہم سب اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ اس خیال کو عملی شکل کیسے دی جا سکتی ہے۔ میں فخر سے سر اٹھا کر یہ نہیں کہنا چاہتی کہ میں ہندو یا مسلم ہوں یا عیسائی یا سکھ یا پارسی وغیرہ ہوں۔ میں تو فخر سے سر اٹھا کر یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں انسان ہوں، قدرت کی سب سے عظیم تخلیق — انسان۔

"میں یہ بھی کہنا چاہتی ہوں کہ کسی بھی سرکار کو دوبارہ اقتدار جیتنے کا حق ہم نہ دیں۔ کسی کا استحصال کرنے کا اسے کوئی حق نہ ہو۔ موجودہ نظام حکومت کے ہوتے ہوئے عورت کا، دلتوں کا، بچّوں کا استحصال کیوں ہوتا ہے؟ ایسے قانون کیوں بنے ہوئے ہیں؟ ایک طرف تو حکومت شراب بنانے کا لائسنس دیتی ہے، بیچنے کے لیے ٹھیکے کی نیلامی سر عام ہوتی ہے، دوسری طرف آکاش وانی اور دوردرشن پر اس طرح کے دل دہلا دینے والے مناظر ہر روز دکھائے جاتے ہیں جن میں شرابی اور دوسرے نشوں کا استعمال کرنے والے اپنی بیویوں کو پیٹتے ہیں، یہاں تک کہ کبھی کبھی جلا کر مار ڈالتے ہیں۔ پھر خود بھی وقت سے پہلے مر جاتے ہیں بچّوں کو بھکاری بنا کر۔

"ایک طرف ہمارے نیتا خود کفالت اور خود اعتمادی پر منحصر زندگی کے فلسفے کی دعوت دیتے ہیں، محنت سے حاصل کردہ روزی کا گن گان کرتے تھکتے نہیں۔ دوسری طرف وہی لوگ عوام کی بہبودی کے نام پر صوبے میں مختلف قسم کی لاٹریاں چلا کر عوام کو بغیر کچھ کیے ایک

دن میں لکھ پتی ہو جانے کا لالچ دیتے ہیں۔

"ایک طرف عورتوں کو پریشان کرنے والے غیر سماجی عناصر کے خلاف قانون بنا کر عوام سے ایک بیدار اور ترقی پسند سنسکار ہونے کی سند حاصل کرتے ہیں۔ دوسری طرف آلودہ ادب، شہوت زدہ چتر ہار اور بھونڈی فلموں کے ذریعہ عوام کے حسّاس جذبات کو جگا کر انھیں عورتوں سے جرم کرنے کے لیے اُکساتے ہیں۔

"ان دوہرے اقدار کو تبھی دور کیا جا سکتا ہے جب عورت کی آزاد حیثیت قبول کی جائے۔ تب اس طرح کے حادثے نہیں ہوں گے، کیونکہ ان کے لیے کوئی وجہ ہی نہیں رہے گی۔ عورت مرد اپنی اپنی خواہش کے مطابق آزادانہ برتاؤ کر سکیں گے۔ غیر احتیاط یقیناً خطرناک ہے۔ لیکن زیادہ احتیاط بے حد غیر فطری ہے۔ آدی واسی سماج میں بلاتکار لفظ ہی نہیں ہے کیونکہ انھوں نے اپنی سماجی زندگی اس طرح منظم کی ہے کہ اس کا امکان ہی نہیں رہتا۔

"لیکن میں ایک تنبیہہ اپنی بہنوں کو بھی کرنا چاہتی ہوں کہ عورت کی آزاد حیثیت کا، عورت کے سیکس امیج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے مساوی حقوق، برابر کی ذمہ داری، ایک صحت مند سماج کی تشکیل کے لیے دونوں برابر کے حصّہ دار ہیں۔ اردھ ناریشور کی علامت ایک خیال کی مجسم شکل ہے۔ ایک دوسرے سے الگ نہیں ایک دوسرے سے آزاد، پھر بھی جڑے ہوئے، عورت کو بس عورت بننا ہے، سندری اور کامینی نہیں۔

"متضادات سے غرق ہندوستانی تہذیب کو عورت کی آزاد حیثیت کو قبول کر کے ہی مکمل کیا جا سکتا ہے۔ سوال کی بے چینی، مسلسل تلاش کی بنیاد پر آج ایک نئے آئین، ایک نئے دستور کی ضرورت ہے..."

آج اس کی آواز اُس کے اندر سے اس طرح پھوٹ رہی تھی جیسے خود مہادیوی ایک نئے سماج کی تشکیل کے لیے دعوت دے رہی ہو۔ جھرنے کی طرح جھرتے جھرتے اس کے الفاظ گلے سے نہیں دل سے ادا ہو رہے تھے۔ اس کے آخری الفاظ تھے — "میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ سدھار نہیں ہم سب کو انقلاب لانا ہوگا اور یاد رکھنا ہوگا کہ انقلاب کا جنم سب سے پہلے ہمارے دلوں میں ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ دلوں میں ہی بے چینی جنم لیتی ہے، وہیں سے تلاش

شروع ہوتی ہے - آخری کچھ نہیں ہے - بیج ابھی بھی انجانا ہے - سائنسی زمانے میں بیج سے بڑھ کر بیج کے تلاش کی اہمیت ہوتی ہے - تسلسل ہی روایت کی طاقت ہے - ماضی ہماری طاقت ہے لیکن وہ ہمارا آدرش نہیں ہو سکتا، ہمارے حال اور مستقبل پر مسلط نہیں ہو سکتا - ماضی سے قوت ایسے ہی ملتی ہے جیسے درخت کو جڑوں سے، لیکن جڑ کبھی اوپر نہیں پھیلتی، نیچے رہ کر بھی وہ درخت کو پھول اور پھل دیتی ہے - جڑ ہی تو بیج ہے اور بیج کے اندر ہی کونپل پھوٹتی ہے، تبھی وہ لائق ستائش ہوتی ہے -

"ساتھیوں! بہت کچھ متعلق، غیر متعلق میں بول گئی، لیکن مجھے یقین ہے، آپ کو سوچنے کے لیے کچھ تو ملا ہی ہوگا - اس لیے سوچیے اور اپنی راہ خود طے کیجیے - میں تو یہی دعا کرتی ہوں کہ آپ کے باطن میں سوچنے کی بے چینی جاگے - بس اتنا ہی - آپ کا بہت بہت شکریہ کہ مجھ ناچیز کو اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا موقع دیا - ایک بار پھر شکریہ!"

اور وہ سیدھے اپنی کرسی پر جا بیٹھی - تب تک سارا ماحول گونج اٹھا تھا، مسلسل تالیوں کی گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی -

جیسے ہی شکریہ کے کلمات کے بعد تقریب کے خاتمہ کا اعلان ہوا - اس ہال میں ایک طوفان سا آ گیا - وبھا اپنے مداحوں سے گھر گئی - کچھ مخالف بھی تھے جنھوں نے اسے درمیان میں ہی ٹوکنا بھی چاہا تھا - جب اس نے کہا تھا، مجھے شرم آتی ہے اپنے آپ کو ہندو کہنے میں، لیکن پاس کے سامعین نے انھیں بٹھا دیا تھا - اب ان کے ساتھ کچھ غیر سماجی عناصر بھی آ ملے تھے - وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے - ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے بولے "میڈم، آپ نے کہا آپ کو اپنے آپ کو ہندو کہتے ہوئے شرم آتی ہے؟"

"ہاں، کہا - پھر...."

"پھر اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

"تم کون ہوتے ہو مجھے حکم دینے والے؟ اور یہ بھی سن لو، میں کسی کے کہنے سے اُسے چھوڑنے والی نہیں ہوں - بلکہ ایسا بنانے کی کوشش ضرور کروں گی کہ پھر کبھی اپنے آپ کو ہندو کہنے پر فخر ہو - ہندو

انسان کا مترادف بنے۔ بالآخر انسان ہونا ہی تو سب سے اوپر ہے۔"

"عورت کو آزاد کر کے۔ عورت کو بازار میں ..."

اس کے بعد کیا ہوا، کیسے ہوا، جوش اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اور اسی عمل میں کسی نے کرسی اٹھا کر پھینک دی۔ یہ جیسے غیر سماجی عناصر کے لیے اشارہ تھا۔ دھکم دھکا، کرسیوں کا اچھلنا، کچھ لمحے تو چیخ و پکار کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دیا، لیکن پھر وبھا کی آواز گونج اٹھی "ہاں میں نے کہا تھا ـــــ مجھے شرم آتی ہے اپنے آپ کو ہندو کہتے اور تم نے اسے ثابت بھی کر دیا ہے۔"

جب تک رضاکار اور پولس وہاں خاموشی بحال کر سکے، وبھا اور کرن دونوں کے ہاتھوں سے خون بہنے لگا تھا۔ چوٹ شاہدہ کو بھی لگی تھی لیکن وہ حیران انکت کو خود سے چپکائے اجیت کو ڈھونڈ رہی تھی۔

چوٹ بہت گہری نہیں تھی، پھر بھی وبھا اور کرن کے سر میں چار چار ٹانکے لگے۔ جب وہ سب گھر لوٹے گیارہ بج رہے تھے۔ فون کی گھنٹی ایک بار بند ہو کر پھر بج رہی تھی۔ اجیت جانتا تھا، ادھر سمیتا ہے۔ لیکن ریسیور اٹھا کر کہا "کہو، سمیتا"

"اجیت! کیا بات ہے، گھر پر کوئی نہیں تھا کیا؟ میں کئی بار فون ملا چکی بس گھنٹی بجتی رہی۔"

"آج وبھا کا مہیلا کلیان سمیتی میں لکچر تھا۔ بہت کھل کر، آزاد ہو کر وہ بولی۔ سب حیران تھے، لیکن ختم ہونے کے بعد ایک چھوٹا سا ہنگامہ ہو گیا۔"

"کیا، سب ٹھیک تو ہیں؟ چوٹ تو نہیں لگی کسی کو؟"

"وبھا اور کرن کے سر میں چار چار ٹانکے لگے ہیں، لیکن ویسے سب ٹھیک ہے۔ گھر آ گئی ہیں۔ دو چار دن آرام کرنا ہوگا۔"

سمیتا گھبرا گئی، بولی "میں تو فوراً آتی ہوں ہوائی جہاز سے۔"

اجیت نے سمجھایا "ارے نہیں بھائی، ایسا کچھ نہیں۔ تم ویسے ہی پریشان ہو۔ آرام سے شیاملا کے ساتھ ٹرین سے آؤ۔ لو، وبھا آ رہی ہے۔ بہت بات نہ کرنا۔"

فون وبھا کے ہاتھ میں تھا، بولی "سمتا بھی تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔ قصور میرا ہی ہے۔ میں کچھ زیادہ ہی پُرجوش ہو گئی تھی۔ جب تک تم آؤ گی ہم سب مکمل صحت یاب ملیں گے۔ ستیا ملا کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ میں کل دوپہر کو چل رہی ہوں۔ سب باتیں وہیں بتاؤں گی، اجیت کو فون دے۔"

اجیت کو جس بات کا خدشہ تھا وہی ہوا سمیتا نے پوچھا "وجے نہیں آیا کیا، اجیت؟"

"نہیں، وہ نہیں آیا۔ تمہیں وبھا نے کچھ نہیں بتایا تھا کیا؟ وجے نے..."

"وجے نے کیا...؟" سمیتا کی آواز کانپتی ہے۔

"وجے نے شادی کر لی ہے۔ مراٹھی کی جانی مانی ادیبہ وسودھا مہاجن سے۔ دونوں آج کل ہونولولو میں ہیں۔"

سمیتا نے یکبارگی کچھ جواب نہیں دیا۔ اجیت نے پکارا "فون پر بھی تم کھو جاتی ہو۔ اب میں رکھتا ہوں۔ مجھے تمہارا ہی بھروسہ ہے۔ مَن کو شانت رکھنا۔ میں جو ہوں یہاں۔ اچھا ڈارلنگ، سو لانگ..."

حصہ تین

باطن

وبھا اور کرن ایک کمرے میں لیٹی تھیں ۔ شاہدہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک سمیتا بھابھی نہیں آجاتیں وہ یہیں رہے گی، اس لیے اجیت مطمئن تھا ۔ وہ انکت کے ساتھ اوپر سویا ۔ پتاجی اپنے کمرے میں تھے ۔ وہ اچانک لوٹ آئے تھے ۔ وہ بہت خوش تھے۔ یہاں کے حادثے سے وہ اور بھی کھل اُٹھے تھے ۔ بہت دیر تک وہ وبھا کے پاس بیٹھے رہے اور اپنے تجربے سناتے رہے ۔ وبھا تکلیف کے باوجود بہت خوش تھی، لیکن اس کے باطن میں ایک طوفان برپا تھا ۔ خیالوں کی ہلچل تھی، اس لیے بیچ بیچ میں وہ غیر حاضر ہو جاتی تھی یکبارگی اس نے پوچھا "پتاجی، 'راماین' اور 'مہابھارت' دونوں مہا کاویوں کی بنیاد میں عورت ہے لیکن دونوں ہی جنگ میں عورت ہتھیار نہیں اٹھاتی ۔ اپنی ساری آزادی کے باوجود حکم کی طابع بن کر رہتی ہے ۔ سیتا، کنتی، دروپدی اور جانے دیجیے امبا کو بھی ۔ کنتی کے لڑکے کرن کے پتا سوریہ دیوتو پل بھر میں سب کو بھسم کر سکتے تھے ۔ کیا انھوں نے کرشن کی سازش کے بارے میں کرن کو تنبیہہ نہیں کی تھی؟ تب کیا وہ کرن کو اس کے جنم کی حقیقت سے آگاہ نہیں کرا سکتے تھے؟"

پتاجی بولے" شاید اس لیے نہیں بتایا کہ اس سے کنتی کی توہین ہوتی "۔

وبھا ہنس پڑی، بولی" مرد کے سماج نے عورت کی توہین کی کبھی فکر نہیں کی ۔ دلیلیں اور بھی دی جا سکتی ہیں ۔ دھرم کی رکشا کا سوال تھا، اونچی ذاتوں کے غرور کو ختم کرنا تھا، لیکن کچھ ہوا، پتاجی؟ ہوا کل یگ کا آغاز جس میں دھرم کا ایک اور پیر ٹوٹ گیا ۔ 'گیتا' میں دھرم کی رکشا کا اعلان کرنے والے کرشن بالآخر ادھرم کو ہی مضبوط کر گئے ۔ وہ تین اور سات کی تعداد کی طاقت پر پانڈوں کو فتح دلا سکے لیکن ان کے خاندان، ان کے اپنے بیٹوں کی رکشا سا تیکی

بھی نہیں کر سکے۔ ارجن کا ناقابل شکست گانڈیو بھی اسے نامرد بنا گیا۔"

پتاجی مستحکم آواز میں بولے "یہی، یہی تو ثابت کرنا چاہتے تھے کرشن۔"

"تب سے آج تک بار بار مہاپرش آئے، یہی ثابت کرنے، لیکن کچھ سیکھا ہم نے؟ ہمارا من وہیں کا وہیں پڑا ہے۔ غرور، حسد، کینہ، ذلالت — کچھ بھی نہیں۔ سائنس کو ہم نے تخلیقی ذہانت کا عروج کہا۔ لیکن بالآخر وہ بھی تباہی کا ہی سبب بنا۔ کیونکہ جو ساتھی تھا وہ دل تھا۔ انسان وہیں ٹھہرا رہا، وقت کی رفتار صرف اس کا لباس بدل سکی، باطن نہیں۔"

مہندر جی نے ایک بار اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ انھیں کی زبان بول رہی تھی۔ چپ چاپ اٹھے، ہلکے سے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بولے "سو جاؤ، بیٹی، ابھی تو، مجھے خوشی ہے تمھارے پاس خیالات ہیں، جہت ہے اور جوجھنے کی طاقت بھی۔ وہی ہماری تقدیر ہے۔ ابھی صحتیاب ہو لو، تب بات کریں گے۔"

کرن دشاہدہ نہ جانے کب کی گہری نیند میں پہنچ چکی تھیں۔ دیکھا کئی پل تک باطن کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ پھر دھیرے دھیرے آنکھیں جھپکنے لگیں اور کچھ ہی پل میں وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ گئی جہاں ایک دبی دبی مگر بے مثال ہلچل مچی ہوئی تھی، کچھ صورتیں تھیں، کچھ آوازیں تھیں، وہ حیران سی دیکھ رہی تھی۔

ایک عورت آگے بڑھی، بولی 'میں موجود تھی، آپ کی سبھا میں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ کے خیالات جان کر، آپ کی ہمت دیکھ کر، میری مدد کریں گی آپ؟

میرا نام رما ہے۔ میں سنٹرل اسکول میں ٹیچر ہوں، ۳۲ سال کی ہوں۔ چار سال سے طلاق کے لیے لڑ رہی ہوں۔ میری شادی ہوئی تب میں پڑھ رہی تھی۔ میرا شوہر کبھی میرے پاس نہیں آیا۔ اس نے دوسری شادی کر لی ہے، بال بچے ہیں۔ میرا قصور یہی ہے کہ میری پیدائش کے بعد میرے باپ میری ماں کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے، کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔ ماں ان کے نام کی مالا جپتی سہاگن بنی رہی۔

میرے ماما نے میری شادی کی، لیکن جب میرا نام نہاد شوہر نہیں آیا تو میں پڑھنے لگی اور آج اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔ چار سال قبل میں نے طلاق کے لیے عرضی دی، لیکن آج تک

فیصلہ نہیں ہوا ۔ وہ آتا ہی نہیں، اور عدالت میری عرضی قبول نہیں کر رہی، کیونکہ کبھی کبھی کیسا کیسا سرٹیفکیٹ آجاتا ہے اور جج اگلی تاریخ دے دیتا ہے۔ قانون ہی جب انصاف نہیں کرتا تو انسان کیسے کرے گا... ؟

وہ لفظ ہلکے پڑتے ہیں کہ دوسری آواز گونجتی ہے۔ میں ماجدہ ہوں۔ ۲۷ سال کی عمر ہے۔ ۱۹ ویں سال میں شادی ہوئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرا شوہر جاہل ہے اور اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ہے۔ میرے سسرال والے ہوشیار تھے مجھے پڑھایا، نوکری بھی ملی لیکن شوہر ہو کر بھی وہ نہیں تھے۔ میں نے ہمت کی۔ میکے لوٹی، طلاق کی عرضی دی۔ اس نے بھی دی اور ازدواجی زندگی کا حق مانگا۔ وہ جیت گیا۔ میری عرضی خارج ہو گئی۔ عدالت نے کہا "شوہر تمھیں ساتھ رکھنے کے لیے تیار ہے تو طلاق کیوں؟" یہ سچ ہے کہ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا لیکن ... سمجھتی ہیں نہ آپ...

ہم لوگوں میں شوہر چاہے تو تین بار' طلاق، طلاق، طلاق، کہہ کر جب چاہے طلاق دے دے، لیکن ہم پر ظلم بھی ہو تو ہمیں انصاف نہیں ملتا۔

سماج مردوں کا ہے۔ ہر قانون میں انھوں نے ہمیں ہرانے کے راستے چھوڑ دیئے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ طلاق کو بڑھاوا دینے سے سماج بگڑ جائے گا...

تیسری آواز گونجی ـــ میں پربھا منچندا ہوں، ۳۵ سال کی۔ کالج میں پڑھتے وقت میری دوستی ایک انجینئر سے ہوئی۔ وہ دوستی گہری ہوئی، اتنی کہ شادی میں بدل گئی۔ میرے باپ پائلٹ تھے۔ ایک حادثے میں ان کی موت ہو گئی۔ ماں کو اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ پاگل ہو گئیں۔ دادا، دادی نے پالا لیکن میری شادی ہونے تک وہ بھی مر چکے تھے۔

ہماری ایک بیٹی ہوئی تبھی شوہر نیروبی چلے گئے۔ ایک سال تک خط آتے رہے، بعد میں اچانک فون آیا' میں ایک انگریز عورت سے محبت کرتا ہوں۔ اسی سے شادی کروں گا!' اس نے یہی کیا۔ بعد میں اسے بھی چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے شادی کی۔ میرا یقین ٹوٹ گیا۔ میں سسرال سے اپنے گھر آگئی۔ ایک اسکول میں نوکری کر لی۔

پھر طلاق کے لیے کئی عورتوں کی تنظیموں سے بات کی۔ عیسائی ہیں ہم۔ چرچ سے بھی بات کی۔ تب ہائی کورٹ میں میں نے دو عرضیاں دیں۔ ایک کے ذریعہ ہندوستانی طلاق ایکٹ کے آئین کو چیلنج کیا اور دوسرے کے ذریعہ قانونی طلاق کی مانگ کی۔

لیکن ابھی تک طلاق نہیں ملی۔ پورے بارہ سال ہو گئے۔ میں اصولوں کے لیے لڑ رہی ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ جو قانون مطلقہ کے زمرہ میں لاکر عورتوں کو کھڑا کر دیتا ہے وہ طلاق کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟ میں یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ جب شوہر دوسری عورت کے ساتھ باقاعدہ شوہر بیوی کی شکل میں رہ رہا ہے تو پہلی بیوی کو طلاق کیوں نہیں مل جانی چاہیے، تاکہ وہ بھی آزاد ہو کر اپنے لیے نئی زندگی نئے ساتھی کی تلاش کر سکے؟

چوتھی عورت بے حد جدید اور خوبصورت تھی۔ اُس کے گھنگھرالے بال اُس کے بائیں طرف کے چہرے کو چھپاتے اسے اور بھی دلفریب بنا رہے تھے۔ ویسے ہی مخمور آواز میں بولی، میں نے تمھیں سنا ہے، تم سے متفق بھی ہوں۔ لیکن کیا تم یقین کرو گی میں جب شادی کر کے نئی زندگی کے خواب دیکھنے شوہر کے گھر میں آئی تھی میں اتنی شرمیلی تھی کہ میرے آج کے روپ کو دیکھ کر تم یقین ہی نہیں کر سکو گی۔ کافی دن تک میں شوہر کی عزیز بن کر اپنی قسمت کو سراہتی رہی۔

پھر شروع ہوا میرا نیا سفر۔ شوہر مجھے پارٹیوں میں لے جاتے تھے۔ اب ان کا اصرار رہا کہ خوبصورت سے خوبصورت دکھوں، 'تم خوبصورت ہو، تمھاری حسین زلفیں تمھارے چہرے کی رونق ہیں۔ انھیں آزاد رہنے دو۔'

انھوں نے اپنے افسروں سے میرا تعارف کرایا۔ میں مارے شرم کے بول نہ پائی۔ وہ حوصلہ افزائی کرتے 'سماج میں عورت کو آگے بڑھنا ہے تو گھر تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔'

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی —— بڑا لمبا عمل ہے یہ۔ میں آزاد ہوتی گئی۔ تعجب، مجھے یہ اچھا لگنے لگا۔ ہنسنا، مذاق کرنا۔ مردوں کا لمس مجھے مسرور کر جاتا اور میں کچھ بغیر خواہش کے جسمانی طور پر قریب آتی گئی۔ شروع شروع میں روایتی سنسکاروں کی وجہ سے میں ندامت سے بھر اُٹھتی، لیکن رات کے سناٹے میں رفتہ رفتہ مجھے لگنے لگا کہ کوئی ہو ویسا ہی مرد میرے

آغوش میں۔ لیکن میرے پاس تو لیٹا رہتا اپنے نئے عہدے کا خواہش مند۔ مجھے دوسرے مرد کے قریب آنے کی حوصلہ افزائی کرتا ایک نامرد۔ مجھے اس سے نفرت ہونے لگی اور یقین کرو، کچھ ہی دنوں میں میں خود ہی جانے لگی وہاں جسے سماج دوزخ کہتا ہے۔ میرے شوہر سیڑھیاں چڑھتے گئے۔ میرے تلوے سہلاتے رہے اور میں خوشیوں کے سمندر میں بہتی رہی۔ رس بکھیرتی رہی اس کے افسروں کے بستروں میں۔ بھرپور زندگی جی میں نے۔ میرے شوہر منیجر ہو گئے اور میں منیجر کی بیوی جس کے آنکھ کے اشارے پر سارے قدموں میں بچھ جاتے۔

کیا یہ گناہ ہے، یا عورت کے زندگی کی کامیابی؟ کچھ لوگ اسے بیوپار کہیں گے۔ کیا سماج بیوپار پر نہیں ٹکا ہوا؟

کئی لمحے وہ سوال ـــ 'نہیں ٹکا، کیا؟' پوری فضا میں گونجتا رہا۔ پھر مدہوش ہنسی ہنستی وہ عورت اچانک نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ کسمسائی لیکن تبھی ویسی ہی مختلف شکلیں، ماڈرن عورتوں کا ایک گروہ آ پہنچا۔ وہ بولیں ـــ ہم نے بھی آپ کا لکچر سنا۔ ہمارا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم ملزم نہیں ہیں۔ ہم بھی اپنی شرطوں پر جینا چاہتی ہیں۔ مرد کو جو حقوق حاصل ہیں وہ ہم بھی چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی سکھ چاہیے، آسودگی چاہیے۔ فرق اتنا ہوتا ہے کہ اب تک مرد اپنے حق کا استعمال کرتا رہا۔ ہم اپنے آپ کو مظلوم، ستائے ہوئے اور استحصالی سمجھتی رہیں۔ اب ہم مرد کو نچاتی ہیں، اپنی شرطوں پر معاہدہ کرتی ہیں، ویسے ہی جیسے دوسر کاریں کرتی ہیں۔ ہمیں سماج قبول کیوں نہیں کرتا؟ کیوں... کیوں... کیوں؟ یہ گونج کچھ کم ہی ہوئی تھی کہ حملہ آور انداز میں ایک اور عورتوں کا ہجوم وہاں آ پہنچا۔ انگارے سا دہکتا ان کا اٹ پٹا بناؤ سنگار، غصّے سے بے چین، پُر جوش ان کی آواز یہ پوچھتی ہوئی ـــ ان جدید خواتین کے جنم سے صدیوں قبل ہمارا جنم ہو گیا تھا۔ مرد کی سہولت کے مطابق مختلف شکلوں میں ہمارا نام رکھا گیا۔ اپسرا، طوائف، نگر ودھو، رقاصہ، منگل مورتی، ویشیا، کسبی، رنڈی ـــ یہ سب ہمارے ہی تو نام ہیں۔

اور اوگھڑ دانی شنکر نے جیسے سمندر منتھن سے نکلنے والے زہر کو حلق میں دھارن کر دیو اور دانووں کی رکشا کی تھی ویسے ہی ہم سماج کی گندگی کو اپنے جسم میں پیوست کر کے

اُس کے صحت کی حفاظت کرتی ہیں۔ تب ہمیں کیوں نہیں ملتی عورت کا پاس و لحاظ ؟ کیوں نہیں بنتا ہمارا بلیدان ہمارے بچوں کی ڈھال ؟ کیوں وہ مجبور ہیں اسی مہذب سماج کی نفرت کا کردار بننے کے لیے کیوں... کیوں... کیوں...؟

ایک بار پھر طویل خلا کیوں۔ 'کیوں' کی آواز اور بازگشت سے گونج اٹھا...

تب اُس نے گھبرا کر دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے سر میں ہزاروں بچھو ڈنک مار رہے ہیں۔ وہ چیخ اُٹھنے کو ہوئی لیکن وہاں تو بے شمار آوازیں گونج رہی تھیں۔ پورا ماحول گونج سے بھر اُٹھا لیکن وہ حیران، اشانت اسی طرح پڑی رہی۔ تبھی ایک سنجیدہ آواز آئی، 'سب مردوں کو الزام لگا رہی ہیں۔ مردوں کا سماج ہے وہ۔ جو قانون بناتا ہے وہ اپنے بچاؤ کا راستہ رکھ لیتا ہے، یہ میں اقرار کرتا ہوں، لیکن کیا قصور صرف ان کا ہی ہے؟ عورت قصوروار نہیں ہے؟ کائنات کے آغاز میں عورت مرد برابر تھے۔ ان کی جائداد بڑھتی رہی، عورت کی گھٹتی رہی۔ تب عورت نے بغاوت کیوں نہیں کی؟ وہ مرجاتی لیکن اپنے حقوق کے لیے لڑتی۔ لیکن وہ نہیں لڑی۔ تب اس کی کوئی تو وجہ رہی ہوگی اسی وجہ کو تلاش کرنا ہوگا تمھیں۔ نہیں کیا...؟'

وہ مردانہ آواز مدھم پڑی ہی تھی کہ ایک اور مردانہ آواز طنزیہ لہجے میں آئی ــــ 'مرد عورت کو اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے، لیکن سب سے پہلے حوا نے ہی آدم کو وہ پھل کھلایا تھا۔ یمی نے یہی یم سے پرارتھنا کی۔ دیویانی نے ہی کچ کو سپرد کرنا چاہا تھا۔ کیا آج بھی بے شمار شادی شدہ عورتیں خوشی خوشی غیر مرد کی ہم بستر نہیں بنتیں...؟'

دبھا کا مجروح دل اب بری طرح پریشان ہو اُٹھا۔ اس نے آنکھیں بند کرنی چاہیں لیکن آنکھیں بند کر لینے سے گونج تو نہیں مٹتی۔ تب وہ یکبارگی بڑے زور سے چیخ اُٹھی۔

تبھی اچانک اس کی آنکھ کھُل گئی۔ اس نے دیکھا کہ سبھی شانت سوئے ہیں۔ صرف اُس کا دل دھونکنی سا چل رہا ہے۔ چیتنا کے دروازے پر جب کوئی اچانک دستک دیتا ہے تو پورا وجود کانپ اُٹھتا ہے... لیکن کیا یہ سب اچانک ہوا تھا...؟ وہ کئی پل آنکھیں کھولے خلا میں گھورتی رہی، سوچتی رہی۔ وہ بھی تو ایک سے زیادہ بار دیجے کی ہم بستر بن چکی ہے،

اپنی خوشی سے۔

اور کیا اب وہ...؟

نہیں، نہیں۔ جب مرد کو حق ہے تو مجھے کیوں نہیں؟ عورت مرد کی خواہش کرتی ہے تو اس میں تعجب کیسا؟ میں اسے پاپ نہیں مانتی۔

تبھی کہیں دور سے کھلکھلاتی ہوئی ایک آواز گونجی 'تو تم بھی مرد بننا چاہتی ہو'۔

اُس نے تیز آواز میں جواب دیا' تو اس میں برائی کیا ہے؟ سماج میں سبھی برابر کے حقدار ہیں

'نہیں! یہ ایک اور آواز تھی' لیکن اس کے لیے ایک صحیح راہ کی تلاش کرنی ہوگی!

'کیا ہے وہ راہ؟"

' اسے تلاش کرنا تمھارا کام ہے۔ باطن میں سوال اُبھرا ہے، جواب بھی وہیں سے ملے گا۔ جدوجہد سخت اور طویل ہے۔ ابھی تو تمھیں 'پرسنل لا' کے خلاف اور مرد کا عورت کے حق میں قانون بنانے کی سازش کے خلاف قانون کے مختلف متضادات کے خلاف جوجھنا ہوگا، لیکن عورت بن کر ہی، مرد بن کر نہیں'

بہت پاس سے، بہت ہی شانت آواز آئی' میں بتاؤں ایک راستہ ـــــ سماج میں رائج شادی ابھی جسمانی سطح سے زیادہ بندھا ہوا ہے۔ اس لیے جسم کے نچلے حصوں کا ملن جنسی تعلق کی علامت بن گئی ہے۔ لیکن جنسی تعلق کے بغیر بھی وہ ملن کتنا پُرلطف اور مکمل ہوتا ہے وہ ہماری نئی نسل آسانی سے دیکھ سکے گی۔ جنسی تعلق کی شرط جب شادی سے ہٹ جائے گی تب شادی سے وابستہ ذہنی پیچیدگی جرم اور حقارت کا جذبہ بھی اس سے نکل جائے گا اور شادی سماج میں زیادہ کامیاب، آسان اور پُروقار ہو جائے گی۔ عورت مرد کے درمیان بوسہ اور ہم آغوشی کے حدود کے نیچے نہ اترنے والا تعلق بن سکے، وہ ان کے لیے ایک فطری اور آسان وسیلہ بن سکے۔ ایک نئے طریقہ شادی کو ہم رائج کرنا چاہتے ہیں'۔

وہ حیرت زدہ ہنس پڑی، لیکن دوسرے ہی لمحے سب کچھ شانت ہو گیا۔ وبھا سمجھ گئی کہ یہ اس کے اپنے اندر اُٹھنے والا ایک طوفان تھا۔ اسے سکون ملا۔ کل ہی تو سمیتا شیاملا کو لے کر آرہی ہے۔ دونوں عورتیں، دونوں محبت سے لبریز روحیں لیکن پھر بھی کتنی مختلف

کتنی دور۔ اُسے نیند آنے لگی، لیکن سیٹیاں تو ابھی بھی بجے جا رہی تھیں۔ ایک سوال گونج رہا تھا۔۔۔ کیا جسم کا سچ دل کے سچ سے الگ ہوتا ہے؟...

کرن

کرن سمیتا کے ساتھ رہتے ہوئے اخلاقی اقدار سے تعمیر شدہ سنسکاروں سے تقریباً آزاد ہو چکی تھی۔ ابھیمنیو کی طرح سنسکاروں کے جال میں پھنس کر متوسط طبقے کے لوگ ہی بہادری سے مر سکتے ہیں، اس لیے اسے سبھا میں چوٹ ضرور لگی لیکن وہ صرف جسمانی تھی، اس کا دل تو کسی تابناک روشنی سے منور ہو اُٹھا تھا جیسے وہ کسی بہت ہی اونچی دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ ربھا جب خود سے جد و جہد کر رہی تھی، وہ معمول کے مطابق اپنی پرانی سہیلیوں سے گھری انھیں اس حادثے کے بارے میں اس طرح تفصیل سے بتا رہی تھی جیسے اُسے کوئی بہت بڑا انعام ملا ہو۔ اس کی سہیلیاں ایک طرف تو چوٹ سے دُکھی تھیں، دوسری طرف اسے جتنی شہرت ملی اُس سے وہ اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کر رہی تھیں۔ چوٹ کے بارے میں پوچھنے پر اُس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا "ارے میں کیا بتاؤں، جب پتھر آنے شروع ہوئے تو بھگدڑ مچ گئی، لیکن ربھا بُواجی ذرا بھی نہ گھبرائیں۔ سب سے زیادہ چوٹ انھیں کو لگی۔ چار ٹانکے مجھے بھی لگے ہیں، درد بھی ہے۔ لیکن دل بہت خوش ہے۔"

ایک سہیلی بولی "اب تُو ہم سے بڑی چیز ہو گئی ہے۔ تیرا فوٹو دیکھا ٹی۔وی پر۔ خون کے دھبوں سے بھری پٹی۔ میں تو ڈر گئی تھی۔ کتنے لوگ تجھے گھیرے ہوئے تھے۔"

دوسری بولی "اونچے لوگن کے ساتھ تو بھی اونچی ہو گئی۔ ہم سے نفرت کرے گی۔"

"میں کیوں کروں گی نفرت؟ اب کوئی نہیں کر سکتا ہم سے نفرت۔ جیل جانا پڑے گا۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں" تیسری بولی "آج بھی ہم سر پر ان کا میلا اُٹھاتی ہیں۔ ان کی خاموش نفرت کو سہتی ہیں۔"

کرن بولی "ہاں، یہ تو بات ہے، اب جلد ہی سرکار قانون بنا رہی ہے۔"

"سنا ہے دوسرے ملکوں میں گھر کے بڑے لوگ میلے کی بالٹی سڑک پر رکھ آتے ہیں۔"
"رکھ آتے تھے لیکن اب تو ہر جگہ فلش کے پاخانے بن گئے ہیں۔"
"کچھ بھی ہو، چالیس سال ہو گئے آزاد ہوئے، ہم وہیں ہیں۔ جو دس پانچ اوپر اٹھے تھے وہ ویسے ہی ہو گئے جیسے بڑی ذات والے تھے۔"
کرن بولی "یہی تو ہماری کمزوری ہے۔ ہم کیوں کریں یہ کام؟ ہڑتال کر کے بیٹھ جاؤ۔"
"تب کھلائے گا کون؟"
"اب اپنا حق لینے کے لیے کچھ تو قربانی کرنی ہی ہو گی۔ وہ ہمیں بھوکوں نہیں مرنے گے۔ دنیا ہمارے ساتھ ہے۔"

پھر یکبارگی منظر بدل گیا۔ وہ ایک خوبصورت مکان میں ہے۔ خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ باجے بج رہے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ خوش ہے۔ آنکھ چرا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے، وہ تو وجے پکارے ہے۔ نہیں۔ نہیں، وہ تو شونا تھ ہے۔ نہیں۔ نہیں وہ مہندر جی کا پیارا شاگرد ہے جس نے ایک دن اس سے خوب باتیں کی تھیں۔ تب اس کے سوا کوئی گھر پر نہیں تھا۔ اس نے اسے چائے پلائی تھی۔ اس نے پوچھا تھا "تیری شادی کسی اونچی ذات میں ہو جائے تو تو خوش ہو گی؟"
تعجب، اس نے سخت آواز میں فوراً جواب دیا تھا "نہیں، شادی میں اپنی ذات میں ہی کروں گی، پڑھے لکھے سمجھدار نوجوان سے۔ تب ہم دونوں مل کر اپنی ذات والوں کو تعلیم یافتہ کریں گے۔ اپنے حقوق کے لیے لڑنا سکھائیں گے۔"
وہ بولا تھا "مان لو، میں تمھاری ذات میں شامل ہو جاؤں۔ وہی میلا ڈھونے کا کام کروں۔"
"نہیں، نہیں، یہ طریقہ غلط ہے۔ ہم تو اس کام کو ہی بند کروانا چاہتے ہیں۔ باقی سب کام برابر، نہ کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا، سب کو کھلی چھوٹ ہو، کوئی کام کرے۔ ذات کیوں بدلے؟ سب ذات ایک ہوں۔"
"معلوم ہوتا ہے سیتا جی نے تمھیں بالکل بدل دیا ہے۔"

"سچ، سمیتا دیدی بہت اچھی ہیں۔ وہ دیوی ہیں۔ کاش میں ان کی اچھی شاگردہ بنوں۔ ذرا بھی فرق نہیں کرتیں۔ میں نے جب بلاتکار کرنے والے پر پتھر مارا تو وہ بہت خوش ہوئیں، مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ تب میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا، ان کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔ میرے لیے انھوں نے کتنا کیا۔ پچھلے جنم میں وہ ضرور میری ماں تھیں۔"

اس نوجوان نے کہا "تو تم مجھے قبول نہیں کرتی؟"

"انکار کیوں کروں گی؟ تم میرے دوست رہو گے۔"

اچانک منظر پھر بدل گیا۔ نہ جانے وہ کہاں ہے؟ ایک عجیب سے مکان میں، جو ابھی پورا نہیں بنا ہے۔ وہیں ایک نوجوان، اس کی ذات کے ایک نوجوان سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ اس سے کہہ رہا ہے "میں تمھارا نام جانتا ہوں۔ تم کرن ہو۔ تمھاری بہن کو میں جانتا ہوں۔ تم تو اب اونچی ذات میں رہنے لگی ہو۔"

چمک کر وہ بولی "تو کیا ہوا، اس سے ذات تو نہیں بدلی۔ میں ذات بدلنا نہیں، مٹانا چاہتی ہوں۔"

"تم شادی کرو گی؟"

"کروں گی۔"

"کس سے؟"

"جواب دے سکتی ہوں جس سے دل مل جائے۔ لیکن میرا ایک فیصلہ ہے، وہ منگیتر میری ذات کا ہوگا۔ اُس کے ساتھ مل کر میں اپنی ذات کی احساس کمتری کو دُور کروں گی۔ بڑی ذات میں مل کر اُن جیسی نہیں بنوں گی۔ یہ کیا بات ہوئی کہ دو چار جن پڑھ لکھ کر اونچے ہو جائیں اور ہم سے نفرت کرنے لگیں۔ نہیں، نہیں یہ پاکھنڈ ہے۔ میں ذات نہیں مانتی۔ لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ اپنی ذات میں پیوست احساس کمتری ہے اور یہ احساس ہماری بیداری کو ریت دیتا ہے۔ لیکن ہمیں پہلے اسے کاٹنا ہے۔ میں اُسی سے شادی کروں گی جو

میری بات سے اتفاق کرے، سچے من سے میرا ساتھ دے، میرا دوست بن کر۔"

کئی لمحے کے لیے وہ نوجوان حیران متحیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "میں آئی۔اے۔ایس ہوں۔ ڈپٹی سکریٹری ہوں۔ میں تم سے متفق ہوں۔ مجھے قبول کروگی؟"

"کروگی، لیکن اس لمحے نہیں، ابھی ہم مل کر کام کریں گے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"اور اگر کبھی ایسا موقع آیا کہ ہم میں اختلاف رائے ہوگیا۔۔ تو۔۔۔؟"

وہ فوراً بول اٹھا، "تو کیا ہوا، اختلاف تو ترقی کی نشانی ہے۔ چاہے اچھا ہے ہم ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں اور اگر ہمیں اپنے راستے الگ چننے پڑے تو مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

"تب میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

اور تبھی اُس نے کروٹ بدلی، آنکھ کھل گئی، گھپ اندھیرے کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن دور، بہت دور سے گھنٹیوں کی آواز اُسے ایک مسرت سے بھر رہی تھی۔ اُسے خود پر بہت حیرانی ہوئی۔ اُس کے باطن میں ابھی نہ جانے کیا کیا چھپا ہوا ہے۔

اور کئی لمحے اُسی خوشی کے حال میں سوچتے سوچتے اُسے پھر نیند کی لوریاں سنائی دینے لگیں۔ آنکھیں بند ہوگئیں، صبح جب اُٹھی تو اُسے کچھ بھی واضح طور پر یاد نہیں تھا۔ کچھ دھندلی غیر متعلق تصویریں ذہن پر ابھرتیں اور مٹ جاتیں۔ لیکن اُس نوجوان کی تصویر اُس کے دل کے پردے پر دھندلی لکیروں میں آویزاں ہوگئی تھی جو مسلسل واضح ہو رہی تھی۔

کیا ایسا نوجوان اُسے ملے گا۔۔۔؟

شاہدہ

شاہدہ کے سر میں چوٹ نہیں لگی تھی۔ داہنے ہاتھ کے اوپر ہلکا سا زخم ہوگیا تھا لیکن اُس رات اسے جلدی نیند نہیں آئی۔ وہ بہت دیر تک شوہر ناتھ کے ساتھ عشق فرماتی رہی۔ اُس نے نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن شادی کرنے کا فیصلہ اُس سے بھی پختہ تھا۔ جب وہ سوگئی تو اُس نے اپنے آپ

کولندن میں پایا تھا۔ کبھی کسی مکان میں، کبھی کسی عمارت میں شونا تھ ساتھ رہتے، عاشقانہ گفتگو بھی ہوتی، لیکن ہر بار ایک گوری خاتون بلا جھجک اُن کے درمیان آجاتی تھی اور ایسا برتاؤ کرتی جیسے وہ اُس کی سب سے پیاری دوست ہو۔ شونا تھ نے دونوں کا تعارف کرایا تھا کہ ماریا اس کی ہم پیشہ بھی ہے اور ایک اچھی دوست بھی۔ شاہدہ کو بھی اُس نے اُسے اپنا دوست بتایا منگیتر نہیں۔

بعد میں شاہدہ نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا۔" مجھے فوراً اس سے یہ کہنا مناسب نہیں لگا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ لوگ . . . اب تم سمجھو گی نہیں۔ دو چار دن رہو گی تو دیکھ لو گی۔ تمھارے اور اُن کے برتاؤ میں بہت فرق ہے۔ وہ بہت آزاد خیال ہیں۔"

"میں بھی آزاد ہو جاؤں؟"

"ارے، نہیں بھائی، میں یہ نہیں کہتا۔ یہ تو تمھاری اپنی پسند ہے۔ ویسے مجھے تمھارے آزاد ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا . . ."

تبھی اچانک منظر بدل گیا۔ شاہدہ کی غزل سننے کے لیے ایک محفل جمی۔ پھر اچانک بی بی سی پر پروگرام ہوا، اور گاتے گاتے اچانک بھارت لوٹ آئی، اپنی ماں سے بحث میں الجھی ہوئی۔

پھر نہ جانے کہاں سے سمیتا آگئی اور نہ جانے کن خطرناک راستوں سے اُسے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ ایک ایسی خطرناک جگہ ہے جہاں دور دور تک ہریالی نہ مکان، بس کھنڈر ہی کھنڈر ہیں۔

شاہدہ کہتی ہے۔" کہاں چل رہے ہیں ہم؟"

سمیتا جواب دیتی ہے۔" بولو نہیں چپ چاپ چلی آؤ۔"

پھر اچانک وہ دونوں ایک خوبصورت بستی میں ہیں۔ سمیتا شاہدہ کو ایک خوبصورت ریستراں میں لے جاتی ہے۔ کافی کا آرڈر دے کر وہ باتیں کرنے لگتی ہیں۔

شاہدہ پوچھتی ہے۔" تم اچانک کیسے آگئیں؟"

"جیسے تم آگئیں۔"

"مجھے تو پتہ ہی نہیں۔"

"مجھے بھی پتہ نہیں۔"

تبھی اچانک وہ چیخ سی اٹھتی ہے۔" وہ دیکھو ادھر۔"

شاہدہ حیران سی اُدھر دیکھتی ہے ــــ وہ تو شونا تھ ہے۔ ایک گوری عورت کے ساتھ بغلگیر ہوا چلا آرہا ہے، ہنستے، دھیرے دھیرے پیار بھری باتیں کرتے۔ دونوں کی آنکھیں محبت سے سرشار ہیں۔

شاہدہ کانپ اُٹھتی ہے۔

تبھی منظر بدل جاتا ہے۔ وہ اکیلی خوفناک سنسان میں گھوم رہی ہے۔ اچانک کوئی غیر مرئی عورت اُسے کھینچ لیتی ہے ــ تم ہی شاہدہ ہونا؟ تمھاری تعریف کرتے نہیں تھکتی سمیتا اور تمھاری سہیلیاں۔ کتنے انعام پائے تم نے لیکن دیکھ لیا کتنی بھولی ہو تم۔ شوناتھ کے پیچھے پاگل ہوگئی ہو۔ شوناتھ مرد ذات کا ہے، بھلے ہی کبھی درج ذیل فہرست ذات کا رہا ہو۔ آج اُس کا سماج میں مقام ہے۔ اُسے عورتوں کی کیا کمی؟ ابھی سمیتا نے دکھایا نہ تمھیں۔ کیا تجھ میں کچھ طاقت ہے۔ سمجھ ہے؟ اور میں کہتی ہوں، وہ ہے تجھ میں۔ تو اُس کا استعمال اپنے سماج کی عورت کو جگانے میں کر۔

مرد تو کبھی بھی خریدے جا سکتے ہیں۔ تیرے جسم کو بھی مرد کی ضرورت ہے۔ ویسے ہی مرد کو بھی ہے۔ وہ دس عورتوں کو خریدتا ہے اور شریف زادہ بنا رہتا ہے۔ ہم دس مردوں کو خریدیں تو ویشیائیں کہلائیں۔ کیوں، کبھی سوچا تو نے؟ بھاگ چلی اُسی کے پیچھے جو تجھے بیچ سکتا ہے۔ تو ہمت کر، اپنے سماج کے نجی قانون کے خلاف آواز اُٹھا۔ سنا ہے، ایک خاتون صحافی منجولتا کا نام؟ شرت بالو کے ایک ناتمام ناول کی ہیروئن ہے، خوفناک متی مالا۔ تمھیں ویسا ہی بننا ہے۔ تمھارا صرف ایک کام ہوگا ــ پرسنل لا، نجی قانون میں تبدیلی لانا۔ منجولتا کا مضمون پڑھ لینا۔ شاہ بانو کا کیس تو دنیا میں مشہور ہے۔ سپریم کورٹ میں جیت کر بھی وہ لوک سبھا میں ہار گئی۔ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴ کے تحت اس مطلقہ خاتون نے اپنے شوہر سے زندگی گزارنے کے لیے گزارہ کی مانگ کی تھی۔ عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن تمھارے ہی مذہب کے کٹر پنتھیوں نے اس کی مخالفت کی۔ سرکار ان کے آگے جھک گئی اور مسلم عورت تحفظ قانون بن گیا۔ انھوں نے سرکار کو چیلنج کیا ہے کہ وہ اپنے پرسنل لا میں کسی طرح کی دخل اندازی برداشت نہیں کریں گے۔ مرد طلاق بھی دے دے تو عورت گزارے کی رقم نہیں مانگ سکتی۔ وقف، بورڈ

ہے، لیکن وہ دے یا نہ دے۔

منجولتا نے عیسائی خاتون کی مثال بھی دی ہے جو طلاق کو آسان بنوانا چاہتی تھی، لیکن سب خاموش ہیں۔ رومن کیتھولک عیسائی اس سلسلے میں سب سے زیادہ سخت ہیں۔ اکیسویں صدی کے کمپیوٹر کے زمانے میں چھلانگ لگانے والے ہم ہندستانی اپنے اندر ابھی بھی تیرہویں صدی میں جی رہے ہیں اور جیتے رہنا چاہتے ہیں۔ تبدیلی کو مذہب کی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ صرف ایک شخص تھا جس نے کامیاب طور پر نجی قانون کے خلاف آواز اُٹھائی۔ وہ تھا نام نہاد اچھوت ذات کا شخص، نام تھا، بابا صاحب ڈاکٹر امبیڈکر۔ کتنا ذلیل کیا نام نہاد اونچی ذات نے اُسے لیکن اسی کی وجہ سے بن سکا ہندو کوڈ بل۔ بھلے ہی بحث طلب رہا ہو، لیکن ترقی کی طرف اٹھا وہ ایک کامیاب قدم تھا۔ اُسی کی وجہ سے عورتوں کو حقوق ملے۔ کاش، ڈاکٹر امبیڈکر تبھی ایک مساوی سول کوڈ کی بات اٹھاتے۔ کاش، وہ بودھ مذہب قبول نہ کرتے، اندر سے ہندو دھرم پر حملہ کرتے۔ وبھا نے اپنے مضمون میں اسی سول کوڈ کا خاکہ دیا ہے۔ یہ ہندوؤں یا کسی خاص ذات کا سول کوڈ نہیں ہے۔ یہ بھارت کا سول کوڈ ہے۔ تمھیں اُسی کو وسیع کرکے اس کے لیے زندگی وقف کردینی ہے۔ ہوسکتا ہے اس عمل میں تمھیں زندگی کا ساتھی مل جائے یا زندگی دینی پڑے، لیکن تمھیں اُس کی فکر نہیں کرنی ہے۔

تمھیں سب سے پہلے کثرتِ ازدواج کے نظام پر زوردار حملہ کرنا ہے۔ تمھیں سمجھانا ہے کہ مرد اور عورت کے سبھی حقوق برابر ہوں گے۔ تمھیں قانون کی اتنی فکر نہیں کرنی جتنی ذہنی تبدیلی کی۔ ایسی خواتین اور مردوں کی مذہب، ذات، عہدہ کی فکر کیے بغیر ایک تنظیم بنانی ہے۔ بھلے ہی شروع میں تمھیں دس لوگ بھی نہ ملیں۔ گاندھی نے جنوبی افریقہ میں جب ستیاگرہ کا بگل بجایا تھا، کتنے لوگ تھے ان کے ساتھ؛ انگلی پر بھی نہ گنے جانے قابل۔ لیکن بوند، بوند سے ہر تحریک سمندر بن جاتی ہے۔ اگر بیڑہ اُٹھانے والے میں عزم ہو، جان کی پروا نہ ہو، مایوسی نہ ہو۔

تمھیں سب سے پہلے اُن قوانین کا مطالعہ کرنا ہے۔ بیباک ہونے کے لیے سماج کی رگ رگ کو جاننا پڑتا ہے۔ خوف انجانے پن سے ٹپکتا ہے۔

کرسکو گی یہ؟

تعجب اشاہدہ حوصلہ سے چیخ اٹھی ۔"کروں گی، ہار جیت کی فکر کیے بغیر کروں گی۔"

اور تبھی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اُس کا دل دھڑک رہا ہے۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی ہے۔ خواہش کے باطن میں کتنے اور نہ جانے کیسے کیسے اثرات پیوست رہتے ہیں، تبھی دروازے پر دستک ہوتی ہے اور وہ جب تک اُٹھتی تب تک کرن دروازہ کھول چکی ہے۔ تعجب، اجیت اور انکت چائے کی ٹرے لیے وہاں کھڑے ہیں۔

کرن گھبرا کر کہتی ہے، "یہ آپ نے کیا کیا؟ ہمیں کیوں نہیں جگایا؟"

اجیت ہنس پڑے، "ارے، کبھی کبھی ہمیں خدمت کا موقع دیا کرو، تم تو اب نیتا بن گئی ہو۔"

کرن شرما جاتی ہے۔ ٹرے لے لیتی ہے۔ پیچھے مہندر جی بھی ہیں۔ کہتے ہیں، "آج ہم سب مل کر چائے پئیں گے۔ اجیت اور انکت نے مل کر بنائی ہے۔ سلسلہ پلٹ گیا ہے۔ پلٹنا اچھا لگتا ہے نا۔ آج تو اس کی خاص وجہ بن گئی، لیکن ویسے یہ سلسلہ بدلتے رہنا چاہیے۔ مغربی ممالک میں تو ایسا ہی ہوتا ہے، ہمارے یہاں کیوں نہ ہو؟"

وہ لوگ چائے پی ہی رہے تھے اور اپنے اپنے خوابوں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دروازے پر پھر آہٹ ہوئی۔ انکت دوڑ کر گیا۔ دروازہ کھولا اور فوراً لوٹا... "بابا جی! کافی لوگ ہیں، ڈاکٹر ہے، پولس بھی ہے۔"

اجیت

خواب اجیت نے بھی دیکھے تھے۔ اُس کے سامنے بھی وہ حادثات تو تھے لیکن اُس کا دھیان رہ رہ کر اپنے وکیل دوست کے ایک مضمون پر مرکوز ہو جاتا تھا جس میں اُس کے دوست نے بڑی بیباکی سے واضح کیا تھا کہ سماج سدھارکوں کی انتھک کوششوں سے جتنے بھی قانون بنے ان میں مردوں نے اپنی ملکیت اور اپنے فائدے کے لیے خفیہ سرنگیں بڑی صفائی سے بنالی تھیں۔ وہ بڑے فخر سے کہہ سکتا تھا ــــ

"تم عورت ہو یعنی میری بیوی، دیشیا، دائی یا کچھ بھی ہو، میری ہو اور میرے سکھ، خوشی مسرت

اور عیش و عشرت کے لیے ہمیشہ سپرد رہنا ہی تمھارا اولین فرض ہے۔ میرے حکم کے مطابق چلتی رہوگی پوری طرح منسوب ہوکر، وفاداری کے ساتھ میری خدمت کروگی تو سیتا، ساوتری اور دھارانی کہلاؤگی۔ سکھ، سہولت، کپڑے زیور، دولت عشرت، عزت شہرت اور مرتبہ پاؤگی۔ مگر مجھ سے الگ میرے خلاف آنکھ اٹھانے کی کوشش کروگی تو کیڑے مکوڑے کی طرح کچل دی جاؤگی۔ کوئی تمھاری مدد کے لیے نہیں آئے گا۔ سماج، مذہب، منٹھا دھیش، وزیر، نیتا اور راجہ — سب میرے ہیں بلکہ یہی وہ ہتھیار ہیں جن سے میں اس دنیا میں ہی نہیں دوسری دنیا میں بھی تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔ پہلی اور دوسری دنیا میں ہی ہوں۔ تم صرف تیسری دنیا میں ہو۔ تمھاری نہ کوئی دلیل سنے گا، نہ اپیل۔

''معشوقہ بن کر پیار کا ناٹک کر کے جو بہ حق جتانا چاہوگی تو میرا کچھ بھی بگڑنے سے رہا، بدنامی تمھاری ہوگی۔ نہ جانے کتنے عالمی شہرت یافتہ فرائڈ، ایڈگر اور ماہر نفسیات بن کر میں نے تمھارا مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے تمھاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں تو تمھاری خوبصورتی کی تعریف کر، شادی کے سنہرے خواب دکھا کر اور پھر اچانک ایک دن تمھیں کسی بیگانے شہر کی انجانی اندھیری بند گلی میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔ تمھیں سنبھال کر رکھنا پیار کی باتیں، میں تو بھول جاؤں گا ساری قسمیں، سارے وعدے۔

''میری دنیا میں جیسے میں چاہوں گا تمھیں ویسے ہی رہنا پڑے گا۔ مجھ سے الگ تمھاری کوئی پہچان نہیں۔ میرے کارناموں کو سوچوگی اور مجھے روکوگی تو پاگل اعلان کروا دوں گا . . .''

یہاں اچانک تیز ہنسی ابھرتی ہے۔ ابھرتی ابھرتی خوفناک قہقہے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اُسے چیر کر ایک آواز ابھرتی ہے —

''جس کے پاس جو ہوتا ہے وہی تو وہ دیتا ہے، لیکن کیا میں تمھیں یاد دلاؤں تمھارے سنہرے دنوں کی، تمھارے مہاکاویوں کی، تمھاری تہذیب، تمھاری ثقافت کی، جس پر تمھیں ناز ہے؛ سنا ہے نا اہلیا، تارہ، سیتا، مندودری دروپدی کا نام، یہ تمھاری قابل احترام، پرم پوتر دیویاں ہیں صبح اُٹھتے ہی جن کا نام لینے سے تمھارے سات جنم پاک ہو جاتے ہیں۔ کتنی بڑی عزت دی ہے۔ انھیں آریوں نے — اہلیا، تارہ، دروپدی، سیتا، مندودری، پنچ کنیات اسمریت نتیم مہا پاتک ناشنام۔ ان پنچ ناریوں کو کیسا داغدار اور ذلیل کیا ہے سماج نے۔ کتنی ذہنی اذیت دی۔ اسی کے

پرائشچت کے طور پر دوسرے طبقے نے انھیں اتنی ہی عزت دی (قہقہہ طنز میں بدل جاتا ہے انھیں جو ایک سے زیادہ مرد کی ہم بستر بنی تھیں،" یہ آواز اُٹھتے اُٹھتے قہقہہ اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ زلزلہ سا آجاتا ہے۔ سب کچھ تباہ ہوتے لگتا ہے۔

اجیت کانپ جاتا ہے۔ اُس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ صبح سست رفتار سے اسٹیج پر داخل ہو رہی ہے۔ اچانک یاد آتا ہے کہ اُسے زخمیوں کو دیکھنا ہے۔ وہ فوراً رسوئی گھر میں جاتا ہے اور چائے کا پانی چڑھا دیتا ہے اور انکت کو اٹھانے کے لیے اپنے کمرے میں آتا ہے...

کیسا عجیب ہے یہ باطن۔ آنکھیں بند کرنے پر ہی دیکھتا ہے۔ پھر کوئی ہنسا،" بھول گئے۔ آنکھیں کہاں دیکھتی ہیں، دیکھتا تو من ہے..."

ڈاکٹر کے ذریعہ چوٹوں کے معائنے اور پولس کارروائی میں تقریباً سارا دن بیت گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ چوٹ زیادہ نہیں ہے، لیکن ایک ہفتہ انھیں زیادہ کام نہیں کرنا چاہیے اور نہ لکچر دینا چاہیے۔

پولس نے بہت چاہا کہ وہ رپورٹ میں کسی کی پہچان بتائیں، لیکن وبھا نے صاف کہہ دیا، ہمیں کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ کوئی ہمارا دشمن نہیں ہے۔ خیالوں میں اختلاف ہوتا ہی ہے۔

یہ پیشہ ور شرارتی عناصر کی شرارت ہو سکتی ہے اور انھیں آپ سے زیادہ کون جانتا ہے؟"

"ہم تو یقینی طور پر آپ سے یہی چاہتے ہیں کہ آپ رپورٹ فائل کر دیں اور آگے کوئی کارروائی نہ کریں۔"

یہی سب انھوں نے لکھ کر دے دیا۔ سبھی نے اس پر دستخط کر دیے۔ پولس کو نجات ملی، وہ لوٹ گئی۔ ہاں مہیلا سمیتی کی ممبران دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ بیچ بیچ میں اچانک کبھی وبھا کو، کبھی کرن کو، کبھی شاہدہ کو، کبھی اجیت کو، اپنے خوابوں میں دھندلی یاد آجاتی اور ان پہ تذکرہ ہونے لگتا۔ من کے کمپیوٹر میں نہ جانے کتنے اور ام' چھپے رہتے ہیں اور وہی یکبارگی ظاہر ہو جاتے ہیں ۔ کبھی کبھی خواب کی شکل میں غیر متعلق اٹ پٹے لیکن یقیناً اپنی صحیح پہچان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

سمیتا کو آنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ تب تک باہر سے وہ جتنے خاموش رہے، جتنے

مداحوں سے گھرے رہے، باطن میں وہ اتنے ہی بے چین تھے۔ ٹھیک سمندر کے برعکس جو اندر بہت خاموش ہوتا ہے لیکن باہر لہریں مسلسل کنارے پر سر پٹکتی رہتی ہیں۔

اُدھر سمیتا کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں تھی . . .

کیرل ایکسپریس تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی، لیکن سمیتا کے من کی تھاہ لینے والی مشین ابھی کسی نے ایجاد ہی نہیں کی تھی۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ سکنڈ کلاس میں اوپر کی برتھ پر لیٹی تھی۔ نیچے شیاملا تھی اپنے سکمارن کے ساتھ۔ سامنے کی دونوں برتھ پر ایک نئے شادی شدہ جوڑے کا قبضہ تھا۔ دونوں خوبصورت خوشحال گھرانے کے تھے۔ ساتھ میں تین ماہ کی بٹیا تھی جس پر ماں باپ دونوں جی جان سے نچھاور تھے، اتنے کہ انھیں سمیتا اور شیاملا سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ وہ دونوں کیرل کے ہی تھے۔ اس لیے شیاملا کبھی کبھی اُن سے بات کرنے لگتی تھی، سکمارن کو لے کر۔ وہ سکمارن کو لے کر بچّی کے پاس جاتی اور اُس کی تعریف کرتی اور ماں باپ کے من کے باغ میں پھول کھل اُٹھتے۔

سکمارن کبھی کھل کھلا کر اُس کو پکڑنا چاہتا تو ان کی بٹیا مسکرانے لگتی۔ دونوں کلکاری مارتے۔ تب اوپر لیٹی سمیتا بھی خوش ہو کر ہنس پڑتی۔ لیکن ایسے مواقع کم ہی آتے کیونکہ وہ شوہر بیوی اپنی بٹیا کو لے کر اتنے مصروف تھے کہ شیاملا کی موجودگی کو بھی بھول گئے تھے۔ باتیں ہوتی لیکن اپنوں کی طرح دو تین جملے تک محدود۔ وہ دو تین جملے بھی بٹیا کی تعریف میں ہوتے۔

شیاملا خود اُن میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ وہ یا تو سکمارن کو لے کر مصروف رہتی یا سمیتا سے باتیں کرتی رہتی۔ ایئر کنڈیشنڈ کلاس میں اکثر یہی حالت رہتی ہے۔ ریزرو برتھ پر کوئی باہری شخص نہیں آسکتا۔ اس لیے سب اپنے آپ میں کھوئے رہتے، بہت کم بحث مباحثے ہوتے۔ بہت کم قہقہے گونجتا۔ تکلفات کی خالص شکل یہیں دیکھنے کو ملتی۔ کیونکہ اکثر بھی خوشحال یا سرکار میں اونچے عہدوں پر فائز لوگ ہی اُن میں سفر کرتے ہیں۔ سمیتا کے ساتھی دونوں سرکاری افسر تھے، لیکن بٹیا کو لے کر وہ اُن عہدوں سے آزاد ہو کر سیدھے سادے ماں باپ بن جاتے تھے۔

سمیتا سادگی سے سب کچھ کرتی، لیکن جیسے ہی موقع ملتا اس کے ذہن میں خیالات ہلچل

بچانے لگتے۔ جیسے عرب ساگر کی لہریں تیز رفتار سے کناروں پر حملہ آور ہوتیں اور پھر اُسی رفتار سے پیچھے لوٹ جاتیں . . .

تبھی کیرل جوڑے کے کوئی واقف وہاں آگئے۔ وہ بھی میاں بیوی تھے۔ وہ اصرار سے دونوں کو اپنے کوپے میں لے گئے جو کچھ فاصلہ پر تھا۔ اب شیاملا اور سمیتا دونوں اکیلے تھے۔ سمیتا نے پردہ کھینچ دیا۔ باقی دنیا اب ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ نیچے اتر کر شیاملا کے پاس آ بیٹھی۔ سکمارن کلکاریاں مار رہا تھا اور شیاملا خوشی سے بھری بھری اُسے بار بار گدگدا رہی تھی اور خود بھی کھل کھلا رہی تھی۔ وہ اب مکمل صحتیاب تھی اور اس کا اعتماد لوٹ آیا تھا۔ وہ اکثر اُسی کو لے کر مصروف رہتی۔ سکمارن کا رنگ ماں کی طرح سانولا تھا لیکن ناک نقش باپ کی طرح خوبصورت اور ترشیدہ تھے۔ آنکھیں جیسے ہمیشہ کسی انجانی خوشی سے منور رہتیں۔ وہ ہر چیز پر جھپٹتا اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر منہ میں لینے کے لیے طرح طرح سے کوششیں کرتا۔

شیاملا نے پوچھا، "بھابھی، ہر بچہ ایسا کرتا ہے۔ کیسی عجیب بھوک ہے یہ۔"

سمیتا تب سکمارن کو دیکھتی کچھ سوچ رہی تھی۔ بول اُٹھی، "یہ پیٹ کی بھوک نہیں ہے۔ یہ کچھ جاننے کی، تلاش کی بھوک ہے۔ سوال کی بے چینی کا پہلا سبق ہے جو قدرت ہمیں پڑھاتی ہے۔"

"کتنا پیارا، کتنا اپنا لگتا ہے تب بچہ۔"

سمیتا اپنے ہی اندر چونک اُٹھی ـــــ یہ اپنا پن کیا ہے؛ سب کچھ اپنا۔ کیا اسی میں ہی جائداد اور مفاد کی جڑیں پوشیدہ نہیں ہیں؛ یکبارگی اُسے مشہور خاتون ٹینس کھلاڑی کی یاد آگئی جو بہترین کھلاڑی کا خطاب پاکر جب اپنے کمرے میں پہنچی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نامہ نگاروں نے پوچھا، "یقیناً آپ خوشی کے مارے رو پڑی ہیں۔"

"نہیں،" اُس خاتون نے بھیگی آواز میں جواب دیا، "میں اس لیے رو رہی ہوں، بے حد خوشی کے اس عظیم لمحے کو بانٹنے والا میرا اپنا کوئی نہیں ہے . . ."

کیا ہے یہ، 'میرا اپنا ہونا'؛ کیا کبھی انسان کو اِس 'اپنے پن' سے نجات مل سکے گی ؟ کیا ملنی چاہیے؛ کیسا مسحور کر جاتا ہے ہر کسی کو یہ اپنا ہونا۔ پیار کا مطلب کیا ہے، 'اپنا ہونا' تو نہیں ہے . . .

یکبارگی وہ کانپ اُٹھی۔ شیاملا پوچھ رہی تھی، "کہاں کھو گئیں، بھابھی میری۔ کیا بھیا کی یاد آ رہی ہے؟"

"نہیں رے،" سمیتا ہنس پڑی، "وہ تو ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی اپنے پن کے بارے میں۔۔۔"

شیاملا نے فوراً بات کاٹ دی، "پر ہمیشہ کسی کے ساتھ رہنا ہی تو اپنا ہونا ہے۔۔۔"

سمیتا ٹھگی سی شیاملا کو دیکھتی رہ گئی لیکن جواب دے پاتی کہ شیاملا یکبارگی سنجیدہ ہو گئی۔ بولی، جیسے خود سے بات کرتی ہوئی، "میں بھی اکثر یہی سوچتی ہوں کہ کون ہے میرا! میری ماں، میرے بھائی، بھابھی، میرے صوبے والے یا تم بالکل اجنبی لیکن بالکل اپنے۔۔۔؟"

تب تک سمیتا نے اپنے آپ کو سمیٹ لیا تھا اسی سادگی سے بولی، "اسی لیے تو کہتی ہوں، سچ بھرو پیا ہے، تشریح سے پرے۔ وہ راستہ ہی راستہ ہے۔ اس کی منزل کہیں نہیں ہے۔ وہ دیدک یگ کی لیکار 'چیرے ویتی، چیرے ویتی' کی تشریح ہے۔ 'گیتا' میں جو پھل کی فکر کرنے کی ممانعت ہے اُس کا بھی یہی مطلب ہے۔ اُس عظیم سائنس داں کے آخری پیغام کا مطلب بھی یہی نہیں ہے کیا۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ بہت تھوڑا ہے اور جو نہیں جانتے وہ بہت زیادہ ہے۔"

شیاملا اتنی دور نہیں جا پاتی، لیکن اُس کا بیزار من بار بار اُس سے کہتا ہے، 'تیری سوچ غلط ہے، تو منزل کی فکر نہ کر۔' لیکن اپنے ہی ضمیر کی آواز کو نظر انداز کر اس نے بار بار منزل کی فکر کرنے کی غلطی کی۔ لیکن کیا اس کے سامنے بچنے کا کوئی راستہ تھا؟ جس ماحول میں وہ پلی، جو سنسکار اُسے وراثت میں ملے، اس میں وہ وہی کر سکتی تھی جو اُس نے کیا۔ سمیتا نے جب اُس سے کہا تھا، "تو نے یہ شادی کر کے غلطی کی، بہت بڑی غلطی کی۔"

"سنا تھا کہ شوہر سے بڑا کوئی دوست نہیں ہوتا اور محبت سے بڑی کوئی دوا نہیں ہوتی۔"

سمیتا کو ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی، بولی، "وہ تو ٹھیک ہے لیکن دو بار کے تجربے سے کچھ تو سیکھتی۔"

فوراً جواب نہ دے سکی، سر نیچا کر کے پریشان ہوتی رہی۔ پھر بولی، "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں بیوقوف ہوں، لیکن اُس حالت میں میں اور کیا کرتی؟"

"بہت کچھ تھا کرنے کے لیے میں مان لیتی ہوں کہ تو مرجاتی تو کیا بگڑ جاتا اس دنیا کا، بلکہ کچھ پریشانی ہی کم ہو جاتی، لیکن چھوڑ اُس کو کم سے کم تو تو آزاد ہو جاتی۔ جب تک تو مرنا نہیں سیکھے گی، کچھ ہاتھ نہیں لگے گا۔"

"اب بھی تو مر ہی رہی ہوں۔"

"لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ تب تو اکیلی مرتی اب اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مار رہی ہے۔"

تب کیسی بے بس نگاہ سے شیاملا نے سمیتا کو دیکھا تھا۔ کئی لمحے خاموشی گہری ہوتی رہی، وہ ضمیر کے چیر کے لگاتی درد کو سہتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے بولی "سچ بھابھی، میں نے بہت تکلیف دی آپ کو۔ کاش، میں مر سکتی۔"

اور اُس کا باندھ ٹوٹ گیا۔ سمیتا اُسے رونے کے لیے اکیلی چھوڑ کر کوپے سے باہر نکل گئی۔ اُسے کیرل کے مناظر خوش کرتے ہیں۔ ابھی ابھی کوئی اسٹیشن پیچھے گیا ہے۔ بارش اس وقت بند ہے، دھوپ نکل آئی ہے اور اُس میں چمکتے سرو کے نیلے درخت، کیلے، ناریل کے پودوں کے درمیان دھان کے کھیت، کھپریل سے چھائے مکان، دور سمندر سے آتا ہوا ہیک واٹر، کیسی ہے یہ دلفریب ہریالی۔

تروانت پورم سے چلے انھیں ساڑھے تین گھنٹے بیت گئے ہیں۔ آسمان اچانک پھر گرجنے شور مچاتے بادلوں سے بھر اٹھا ہے۔ کوئی اسٹیشن آرہا ہے، رفتار پر روک لگ رہی ہے۔ کھپریل کے بہت سارے مکان ادھر ادھر بکھرے ہیں۔ عورت مردوں کے ہاتھوں میں چھاتے ہیں۔ یہ چھاتے انھیں کسی بھی لمحے ہونے والی بارش اور پھر نکل جانے والی تیز دھوپ دونوں سے بچاتے ہیں۔ ٹرین کے اسٹیشن سے باہر ہوتے ہی پانی میں کھڑے ناریل کے درختوں کی جھرمٹ نے اُسے موہ لیا۔

اچانک اس کے اندر ایک سوال اٹھتا ہے — کتنی خوبصورت ہے یہ قدرت! اور عورت بھی تو قدرت ہی ہے مرد اور قدرت، قدرت اور مرد۔ یہی تو دنیا ہے۔ انسان بھگوان کو ہرا سکتا ہے کیونکہ وہ ایک خیال ہے، لیکن قدرت کو نہیں ہرا سکتا کیونکہ وہ مسلّمہ حقیقت ہے، ایسی حقیقت جو اُس کی انا کو ہمیشہ چیلنج کرتا رہتا ہے، لیکن اُسی صوبہ کی یہ عورت اتنی بے سہارا، اتنی معصوم... کیا اس میں قصور عورت کا ہی نہیں ہے...؟

تبھی شیاملا نے اُسے پکارا۔ ارنا کولم آنے والا تھا اور یہاں گاڑی کا انجن بدلنا تھا۔ کسی

نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کھانا کھایا۔ سامنے کی برتھ پر شوہر بیوی دونوں ابھی بھی اپنے نوزائیدہ کو لے کر مصروف تھے۔ کیسی بارونق نور سے دونوں کے چہرے دمک رہے تھے۔

پھر کیرل کا تہذیبی مرکز تری چور پیچھے چھوٹ گیا۔ رات گہری ہونے لگی۔ باہری دنیا جیسے تاریکی کا لباس اوڑھے دوڑی جا رہی ہو۔ سلیم پہنچتے پہنچتے دس بج گئے۔ سمیتا نے کہا، "اب میں اوپر جاتی ہوں، نیند آرہی ہے۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ سکمارن بھی سو گیا ہے۔"

یہ سب اس نے کہا ضرور لیکن کیا وہ دونوں مطمئن ہو سکیں؟ ہاں، سامنے والی برتھ کے ہمسفر ضرور مطمئن تھے۔ ان کا نوزائیدہ بھی سو گیا تھا۔ سمیتا نے بتیاں بجھا دی تھیں۔ دو پل بعد رات کی بتی نے اس کوپے کو ایک پراسرار روشنی سے بھر دی۔ وہی اسرار سمیتا کے باطن میں ابھر آیا۔ اوپر سے وہ شانت تھی لیکن اس کے باطن میں ایک کے بعد ایک منظر ابھر رہے تھے، سنیما کے پردے پر ابھرتے مناظر کی طرح۔ کبھی کبھی ایک شدید ہلچل اُس کے وجود کو جھنجھوڑ دیتی جیسے کسی نے ٹھہرے پانی میں زور سے پتھر پھینک دیا ہو، یا اٹھارتی چیختی شور مچاتی مال گاڑی ادھر سے گزرتی جا رہی ہو۔

اچانک شور مٹ جاتا ہے اور اُس کے دل کی پراسرار تاریکی میں بے شمار تصویریں ابھرتی ہیں۔ بے شمار اعتماد بھرے جملے گونج اُٹھتے ہیں جنہیں وہ خود ہی نہیں سمجھ پاتی۔ اصل میں تو اس کے دل میں اس وقت ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ اُس کے نیچے کی برتھ پر ایک بالکل ابھاگن۔ ایک ماں لیٹی تھی۔ اپنے بچے کو اپنی چھاتی میں سمیٹے۔ سامنے کی برتھ پر بھی ایک ماں ہی تھی، خوشی اور مسرت سے بھری۔ اس کا ہاتھ بھی اپنے بچے کو باندھے ہوئے تھا جیسے وہ اُسے اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ اس کے اپنے اندر بھی ویسے ہی مناظر ابھر رہے تھے۔ اپنے بیٹے انکت کے لیے باپ کی راہ پیدا ہوئے اس ادگمرداتی سمانی: راگن نے اپنی پہلی اولاد کی پیدائش پر کیسے خوشیوں سے بھر کر اُسے تار دیا تھا۔۔۔ "دس ہیز کم آوٹ ود فل گلوری۔"

وہ اس تار کو پڑھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کیا ورنکا کے دل میں بھی ایسے ہی احساس نہیں پیدا ہوئے ہوں گے؟ بغیر کسی سنسکار کے کسی مرد کے ساتھ رہنے والی عورت کو بھی کیا اولاد کی خواہش سے نجات ملی ہے؟

اور امریکہ سے آئے اُس خاندان کی ایک عورت کا پہلی بار ماں بننے پر خوشی اور ممتا سے

چھلکتا وہ خط، جیسے اُس کے لیے اس کی اولاد کے علاوہ دنیا کا وجود ہی نہیں ہے. کیسی کہانی کہہ جاتے ہیں اُس کے یہ جملے — 'میرا تو زیادہ وقت گڑیا کے کام میں ہی نکل جاتا ہے، اُسے بڑا کرنے میں بہت لطف آتا ہے . . . اُس کا ڈیولپمنٹ کافی ایریاز میں ایوریج بچے سے فاسٹر ہے. پاپا، اب میری گڑیا اُٹھ گئی، میں جاتی ہوں.

"پاپا، مجھے گڑیا کو اٹھا کر دودھ پلانا ہے، کیونکہ اب وہ رونے لگی ہے... اب کافی ناراض ہو رہی ہے، کہہ رہی ہے، مما، مجھے بھوک لگی ہے.

'پاپا، اب میری گڑیا پھر رونے لگی ہے اور کہہ رہی ہے — مما، اب مجھے سلا دو.

'پاپا، میری گڑیا اپنا باتھ ٹائم بے حد انجوائے کرتی ہے اور مجھے بھی اُسے نہلاتے ہیں مزہ آتا ہے. راج کو بھی اُسے نہلانے میں مزہ آتا ہے. اس کے بعد کا کام، یعنی بدن پونچھوانا اور کپڑے پہننا اُسے بالکل پسند نہیں. ان دونوں کاموں کو نبٹانا اچھی خاصی اسٹرگل ہوتی ہے. پھر فریش ہو کر وہ اپنی کریب میں کھیلتی ہے. میں چپکے سے دیکھتی ہوں. اتنی پیاری اکیلی کھیلتی ہے اور اتنی پیاری آوازیں نکالتی ہے کہ مزہ آجاتا ہے. ہر وقت مم، مم کا راگ گاتی ہے، کبھی کبھی مما بھی نکلتا ہے، اس کے اس پریکٹس سیشن کے دوران. کیا مزہ آتا ہے سُن کر.

'رات کو وہ زیادہ تر نو سے دس کے درمیان سوتی ہے. پھر بارہ کے قریب اٹھتی ہے، پھر دودھ پی کر سو جاتی ہے، پھر تین سوا تین بجے صبح کی فیڈ لیتی ہے اور پھر سات بجے کے بعد تو وہ سو ہی نہیں سکتی.

'پاپا، آپ کی گڑیا بڑی اچھی طرح کرال کرتی ہے اور سب سے زیادہ تو پیپر، میگزین کے پیچھے بھاگتی ہے. جتنے اُس کے کھلونے ہیں، اب اس نے ریجکٹ کر دیے ہیں. بس ہم لوگوں کی جو چیزیں رکھی ہیں، کتابیں، گملے، کرسی، چپل، یہ ساری چیزیں اُسے مُنہ میں ڈالنے کے لیے چاہییے. میرا سارا دن اُسے نو نو کرنے میں نکل جاتا ہے.

'اب تو گڑیا کھڑی ہونے کی کوشش میں ہے. ساری چیزیں بڑی فاسٹ سیکھ رہی ہے.'

یہ سب سوچتے ہوئے اُس کی نگاہ کپل جوڑے کی سرگرمیوں پر تھی. بچی کئی بار روئی، ماں نے اُسے اپنی چھاتی سے چپکا کر دودھ پلایا. پھر دھیرے سے شوہر کو جگایا کی اُس کے کپڑے بدلے

اور بڑے پیار سے دونوں اُسے دیکھتے رہے، کھیلتے رہے اور سمینا کے اندر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ خوش بھی تھی اور پریشان بھی۔ کیا اولاد کی اس چاہ کا دوسرا نام قسمت نہیں ہے اور کیا خوش قسمت کا مطلب مرد نہیں ہوتا؟ تب کیسے پائے گی عورت مرد کے طاقت کی کشش سے نجات، کیسے ہوگی وہ آزاد؛ کیا عورت کی آزادی صرف خواب ہے، صرف ایک خیال؛

نہ جانے کتنی دیر تک پریشان ہوتی رہی سمینا اپنے اندر۔ کتنی عظیم شخصیات کے اُسے پر اعتماد کلمے یاد آئے۔ کتنی آزادیٔ نسواں کی تحریکیں اُس کی نگاہوں سے ہوکر گزر گئیں۔ پھر دھیرے دھیرے اُسے نیند آنے لگی اور بالآخر وہ سوگئی۔ شاید ایک نیا خواب دیکھنے کے لیے۔ خواب یہی تو ثابت کرتے ہیں کہ آنکھ بند کر لینے پر دکھنا تو بند نہیں ہو جاتا۔

چار دن قبل وہ دہلی سے صبح پانچ بجے کی اڑان سے اڑی تھی اور دس سے پہلے تروانت پورم پہنچ گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہر بار یہ خیال ضرور اس کے ذہن میں آتا۔ کتنا خوبصورت ہے یہ صوبہ تپوون کی طرح۔ چاروں طرف پھیلی ہریالی۔ نیچے سرخ زمین۔ اسی صوبہ کی بیٹی ہے یہ شیاملا ہمیشہ سے آزاد، ہمیشہ سے بدحال۔ تکلیف ہی اس کے لیے سچ ہے، باقی سراب ہے۔ لیکن بار بار وہی اُس سراب کے پیچھے بھاگتی ہے اور پہلے سے زیادہ تکلیف پاتی ہے، سہتی ہے پہلے سے زیادہ ذلالت۔

وہ پہلے بھی وہاں آچکی ہے۔ اس لیے ایئرپورٹ سے سیدھے تنک ہوٹل پہنچی۔ تیار ہوئی اور فوراً بس لے کر پہنچ گئی کوٹم۔ یہاں سے اُسے ناؤ لینی تھی، کیونکہ اسٹیمر تب تک جا چکی تھی۔ کچھ ہی لمحے میں وہ اُس مانوس گھر کے اجڑے باغ کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا اور کندھے پر لٹک رہا تھا شانتی نکیتن کا جھولا۔ دیکھا، چاروں طرف سناٹا ہے، سامنے کا دروازہ بھی بند ہے۔ جہاں پہلے کچھ نہیں تھا وہاں اب ایک چھوٹا سا پھاٹک ہے۔ اُسے کھول کر وہ بائیں طرف کے دروازے پر پہنچی۔ دستک دی۔ دو لمحے بعد دروازہ کھلا، سامنے خود شیاملا کھڑی تھی۔ نگاہ ملتے ہی وہ بھاگتی ہوئی اُس کے گلے سے لپٹ گئی اور خوشی سے بھپک اٹھی، یہ کہتی ہوئی "میں جانتی تھی بھابھی، تم آؤگی، ضرور آؤگی۔" افسردہ دل کیسے ایک ناقابلِ بیان مسرت رگ رگ میں جاری کر دیتا ہے۔

سمیتا نے تھیلا رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اسے تھاما، اپنے سامنے کیا اور بولی، "یہ کیا حال کر لیا، تو نے اپنا؟"

"پندرہ دن سے تیز بخار میں جلتی رہی ہوں. کل ہی ہسپتال سے آئی ہوں۔"

اندر آکر دیکھا، وہ کٹے پھٹے نواڑ والا پلنگ اور اس پر گودڑ بھرا پھٹا بچھاون، ویسی ہی ادھ میلی چادر، میز ہے۔ دیوار میں الماریاں بھی ہیں۔ آس پاس دونوں کمروں میں نہ جانے کب کے اور کس کس کے رنگ برنگے فوٹو ویسے ہی ٹنگے ہیں۔ ادھر فوٹو لگانے کا بہت شوق ہے۔ اُن میں ایک فوٹو اجیت کے ساتھ اُس کا اور شیاملا کا بھی ہے۔ ایک کرسی بھی ہے۔ وہ اُسی پر بیٹھ گئی۔ پلنگ پر سکمارن سو رہا تھا۔

جھک کر اس کا ماتھا چوم لیا، "تیرا بیٹا ہے؟"

شیاملا ہنس پڑی، "بچّہ تو ماں کا ہی ہوتا ہے۔ میں تو واہ واہ ہو گئی اسے پا کر۔ اچھا، میں ابھی قہوہ بنا کر لاتی ہوں، ماں کہیں گئی ہیں۔"

"کیشون کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں اُسے کوئی ناٹک تیار کرنا ہے اس لیے ترونندرم میں ہوگا۔ یہاں تو کبھی کبھار آتا ہے اور . . ."

سمیتا نے جملہ پورا کیا، "اور مارتا ہے۔"

شیاملا نے باہر جھانک کر دیکھا ــــ ماں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ وہیں سے بولی، "شاید بازار گئی ہے۔ گھر میں چاول کا ایک دانا نہیں ہے۔ ادھار مانگتے مانگتے بے شرم ہو گئی ہیں۔ دس ہزار کا قرض ہو چکا ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی تقاضہ کرنے آتا ہے اور گالی دیتے ہوئے لوٹتا ہے اور میں ہوں کہ مرتی بھی نہیں۔"

پھر اُس کے پاس آگئی، بولی، "دیکھو سر میں تین ٹانکے لگے ہیں۔ ابھی بھی درد ہے۔ میں نے اتنا ہی تو کہا تھا، 'گھر میں کچھ بھی نہیں ہے'، وہ چیخ پڑا، 'تو میں کیا کروں؟ گھر تیرا ہے، میرا کام تجھے یہاں لانا تھا، لے آیا۔ اب تو چلا اسے۔ میں نے ٹھیکہ نہیں لیا۔ تیری ماں کیوں نہیں مدد کرتی تیری؟'

"میں نے کہا، 'اُس کے پاس کیا ہے جو مدد کرے گی؟'

"وہ بولا، 'نہیں ہے تو مر۔ جب بھی گھر آتا ہوں۔ یہی رٹ لگاتی ہے، کچھ نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہے تو مر کیوں نہیں جاتی؟'

"اور اُس نے مجھے ایسا دھکا دیا سنبھل نہ سکی۔ کئی دن سے بیمار تھی۔ چوکھٹ پر جا کر گری اور سر پھٹ گیا۔ خون دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ ماں کے ساتھ کسی طرح کوٹم گئی۔ ہسپتال میں ایک جان پہچان کی بہن ہے۔ اس سے پچاس روپے لیے۔ دس دن وہاں رہی، بخار پہلے ہی تھا اور تیز ہو گیا۔ ایک بار تو ماں ڈر گئی تھی۔ وہ کبھی آیا تھا، پاس بیٹھا رہا، پھر مجھے گھر چھوڑ کر چلا گیا، یہ کہتا ہوا، 'نخرے مت دکھا، ناول لکھ اور پیسے لا...' گھر میں رہ کر جیل کی کوٹھری کی اذیت سہنا عورت کی تقدیر ہو جیسے..."

یکبارگی شیاملا چونکی، "میں بھی کیسی پاگل ہوں، تم اتنی دور سے چل کر آئی ہو اور میں قہوہ بھی نہیں بنا سکی۔ کھانے کو کچھ..."

"سُن،" سمیتا بولی "میں تلک ہوٹل میں ٹھہری ہوں۔ کھاپی کر آئی ہوں۔ تجھے ابھی میرے ساتھ چلنا ہے، سمجھی؟"

"کہاں؟"

"ابھی تروندرم اور پھر دہلی۔"

شیاملا سنتی ہوئی چلی گئی۔ پاس ہی رسوئی تھی، کچھ لمحے وہاں کھٹ پٹ ہوتی رہی اور سمیتا سوچتی رہی کہ اپنے وجود کو انکار کر کے کسی کے ساتھ رہنے کا مطلب کیا ہوتا ہے، یہ شیاملا کو دیکھ کر ہی وہ جان سکی۔

اسی درمیان اُس نے کنویں پر جا کر پانی کھینچا، ہاتھ مُنہ دھویا اور پھر کرسی باہر لا کر اُسی چبوترے کے پاس بیٹھ گئی، جہاں اجیت بیٹھا کرتا تھا، ٹیپی اوکا کے پیڑ کے نیچے۔ ہوا میں جھومتے ہوئے اُس کے رنگین پتے، گنگنی دھوپ، آکاش میں یہاں وہاں امنڈتے بادل، کسی بھی لمحے جھڑ کر برس پڑتے ماحول کو ایک سوندھی مہک سے بھرتے۔ اپنے خط میں شیاملا اُن بادلوں کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتی تھی۔ ناریل کے درخت آسمان کو چھوتے، من کو لبھاتے کولی پھل کے گچھے... کاش، وہ بچی ہوتی اور ان گچھوں کو توڑنے کے لیے کودنے لگتی۔ تبھی شیاملا آ گئی، ہاتھ میں دو گلاس لیے۔ ایک سمیتا کو دے کر

وہ پاس کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ پیڑ کی پتیوں سے کھیلتی، قہوہ پیتی، دھیرے دھیرے ...

پھر نہ جانے کہاں سے وہ بولا، ''بھابھی، آنے والا سکھ ہو یا دکھ اُس میں ایک دہک ہوتی ہے جو ہم تک پہنچ جاتی ہے اُس کے آنے سے پہلے ...'' وہ جملہ پورا کر پاتی کہ دیکھا، ماں آگئی ہے، تیز قدم رکھتے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک میلا سا تھیلا ہے، اس میں شاید چاول ہے، ویسا ہی میلا سا پھٹی کوٹ اور بلاؤز، سفید سفید بال۔ سمیتا پر نگاہ پڑی تو جیسے اُس کا سارا وجود کھل پڑا۔

سمیتا نے اُٹھ کر نمستے کی۔ وہ اُن کی زبان نہیں جانتی، لیکن آنکھوں کی مسکان اور چہرے پر ابھرتی چمک، اُن کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ اندر کی زبان۔ احساس اور محبت کی زبان۔

شیاملا بولی، ''ماں آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کہتی ہے، انھیں اُمید تھی کہ تم آؤگی۔''

تبھی شکمارن کے رونے کی آواز آئی۔ ماں اندر چلی گئی۔ شیاملا نے کہا، ''بھابھی، تار ہیں نے ہی دیا تھا، میں سچ مچ مرنا چاہتی تھی۔ ماں نے بھیجا تار۔ وہ چاہتی ہے کہ میں کچھ دن کے لیے دہلی چلی جاؤں۔''

سمیتا نے کچھ جواب نہیں دیا، چپ چاپ اُٹھ کر سوٹ کیس لے آئی، کھانے کی کچھ چیزیں تھیں — مٹھائی، بسکٹ، بھوجیا، چاکلیٹ اور سیب۔ دو ساڑیاں تھیں، بچے کے لیے بھی دو سوٹ تھے دو کھلونے تھے، جو بجتے بھی تھے اور چلتے بھی تھے۔ ماں کے لیے ایک ساڑی تھی، وہ سب کچھ اسے سنبھلوا کر بولی، ''اچھا اب چلنے کی تیاری کر۔ تیری ماں کو کولم سے کوئی کی بس میں بٹھادیں گے۔''

سمیتا نے پھر کروٹ بدلی۔ ٹرین اُسی طرح دوڑ رہی تھی، کوئی اسٹیشن بیچ میں پڑتا تو روشنی چمک اُٹھتی، اور پھر چھک چھک کی اُٹھتی گرتی آواز ایک مقام پر آکر گونج اُٹھتی، گونجتی رہتی ...

ترونندرم میں آکر شیاملا کے حواس قابو میں آئے۔ جسم میں طاقت نہیں تھی پھر بھی اس کا مانوس چلبلا پن لوٹ آیا۔ سب سے پہلے ہندی پرچار سبھا میں جاکر سمیتا نے دہلی فون ملایا۔ ریزرویشن ہوگیا تھا، تیسرے دن انھیں روانہ ہونا تھا۔

اگلے دن اجیت کے دوست کی مدد سے شیاملا کو ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ سفر کے لیے دوا لی۔

انجکشن لگوایا۔ تعجب ہے کہ جب تیسرے دن وہ اسٹیشن پہنچے، تو کیشون وہاں موجود تھا۔ شیاملا نے اُسے دیکھ کر اَن دیکھا کر دیا۔ لیکن سمیتا نے اُسے پاس بلایا اور سخت آواز میں کہا، "شیاملا کو میں لے جا رہی ہوں، کچھ مہینے میرے پاس رہے گی۔"

کیشون نے کچھ کہنا چاہا، ہاتھ سے روک دیا۔ "تم کیا کہو گے، جانتی ہوں۔ اُس کی فکر مت کرو۔ تمہارا وہ ناٹک کیسا ہے؟"

"ٹی۔ وی۔ کے لیے ایک فلم بنا رہے ہیں۔ میرے ایک اور دوست ہیں، وہ اُن کی فلم ہے، میں تو اسسٹنٹ ہوں۔"

"تم خود کیوں نہیں بناتے؟"

"کوشش تو کر رہا ہوں، لیکن۔۔۔"

"کوشش تو تمھیں شیاملا کی نوکری کے لیے بھی کرنی ہے، سمجھے۔ ملے گی ضرور۔"

پھر یکبارگی ہمدردی بھرے لہجے میں بولی، "تم نے شیاملا کو مارا، سن کر میں شرم سے گڑ گئی۔ جانتی ہوں، مرد کے سماج کو۔ لیکن جو ہوا، اس کے بعد۔۔۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں، لیکن وہ بھی تو ہر وقت جھگڑا کرتی ہے۔۔۔"

ان سُنی کر کے سمیتا نے کہا، "شیاملا سے کچھ بات کرنی ہو تو کر لو۔ تمہارا بیٹا بھی ہے۔ گاڑی چلنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ تب تک میں کوئی میگزین دیکھتی ہوں۔"

"میں لاتا ہوں۔"

"نہیں، تم بات کرو۔"

نونی ٹو شکاری اس کی گود میں کھل کھلا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور شیاملا رو رہی تھی۔

سوچتے ہوئے اُس نے کروٹ بدلی، گاڑی پھر کسی اسٹیشن کو پار کر رہی تھی۔ پل پل میں روشنی کی لکیریں کوپے کی دیواروں پر چمکتی ذہن کے پردے پر اُبھرے خیالوں کی طرح اور ڈوب جاتیں۔ بیچ بیچ میں سامنے کی برتھ والے جوڑے کی طرف وہ دیکھ لیتی۔ عورت گہری نیند میں تھی،

اس کا شوہر کبھی کبھی جھک کر اُسے دیکھ لیتا۔ شیاملا بھی گہری نیند میں تھی۔ لگتا تھا، بہت دنوں بعد اُسے یہ موقع ملا ہے۔ بیچ بیچ میں کچھ آوازیں بھی اُٹھتیں۔ ان کا مطلب وہ نہیں سمجھتی تھی لیکن آوازوں کی بھی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ وہ اُٹھتیں اور پھر ایک دم پرسکون ہو جاتیں اور پھر وہی گاڑی کی مانوس چھک چھک کی آواز ایک لے پر گونجتی رہتی...

اچانک منظر بدل جاتا ہے۔ نہ جانے کیسے اور کب وہ دہلی پہنچ جاتی ہے۔ اب نارائن کی مورتی اُس کے ذہن پر ابھر آئی ہے۔ اوگھڑ دانی بے فکر نارائن بالآخر کتنا کمزور ثابت ہوا کینسر تک کی نوبت آ گئی۔ اُس دن نارائن جیسے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے موڈ میں تھا سمیتا جیسے جال میں پھنس گئی تھی، اُس کے سامنے کوئی راہ نہیں تھی۔ نارائن نے نہ جانے کس حوالے میں کہا تھا "بھابھی، کبھی کبھی آدمی واقعی کمزور ہو جاتا ہے۔"

"کبھی کبھی کیوں، وہ کمزور ہے، بزدل ہے تبھی تو خود کو شکاری مانتا ہے۔"

نارائن یکبارگی اس انداز گفتگو سے جھکرا گیا۔ پھر مسکرا کر دھیرے دھیرے بولا تھا، "ماں نے میرے گلے میں جو تعویز ڈالی تھی، اُس میں میری ساری کہانی درج تھی۔ اس کہانی نے مجھے اندر ہی اندر توڑ دیا تھا اور میں وہ بن گیا تھا جسے لوگ اوگھڑ دانی کہتے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ وہ انتقام لینے کی ہی ایک شکل تھی۔ اُس نے مجھے غیر فطری بنا دیا۔ میرے متبنیٰ باپ نے مجھے سمت نہ دی ہوتی تو میں آوارہ دہشت گرد ہی بن سکتا تھا۔ اور کیا اس کے لیے میں ملزم ٹھہرایا جا سکتا تھا؟"

سمیتا سُن رہی تھی۔ بولی نہیں تھی۔ بول وہی رہا تھا—

"جب کبھی میرا ہاتھ اس تعویز پر پڑتا تو میں کانپ اُٹھتا۔ لگتا۔ جیسے میرے گلے میں سانپ لٹکا ہوا ہے۔ ایسی ہی ذہنی حالت میں ایک دن میں نے اُسے کسی ندی میں پھینک دیا۔ سوچا، اب تو نجات ملے گی۔"

"نجات ملی؟" سمیتا نے اچانک پوچھا۔

"کہاں ملی؟ یہ تو اور بھی شدت کے ساتھ ملے گی۔ میرے اندر تک رچ بس گیا ہے۔ آج بھی میں اُس کی حرارت کو محسوس کرتا ہوں۔ کیسا ہے یہ جسم اور من کا رشتہ! معلوم اور نامعلوم کا رشتہ..."

حیرت زدہ ہوتے ہوئے سمیتا نے پھر کروٹ بدلی اور بول اُٹھی جیسے اپنے آپ سے ہی بات کرتی ہو۔ وہ دیکھنے والا اُدگھڑ دانی واقعی سچ بول رہا تھا۔ اسی عمل میں باطن کی طاقت جسے سائنسدان تصرف توانائی کہتے ہیں، تیزی سے خرچ ہوتی رہتی ہے، اور باہر سے طاقت ور دکھنے والے شخص کے باطن میں کینسر، ذیابیطیس، دل کا مرض، اور مختلف طرح کی بیماریوں کے لیے زمین ہموار کرتی رہتی ہے۔

اور اسی اندرونی فرار کو چھپانے کے لیے وہی انسان فخر سے سر اُٹھا کر کہتا ہے، 'میں طاقت ور ہوں'۔

نارائن نے اُسے ایک دن، ایک اور بات بتائی تھی، انیتہ اور اپرنا کے بارے میں۔ وہ دونوں امریکہ چلے گئے تھے۔ اچانک ایک دن ایک تھیئٹر ہال میں ناٹک دیکھتے وقت نارائن سے اُن کی ملاقات ہوگئی۔ نارائن نے بتایا تھا، "جانتی ہو بھابھی، وہ ناٹک وبھا کی کہانی پر مبنی ہے۔"

"کیا!" سمیتا چونکی تھی۔

"ہاں، اُس نے خود وہ ناٹک لکھا تھا۔ وہ وبھا کا نہایت ہی ممنون تھا۔ ایسا خوبصورت کردار وبھا کے لیے وضع کیا تھا اُس نے کہ امریکن جدیدیت پسند عورتیں عش عش کر اُٹھی تھیں۔ پوچھا تھا، 'کیا ایسی عورت ہے بھارت میں؟'"

"جی ہاں، انیتہ کا جواب تھا، 'جی ہاں، بھارت میں ہی ایسی عورت ممکن ہو سکتی ہے ...'"

سمیتا اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اُس پُراسرار تاریکی میں پھٹی نگاہوں سے وبھا کو دیکھنے لگی جس کے ماتھے پر خون کی بوند لگی سفید پٹی بندھی ہے اور جو ہنس رہی ہے، جس نے اپنی مرضی سے انیتہ کو اپنی زندگی سے چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اب وجے کو بھی اپنی مرضی سے اجازت دینے میں جھجکی نہیں۔ یہ حوصلہ بھارت کی معمولی عورت میں کب پیدا ہوگا...؟

جواب میں اُسے حیران کرتا ہوا، اُس کے باطن سے سوال اُبھر آیا۔ 'کیا تم وبھا کو عام عورت سے الگ مانتی ہو؟ کیا تم خود عام عورت نہیں ہو؟ جب تم اور وبھا ہمت کر سکتی ہو تو دوسری عورتیں کیوں نہیں کر سکتیں؟'

لیکن کیسے تلخ تجربے کی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے، یہ ہمت پانے کے لیے...

اس تلخ تجربے کی اذیت میں سے کم و بیش سبھی کو گزرنا پڑتا ہے۔

لیکن اُس کی اس ہمت کو صدیوں سے چلے آئے سنسکار نگل جاتے ہیں اور اُسے بے معنی کر دیتے ہیں۔ وہ ماننے لگتی ہے کہ قربانی اُسے ہی دینی ہوگی۔ زمین کی طرح اُسے تبھی تو کہا گیا ہے۔ ' دھرا ہوئی جو دھارن کر کے جگ سارا ' کا مطلب یہی تو ہے کہ ' ناری ہوئی جو دھارن کر کے دُکھ سارا . . . '

ضمیر کی آواز اس بار اور سخت اور شدید تھی ۔ ان سنسکاروں نے ہی اسے اس حالت تک پہنچا دیا ہے۔ اُسے اِن سنسکاروں سے نجات پانے کے لیے وہ حوصلہ پانا ہی ہوگا۔ ایک نئے اخلاقی دستور کی تشکیل کرنی ہوگی۔

اپنے ہی باطن میں اٹھتے اس طوفان سے سمیتا کو جیسے اور بھی طاقت ملی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے باطن کی یادداشت پر ایک کہانی کے یہ الفاظ ابھر آئے جس میں ہیروئن شوہر کی ناانصافی کے خلاف جد و جہد کرتی ہے لیکن بالآخر جب اُس کا شوہر کہتا ہے۔ ' ہے تم میں اپنا بسا بسایا گھر اجاڑنے کی ہمت ؟ کہاں جاؤ گی دو بچوں کو لے کر یا پھر چھوڑ سکو گی اِن کی چاہ ، تمھاری یہ عزت ، بچوں کا مستقبل سب مٹّی میں مل جائے گا۔ سوچا ہے کبھی اِن سب کے بارے میں یا بس ناانصافی ناانصافی ہی چلاّنا آتا ہے ؟ '

بیوی کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ اپنے اندر جھانکنے لگی۔ اس کا جوش ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ شوہر کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں واضح طور پر لکھا تھا ، بیوی کا مستقبل صفر ہے۔

اس نے حالات کو قبول کر لیا . . .

تعجب ، یہ کہانی خود ایک عورت نے لکھی تھی۔ تبھی اُس کی نگاہ شیاملا پر پڑی جیسے وہی اُس کہانی کی ہیروئن تھی۔ کمزور ، گھٹن زدہ سنسکاروں کی غلام۔ لیکن نہیں ، اُسے وہ ہمت پانا ہوگا ، پانا ہی ہوگا۔

تبھی شیاملا اُٹھی۔ دیکھا ، سمیتا اپنی بستر پر بیٹھی کہیں کھوئی ہے۔ پوچھا ، " کیا بات ہے بھابھی ؟ "

سمیتا یکبارگی چونک پڑی۔ لیکن خود کو فوراً سنبھال لیا ، " کچھ نہیں۔ یا تھ روم جانا ہے۔ "

لوٹ کر پھر وہ سو گئی ، لیکن کچھ ہی پل کے لیے۔ خیال ابھی پریشان کر رہے تھے۔ اُس نے

دیکھا۔ باہر روشنی چمک رہی ہے۔ ماحول بدل گیا ہے۔ نہ ہیں ناریل کے درخت، نہ کیلے کے پتے، نہ دھان کے کھیت۔ کہیں کہیں دور جھول بولے میں پانی میں کھیت، پودے، اونچی زمین دکھ پڑتی ہے۔ اُس پر ہریالی بھی ہے اور آسمان میں بادل بھی۔

ٹرین اُسی تیز رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ سات بجنے والے ہیں۔ کوئی اسٹیشن آرہا ہے۔ جھونپڑی نما مکان ہے۔ رکشہ دوڑ رہی ہے۔ وہ سب آندھرا پردیش میں ہیں اب، دس بج چکے ہیں، وجے واڑہ پاس آرہا ہے۔ یہاں بہت دیر بعد ناریل کے پتلے درخت دکھنے لگتے ہیں۔ بادل بھی کہیں کہیں پر دکھ جاتے ہیں۔ میدان میں ہریالی بھی ہے، لیکن کیرل کی سی شان کہاں۔

دن میں اُس نے رات کی کشمکش کو بھول جانا چاہا۔ اس لیے خوب چہکتی رہی۔ کیرل کے اس جوڑے سے بھی دوستی کرلی۔ اُس کی بچی کو پیار کیا، لیکن بیچ بیچ میں قدرت کے نظارے دیکھتے ہوئے اُس کے اندر ایک آندھی اُٹھی ۔ کیا ایسے ہی ہمارے خیال اور غور و فکر میں فرق نہیں ہوتا؛ کبھی ہریالی، کبھی بنجر زمین ... خیالوں کا بھی تو ایک اپنا بنجر پن ہوتا ہے اور ...

تبھی ایک اسٹیشن آگیا۔ وہ فوراً نیچے اتر کر پلیٹ فارم پر آگئی۔ اُسے اخبار لینا تھا۔ تعجب، ''نو بھارت ٹائمس'' دکھائی دے گیا اسے اور اس کے پہلے صفحہ پر ایک تصویر تھی جس میں وہ وبھا، کرن، شاہدہ اور انکت کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے اندر ایک طوفان مچ گیا۔ اُس نے فوراً وہ اخبار خریدا اور اندر جاکر پڑھنے لگی۔

وبھا کے لکچر کی پوری تفصیل تھی۔ بے قابو بھیڑ اور پتھروں کی بوچھار، وبھا کا زخمی ہونا...

وہ پاگل سی ایک ایک لفظ کو پڑھنے لگی۔ آخر میں لکھا تھا، وبھا کا زخم معمولی ہے، ہسپتال سے وہ گھر آگئی ہے لیکن سبھی اس کے خیالات، اُس کی دلیلوں، اُس کی بے پناہ ہمّت سے متاثر ہیں، کاش، ہمارے ملک میں ایسی بہادر عورتیں ہوں تو ...

اُس نے اخبار کو سینے سے لگا کر آنکھیں بھینچ لیں۔ لیکن وہاں تو وہ مورتیاں اور بڑی ہوگئیں۔ دل خوشی سے جھوم جھوم اُٹھا۔ آنکھوں سے موتی جھرنے لگے۔ .. شیاملا نے دیکھا تو گھبرا گئی، وہ بولی، ''کیا بات ہے بھابھی؟''

سمیتا نے چونک کر فوراً خود کو سمیٹ لیا اور اخبار اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔ دیکھتے

ہی اُس کے مُنہ سے نکلا، "ایو!" اور پھر وہ خوشی خوشی کئی پل تک اُن تصویروں کو دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ ساری رپورٹ پڑھ گئی۔ پڑھ چکی تو ایک لمحے کے لیے لگا۔ کاش، وہ ہوتی دبھا کی جگہ پر۔

پھر جیسے سب کچھ دھندلا ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں سرد ہو گیا، دل ندامت سے بھر گیا، اخبار ہاتھ سے گر گیا اور وہ نہ جانے کہاں پہنچ گئی۔ سمیتا اُسے مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ اب بولی، "دبھا پر مجھے ناز ہے۔"

"کاش، میں ہوتی دبھا کی جگہ۔"

"تم بھی ہو گی۔ ہونا ہو گا۔ تم اب تب تک واپس نہیں لوٹو گی جب تک کیشون تمھاری عزت کرنا نہیں سیکھتا۔"

تعجب جب شیاملا نے بڑے فخر سے وہ تصویر سامنے کی برتھ والے جوڑے کو دکھایا اور ساری کہانی سنائی تو اس نے جواب دیا، "میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کروں گی۔ میں اونچے عہدے پر ہوں، پوری آزادی ہے مجھے۔ لیکن کیا آپ نہیں مانیں گی کہ آزادی بغیر اعتماد کے عذاب ہے؟ کیا آپ ماڈرن سماج میں اُس آزادی کا روپ نہیں دیکھ رہیں؟ کیا جدید تعلیم نے عورت کو خوددار کی جگہ مغرور نہیں بنا دیا ہے؟ قوت برداشت کا مطلب ظلم نہیں ہے، لیکن اُس کی جگہ پر کیا تنک مزاج ہونا پسند کریں گی؟ نرمی ایک مثبت صفت ہے۔ آج کی عورت اُسے بے عزتی سمجھتی ہے اور اُس کی جگہ پر اکڑ سے بھر اُٹھتی ہے اور جو آزاد پسند ہیں وہ خود سوزی اور طلاق کی دھمکی بھی دیتی ہیں۔ سیکس امیج کو بھی وہ عورت کی آزادی سمجھتی ہیں۔

"میں آزاد ہوں، لیکن مانتی ہوں، عورت ایک ندی کی طرح ہے جس کا وجود دو کناروں کی وجہ سے ہے اور وہ کنارے ہیں سہاگ اور اولاد ...."

وہ بہت شدید نہیں تھی، لیکن استحکام کے عروج پر ضرور تھی۔ شیاملا دیکھتی رہ گئی۔ بٹیا کو گود میں سنبھالے، شوہر سے سٹی بیٹھی اس عورت کو، لیکن سمیتا ایک پل کے لیے کچھ کمزور ہوئی، لیکن دوسرے ہی لمحے، پورے اعتماد سے اُس نے کہا، "آپ کی بات کا مطلب میں سمجھتی ہوں، لیکن کیا آپ نہیں سوچتیں کہ ایسی عورتوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے اور جو ہے وہ کیا صدیوں سے برداشت

کرتے آئے ظلم کا ردّ عمل نہیں ہے ؛ ردّ عمل ایک قائم جذبہ نہیں ہے، صرف وقتی اثر ہے۔ میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں کہ عورت اگر سیکس امیج بنانے کو ہی آزادی سمجھتی ہے تو وہ کبھی آزاد نہیں ہوسکتی۔ مرد کے طاقت کی کشش ہی اُس کی جڑ میں ہے۔ میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں کہ ایسی اعتماد ہی عورت مرد کی آزاد حیثیت اور دوستی کی بنیاد ہو سکتی ہے لیکن تبھی جب ہم خلیل جبران کے اِن الفاظ کو یاد رکھیں کہ ' ہم ایک دوسرے کے پیالے کو بھریں، ایک دوسرے کے پیالے سے پئیں نہیں...'

سمیتا اپنے فارم میں آگئی تھی اور پورے اعتماد سے بول رہی تھی، شانت، مستحکم اور غیر جذباتی آواز میں۔ اب اس ملیالی عورت کے حیران ہونے کی باری تھی۔ لیکن ابھی سمیتا کی آواز رکی کہاں تھی؟ آہستہ آہستہ بولتی ہوئی وہ اچانک تیز رفتار پر آکر بولی، "ایک بات کہتی ہوں، آپ سے بحث کرنے کے لیے نہیں، آپ سے جواب مانگنے کے لیے بھی نہیں، بس اس لیے کہ آپ اس رُخ پر بھی اپنے خیالات پیش کریں۔ عورت آئے دن بلاتکار کی شکار ہوتی ہے۔ آپ شاید کہیں گی کہ اس میں بھی عورت کا قصور ہوتا ہے۔ میں مان لیتی ہوں، ایسی عورتیں بھی ہیں، لیکن جب غیر شادی شدہ کنواری کے ساتھ بلاتکار ہوتا ہے تو زندگی بھر کے لیے وہ کلنکنی نہیں ہو جاتی ہے کیا؟ کوئی نوجوان اس سے شادی کرنا چاہے گا؟ میں استثنا کی بات نہیں کرتی، سماجی حالات کی بات کرتی ہوں۔ مرد دس عورتوں سے جسمانی تعلقات رکھ سکتا ہے۔ عورت چاہے اچھا ہے ایک سے زیادہ تعلق بناتی ہے یا بنانے کو مجبور ہوتی ہے تو وہ رذیل ہے، فاحشہ ہے۔"

جس سختی اور اعتماد سے بول رہی تھی اُسی یکبارگی سے وہ بیچ میں ہی چپ ہوگئی۔ ملیالی جوڑا اس بار مسحور اور لاجواب تھا۔ ان کے درمیان کئی لمحے خاموشی چھائی رہی۔ اب رات گھر آئی تھی، باہر سب کچھ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ناگپور اسٹیشن پر سمیتا کے دور کے ایک بھائی رہتے تھے۔ وہ مع اہل و عیال کھانا لے کر اُن سے ملنے آئے۔ سکھ دکھ کی باتیں کیں۔ پھر کھانا پینا ہوا۔ ملیالی جوڑا تب تک خاموش رہا۔ لیکن سونے سے قبل وہ عورت سمیتا کے پاس آئی، "میں نے نہیں جواب دیا، آپ نے بُرا مانا ہوگا۔ لیکن اتنی مسحور تھی آپ کی بات سے کہ اپنے آپ میں الجھ کر رہ گئی۔ اب سوچتی ہوں، آپ کی بات میں واقعی سچائی ہے۔ اِس مرد کے سماج میں بالآخر عورت کو ہی سولی پر چڑھنا ہوتا ہے۔ میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔ مجھے محبت ہی نہیں کرتے، عزت بھی کرتے ہیں، لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ

اگر میں دیر تک کسی غیر مرد کے ساتھ باہر رہوں تو...،،

سمیتا نے دھیرے سے اُس کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر ایسے دبایا جیسے دل کا پورا احساس انڈیل دیا ہو۔ ملیالی عورت نے اُس محبت کو سمیٹتے ہوئے کہا،" کیا آپ بتا سکتی ہیں، نجات کی راہ کہاں ہے ؟"

سمیتا پُر خلوص آواز میں بولی،" نجات کی فکر چھوڑ کر تلاش کی راہ پر چلتے رہنا ہی ہماری قسمت ہے۔"

" اس قسمت کو ہی نجات کہو گی ؟"

" ارادہ ہے منزل نہیں، منزل کی تلاش، سچ نہیں، سچ کی تلاش، یہی اُس اعتماد کی راہ ہے جس کا تم ذکر کر رہی تھیں۔"

اُس رات بھی سمیتا بے فکری کی نیند نہیں سو سکی۔ نہ جانے خوابوں میں وہ کہاں کہاں بھٹکی۔ کیسے کیسے منظر آنکھوں میں ابھرے، لمحے بھر کا ایک خواب جیسے صدیوں کی کہانی کہہ جاتا ہے۔ ریڈیو ڈرامہ کے مونتاژ کی طرح ایک کے بعد ایک منظر ابھرتے چلے گئے۔ ایک عورت اُس سے کہہ رہی تھی،" ہاں، میں چاہتی ہوں کوئی مجھ سے بلاتکار کرے۔ میں اُس کے لیے ترستی ہوں۔"

دوسری عورت کہہ رہی تھی،" ہاں، یہ سچ ہے کہ میرے شوہر نشیلی دواؤں سے نجات پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے، لیکن میں نے انھیں پھر اس نشے کی طرف راغب کیا۔ جب وہ نشے میں ہوتے تھے، تبھی میں آسودہ ہوتی تھی۔"

"ہاں، تیسری بولی،" میں چاہتی ہوں، میرے شوہر شراب پئیں، لیکن اتنی ہی جتنی جھیل سکیں۔"

چوتھی نے کہا،"...، پانچویں بولی...، چھٹی مسکرائی،" کیا تم خود نہیں چاہتیں، کیا تم نے خود بلاتکار کو قبول نہیں کیا ؟ کیا تم نے امریکہ میں واقع ہوئے حادثات کا صحیح تجزیہ کیا ؟ کیا تم نے ادگھڑ دانی نارائن کے آزادانہ برتاؤ کو پسند نہیں کیا ؟ کیا تم نے... کیا تم نے...؟"

وہ یکبارگی چیخ اُٹھی،" نہیں، نہیں، نہیں۔"

" نہیں، نہیں، نہیں، یعنی ہاں، ہاں، ہاں۔"

یہ مسلسل ہاں، ہاں، ہاں کی گونج اتنی تیز تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ سیکس امیج، مرد کے طاقت کی کشش، اپنے جسم کی مانگ، تو کیا مرد کی خواہش نہ ختم کر پانا اس کی لاچاری ہے۔۔۔

یکبارگی اُسے یاد آئے ایک مشہور بائیں بازو کے تاناشاہ کے الفاظ جو انھوں نے تب کہے تھے جب یوگوسلاویہ کے نائب صدر اور مفکر میلوان جیلاس اُن سے ملنے آئے تھے اور بات چیت کے دوران اُن سے شکایت کی کہ ان کے (تاناشاہ) ملک کی فوجیں ہمارے ملک کی عورتوں کے ساتھ بلاتکار کرتے ہیں۔ تب سماجی مساوات کے حامی اس تاناشاہ نے کہا تھا ہمارے فوجی عرصے سے گھر سے دور تھے اور عورت کے سُکھ کے ترسے ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے جو کیا وہ فطری تھا:

وہ تب نہ جانے کہاں پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے ایک آواز آئی ''جب مساوات کے مسیحا ایسا کہہ سکتے ہیں تو پھر عام مردوں سے کیا اُمید کر سکتی ہیں عورتیں؟

تو کیا عورت کی خواہش نہ ختم کر پانا مرد کی مجبوری نہیں ہے؟ لاچاری دونوں طرف ہے، لیکن مرد غالب سماج ہونے کی وجہ سے عورت ہر طرح کی پابندیوں کو برداشت کرنے پر مجبور ہے اور جب تک موجودہ سماجی نظام بنا رہتا ہے، وہ مجبور رہے گی۔

تبھی اُسے چونکاتی وہ ایک دوسرے کو کاٹتی آوازیں ابھرنے لگیں ''مرد عورت کے تعلقات میں اہم ہے جسم کی مانگ، مباشرت کا رنگ، اولاد تو بائی پروڈکٹ ہے، ثانوی ہے:

''نہیں، نہیں، جیسے انسان سماج میں انسانی اقدار کو قائم کرتا ہے ویسے ہی وہ انسان کو بھی پیدا کرتا ہے:

پھر یکبارگی ایک عورت نہ جانے کہاں سے آکر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے: مجھے پہچانتی ہو؟ میں رکھیل ہوں، ایک شادی شدہ مرد کے گھر میں رہتی ہوں۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ اس کی بیوی بھی مجھے چاہتی ہے، لیکن میں پھر بھی دکھی ہوں کیونکہ دوسری ہونے کا دکھ مجھے ہر لمحے کھٹکتا ہے۔

پھر ایک تیز آواز: ''کھٹکنا ہی چاہیے، کیونکہ شادی کے بعد محبت طوائفیت ہے، عیاشی ہے۔

تم کیسی ہو کیسی:

پھر تو چاروں طرف سے آوازیں گونجنے لگیں ''تم کیسی ہو، کیسی ہو، کیسی ہو۔۔۔؛
سمیتا جیسے تیزی سے چونک کر اُٹھی۔ اُسے لگا، جیسے یہ اُس کی اپنی آواز ہے۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ ہلکی دھندلی روشنی میں وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ کہیں کچھ نہیں تھا۔ سب سوئے تھے، سوچتی رہی خواب کی بات۔ باہر ایک بے چین کر دینے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خلا دہشت زدہ کرتا ہے تو طاقت بھی دیتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کو منتقی رہی۔
نہ جانے کب اُسے نیند آگئی اور پہنچ گئی صدیوں جیسے لمحاتی خوابوں میں۔ اس بار منظر ایک دم بدل گیا۔ ایک بے سہارا لوز ائیدہ بچی اُس سے کہہ رہی ہے '' میری کہانی سنو گی؟ میں تمل ناڈو کے مدورائی ضلع کی سوکھے سے برباد ایک گاؤں کے گھر میں دوسری لڑکی کے طور پر پیدا ہوئی تھی یہاں بیاہ کے لیے بہت جہیز دینا پڑتا ہے، پھر بھی بڑے رحم دل ہیں یہاں کے لوگ۔ پہلی لڑکی کو کچھ نہیں کہتے، تیسری کا جنم شبھ ہوتا ہے، وہ بھی زندگی کے خیرات پا جاتی ہے۔ باقی کو مرنا ہوتا ہے۔ مارنے کے بہت طریقے ہیں۔ گیلے کمبل میں لپیٹ دینا، زہریلی بوٹی دودھ میں پلا دینا لیکن جانتی ہو، مجھے کیسے مارا گیا؟ میرے مُنہ میں دھان کے دانے رکھ دیئے گئے، آنتیں کٹ گئیں، خون کی الٹی ہوئی اور مر گئی، کیسی تڑپی میں درد سے! آپ تصور کر سکیں گی۔۔۔
اگر کوئی لڑکی بچ بھی جائے تو اس کی زندگی اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ بہت سے سماجی کارکنان نے ایسی بدنصیب لڑکیوں کے لیے کلیان آشرم کھول رکھے ہیں اور وہاں ہمیں جگہ مل جاتی ہے، لیکن وہاں بھی ہمیں جسم کا سودا کرنا پڑتا ہے یعنی کسی نہ کسی روپ میں مرنا ہماری قسمت ہے؛
تب نہ جانے کہاں سے ایک آواز اٹھتی ہے، ''بچی تم پیدا ہی مت ہو؛
''لیکن پیدا ہونا یا نہ پیدا ہونا کیا ہمارے ہاتھ میں ہے؛
کہاں ہے اس مسئلے کا حل؟ کہاں ہے؛
ایک طنزیہ دبی دبی ہنسی ''یہ مرد کا جذبہ نہیں، خود عورت بھی یہی چاہتی ہے۔ اس کے باطن میں عدم تحفظ کا ایک جذبہ بنا رہتا ہے۔ اسی جذبہ کا ردِعمل اُس کی اس سوچ میں ہوتا ہے کہیں وہ کسی کو بدصورت نہ لگے۔ تب اس کے اندر جاگتی ہے آرائشی اشیاء کے استعمال کی بھوک' ہمیشہ نوجوان دِکھتے رہنے کی بھوک؛ تبھی جیسے شبرس آوازوں کی آہستہ آہستہ گونج پاس آنے لگی اور انھیں کے ساتھ سائیکل

لیے، ہاتھ میں کلائی گھڑی باندھے۔ مشرقی خطے کی کھل کھلاتی سجی سنوری دوشیزاؤں کا گروپ اُدھر سے گزرنے لگا، یہ کہتا ہوا کہ ہم گھڑی اور سائیکل کے لیے غیر ملکیوں سے اپنے جسم کا سودا کرتی ہیں۔ ویسے ہی جیسے مرد اونچا عہدہ پانے کے لیے اپنے بیویوں کے جسم کا سودا کرتا ہے!

آوازیں اُبھرتی رہیں اور وہ نیم خوابی میں اُن کا تجزیہ کرتی رہی۔ جب صبح وہ پچ مچ جاگی تو وہ سارے غیر متعلق اٹ پٹے حادثات بالکل یاد نہیں تھے۔ کوشش کرنے کے باوجود بھی نہیں سمجھ سکی۔

بس وہ اتنا ضرور سمجھ پا رہی تھی کہ بہت سی باتیں اُس نے کسی نہ کسی رسالہ میں پڑھی تھیں۔ اُس کے مَن کے اندھیرے کنوئیں میں وقت وقت پر انجانے ہی جمع ہو جانے والی اندرونی کش مکش مناسب فضا پا کر اُبھر آئے۔ اسے حیرانی نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُس کے باطن میں کتنی سیتائیں رچ بس گئی تھیں۔ انھوں نے ہی تو مجبور کیا یہ فیصلہ لینے کے لیے کہ اگر پورے سماجی ڈھانچے کو مکمل سماجی اقدار، دستور اور معاشی نظام کو بدل دیا جائے تو مرد عورت کے رشتے خود بخود پائیدار ہوتے چلے جائیں گے۔ اس انقلابی تبدیلی کے بغیر وہ یقین حاصل نہیں ہو سکتا جو صحت مند رشتوں کی بنیاد ہے۔ نہیں تو عورت کوئی گورو کے الفاظ میں ہمیشہ یہی پکار کرتی رہے گی ـــ

'ہے پیدا کرنے والی، آج تمھاری سونے کی تھالی میں میرے دُکھ کی آنسوؤں کو سجا کر انھیں آنسوؤں کی بوند بوند کو پرو کر تمھارے گلے کی موتیوں کا ہار بن جاؤں گی!'

اُن خوابوں کا ذکر اُس نے کسی سے نہیں کیا۔ اس اندرونی کش مکش اور غور و فکر نے اُسے ایک بے مثال طاقت دی تھی۔ اُسے لگا کہ خوابوں کے بہانے کسی نے اسے ہپنوٹائز کر کے اُسی کے باطن سے ملاقات کرا دیا تھا اور جیسے اس کا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ جیسے اسے راہ دِکھ گئی تھی کش مکش کے درمیان۔ آخری کچھ نہیں۔ وقت مسلسل رواں ہے تب انسانی اقدار کیوں جامد رہیں؟

وہ روزمرّہ کی ضروریات سے فارغ ہو کر دیر تک سُکمارن کے ساتھ کھیلتی رہی۔ سامنے کی

برتھ کی نوزائیدہ بچّی کی کلکاریوں میں اُس نے خوب رس لیا۔ اس کا فوٹو بھی کھینچا۔

وہ ملیالی عورت اب تک پوری طرح سے سمیتا کی ہم مزاج ہو چکی تھی۔ دہلی آنے میں اب دیر نہیں تھی۔ اچانک نوزائیدہ نے رونا شروع کر دیا۔ ماں نے بہت کوشش کی، باپ نے بھی لیکن کسی بھی طرح سے چپ نہیں ہو رہی تھی۔ دودھ بھی نہیں پی رہی تھی۔ سمیتا کافی دیر تک دیکھتی رہی، پھر یکبارگی اُس نے بچّی کو گود میں لے لیا" شاید اس کے پیٹ میں درد ہے"۔ اُس نے کہا اور آہستہ آہستہ اُس کا پیٹ سہلانے لگی، سہلاتی رہی۔ ماں دیکھتی رہی کہ بچّی نے اچانک قے کر دی۔ سمیتا کی ساڑی گندی ہو گئی، بچّے کی رُلائی میں فرق آنے لگا تھا۔ اُس نے ایک بار پھر قے کیا۔ رونا بہت کم ہو گیا۔ اُس نے اب بچّی کو اس کی ماں کو دے دیا۔ وہ ابھی رو رہی تھی لیکن اس کی ماں خوش تھی، اس کے چہرے کا رنگ لوٹ آیا تھا۔ اس نے ممنون نگاہوں سے سمیتا کی طرف دیکھا، پوچھا" اب ٹھیک ہے نہ میری بچّی؟"

"ہاں، کچھ ٹھیک ہے، لیکن دہلی پہنچتے ہی کسی ڈاکٹر کو دکھا دیجیے۔ بدہضمی ہو گئی ہے، گھبرایئے نہیں"۔

"کتنی دور ہے نظام الدین اسٹیشن؟ ہم وہاں اتریں گے"۔

"بس اب گاڑی وہیں رکے گی"۔

نظام الدین اسٹیشن پر انھیں لینے ان کے دوست و رشتہ دار آئے تھے۔ گاڑی پانچ منٹ رُکتی تھی۔ لیکن وہ عورت، ماں، سمیتا کو نہیں بھولی۔ دوڑتی ہوئی آئی اور گلے سے لپٹ گئی "آپ سے تعارف ہوا، بہت بڑی کامیابی ہے میری۔ کسی دن آؤں گی"۔

پھر اُس نے شیلا ملا سے اپنی زبان میں دو باتیں کیں، سُکمارن کو پیار کیا اور چلی گئی۔

دہلی اسٹیشن پر اجیت، وبھا اور انکت تینوں آئے تھے۔ ماں کو دیکھتے ہی انکت بھاگا، اُس سے چمٹ گیا بولا" ہمارا فوٹو دیکھا اخبار میں؟ تُوا کو چوٹ لگی ہے پھر بھی وہ آئی ہیں۔ لیکن کوئی ڈر نہیں ہے"۔

اور وہ سامان کی طرف لپکا، لیکن سُکمارن کو دیکھا تو اُسے گود میں لے لیا۔

سمیتا نے انکت کے الگ ہوتے ہی وبھا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی چھلچھلاتی آنکھیں ملیں

اور وہ لپک کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ کئی منٹ بعد سمیتا نے پوچھا "چوٹ زیادہ تو نہیں ہے؟"

"نہیں بھابھی! کوئی خطرہ نہیں مجھے، اور ہو بھی تو ان کا استقبال ہی کروں گی۔"

یہ کہتی ہوئی وبھا شیاملا کے پاس پہنچی۔ اُسے باہوں میں بھر لیا۔ کہا "اب کوئی ڈر نہیں مل کر باتیں کریں گے۔"

تب تک قلی سامان سمیٹ چکا تھا۔ وبھا، شیاملا کے ساتھ چل رہی تھی۔ انکت اسکمارن کو جیکائے تھا۔ اجیت اب سمیتا کے برابر چلتے ہوئے بولا "کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں، اب تو میں خوب واقف ہو گئی ہوں کیرل سے۔ پھر تمھارے دوست تھے جو ہمیشہ پلکیں بچھائے رہتے تھے۔"

اجیت نے دھیرے سے سمیتا کا ہاتھ دبا دیا۔ اسی لمحے دونوں کے جسموں کو لہراتی ایک لہر جیسے دونوں کو ایک کر گئی۔ دونوں کئی لمحے چپ چاپ چلتے رہے۔

پھر یکبارگی سمیتا کو یاد آیا، پوچھا "پتاجی آ گئے؟"

"ہاں، تمھارے جاتے ہی آ گئے تھے، اچانک۔"

"کیسے ہیں؟"

"ہمیشہ کی طرح خوش اور اپنے میں غرق۔ انکت بس اُن کا ساتھی ہے۔"

"فطری ہے۔"

پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔

سمیتا کے لوٹنے کے بعد پورا ہفتہ اُن کے گھر میں تقریب اور تحریک کا ملا جلا ماحول بنا رہا۔ خیریت کی خبر لینے والوں، اُن کے حوصلے اور بہادری پر مبارکباد دینے والوں کا سلسلہ بنا رہا۔ ڈاک میں اتنے خطوط آنے کہ انھیں پڑھنا مشکل ہو گیا۔ یہ کام شاہدہ کو سونپ دیا گیا تھا۔ شیاملا کا اس گھر میں داخل ہوتے ہی کایا کلپ ہو گیا۔ ہر وقت ہر طرح کی مدد کے لیے وہ حاضر تھی۔ وبھا تنہائی پاتے ہی وجوا آشرم دیر رات وہیں ہی ملتی تھی، اپنے آئندہ کے منصوبے کو شکل دینے میں لگی رہتی تھی۔ گایتری آسا! زبردست مذاح تھی۔ موقع پاتے ہی اس کی مدد کے لیے حاضر رہتی۔ ایک دن اُس نے

اعلان کیا — ”میں آج ایک عجیب وغریب کتاب لائی ہوں۔ وہ سو سال قبل ایک انجان ہندو عورت نے لکھی تھی۔ اُسے ابھی ایک آئی۔ اے۔ ایس افسر نے جو خود ترقی پسند مصنّف ہے، ڈھونڈ نکالا ہے۔ اُس زمانے میں عورت کیا سوچتی تھی، پڑھ کر حیران رہ جانا پڑتا ہے۔ وہ عظیم سدھارکوں کا زمانہ تھا لیکن وہ عورت تو جیسے اپنی زبان اپنے خیالوں میں اُن کی بھی خلاف ورزی کر جاتی ہے۔ جب میں نے اسے پڑھا تو اپنے عورت ہونے پر ناز ہوا۔ ویسے جب شرت چندر، کیشو چندر سین، سوامی دیانند سرسوتی، مہاتما پھولے وغیرہ ایسے ہی بے شمار مہاپُرش تھے۔ انھوں نے آزادیٔ نسواں کی دعوت دی۔ اُسے انسان کا پاس و لحاظ دیا۔ لیکن اس بے نام عورت نے اپنی اس کتاب میں جس کا نام 'سیمانتنی اُپدیش' ہے، عورت کی کمزوریوں پر گن گن کر حملہ کیا ہے۔ میں آپ کو اس کا ایک حصّہ پڑھ کر سناتی ہوں —۔ اولاد کے لیے پاگل کیا نہیں کرتی؟ ڈھونگی سادھو سنیاسیوں کے جال میں نہیں پھنستی؟ ایسے دردناک حادثات کا ذکر کرنے کے بعد وہ کتنی ہمّت سے انھیں سمجھاتی ہے —

”اولاد سے کسی کا نام اس دنیا میں نہ رہا۔ کسی کا دس پُشت، کسی کا بیس۔ آخر بند ہو جاتا ہے۔“

”ہم کو اس نام کے رہنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ہمارے مرنے کے بعد قائم رہے۔ لڑکا جس کے جینے کی ہمیں اپنی زندگی میں امید نہیں، پھر پیچھے کیا امید ہو سکتی ہے؟ دیکھو، میرا بائی کی آج کوئی اولاد نہیں اور اسے مرے ہوئے بھی مدّت ہوئی۔ مگر کس عزّت کے ساتھ آج تک اس کا نام لیا جاتا ہے۔ پرمیشور کی محبت میں اس عورت کے برابر آج تک دوسری کوئی مشہور نہیں ہوئی۔ بھیلنی ایک نیچ قوم میں تھی، مگر پرمیشور کا بھجن کرنے سے آج تک اس کا نام قائم ہے۔ پھر کالیداس کی عورت ودّوتما کی کوئی اولاد نہ تھی مگر علم کے سورج کی طرح آج تک اس کا نام روشن ہے۔ دیکھو مہابھارت میں کُنتی، درو پدی، ستیہ بھاما، ستیہ دتی، رُکمنی — کیسی عزّت کے ساتھ ان نیک خواتین کا نام لکھا ہے۔ پھر لیلاوتی، دمینتی، شکنتلا، کوئی ان کی اولاد کو نہیں جانتا۔ اہلیا، رانی بھوانی، کرشن کماری، شرن کماری کیسی ہمّت کے ساتھ ان خواتین نے اپنا نام مشہور کیا...

''اور دوسری طرح سے بھی یہ خواہش تمھاری بے فائدہ ہے۔ کیونکہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے، تبھی سے لڑکے کا نام باپ کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ تواریخ میں برابر را جاؤں کا حال ہے۔ کہیں اُن کی ماں، بہن، بیٹی، جورو کا ذکر نہیں، مگر انھیں عورتوں کا نام ہے جن کی کوئی تصنیف ہو یا کوئی عمارت بنوائی ہو یا کوئی اور ملکی بندوبست کیا ہو یا مذہب کے ساتھ کسی طرح کی دلیری کی ہو یا پرمیشور کے بھجن میں مشہور ہو۔

'' بہت سی عورتوں کا خیال ہے کہ عورتیں اولاد پیدا کرنے کے لیے ہیں۔ اگر یہ نہیں ہے تو وہ کسی کام کی نہیں ہیں۔

'' نہیں، یہ خیال ان کا بالکل غلط ہے۔ اگر پرمیشور اولاد کے لیے عورتوں کو بناتا تو یہ جو نیک و بد پہچاننے کی عقل ہم میں ہے، ہرگز نہ دیتا۔ آدمی کا دل جو تمام بدن میں ایک بیش قیمتی چیز ہے، تمھیں نہ دیتا۔

'' نہیں، پرمیشور نے حمل قرار پانے کو عورتیں اور حمل قائم کرانے کے لیے مرد بنائے ہیں۔ اس میں کسی کو اپنے نام رکھنے کی یا زیادہ ہونے کی خواہش نہ ہونی چاہیے۔ یہ تو قدرت کا دستور ہے۔ وہ ان دونوں کے ذریعہ اپنی دنیا وسیع کرتا ہے۔ جب اولاد ہو، خیال کرنا چاہیے کہ ہمارے ذمّہ پرمیشور نے ایک خدمت کی۔ بس، اُسے دل وجان سے بجا لانا انسان کا فرض ہے۔

'' اور جنھیں پرمیشور اس خدمت سے معاف رکھتا ہے انھیں یہ خیال ہرگز نہ کرنا چاہیے کہ پرمیشور کم بخت ہے، ہمیں اولاد نہیں دیتا۔ انھیں ایک طرح سے خوش ہونا چاہیے کہ پرمیشور نے اتنی بڑی خدمت سے انھیں معاف کر دیا۔''

یہاں آکر گایتری اچانک رُک گئی۔ اُس نے کتاب بند کر کے اپنے سامعین کی طرف دیکھا۔ وہ تو جیسے پتھّر کی مورت بنے، بغیر پلکیں جھپکائے دیکھے جا رہے تھے۔ وہ رُکی تو جیسے بھونچال آ گیا۔ وہ گہری پھیلی خاموشی سے جاگے۔ کئی لمحے مبہوت رہنے کے بعد وبھا نے خاموشی توڑی ''کیسی آسان، سیدھی زبان میں کیسے انقلابی خیالات۔ میں نہیں سمجھتی آج کی فیشنیبل عالمہ لیڈران بھی ایسے مدّلل طریقے سے سوچ سکتی ہیں۔ میرا تو سارا علم، سارے

لکچرز ترازو کے ایک پلڑے میں اور یہ دو صفحات دوسرے میں۔ تو میرا والا پلڑا آسمان میں ہی لٹکا رہے گا۔ زمین کو چھوئے گا بھی نہیں۔"

شاہدہ بولی "سچ دیدی، میری آنکھیں تو کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ گایتری جیسے پڑھ رہی تھیں، کبھی تیز، کبھی آہستہ، کبھی متوازن، لگتا تھا کہ وہ پڑھتی رہیں اور میں سنتی رہوں۔ میرا تو سر اونچا ہو گیا۔"

تب تک سمیتا نے کتاب اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مدیر کی جگہ پر ستیہ دیو کا نام دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم کر بول اٹھی "ارے، یہ تو اپنے ستیہ دیو ہیں۔ اجیت ان سے خوب واقف ہیں۔ انھوں نے پتاجی پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ واہ، کیسی عجیب عورت سے متعارف کرایا انھوں نے۔ اس کتاب کو تو بھارت سرکار کو چھپوا کر گھر گھر میں تقسیم کرنی چاہیے۔ آج میری عورت کی زندگی کامیاب ہو گئی۔ نہ کسی سے نفرت، نہ کسی پر تہمت، نہ بھاشنک زبان، لبوں مغز کو چھونے والے منطقی خیالات۔ کیسی انقلابی، لیکن کیسی متوازن! وہ عورت، واقعی عظیم ہے اور نام کی خواہش نہیں۔ میں تو اس کی سو کاپیاں خرید کر بانٹوں گی۔"

شیاملا نے ستیہ دیو کا نام سنا تو چونک اٹھی "میں تو انھیں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ انھوں نے میری کافی مدد کی ہے، لیکن اس کتاب میں اس بے نام عورت نے جو کچھ لکھا ہے اُسے سن کر تو ندامت سے میرا جی کٹ رہا ہے۔ کاش زمین پھٹ جائے، میں اس میں سما جاؤں۔"

"وہ بھی سیکھا تو نے؟ تیرے اندر تو طاقت کا سرچشمہ پھوٹ پڑنا چاہیے۔"

"اسی لیے تو ندامت ہو رہی ہے کہ اب تک کہاں تھا وہ سرچشمہ؟ کیوں قبول کیا ہم نے کہ ہم عورت ہیں؟"

"تو اب تو راستہ مل گیا۔ اب زمین کیوں پھٹے؟" شاہدہ نے چٹکی لی۔

"ہاں، اب نہیں پھٹے گی۔" شیاملا نے اعتماد سے کہا "اور اسی خوشی میں میں آپ سب کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

سمیتا اچانک، نہ جانے کس دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ اس کے باطن میں ایک مدھم لیکن مستحکم آواز ابھر رہی تھی ـــــ دیکھا تم نے! مردوں نے ضرور راہ دکھائی لیکن عورت،

کو واقعی عورت ہی پہچان سکتی ہے'۔

وبھا اُس رات شانت، پُرسکون سوتی رہی۔ خواب میں اُس نے خود کو ایک ماورائی روشنی سے گھرے پایا جو ویسے ہی ماورائی موسیقی سے گونج رہا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کو دیکھا بھابھی کو دیکھا، تعجب! اُس نے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا۔ وہ دیر تک ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے بھونچال سا آگیا۔ منظر ایک دم بدل گیا۔ وہ اپنی جیٹھانی کے سامنے غصّے سے کانپتی، سرخ چہرہ اور دہکتے انگارے جیسی آنکھیں لیے کھڑی تھی، چیخ رہی تھی، 'کسبی، بدکردار! تُو نے میرے شوہر کو مجھ سے چھینا ہے۔ تُو نے میرا گھر برباد کر ڈالا۔ میں نے تو کبھی تیرا بُرا نہیں چاہا تھا۔ تُو نے مجھے کس جرم کی سزا دی؟ میرے سہاگ سے تو قسمت والی بنی۔ میں تجھے جینے نہیں دوں گی۔ میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گی۔ میں تیرے شوہر کو، تیرے بچّے کو...'

شو نے جیسے تیسری آنکھ کھول دی ہو لیکن جیٹھانی بچ گئی، کیونکہ وبھا شو نہیں تھی۔ تبھی اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اس کا دل دھک دھک دھونکنی سا چل رہا تھا اور ایک آواز اُبھر رہی تھی' دیکھ لیا اپنے آپ کو... اتنی طاقت اور اتنی ہمت کے باوجود تُو اتنی کمزور ہے— اتنی معمولی عورت...'

'میں.. میں معمولی...' اس نے مداخلت کرنی چاہی۔

'ہاں، تُو معمولی سے بھی معمولی ہے...' آواز تیزی سے اُبھر رہی تھی۔

'کون ہے تُو؟'

وہ آواز ہنسی 'مجھے نہیں پہچانتی؟ میں وبھا ہوں، وہی وبھا جس نے سمیتا کے کردار پر طرح طرح کے تہمات لگائے تھے اور اپنے شوہر کو معاف کر دیا تھا کیونکہ...'

وہ چیخ پڑی 'نہیں، نہیں، بس اب ایک لفظ نہیں۔ میں نے واقعی... ہاں، سچ مچ بدلہ لینے کے لیے ایک نوجوان کو بلوایا تھا...'

'بس، بس' وہ آواز گونجی 'اتنا ہنگامہ کافی ہے۔ میں اب مطمئن ہوں تُو نے صحیح

راستہ پا لیا۔ کامیابی یا ناکامی، کسی کی فکر تجھے نہیں کرنی ہے۔ ہر فرد میں نہ جانے کتنے اور فرد، کتنے روپ لے کر چھپے رہتے ہیں۔ یہ سماجی نظام ہے ہی ایسا۔ تُو نے اُسے بدلنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے، اس لیے میں تجھے معافی دیتی ہوں۔"

اور وہ آواز بند ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے ڈری، سہمی، غیر یقینی سی کانپتی وبھا اچانک یقین سے ہنس پڑی اور اس نے شیاملا کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل خاموش تھی۔

اس نے پھر آنکھیں موند لیں، لیکن کیا شیاملا شانت تھی؟ شیاملا حالانکہ یہ نسبت صحت مند اور خوش تھی، لیکن بیچ بیچ میں گہرے اندھیرے میں کھو جاتی تھی اور وہاں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ وہ گیشون کو پکارتی تھی اور آ جاتا تھا اجیت۔ پھر سمیتا آتی۔ اب تو زیادہ سمیتا ہی آتی تھی۔

پھر پل بھر کے لیے اس کا پہلا شوہر آ جاتا جس نے اُس کے بال کاٹ ڈالے تھے اور اُسے بے سہارا دہلی میں چھوڑ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کھِل کھِلا [illegible]

پھر آتا وہ نوجوان جو ابھی ڈاکٹری پڑھ رہا تھا۔ اس نے اُس سے [illegible] جانے کو کہا تھا، لیکن وہ گئی نہیں تھی۔

تب نہ گئی ہو لیکن بعد میں وہ بے سہارا، یتیم عورت کس کس کے پاس نہیں گئی؟ کس کس سے وعدے نہیں کیے؟ اُس نے اس افسر سے کہا تھا "میں تمھارے ساتھ کہیں بھی جا سکتی ہوں۔"

پھر اس نے ایک معمر ادیب سے دوستی کی۔ بڑے فخر سے کہا "میں جسم کی قیمت پر مدد نہیں چاہتی۔"

یکبارگی وہ تھرتھرائی۔ کوئی دھیرے دھیرے ہنس رہا تھا "اور تم نے اُسے بانہوں میں لینے اور بوسہ کی اجازت دے دی تھی۔"

پھر آیا وہ خطرناک، بگڑے ذہنی توازن والا ڈاکٹر، جس نے شروع میں اسے پیار دیا لیکن جب وہ ناول لکھ کر پیسے نہ لا سکی تو مارنا شروع کر دیا۔ اس نے ناریل کے درخت بیچ کر اُسے کار دی تھی۔ وہ بھی اُس شرابی نے توڑ ڈالی۔ اور اس سے کہا "باسٹرڈ، تجھے

کچھ نہیں آتا ۔ پتہ نہیں کیسے لکھ لیتی ہے ۔ تو پاگل ہے ۔''
وہ دوستوں کو ڈاکٹری کتابوں میں درج پاگلپن دکھاتا اور انھیں اپنی بیوی پر گھٹاتا ۔ وہ اس کا سارا پیسہ کھا گیا ۔ شراب پی کر اُس کے اسکول میں بار بار ہنگامہ مچایا، اس کی نوکری چھڑوا دی اور وہ پاگل اُس کے بغیر رہنے کی بات سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ شرابی رات میں اس کی نسوانیت کو کامیاب کر دیتا تھا ۔
لیکن جسم کا ملن کیا محبت کا مترادف ہو سکتا ہے ؟
مترادف نہ ہو لیکن متبادل تو ہے ہی ، تبھی وہ کہتی ہے میں اُس کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتی ، اس کے بغیر بھی نہیں رہ سکتی ۔ اگر اجیت نہ آجاتے تو وہ واقعی مجھے مار ڈالتا ۔ انھوں نے ہمت کر کے مجھے اُس سے الگ کر دیا ۔ اوہ ، کیسا ہے یہ مایا جال ۔ میں محبت کے ریگستان میں بھٹکتی رہی ، وقتی نخلستان کے سہارے !
کوئی زور سے ہنسا ۔ 'لیکن تو تب بھی نہیں ہوشیار ہوئی ۔ ایک اور بے سہارے سے جا جُڑی ۔ مرد کے بغیر رہنے کا تصور بھی تو نہیں کر سکتی ۔ اس لیے تجھے جو ملا تو اسی کے لائق تھی ۔ ... لیکن شوہر سے محبت کی یقین دہانی نہ ملنے پر بھی بیوی کے فرض کو نبھایا ۔ اس سے بڑی اذیت کیا ہو سکتی ہے ؟ کیا یہ شہادت ہے ؟' طنز سے کوئی مسکرایا ۔ 'شہادت نہیں یہ زندگی کی قیمت ہے ۔ فن اسی راہ پیدا ہوتا ہے ...'
اس ہنگامے کے بعد وہ ایکدم گونگی بہری ہو گئی تھی ۔ کچھ کہنا چاہتی ، کہہ نہ پاتی ۔ سُننا چاہتی سُن نہ پاتی ۔ اُسے لگ رہا تھا کوئی بڑے بڑے دانتوں والا درندہ اس کی طرف آرہا ہے ۔ وہ بھاگی ۔ اچانک سُکمارن اس کی گود سے گر پڑا ۔ وہ رُکی اور درندے نے اسے دبوچ لیا ۔ وہ بے ہوش ہو گئی ...
لیکن جب سُکمارن کے گنگنانے پر اس کی آنکھ کھلی تو وہاں کچھ نہیں تھا ۔ رات کے لیمپ کے اوسط لیکن اُجلی روشنی میں بے مثال خاموشی تھی ۔ کرن باہر لیٹی تھی ۔ کہیں کوئی آہٹ نہیں تھی ۔ بس وہ خود تھر تھر کانپ رہی تھی ، بھُس بھُسا رہی تھی ـــــ اُس نے بہت جرم کیے تھے ۔ وہ واقعی مجرمہ تھی ۔

کسی نے آہستہ سے کہا ' ہاں ، تو مجرم ہے لیکن ابھاگن بھی تو ہے ۔ اب یہ سنہری موقع ہے اپنی طاقت کو پہچان اور ... تم کون ہو ؟ '

' میں شیا ملا ہی تو ہوں ۔ برے دن بیتے سمجھ ۔ لیکن اگر اب بھی ... '

یکبارگی باہر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی ۔ شیاملا نے گردن کو جھٹک دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ ایک نئے دن کا آغاز ہو چکا تھا ۔ وہ اور کرن تیار ہو کر کچن میں پہنچی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بج اُٹھی لیکن جب تک کرن کچن سے باہر آسکے ، وبھا دروازہ کھول چکی تھی اور اُس کے سامنے کھڑے تھے ۔ وجے بیگارے اور وسودھا بیگارے ۔ ایک لمحے کے لیے رات کے باطنی ہنگامے نے اسے مبہوت کر دیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہی وبھا جی اُٹھی اور خوشی سے چیخ کر اُس نے بیگارے کا ہاتھ پکڑ کر بڑی محبت سے دبایا اور پھر وسودھا سے لپٹ گئی " بہت خوشی ہوئی تمھیں نئے روپ میں دیکھ کر ۔ تم بھی خوش ہو ' تمھارا چہرہ بتا رہا ہے ۔ لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا ۔۔۔ وجے کو ڈانٹتی رہنا ، پیار سے ۔ شیشے کی طرح شفاف ہے یہ لیکن بے ڈول ، اٹ پٹا ، چیر باکس ! "

پھر یکبارگی چونک اُٹھی ۔۔ " لو ، میں بھی کیسی بے وقوف ہوں ! "

وجے بول اٹھا " بالکل میری طرح ! "

" آؤ ، اندر آؤ ! "

پھر اندر مڑ کر پکارا ۔۔ " بھابھی ' او بھابھی ، اجیت بھیا ، دیکھو تو کون آیا ہے ! "

اس کے بعد تو گھر میں وہ طوفان مچا کہ پڑوسی بھی گھبرا گئے ہوں گے ۔ وہ چھ بجے آئے تھے اور تین گھنٹے نہ جانے کدھر سے آکر کدھر چلے گئے ۔ وسودھا بالکل اجنبی نہیں تھی ۔ اُسے سب سے پہلے جانا تھا ۔ اجیت کے ساتھ وہ کار میں چلی گئی ۔ وہ اُسے بیگا منتری کے دفتر میں چھوڑ دیں گے ۔ سمیتا اُن کے بعد ٹیکسی سے گئی ۔ کرن سب سے آخر میں گئی ۔ انکت کی آج چھٹی تھی ۔ وہ بیگمارن کولے کر مصروف تھا اور بیگارے کو اُس کی ساری سرگرمیوں کی تفصیل دیتے نہیں تھکتا تھا ۔

اجیت کو چھوڑ کر سبھی دوپہر میں لوٹنے والے تھے ۔ اس لیے کرن بہت مصروف تھی ۔ وبھا چاہتی تھی اُس کے ساتھ رہنا ، لیکن وجے بیگارے نے اسے پکڑ کر بٹھا لیا ۔ دھیرے سے بولا " میں تمھیں اب اور بھی شدت سے چاہتا ہوں ۔ لیکن وسودھا کے بعد ۔ وہ بہت اچھی

ساتھی ہے، لیکن تمھاری بات کچھ اور تھی "

"تب تم نے زبردستی کیوں نہیں کی ؟"

"کیونکہ تم دوسرے طلاق کے لیے تیار نہیں تھی "

وبھا ہنس پڑی، کھسیانی ہنسی "سچ وجے میرے من میں ایک گانٹھ بن گئی ہے۔ میں مرد کو جیون ساتھی کے طور پر نہیں دیکھ پاتی۔ میں خود سے لڑتی ہوں۔ ہنگامہ کرتی ہوں۔ لیکن میرے نہ چاہنے پر بھی میرے اور مرد کے درمیان نفرت کی ندی اچانک ظاہر ہو جاتی ہے۔ میں تمھیں کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے..."

ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گئی۔ صدیوں جتنے لمبے اس لمحے کو اس نے ہی توڑا۔ اب وہ مکمل شانت تھی۔ بولی "وجے، سارے حالات پر غور کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ہم اچھے دوست ہو سکتے ہیں، اچھے جیون ساتھی نہیں۔ عورت میں ایک سیکسٹھ سینس ہوتی ہے، وہ انسان کے باطن میں جھانک لیتی ہے "

وہ چپ ہو گئی۔ وجے نے اس کی زرد اداس آنکھوں میں جھانکا۔ چاہا کہ اسے اپنی باہوں میں بھر کر اوپر لے جائے۔ لیکن ویسے ہی بیٹھا رہا، ریشمی دھاگوں میں بندھا۔ یکبارگی وبھا نے اس کا ہاتھ اٹھا کر چومنا چاہا لیکن ہونٹوں کا لمس ہوتے ہی وجے نے اسے کھینچ لیا، یہ کہتے ہوئے "وبھا میں تمھیں ایک سچ بات بتاؤں، بُرا نہ ماننا۔ میں تمھیں چاہتا تھا، میں تم سے کھیلتا بھی تھا لیکن وہ پیار نہیں تھا۔ ہم ماڈرن لوگ پیار کی شکایت کرتے نہیں تھکتے، کیونکہ کمپیوٹر کے زمانے میں وہ ہاتھ میں اُگ آئی ایک چھٹی انگلی کی طرح ہے بدصورت، غیر ضروری اور غیر متعلق۔ اس لفظ کو اب لغات سے نکال دینا چاہیے "

وہ ایک لمحے کے لیے جھجکا۔ پھر دھیرے دھیرے بولا "میں نے ایک جپسی فلم دیکھی تھی۔ اس میں ایک بوڑھا مرد میرے جیسے عاشق سے کہتا ہے — عورت سے پیار مت کر۔ یہ دغا کرے گی "

وبھا یکبارگی تڑپ اٹھی "میں جپسی عورت نہیں ہوں۔ پھر بھی میں یہ کہوں کہ میں نے اسی دغا سے بچنے کے لیے ایسا کیا تو بہت غلط نہیں ہوگا۔ میں تمھاری زندگی کو ایک نا تمام

پچھتاوے کے جال میں پھنسانا چاہتی تھی۔"

وجے یکبارگی ہنس پڑا۔" ردِّ عمل وبھا! خالص ردِّ عمل۔ کب آزاد ہوں گے ہم اس جال سے؟"

وبھا حیران وجے کو دیکھتی رہ گئی۔ یہ کون سا وجے ہے؟ کیا اتنے کم وقت میں اس نے...؟

پھر یکبارگی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی" مجھے بھی ایک گھنٹے میں جانا ہے۔ تیار ہوتی ہوں۔" اور یہ کہتے ہوئے وہ اس کے پاس آئی اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما، آنکھوں میں جھانکا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھنے کو جھکی، لیکن نہ جانے کیا ہوا، وہ بھاگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔ خاموش سا کئی لمحے وجے وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے باطن سے مسلسل وہی آواز اٹھ رہی تھی' وبھا تم سے سچ مچ پیار کرتی ہے تبھی تو...'

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور سیدھا مہندر جی کے کمرے میں چلا گیا جو شیلا کو اپنی ہی ایک کہانی کے بارے میں بتا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے" سچ بیٹی، جب میں نے وہ کہانی لکھی تب اس کے وہ معنی میرے ذہن میں بالکل نہیں تھے جو بعد میں مبقروں نے ڈھونڈ نکالے۔"

" کیا سچ مچ میں انجان تھا ان معنی سے یا میرے باطن میں وہی معنی تھے جنھیں مبقرین اور قارئین نے سمجھا؟ سچ بیٹی، ہمارے ہی باطن میں کیا کیا ہے، یہ ہم خود ہی نہیں سمجھ پاتے۔"

" اوہ، یہاں بھی باطن! آخر کیا ہے باطن؟ کیوں نہیں جان پاتے ہم اسے؟"

تبھی اسے لگا کہ اس کے چاروں طرف یہی سوال گونج رہا ہے۔ 'کیا ہے باطن؟ کیوں نہیں جان پاتے ہم اسے؟ کیوں، کیوں؟'

کھانے کے وقت ماحول خوشگوار تھا، پھر بھی وبھا نہیں آسکی تھی اور نہ آج شاہدہ ہی آئی تھی۔ وبھا نے جان بوجھ کر مصروف پروگرام بنایا تھا، لیکن شاہدہ؟ آج تو اس کی چھٹی ہے۔ وہ جانتی ہے۔ آج کل شاہدہ بہت پریشان رہتی ہے، پھر بھی...

وہ کچھ سوچ پاتی کہ تبھی دروازے کی گھنٹی کی تیز آواز نے اسے چونکا دیا۔ دروازہ کھولا

توخوش ہو کر بولی " ارے، تم، آؤ، آؤ نکنج ، میگھا ، تم بھی آؤ "

اُن کے پیچھے کھڑی شاہدہ کو سمیتا نے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ اب شاہدہ نے دیکھا کہ سب مڑ رہے ہیں تو بولی " اور میں جاؤں ؟ "

سمیتا مڑی، مسکرائی " جا یا آ، تجھے حکم دینے والی میں کون ؟ "

" تو جا رہی ہوں "

" جا "

تبھی نکنج نے کہا " دیدی، جانا تو مجھے ہے، اسی فلائٹ سے۔ پرسوں لوٹوں گا۔ تب تک میگھا تمھارے پاس رہے گی "

یہ کہہ کر اُس نے نمسکار کیا اور چلا گیا۔

سمیتا نے مڑ کر شاہدہ کی پیٹھ پر ایک گھونسا دیا " کہاں تھی اب تک ؟ آج تو تیری چھٹی تھی۔ اچھا پہلے کچھ کھا لے "

تعجب جب تک وسودھا اور دیے چلے نہ گئے شاہدہ اخلاق کی مورت بنی رہی۔ اُن کے جانے کے بعد قہقہوں اور گیتوں کی محفل اور بھی ہوا نکلے غبارے کی طرح پچک گئی تھی۔ اجیت کو بھی جانا تھا۔ کرن کچن میں مصروف تھی۔ انکت، سُکمارن کے سونے کے بعد ہوم ورک میں مصروف ہو گیا تھا۔ تب شاہدہ نے چپ چاپ ایک خط سمیتا کے ہاتھ میں دیا۔ سمیتا کچھ حیران سی ہوئی۔ شاہدہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی بھی تھی اور آنسو بھی۔

رشو ناتھ نے لکھا تھا ـــ

پیاری شاہدہ !

میں جانتا بھی ہوں اور مانتا بھی ہوں کہ یہ خط پڑھ کر تمھیں دُکھ ہوگا، لیکن میں مجبور ہوں۔ آج کی دنیا جذبات کے سہارے نہیں چلتی۔ مشین اب اِس کی نگراں دیوی ہے تو محبت، پیار، لگاؤ، احساس یہ بھی سب مشینی ہو گئے ہیں، نہ کوئی کسی کے لیے جیتا ہے، نہ کوئی کسی کے لیے مرتا ہے۔

بی۔ بی۔ سی کے جس شعبے میں مَیں کام کرتا ہوں اُس میں ناروے کی ایک لڑکی بھی ہے

ہے۔ خوبصورت، نیک، کوئی گھمنڈ نہیں چھوتا اُسے۔ پھر بھی شاندار، ہر چیز، ہر کام میں، ایک خوبصورت جذبہ۔

میں اقرار کروں گا، مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ اس لیے اور زیادہ جس ملک میں مَیں نے جنم لیا وہاں ہمیشہ میں نے توہین پائی۔ ایک زرخرید غلام کا سا جذبہ اب بھی ہے سبھی ذاتوں میں، جب کہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ہم میں ذہانت ہو سکتی ہے، یہ تو شاید ہی کوئی مانے۔ یہ سب تو تم جانتی ہو۔ مسلمان، مَیں مانتا ہوں، اتنی نفرت نہیں کرتے، لیکن تبھی تک جب تک وہ لوگ بھی مسلمان نہیں ہو جاتے۔ تمھارے گھر والوں نے اعتراض کیا ہی ہے۔

میں نے تمھیں سچے مَن سے چاہا ہے۔ تمھاری غزلوں نے مجھے باندھا ہے۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ مَیں تو تم سے معافی چاہتا ہوں۔ اپنا جرم قبول کرتا ہوں۔

مجھے لگتا ہے کہ اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ میٹیلڈا نے شادی کی تجویز رکھی ہے۔ مَیں نے قبول کر لی ہے۔ جلد ہی ہم شادی کر لیں گے۔ تم ناراض نہ ہونا۔ سوچ کر دیکھنا۔ تمھیں مَیں پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم خوش رہو۔ میں تمھیں ہمیشہ پیار سے یاد کرتا رہوں گا۔

دیکھو نا، یہاں کوئی بندھن نہیں اور ہمارے یہاں ریکھائیں ہی ریکھائیں، دائرے ہی دائرے۔ بھارت آنے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں۔ یہاں کا کانٹریکٹ ختم ہونے پر وائس آف امریکہ یا روس یا ناروے کہیں بھی چلا جاؤں گا۔

مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گی، سوچو گی اور معاف کر دو گی۔ بہت بہت پیار اور معذرت کے ساتھ۔

تمھارا

رشوناتھ

سمیتا نے خط پڑھ لیا۔ کئی لمحے سوچتی رہی۔ پھر شاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی " بچ گئی تو، اچھا ہوا، یہ اُدھر سے ہی ہوا۔"

شاہدہ نے رُندھی آواز میں کہا " مجھے اب بھی یقین نہیں آتا۔ اُس کی خوبصورت مُسکان

میرے باطن میں جذب ہے۔"

سمیتا نے کہا "یہی تو لالچ ہے۔ محبت یہ نہیں ہوتی، وہاں کوئی شرط نہیں ہوتی۔"

"آج سمجھتی ہوں کہ آپ مجھے کیوں بار بار روکتی تھیں۔ دُکھ تو ہے مجھے، غصہ آتا ہے اس پر، لیکن اُس نے تو دل کھول دیا۔ میں آزاد ہو گئی۔"

"تم نے امّی جان کو بتایا؟"

"ابھی نہیں۔"

"بتانا بھی مت۔ وہ کبھی پوچھیں گی تو کہہ دینا — میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا۔"

"کچھ تو کہوں گی ہی۔ لیکن بھابھی جان، سب کچھ کے باوجود میرے اندر سے ایک آواز اُٹھتی ہے — کاش، ہم ایک ہو پاتے۔"

سمیتا ہنس پڑی "ایک ہونے کو بہت ہیں۔ تو آج کہہ، کل میں تیرے لیے دس دولہے نہ لادوں۔ لیکن شاہدہ۔ اس لگاؤ کو جتنا روک سکے روک۔ شوناہنؔ کے برتاؤ سے سبق سیکھ۔ دبھا کر دیکھ۔"

تبھی گھنٹی پھر بجی۔ اس بار انکت نے دروازہ کھولا۔ سامنے راج کلی تھی، گود میں ایک چھوٹی گڑیا سی لڑکی لیے۔

وہ بھاگا — "ممی ممی، وہ راج کلی بُوا آئی ہیں۔ اُن کے پاس ایک گڑیا سی بچی ہے۔"

تب تک سب نے اسے گھیر لیا تھا۔ تعجب یہ وہی راج کلی تھی جسے بمبئی میں ڈھونڈنے میں سمیتا نے کتنے پاپڑ بیلے تھے — جینس اور قمیض میں کسی، بالوں کا جوڑا، اُوپر آنکھوں پر چشمہ، پیروں میں پہاڑوں پر کام میں آنے والی خوبصورت سینڈل۔ بچی سانولی لیکن مسکراتی ہوئی آنکھیں، بال باپ پر۔

اجیت نے پوچھا "تم اکیلی ہو، ولیم کہاں ہے؟"

وہ رانچی گئے ہیں، کسی گھریلو کام سے، ایک ہفتہ لگے گا۔ میں نے سوچا، میں تب تک دیدی کے پاس رہوں گی۔"

پیچھے قُلی تھا — ایک خوبصورت اٹیچی، ایک بیگ، ایک ٹوکری جس میں ڈھیر سارے

سچل تھے۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سمیتا راج کلی کا انتظام کرے، تب تک چائے میز پر پہنچ چکی تھی۔ تبھی وبھا بھی لوٹ آئی۔ راج کلی کے لباس نے اُسے حیران کر دیا۔ چائے پیتے ہوئے اُس نے پوچھا "تو خوش ہے؟"

"خوش، میں اتنی خوش ہوں جتنی جنت کی اپسرا بھی نہ ہوگی۔"

"جنت کی اپسرائیں تو کرائے کی جدید کال گرلس ہیں، میں تیری بات پوچھ رہی ہوں۔"

راج کلی ہنس پڑی۔ بولی "غلط تشبیہہ کے لیے معافی چاہتی ہوں اور یہ جو کپڑے میں نے پہنے ہیں، یہ سہولت کے لیے ہے۔ نہیں تو میں وہی راج کلی ہوں جس کے مُردہ جسم میں دیدی نے جان پھونکی تھی۔ دیدی میری آدرش ہیں۔ میں پڑھ رہی ہوں۔ مجھے ولیم سے بہت ہمت ملی۔ ان کے یہاں اتنی ممانعت نہیں ہے۔ بڑے سیدھے انسان ہیں، تبھی ہر کوئی انھیں ٹھگ لیتا ہے۔ ہمارا سماج کتنا بٹا ہوا ہے۔ میں مطالعہ کر رہی ہوں۔ ان کے سماجی نظام کا۔ کئی بار ہو آئی ہوں۔"

اچانک سمیتا نے پوچھا "اچھا بتا، ہنڈیا پی تو نے؟"

ایک پل کے لیے راج کلی جھجکی، پھر بولی "ولیم نے مجھے سب بتا دیا تھا۔ ہم لوگ بھی تو پیتے ہیں۔ میں نے سب کچھ سیکھ لیا، لیکن حد سے کبھی آگے نہیں بڑھی۔ ہر سماج کے اپنے دستور ہوتے ہیں، ان کی عزت کرنا، انھیں برتنا دو الگ الگ باتیں ہیں۔" ایک لمحے کے لیے وہ رُکی، پھر بولی "وہ محنت کش سماج ہے، عورت مرد برابر ہیں۔ اس لیے ان کی زبان میں بلاتکار لفظ ہی غائب ہے۔ اُس کی جگہ پر 'ڈگرا' لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے عیاشی۔ اس میں عورت مرد دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ تنہائی کی مانگ جو ہمارے سماج میں صرف مرد کو ہے، اُن کے سماج میں عورت بھی اتنی ہی آزاد ہے۔

"میں نہیں کہتی کہ وہاں مرد غالب نہیں ہے۔ وہ اب بھی ہے۔ سارا کام وہی کرتی ہے۔ مرد دروازے پر بیٹھا حقہ پیتا ہے۔"

لمحے بھر پہلے کی راج کلی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اس کی جگہ پر وہ عورت تھی جو چوٹ کھا

چکی تھی اور جو سماج سے لڑنا چاہتی تھی۔ دیبھا کچھ حیران ہوئی۔ پھر مسکرا کر بولی "تم تو میری ذات کی ہو لیکن ہمیں مردوں سے نہیں سماج سے لڑنا ہوگا۔"

راج کلی مستحکم آواز میں بولی "نہیں دیدی، اس سے پہلے اپنے آپ سے لڑنا ہوگا۔ خوف کو تبھی جیت سکو گی۔ ہمارے زوال کا سبب خوف ہے۔ آپ کے ساتھ بلاتکار ہوتا ہے، مہذب سماج آپ کو نکال دیتا ہے، یہی خوف ہے نا آپ کو۔ آپ کہیے، بلاتکار سے جسم ناپاک ہوا ہوگا۔ نسائیت تو ناپاک نہیں ہوئی۔ آپ اپنا سماج بنائیے۔ کیا آپ کا سماج عورت کے بغیر سماج رہے۔"

دیبھا اُس کی باتوں سے بہت خوش دکھی۔ سمیتا تو بس اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ کرن کو جیسے اپنے ہی خاندان کا عزیز مل گیا۔ لیکن شیاملا کے باطن میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی — ایک یہ ہے، ایک میں ہوں۔ اُس نے دھیرے سے کہا "بہن تمھارے خیال بہت اونچے ہیں۔ گاندھی مہاتما بھی تو کہتے رہے، لیکن کیا یہ اتنا آسان ہے؟"

"نہیں ہے، لیکن اگر مرد غالب سماج میں برابری کا درجہ پانا ہے تو اِسے آسان بنانا ہی ہوگا۔ جائداد کی تقسیم مرد عورت میں برابر ہوگی۔ آدم سماج میں عورت مرد دونوں کام کرتے تھے۔ دونوں کا اپنی اپنی جائداد پر حق تھا۔ عورت مرد میں سماتی نہیں تھی، اس کے برابر کھڑی ہوتی تھی۔ آج کی زبان میں کہوں تو سب میں مِلی جُلی لیکن سب کی کشش سے آزاد۔ یہ اُلٹ پلٹ کیسے ہوا؟ عورت کو اپنے باطن کو ٹٹول کر اپنی غلطیوں کی طرف دیکھنا ہوگا۔ سجنا سنورنا، مرد کو لُبھانا، یہ شریف سے شریف عورت کرتی ہے۔ تبھی تو اشتہاروں میں عورت کے جسم کا، عورت مرد کے شہوت پرست مناظر کی کھلے عام نمائش ہوتی ہے اور گھر میں سب دیکھتے ہیں اُسے ۹۰ برس کے بوڑھے سے لے کر ۱۰ برس کے بچے تک۔"

شیاملا یکبارگی چونک اُٹھی "بریو، ہپ ہپ ہرّے۔ راج کلی زندہ باد۔"

پھر اتنی ہی سنجیدہ ہوگئی "ہاں، راج کلی، خوف کو جیتنا ہوگا، موت کو جیتنا ہوگا۔"

دیبھا نے کہا "مجھے تو ان سیدھے سادے الفاظ سے بہت طاقت ملی۔ میں جو ایک مساوی دستور سازی کا خاکہ تیار کر رہی ہوں، اُس میں مجھے تم سے بہت مدد ملے گی۔ طاقت جسمانی ہی نہیں ذہنی بھی ہوتی ہے۔"

راج کلی بول اٹھی "میں تو کہتی ہوں کہ صرف وہی ہوتی ہے۔ ذہنی طاقت کا مطلب ہے، بے خوف ہونا۔ خوف کو جیتے بغیر کیا کچھ پایا جا سکتا ہے؟ اس لیے صرف جسم کو اہمیت نہ دو۔ بے پناہ فراخدلی، بے پناہ خواہش، جسم کی فکر نہیں۔ عورتیں مر گئیں تو کیا سماج رہے گا؟"

راج کلی جتنی دیر بولتی رہی، وہاں روشنی بکھری رہی۔ اس کے پاس علم نہیں تھا، تجربہ تھا۔ اس کے آخری الفاظ تھے "خوف صرف مرد کی جسمانی طاقت سے نہیں، اپنے باطن میں جذب ذہنی سنسکاروں سے بھی۔ خود اعتمادی خوف کو جیتے بغیر نہیں پائی جا سکتی، لیکن یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ خود اعتمادی کے بغیر خوف کو نہیں جیتا جا سکتا۔ دراصل یہ دونوں ایک ہی لفظ کے دو تلفظ ہیں۔"

تبھی سب نے دیکھا کہ مہندر جی انکت کا ہاتھ پکڑے وہاں آئے اور راج کلی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے "سب کچھ سنا میں نے۔ تمھاری آواز میں ہی آزادیٔ نسواں کی کنجی ہے۔ کسی مقصد کے لیے جان کی قربانی دینے والے بلاشبہ عظیم ہوتے ہیں، لیکن شہیدوں کا ایک درجہ اور ہوتا ہے جو جیتے جی اپنے 'میں' کو مٹا کر اپنے آپ کو سماج، ملک اور انسانیت کی تحفظ کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔"

یکبارگی وبھا نے پوچھا "کیا شادی کی تنظیم بے معنی نہیں ہو گئی؟ کیا اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی؟ کیا وہ ایک روایتی رومانی سماجی دستور والے سماج کی پیداوار نہیں ہے؟ آج روایت والے بغیر سماجی اور بے حد مفاد پرست ہیں، دنیا میں اس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔"

مہندر جی بول اٹھے "ایک فلم پروڈیوسر کے الفاظ ہیں یہ۔ ان کے لیے شادی کی تنظیم کو مٹا دینے کا تصور بہت آسان ہے۔ وہ رہتے ہی آزاد ماحول میں ہیں، انھیں کی ذات کے ایک شخص کے یہ الفاظ بھی تمھیں یاد ہوں گے 'میں دن میں دس لڑکیوں کے ساتھ سوتا ہوں، کیا سب سے شادی کر سکتا ہوں؟' شادی کی تنظیم کو مٹانا سماج کو مٹا کر پھر غار کے زمانے میں لے جانا ہوگا۔ بنیادی لفظ ہے سماج، بھیڑ اس کا متضاد ہے۔"

وبھا پھر بولی "کیا ہم جس شخص کو پیار کرتے ہیں اس کے ساتھ بغیر کسی قاعدے قانون کے نہیں رہ سکتے ہیں؟ بچوں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ماں کے پاس رہیں۔ بچوں کو یہ تبدیلی قبول کرنا ہوگا۔"

"سوال، بیٹی، بچّے کے قبول کرنے کا نہیں، ماں کا بھی ہے۔ انسانی نفسیات کا بھی ہے۔ بچّہ پیدا ہوتے ہی کسی کی گود میں ڈالا جا سکتا ہے، پرندوں کی دنیا میں ایسا ہوتا ہی ہے لیکن جہاں تک انسانی سماج میں ماں کا سوال ہے، میں نہیں سمجھتا وہ اس حالت کو قبول کر سکے گی۔ تب کیا وہ زچگی والی ایک مشین نہیں رہ جائے گی؟ اور سماج مشینوں سے نہیں بنتا۔ تبدیلی مسلسل ہوتی ہے، لیکن وہ آگے بڑھنے کے لیے ہوتی ہے۔ سماج ملک کی ضرورت کے لیے ہوتا ہے۔ بھارت چین جیسے ملک بڑھتی آبادی سے بے چین ہو کر فیملی کنٹرول چاہتے ہیں اور روس کو انسان چاہیے۔ وہ ماں سے زیادہ اولاد کی خواہش کرتا ہے۔ کوئی قاعدہ آزاد نہیں ہے سب سماج اور تہذیب کے ارتقاء سے بندھے ہوئے ہیں۔"

تبھی کرن نے اطلاع دی، کھانا تیار ہے۔ وہ سب اُٹھے۔ دوپہر کے کھانے سے لے کر اب تک کا وقت دوستوں کے آنے جانے اور بحث کرنے میں ہی گزر گیا۔ اس لیے سمیتا نے اعلان کیا "کھانے پر کوئی بحث نہیں ہوگی۔ اور دیر بھی نہیں ہوگی۔ اس کے بعد محفل جمے گی۔ شاہدہ کی غزل، میگھا کے گیت تو ہوں گے ہی، میں اپنی کویتا سناؤں گی اور شیاملا ملیالی سنگیت سے نوازے گی۔ محفل کی نظامت کرے گی، کرن۔"

"اور وبھا دیدی؟" شیاملا نے پوچھا۔

"وہ ڈھولک بجائے گی اور میں ناچوں گی۔"

اور واقعی اس رات اس محفل میں جو امرت برسا وہ بڑی انجمنوں کے ذریعہ منعقد عظیم موسیقاروں کی محفل میں نہ برسا ہوگا۔ میگھا نے میرا کا پد گایا — "ہے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کوئے"۔ میرا کا ہی پد گایا کرن نے بھی — "میرا لاگو رنگ ہری، آنکھ اٹک پری۔ کوئی نندو، کوئی بندو، دھا تو گن گووندا کا سیو"۔ شاہدہ نے اپنی غزل کے بعد غالب کی غزل — "یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا" سنائی تو واقعی سب کے دل درد سے بھر آئے۔ شیاملا کے گیت وہ سمجھ نہیں سکے، لیکن اس کی خوبصورت آواز نے سب کا دل جیت لیا۔ سب سے بعد میں وبھا نے ڈھولک پر تھاپ دی — "راناجی میں تو سانورے رنگ رانچی"، نہ چاہتے ہوئے بھی سب کے گلے سے آواز نکل پڑی اور سمیتا شانت مزاج

سمیتا تھرک اُٹھی نوجوانی کی پوری رفتار کے ساتھ۔ وہ بھول گئی وہ کہاں ہے۔ آواز پتا جی تک پہنچ رہی تھی۔ وہ تو بس مست ہو کر ناچ رہی تھی اور گا بھی رہی تھی۔ دراصل سبھی اپنے آپ کو بھول کر سمیتا کی تال کے ساتھ تال ملا رہے تھے کہ اچانک وبھا نے ڈھولک پر آخری تھاپ اتنے زور سے دی کہ سمیتا گرتے گرتے بچی۔ ایک پل کے لیے تو وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ کیا ہوا، لیکن گیت ختم ہو چکا تھا اور انکت بھاگتا ہوا آ کر ماں سے چپک گیا تھا۔ "ممی تم اتنا اچھا ناچتی ہو!"

سمیتا نے اسے دیکھنے کے لیے نگاہ اُٹھائی تو سامنے اجیت آ گئے۔ سمیتا بھاگتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔ وبھا نے کہا "آپ کب آئے بھیا؟"

"جب تم نے ڈھولک پر تھاپ دی!"

شاہدہ کو گھر چھوڑ کر جب اجیت لوٹے تو سب اپنے اپنے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ سمیتا نے ہی دروازہ کھولا۔ مسکرائی۔

"تم اتنا اچھا ناچتی ہو، یہ میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا!"

"تم نے کبھی اس طرف دھیان دیا؟"

اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے وہ مسکرایا۔ "کیسے دیتا، تم تو مجھے ہی نچاتی رہیں!"

"تو اب دونوں ناچیں گے، تیار ہو؟"

"اب نہیں ناچ رہے کیا؟ یہ تو تم ہی ہو جو سب کچھ سنبھال لیتی ہو۔ میں تو گھبرا جاتا!"

پاس لیٹی ہوئی سمیتا بولی "آج ایک بہت اہم خبر ملی ہے۔ تم نے سنا؟"

"نہیں تو!"

"شاہدہ نے نہیں بتایا؟"

"نہیں، کیا ہوا! بتاؤ گی نہیں؟"

"گھبراؤ نہیں، مردوں نے ایک بار پھر اپنی ذات دکھا ہی دی، لیکن یہ اچھا ہی ہوا!"

"اب کچھ بتاؤ گی بھی!"

"ہشوناتھ نے لندن میں ایک ناروے کی لڑکی سے شادی کر لی۔ بی۔بی۔سی میں اس کی معاون ہے۔"

ایک لمحے کے لیے تو اجیت حیران رہ گیا۔ پھر سیتا کی طرف مڑ کر بولا "تمھیں کیسے پتہ؟"

"اس نے خود شاہدہ کو خط لکھا ہے۔ بہت بہت معافی مانگی ہے۔ لو پڑھ لو۔"

اجیت نے خط پڑھ لیا۔ پہلا تاثر بہت اچھا نہیں تھا۔ لیکن پھر بولا "تم ٹھیک کہتی ہو، بالآخر یہ اچھا ہی ہوا۔"

"سنو، اجیت!" سیتا یکبارگی سنجیدہ ہو کر بولی "میں سمجھتی ہوں ہشوناتھ کے باطن میں بھارت اور بھارتیوں کے لیے گہری نفرت ہے جسے شاید وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ وہاں جاکر اُسے موقع ملا اور اُس نے اَسے فوراً قبول کر لیا۔۔۔"

اجیت نے اپنا وزن اس کے جسم پر ڈالتے ہوئے کہا "سمی! تمھارا تجزیہ صد فی صد صحیح ہے۔ انسان جو دکھتا ہے وہ تو وہ ہوتا ہی نہیں۔ اس سچ کو وہ خود بھی نہیں جانتا۔"

"تم کیسے جان گئے؟"

کہیں دور سے بولتے ہوئے اجیت نے جواب دیا "تم اور میں کیسے کیسے حالات سے گزرے ہیں۔ اُسی نے ہمیں ہماری نگاہ میں ننگا کر دیا ہے۔"

پھر لمحے بھر کے لیے رُک کر اس نے دھیرے دھیرے کہا "اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ تو تمھیں الزام نہیں دوں گا۔ سچ کتنا درد برداشت کیا تم نے۔"

یکبارگی تیزی سے اجیت کو پرے دھکیل کر بیٹھ گئی اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر تیز آواز میں بولی "اگر اب ایک لفظ بھی کہا تو ضرور چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ تمھارے اندر سے یہ بات مٹتی کیوں نہیں؟"

پُر جوش ہوئے بغیر اُسی شانت آواز میں اجیت بولا "اس دنیا میں جو واقع ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اِس آسمان میں درج ہو جاتا ہے۔ اسی آسمان کا ہم حصّہ تو ہیں۔ تم نے بھی تو بار بار طعنہ دیا ہے مجھے۔"

سیتا اچانک جواب نہ دے سکی۔ کئی پل بعد دھیرے دھیرے بولی "اس بات کو جان لینا

کیا آزاد ہو جانا نہیں ہے؟"

"ہے۔"

"تو پھر تم کیوں؟"

"تم نہیں ہم..."

"بار بار اپنے گناہوں کو یاد کر لینا..."

"نہیں بار بار یاد کرنے سے خود اذیت کا جنم ہوتا ہے اور وہ خود ستائش کا ہی دوسرا روپ ہے..."

اچانک گردن گھما کر اجیت نے سمیتا کی آنکھوں میں جھانکا، پھر اس نے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "سچ، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا، کتنا پیچیدہ ہے یہ دل کا دستور۔

"تم یہ نہیں سوچتیں کہ ساری پیچیدگیاں ملکیت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہیں۔ کائنات کے ابتدا میں مرد عورت میں ملکیت کا جذبہ نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ یہ کیسے پیدا ہوا، اسی کو لے کر مختلف مفکرین نے مختلف طریقے سے غور و فکر کیا ہے۔ کتنے دستور، کتنے قاعدے، کتنے دھرم گرنتھ! پونجی کا جنم، اس کی ملکیت، مرد نے رکاب ایجاد کر کے گھوڑے کو غلام بنایا، ویسے ہی عورت کو ممتا کی عظمت سے سجا کر اسے اپنے قدموں کی خادمہ نہیں بنا لیا گیا؟ ویسے ہی ذہانت کا نقاب اوڑھ مالک اور غلام میں آدمی کو بانٹ دیا۔ ایک دن میں نہیں ہزاروں ہزاروں سالوں میں یہ سب آسانی سے واقع ہوتا رہا۔ ریوڑوں کا مالک گھومنے والے سماج، زراعت کی ایجاد کرنے والا سماج، صنعتوں کی ترقی کرنے والا سماج۔ ایک طرف سائنس کی ترقی ہوئی۔ دوسری طرف عناصر کے ماہرین نے عظیم ادبی سرمائے کی تخلیق کی اور ثنویت و کشمکش کے بیج بو دیے... میرا تو سر چکرا جاتا ہے۔ مجھے تو دبھا کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے دماغ میں ابھی ایک نقشہ ابھرا ہے۔ نئے سماج کا اسے روپ دینا ہے..."

وہ بول رہا تھا۔ سمیتا اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتی، کبھی چوم لیتی۔ وہ چپ ہوا تو بولا "سچ اجیت، مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ اسی ملکیت کا جذبہ، سائنس، ادبی سرمائے کے مفروضے نے انسان کو انسان سے نفرت کرنا سکھایا۔ اجیت، کیا تم یہ نہیں سوچتے

کہ نام نہاد ہندو جتنا نفرت کرتا ہے اپنے ہی جیسے گوشت پوست کے انسان سے، اتنا شاید کسی اور سماج میں نہیں ہوتا۔"

"کہتے ہیں، جہاں جتنی آزاد خیالی ہوتی ہے، وہیں اتنا چھوٹا پن بھی ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے، اس کا تجزیہ بھی اتنا ہی پیچیدہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو کہتا ہوں بند کردو الماریوں میں ماضی کو۔ محقق اس کا مطالعہ کریں، اس پر ناز بھی کریں، لیکن جو حال میں ہے وہ اپنے زمانے کے لیے اپنا دستور بنائیں۔ وقت ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ خیال بھی بہتے ہیں۔ ہم کیا وہی ہیں جو ہمارے دادا یا ان کے دادا تھے؟"

"اجیت، کیوں نہ ہم ایک تنظیم بنائیں۔ اپنے ان خیالات کو چھپوا کر بانٹیں۔ اخباروں میں پابندی سے کالم لکھیں — تم، میں، وبھا اور ورتکا..."

ایک دم چونک اُٹھا "کئی دن سے ورتکا دیدی کی خبر نہیں ملی۔ کہاں ہیں نارائن بھائی صاحب؟"

"ہاں، کل پہلا کام یہی کرنا۔ چلو اب سو جاؤ۔"

"ہاں، سو جائیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اجیت کو دونوں باہوں میں لے کر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ اسے واقعی نیند آرہی تھی۔ اجیت دیر تک اُس کی چھاتی پر سر رکھے سوچتا رہا، سمندر اور انسان کے فرق کو۔ پتہ نہیں کب سویا۔ دروازے پر آہٹ ہونے پر ہی وہ جاگا۔ شیاملا سامنے تھی۔ "نیچے تار والا کھڑا ہے۔ آپ کا تار ہے۔"

حیران پریشان سمیتا نے تار پڑھا "میرا خط ملا ہوگا۔ نارائن ناروے چلے گئے کبھی نہ لوٹنے کے لیے میں تمھارے پاس سے ہوکر بمبئی جارہی ہوں۔ میں نے 'نو جاگرن' کے سب ایڈیٹر کا عہدہ قبول کرلیا ہے۔ وبھا بھی تو نہیں ہے۔ میں اتوار کو پہنچوں گی۔"

"اتوار یعنی پرسوں۔ لیکن وہ خط۔ یہاں تو کوئی خط نہیں آیا۔"

اس نے اجیت کی طرف دیکھا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

"جواب تک ہوتا رہا اس کا اختتام"۔

"اختتام"

"ہاں، الفاظ کے پیچھے کے معنی سمجھو۔ وہ الگ ہو گئے ہیں۔"

"نہیں ..." سیتا جیسے چیخ پڑی۔ تھوڑی دیر میں سارے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ صرف مہندر جی نے سادگی سے کہا "میں جانتا تھا، ایک دن یہی ہوگا اور یہی ہوا۔ مجھے یقین ہے، ورتکا اس اختتام کے لیے تیار تھی۔ اور ...."

"لیکن وہ خط"

"آج کل ہماری حکومت کی طرح وہ خط بھی کسی ہڑتال یا کسی فساد کی وجہ سے کہیں پھنس گیا ہوگا، آجائے گا۔ تعجب تو یہ ہے کہ تار پہنچ گیا۔ نہیں تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ تار اور خط خود ورتکا کو ہی ملتے۔"

اور واقعی ورتکا کے آنے سے ایک دن قبل صبح کی ڈاک سے وہ خط سیتا کو ملا۔ چار صفحے والے اس خط کو پڑھتے ہوئے نہ جانے کتنی بار اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اتفاق سے تب نہ ربھا تھی نہ اجیت اور انکت اکرن بھی کالج گئی تھی۔ بس تیا ملا کچن میں مصروف تھی۔

خط کے ایک ایک لفظ کو وہ بغور پڑھتی چلی گئی —

میری پیاری پیاری بھابھی،

میں جانتی ہوں یہ خط پڑھتے ہوئے تم ایک بار تو پریشان ہو جاؤ گی اور پورا پڑھ لینے کے بعد اتنی ہی شانت بھی۔ کیونکہ میرے علاوہ نارائن کو تم سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا ...

لیکن بھابھی! وہ یہ کبھی نہ بھول سکا کہ وہ گناہ کی راہ سے آیا ہے۔ اس کا وجود کسی تشدّد کا نتیجہ ہے۔ ایک عورت کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اُسے اس دنیا میں لایا گیا۔ اس لیے وہ عورتوں کے حقوق اور آزادی کا شدید حامی تھا، لیکن اس نے یہ بھی کہا تھا، عورت اپنی بدحالی کی ذمہ دار خود ہے۔ مرد اُسے مکمل آزادی کبھی نہیں دے گا۔ وہ اُسے خود لینی ہوگی۔ ہمارے ادبی سرمائے میں اردھ ناری شنکر اور پاروتی کی بے مثال کردار ہے۔ وہی حقیقی اردھ ناریشور ہیں۔ شنکر بے وقوفی کی حد تک بھولے ہیں، لیکن تیسری آنکھ بھی صرف

انھیں کے پاس ہے۔ یہ تیسری آنکھ سچ اور انصاف کی ضامن ہے۔ وہ تبھی کھلتی ہے جب ناانصاف ہوتا ہے۔ سوچو تو تانڈو ناچ کرنے والا بھسماسُر کے آگے بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ وہ کام دیو کو بھسم کر دیتا ہے، لیکن شہوت کے راز کا عالم وہی ہے۔ عجیب کلپنا کی ہے ویدک رشی نے شنکر کی۔

اور ویسی ہے پاروتی، ایک طرف دیوتاؤں کے سپہ سالار کارتکیے کی ماں، دوسری طرف گنیش کی بھی۔ وہ شِو کی جانگھ پر بیٹھنے والی پاروتی بھی ہے تو کالی، مہاکالی، رن چنڈی بھی وہی ہے۔ اُسے شانت کرنے کے لیے شِو اُس کے چرنوں میں لیٹ جاتے ہیں۔ کاش، اس علامت کے صحیح معنی ہم سمجھ سکے ہوتے۔

گھنٹوں وہ مجھے علامتوں کے مطلب سمجھاتا۔ پھر کیسے مرد مالک اور عورت خادمہ بنتی گئی، معاشیات کے ذریعہ وہ ملکیت کی تشریح کرتا اور روحانیت کے ذریعہ اس کائنات کے اسرار کو سمجھاتا۔ اوتاروں کی سائنسی تشریح کرتا۔ اُس کے باطن میں علم کا بے مثال ذخیرہ ہے لیکن وہی نارائن کسی بھی لمحے پریشان ہوکر دوسری زبان بولنے لگتا اور اعلان کرتا، مجھے کل ہونولولو جانا ہے۔

کبھی اتنا منظم، کبھی اتنا ہی بکھرا ہوا جیسے اُسے کسی سے انتقام لینا ہے۔ وہ مجھ پر چوٹ کرتا اور خود کو ہی لہولہان کر لیتا اور کئی کئی دن غائب رہتا، کسی مشن پر۔

لوٹتا تو وہی پیارا پیارا ساتھی۔ جتنی انتقام کی شدت اتنی ہی پیار کی بھوک۔

ایسا ہمیشہ ہوتا ہو، یہ نہیں، کبھی کبھی ہی دورے پڑتے تھے۔ تم تو بھگت چکی ہو، لیکن ماما جی کی وہ بہت عزت کرتا ہے۔ کہتا ہے، وہ تو بس بھولے شنکر ہیں۔ خوفناک نہیں ہیں، نہ تانڈو ناچ کرتے ہیں تنہا ہیں۔ ویسا ہی ہے اجیت پیارا دوست کبھی ناراض ہوتا ہی نہیں۔ اُسے غصے میں دیکھنا نوواں عجوبہ ہوتا ہے۔

کبھی جولی موڈ میں ہوتا تو کہتا 'وتی، کیا تم نہیں سوچتیں کہ ہم بہت دن رہ لیے ایک ساتھ؟ اب ساتھی کیوں نہ بدل لیں؟ سماج میں اس کا بھی انتظام ہونا چاہیے!!'

میں کہتی 'تب سماج رہے گا کہاں؟'

"ضرورت ہے سماج کی ؟"

"ضرورت ہے تبھی تو یہ بھیڑ میں سے پیدا ہوا ہے۔ ہر کام میں فائدہ نقصان، اچھا برا، ضروری غیر ضروری سب ہوتا ہے۔ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے ویسے تم...."

'نہیں، نہیں، وہ شانت ہو کر کہتا' ویسے ہی ایک خیال آیا اور میں نے تم سے کہہ دیا!'

یہ سب مجھے بہت اچھا لگتا۔ روز کی اوب کو توڑنا تھا نا۔ خوب بحث کرتے۔ خوب لڑتے، پھر خوب پیار کرتے۔ اسی عمل میں ایک دن بیٹا آ گیا۔ بڑے گدگد، بہت خوش، تم تو جانتی ہی ہو، لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ کبھی کبھی بچے سے کھیلتے کھیلتے اسے دور ہٹا دیتے۔ کبھی تو ایسے رلاتے کہ وہ چیخ پڑتا۔

میں سب کچھ سمجھ رہی تھی، لیکن میں نے کچھ بھی نہ کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، ایک دن وہ اچانک بول پڑے، 'تم نہیں سوچتیں وَتی! ہم دونوں کے بیچ میں اس کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟'

'جب ہماری طرح دو ملتے ہیں تو تیسرا آتا ہی ہے۔'

'نہیں، نہیں، یہ بائی پروڈکٹ ہے۔ اس کی ضرورت نہیں۔'

'کیا مطلب؟'

'کسی یتیم خانے میں دے دو۔'

میں ذرا سخت ہوئی۔ میں نے کہا 'یہ تم کہتے ہو اور ایک ماں سے کہتے ہو!'

'ہاں، ماں بننا عورت کی کمزوری ہے۔ اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر تو اس نے عورت کو غلام بنا لیا ہے۔'

'تم صاف صاف بات کرو۔'

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ پھر بولا 'تم نے ضرور پڑھا ہوگا کہ بچہ والدین کی اچھائی برائی اتنی قبول نہیں کرتا، جتنی دادا دادی کی۔'

'تو؟'

'تو کیا، میں اپنے باپ سے نفرت کرتا ہوں۔ وہ بدکردار تھے۔ انھوں نے مجبور عورتوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر ان کو تباہ کر دیا۔ وہی صفات اس میں آئیں گے۔ اس کے لیے کیا

ہم قصوروار نہیں ہوں گے ؟ نہیں، نہیں، اس کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے میں نہیں دیکھ سکتا۔ اِسے کہیں پھینک دو!'

'نارائن، تم اتنے ظالم ہو سکتے ہو۔ اپنے تشدّد کے لیے سائنس کے بھی عالم بن گئے!'

نارائن واقعی ظالم ہو گیا' یہ تم کہتی ہو۔ میری بے رحمی کیسی ہے، وہ کیوں ہے، میں جو ہوں، وہ کیوں ہوں —— یہ تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ صاف بات ہے۔ میں ظالموں کی بیل نہیں بڑھنے دینا چاہتا۔ میں اس سے نجات چاہتا ہوں ...'

شروع شروع میں تو اِسے دورے کبھی کبھی پڑتے، لیکن پھر اُن کی تعداد بڑھنے لگی۔ میں نے بہت سمجھایا پیار سے کہ یہ ضروری نہیں ہے ...

یہ دلیل سُن کر وہ اور بے رحم ہو جاتا۔ دلیل پر دلیل دے کر مجھے طعنے دیتا۔ میں سِسک اُٹھتی۔ تب وہ چلا جاتا کئی کئی دن کے لیے۔ پھر لوٹتا۔ معافی مانگ لیتا بچّے کو بہت پیار دیتا۔ لیکن ایک دن بحث اتنی تیز ہوئی کہ اس نے کہا 'تمھیں اِسے یا مجھے —— دو میں سے ایک کو چننا ہو گا!'

'پاگل مت بنو نارائن!'

'میرا یہ فیصلہ ہے!'

'تو پھر میرا بھی فیصلہ ہے، مجھے میرا بچّہ چاہیے!'

اُس نے گھور کر مجھے دیکھا 'میں سمجھتا تھا کہ تم اس پورانک ماں کو پیچھے چھوڑ آئی ہو، لیکن تم تو وہی ممتا والی اور نہ جانے کیا کیا ہو۔ رہو تب، میں نہیں رہوں گا۔ میں چلا جاؤں گا کہیں بھی۔ نہ لوٹنے کے لیے۔ تم طلاق چاہو گی تو میں منع نہیں کروں گا۔ آپسی اتفاق سے ہم الگ ہو سکتے ہیں!'

بھابھی، بہت سی باتیں ہیں۔ بہت بار بحث ہوئی۔ آخر میں تنگ آ گئی۔ میں نے کہا 'نارائن' میں نے تمھیں چُنا تھا، میں ہی تمھیں آزاد کرتی ہوں!'

پھر کئی دن گزر گئے، لیکن ایک دن وہ وکیل صاحب سے سارے کاغذات تیار کروا لایا۔ اُس میں بچّے کو میرے پاس رہنا تھا۔ میں چاہوں تو وہ خرچ دے سکتا ہے!

میں نے چپ چاپ وہ دفعہ کاٹ دی۔ کہا 'جس سے تم اتنی نفرت کرتے ہو، وہ تمھاری

خیرات سے کیوں پلے ؟'

اور ایک دن وہ واقعی نارو ے چلا گیا۔ کہہ گیا کہ اب بھارت نہیں آؤں گا...

بہت کچھ اَن کہا رہ گیا۔ زبان کہاں ہے وہ جو سب کچھ کہہ سکے، لیکن تم سب سمجھ لوگی۔

ماما جی سے ابھی کچھ نہ کہنا۔ میں ہی کہوں گی ۔ اچھا حضرت جاگ گئے ہیں اور مجھے پکار رہے ہیں،

تو میں چلوں!

تمھاری بہت بہت پیاری

دَتی

مکرر :۔

میں ایک بات لکھنا بھول گئی ۔ ایک دن پچ مچ میرے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا —

آخر کیا ہوگا تخلیق بڑھا کر ؟ نارائن کی خاطر اسی یتیم خانہ میں رکھ آتی ہوں جس میں وہ پلا تھا۔

اچانک کوئی عورت بہت زور سے ہنسی — 'پگلی، تخلیق تو تب بھی بڑھے گی، غلط طریقے

سے بڑھے گی ۔ اسے روکنا ہے تو اس کا گلا گھونٹ دے۔ گھونٹ سکتی ہے؟'

میں خوف سے کانپ اُٹھی ۔ ایک دم بھاگ کر وردن کے پاس پہنچی ۔ اُسے گود میں لے کر

تابڑ توڑ چومنے لگی ۔ وہ آواز ہنسے جارہی تھی ۔ میں حیران ہوں، وہ مَیں ہی تھی ۔ کتنے 'مَیں' چھپے

رہتے ہیں باطن ہیں۔

پڑھ چکی تو اچانک بجلی کی طرح ایک منظر اس کے ذہن میں کوندھ گیا۔ ورتکا دیدی، نارائن بھائی

صاحب دونوں امن کے پاس ٹھہرے تھے ۔ وردن تب بہت چھوٹا تھا ۔ ایک دن وہ صبح سے

روئے جارہا تھا۔ اسے سردی لگ گئی تھی۔ شاید بخار بھی تھا۔ تب ورتکا دیدی بہت بے چین

دکھائی دی۔ اُوپر سے وہ پُرسکون رہنے کی پوری کوشش کر رہی تھی لیکن ہر پانچ سات منٹ بعد

وردن کے ماتھے پر ہاتھ رکھتی اور گھبرا کر کہتی' دیکھو تو نارائن، ہمارے وردن کو تیز بخار ہے'!

نارائن نے جواب دیا ''کوئی بات نہیں، سردی لگ گئی ہے، بخار کا آنا فطری ہے'!

''میں کہتی ہوں، تم ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلا لاتے ؟ دیکھو کیسے چھینک رہا ہے ؟''

''تم ڈرو مت ۔ بچوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ بڑے نازک ہوتے ہیں۔ تم اس کا

بہت دھیان رکھتی ہو ۔ اِسے کچھ نہیں ہوگا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں؟"

"کہیں ہم اُسے کھو نہ دیں۔"

نارائن جھنجھلا اٹھا "یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ کیا بنا دیا تمھیں اس ننھے شیطان نے۔ دیکھو تو، بخار میں بھی وہ کیسا مسکرا رہا ہے۔ میرا بیٹا ہے۔ اِسے کچھ نہیں ہوگا۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں لیکن..."

"اب تم چپ ہو جاؤ۔" نارائن نے کہا "اسے دوا دے دو اور سو جاؤ۔"

سمیتا سب کچھ سن رہی تھی۔ اُس کے ساتھ بھی تو ایسا ہوا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اجیت نارائن کی طرح جھنجھلایا نہیں تھا۔ تبھی ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا تھا۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے۔ سوال ہے عورت کے مخلص ہو جانے کا اور تب تو صورت حال اور بھی خوفناک ہو جاتی ہے جب کسی کا نارائن بھائی صاحب جیسا شوہر ہو۔

اس لیے وہ خط پڑھ کر بہت حیران ہوئی۔

شبہہ اُس کے باطن میں بجلی کی طرح چمک جاتا تھا۔ ایسے کرداروں میں اپنی ساری ممکنات کے باوجود دکھراؤ آجانا فطری ہے۔ ہم سبھی کسی نہ کسی غیر فطری حالات سے گزرے ہیں۔ اس کی چبھن سبھی محسوس کرتے ہیں، بکھرتے ہیں، اجڑتے ہیں، لیکن سبھی تعلیم یافتہ اور ذہین ہیں، ایک مقصد کے لیے وقف ہیں، اس لیے سنبھال لیتے ہیں۔ نارائن اکیلے ہی رہے۔ ورتکا نے سہا ضرور لیکن تہمات میں، دراصل نہیں، اسی لیے شاید نارائن کے درد کو اتنا نہ محسوس کر سکی ہو۔ میں سوچ رہی ہوں، ان کے لیے ناانصافی نہیں کر رہی؟ ہم سب میں وہی ہمتی تھیں۔ انھوں نے ہی بنیاد دی، ہمیں راہ دکھائی، پھر بھی...

اچانک پھر بجلی کوندھی۔ خود اُسے حیرانی ہوئی۔ ایک خیال چمکا — اس روشنی میں بیوی کسی دوسرے شوہر کی بیوی ہو سکتی ہے؟ اولاد کیا کسی دوسرے باپ کی اولاد نہیں ہو سکتی؟ تبھی دروازے کی گھنٹی بجی۔ اجیت، انکت، وبھا — تینوں ایک ساتھ آئے۔ میرے ہاتھ میں کھلا خط دیکھ کر اجیت نے

کہا "وِتّی کا خط ہے۔"

چپ چاپ خط ان کے ہاتھ میں دے کر وہ انکت کو لے کر چلی گئی۔ اجیت نے خط پڑھ لیا۔ اُن کا چہرہ ایک بار تو تمتمایا، پھر اُداس اُداس آنکھوں سے وبھا کو دیکھتے ہوئے انھوں نے وہ خط وبھا کو دے دیا۔ وہ ایک سانس میں پڑھ گئی اور بولی "نارائن بھائی صاحب بھی... خیر کوئی بات نہیں، مرد کو چھٹی کا دودھ یاد نہ دلایا تو میرا نام وبھا نہیں۔"

وہ سیدھے پتاجی کے پاس پہنچی اور خط اُن کی طرف پھینک کر بولی "دیکھ لیجیے اپنے نارائن بیٹے کی کرتوت۔ آپ تو تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔"

سمیتا تب تک نیچے آگئی تھی۔ وبھا کو پکار کر اُس نے کہا "یہ تُو نے کیا کیا؟ دیدی خود ہی بات کرتی اُن سے۔"

"ٹھیک کیا میں نے۔ تب تک وہ خود کو سنبھال لیں گے۔"

"ان کی خاصیت یہی ہے وبھا کہ وہ آسانی سے بے چین نہیں ہوتے۔"

اور واقعی بغیر کسی غصّے، شدّت کے انھوں نے کہا "جو کچھ وِتّی نے لکھا ہے وہ بالکل فطری ہے، لیکن میری بات یاد رکھنا، ایک دن وہ یہیں لوٹ کر آئے گا۔"

"آپ کو یقین ہے؟"

"ضرور۔"

"اِس کی بنیاد؟"

"وہ بھی مجھے تمھیں بتانا ہوگا؟ کوئی اپنے سائے سے الگ ہو سکتا ہے؟ وہ سایہ اب بھی اُس کا پیچھا کر رہا ہوگا۔ وہی اسے لَوٹا کر لائے گا۔"

"سایہ تو سب کا ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہے لیکن سبھی کے سائے میں ایک اور دوسرا سایہ جذب نہیں ہوتا۔"

... وبھا کے باطن میں جیسے کچھ چمک اٹھا، وہ آگے پوچھنے کی ہمّت نہ کر سکی۔

کرن نے بڑی معصومیت سے کہا "نہ آئیں۔ دیدی اور شادی کر سکتی ہیں۔"

حیرت زدہ وبھا نے کہنا چاہا — ہاں، دیدی شادی کر سکتی ہے۔ چاہنے پر عورت کو دوسرا شوہر مل جا

ہے، لیکن اولاد کو دوسرا باپ نہیں مل سکتا۔ لیکن وہ بولی نہیں کیونکہ دیدی کسی بھی وقت آ سکتی تھیں۔ اور واقعی جب وہ چپ چاپ اپنے آپ سے ہی اُلجھتے کھانا کھا رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ کرن فوراً دوڑی اور دروازہ کھولتے ہی وہیں سے چلائی "دیدی آگئیں، دیدی آگئیں۔"

پلک جھپکتے سب نے انھیں گھیر لیا تھا۔

آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ ورتکا نے ہمت سے خود کو سنبھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ ذرا بھی ڈگمگائی نہیں۔ سمیتا نے سب سے پہلے اُس کے چرن چھوئے تو ورتکا نے اُسے چھاتی سے لگا لیا۔ سمیتا سسک پڑی۔ ورتکا نے بس پیٹھ تھپ تھپائی، ایک لفظ بولی نہیں۔ تبھی انکت نے دوڑ کر چرن چھوئے اور پھر ورون کو لے کر ماجی کے کمرے میں بھاگ گیا۔ وبھا نے مسکراتے ہوئے اس کے پاؤں چھوئے اور دھیرے سے بولی "آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں بہت خوش ہوں۔"

سیا ملا چرن چھونے کو جھکی تو بیچ میں ہی سمیٹ لیا۔ سپاٹ آواز میں پوچھا "اتنی دُبلی کیوں ہو گئی تو؟ چل میرے ساتھ بمبئی، کہاں ہے تیرا بیٹا؟"

"سو رہا ہے بی بی! آپ ٹھیک ہیں؟"

"کیسی دِکھ رہی ہوں؟"

اور دونوں ہنس پڑیں۔ کرن نے وہیں سے پکارا — "دیدی، پہلے کافی پی لو۔ پھر کچھ کرنا۔"

"ماماجی کے کمرے میں لے آ۔"

اور وہ مہندر جی کمرے میں چلی گئی۔ چرن چھوتے ہوئے پوچھا "اچھے ہیں نا، ماماجی؟ سفر بہت اچھا رہا؟"

"سچ بہت اچھا رہا، بہت کچھ سیکھا اس عمر میں۔"

ایک لمحے کے لیے رک کر بولے "تیرا خط آج ہی ملا۔ تار پرسوں آ گیا تھا۔ ہماری سرکار کی طرح ہے۔ میں نے پڑھ لیا۔ بڑا پیچیدہ ہے انسانی کردار۔ لیکن ایک بات میری یاد رکھنا۔ نارائن ایک دن تیری پناہ میں ہی لوٹے گا۔"

ورتکا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کافی دیر تک وہ سب خاموش کافی پیتے رہے اور اپنے اپنے باطن کے طوفان سے اُلجھتے رہے۔ مہندر جی نے خاموشی توڑی کہا "اچھا بیٹی، اب تو آرام کر۔ ابھی تو تو کچھ دن رہے گی نا؟"

"ہاں ، ماماجی ایک ہفتہ تو یوں ہی میگزین والوں کو لکھ دیا ہے ۔ ماماجی آپ میری طرف سے ذرا بھی پریشان نہ ہوں"۔

ماماجی ہنس پڑے "جا آرام کر، کھانا کھا' دیکھ وردون انکت کی گود میں کیسا کھِل کھلا رہا ہے"۔

اچانک ورنیکا کو ایک جھٹکا لگا۔ یہ بھی پوچھے گا ایک دن ۔۔ میرے باپ کہاں ہیں؟ لیکن دوسرے ہی پل تیزی سے کہتی ہوئی باہر چلی گئی" انکت بیٹے، وردون کو اوپر لے آنا ۔ اب دودھ پیئے گا"۔

وبھا ورنیکا کے ساتھ ہی نکل گئی ۔ شیاملا کچن کی طرف بڑھ گئی ۔ سمیتا کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ شیاملا بولی"بھابھی، دیدی اوپر گئیں تم بھی جاؤ۔ میں کرن کے ساتھ ابھی آتی ہوں"۔

ایک لفظ بولے بغیر سمیتا اوپر چلی گئی ۔ اجیت جب آئے تب تک سب کھانا کھا چکے تھے وہ کھا کر آیا تھا۔ ورنیکا آ گئی ہوگی، یہ بھی وہ جانتا تھا۔ پاس جا کر بولا" شکر ہے ۔ ڈاک کی طرح آپ کی گاڑی پٹری سے نہیں اُتری ۔ کہاں ہے وردون؟"

وبھا نے جواب دیا" اور کہاں ہوتا؟ مرد مرد کے پاس ہے"۔ اجیت نے ویسے ہی جواب دیا۔" وہ سب تو وقتی سیاست ہے ۔ بالآخر آنا تو اسے عورت کی پناہ میں ہی ہے"۔

سمیتا بہت دیر بعد مسکرائی ۔۔" کاش مرد اِس بات کو سمجھ لے"۔

عورت ہی آسانی سے یہ سبق مرد کو سکھا سکتی ہے ۔ میرے ایک وکیل دوست نے دھرم یگ میں ایک مضمون لکھا ۔ اُس میں وہ بتاتا ہے کہ مرد کیسے عورت کو بلیک میل کرتا ہے۔ اُسی کی زبان میں عورت جواب دے سکتی ہے"۔

"کیسے؟" سمیتا نے پوچھا۔

" ویسے تم تو سب کچھ جانتی ہو، پھر بھی مضمون پڑھ لینا۔ جواب مِل جائے گا۔ اچھا یہ ہر وقت مسائل میں اُلجھے رہنا بھی کیا مناسب ہے؟ اُسے بھول جاؤ۔ اپنے آپ سلجھ جائے گی"۔

" ہاں بھیّا، یہی ٹھیک ہے ۔ نیند آرہی ہے ۔ انکت بیٹے، وردون کو مجھے دے کر تو باباجی کے پاس جا' اور بھابھی تم بھی جاؤ۔ وبھا، شیاملا، ہم یہیں سوئیں گے"۔

دبھا بہت خوش تھی۔ وہ اپنے منصوبے کو آخری شکل دے چکی تھی۔ سارا دن وکیل چاچا کے ساتھ بحث کرنے کے بعد وہ ورتکا کے سارے نکتوں پر سنجیدگی سے گفتگو کرتی تھی۔ 'دھرم یگ' میں مطبوعہ مضمون کو اس نے بڑے دھیان سے پڑھا اور اس کے لیے وہ بہت مفید ثابت ہوا۔ اپنے خاکے میں مرد کی دلیلوں کا استعمال کر کے اُس نے اپنے بات کی تائید کی۔ اس نے اپنے ابتدائی بیان میں واضح طور پر لکھا کہ عورت اور مرد کے حقوق برابر ہیں۔ تو 'عزت' دونوں کے لیے ضروری ہے۔ اگر مرد بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے رشتہ بناتا ہے۔ طوائفیت کرتا ہے، تو عورت کو بھی وہ حقوق ملنے چاہیے۔ مرد غالب سماج اگر انھیں انکار کرتا ہے تو ہمیں بھی تحریک کرنے کا حق ہے اور ہم اس کا استعمال کریں گے۔ عدم تشدّد، پر تشدّد — جیسے بھی ہو۔ بلاتکار سے عصمت برباد ہوتی ہو، ہو، لیکن نسوانیت ختم نہیں ہوتی۔ اور عورت کے لیے نسوانیت مقدّم ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے زمانے میں حاملہ ہونے کا خوف دور ہو گیا ہے۔ سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بیٹی کی پیدائش کے لیے عورت نہیں، مرد ذمّہ دار ہے۔ سماج میں ہو رہی یہ تبدیلیاں کیا پرانے اخلاقی دستور کو بے معنی نہیں ثابت کر دیتیں ؟ نئے مرض ایڈس کا خوف کیا مرد کو سوچنے کو مجبور نہیں کرے گا ؟

اسی لیے میں کہتی ہوں کہ ہر زمانے کا اپنا دستور ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں راجہ کے نامرد ہونے پر رانی کو دستور کے مطابق دوسرے مرد سے اولاد حاصل کرنے کا حق تھا۔ تب تو کسی نے انھیں خود غرض نہیں کہا۔

اور میں تو کہتی ہوں کہ عورت کو خود کو قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بیٹیوں کے پیدا ہوتے ہی افیم چٹا کر مار دے۔ سماج میں عورت کو پیدا ہی نہ ہونے دے۔ تب مرد کیا کرے گا ؟

اس حقیقت کو لے کر ایک دن ورتکا، سمیتا اور دبھا کافی سنجیدگی سے باتیں کر رہی تھیں۔ دبھا تھوڑی شدید تھی، لیکن سمیتا نے اطمینان سے کہا "لکچر دینے کے لیے یہ سب اچھا ہے، لیکن قانون، دستور میں ہمیں منطقی اور تخلیقی زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ سائنسی، سماجی اور سیاسی تبدیلیوں نے کتنے پرانے خیالات کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ انھیں کا صحیح استعمال کر کے

ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔ بالآخر ہم انصاف چاہتی ہیں، مرد سے نجات نہیں۔ بیٹے کی خواہش عورت میں مرد سے کم نہیں، بلکہ زیادہ ہی ہوتی ہے۔"

ان کی اس بات چیت میں کبھی کبھی پاس پڑوس کی خواتین بھی حصّہ لیتی تھیں۔ خاص طور سے لڑکیاں۔ ایک دن گایتری ایک عورت کو ساتھ لے کر آئی بولی" دیدی! یہ پوترا ماتھر ہیں۔ ٹیچر ہیں، بہت شوخ ہیں، ترقی پسند ہیں۔ انھوں نے اپنی شادی کے لیے خود اشتہار چھپوایا تھا ___ ضرورت ایک لڑکے کی، ایک ماتھر لڑکی کے لیے جو ٹیچر ہے۔ عمر ۲۲ سال، قد ۵ فٹ ۶ انچ۔ شکل صورت معمولی۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں، جہیز بھی نہیں۔ سادگی سے آریہ سماج مندر یا عدالت میں شادی کریں گے۔"

سمیتا نے پوترا کو پاس کھینچ کر کہا" تمھاری طرح سب ایسی ہمت کریں تو آدھا مسئلہ خود حل ہو جائے۔ کیا تمھیں جواب ملا؟"

وہ ہنس پڑی "میری شادی ہو چکی ہے دیدی۔ ہُوا یہ کہ ایک دن ایک نوجوان جو خود بھی ٹیچر ہے، مجھے پوچھتے ہوئے اسکول میں آئے، بولے 'آپ کے پتا جی نے آپ کی شادی...' میں نے ایک دم بات کاٹ کر کہا' جی وہ اشتہار میرے پتا جی نے نہیں، میں نے دیا تھا' وہ حیران رہ گئے 'آپ کے پتا جی جانتے ہیں؟' 'جی، ابھی تو نہیں آپ چاہیں تو ان سے مل کر باتیں کرلیں' وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مجھے بھی اچھے لگے۔ وہ بھی تیار ہو گئے۔ میں نے کہا 'ٹھیک ہے، کیا یہ اچھا نہیں ہوگا دو تین ماہ بعد شادی کریں۔ تب تک دونوں گھرانے بھی ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں گے' وہ اور بھی متاثر ہوئے۔ بولے' ایک بات میں نے ابھی تک آپ سے چھپا رکھی تھی، میں عیسائی ہوں'

یکبارگی میں نے ان کی طرف دیکھا ٹھٹھکی پھر مستحکم آواز میں بولی' میں نے تو لکھا ہی ہے۔ ذات پات کا سوال نہیں ہے۔ مجھے تو خوشی ہوگی، لیکن آپ نے اب تک کیوں چھپایا؟'

'میں آپ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہتا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی آپ سے باتیں کرکے۔ آپ اپنے گھر میں باتیں کرلیں میں بھی کر لوں گا۔ تب تک ہم ملتے رہیں گے'

"ضرور"

یہاں آ کر وہ رُکی پھر بولی "جب ہمارے گھر والوں کو پتہ لگا تو تھوڑی پریشانی ہوئی۔ لیکن میرے پتاجی بہت سلجھے ہوئے خیالات کے ہیں، انھوں نے بالآخر منظوری دے دی"۔

وبھانے پوچھا "اب آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟"

"وہ بڑے سیدھے ہیں۔ انھوں نے پہلی رات کو ہی مجھ سے کہہ دیا تھا کہ انسان کمزور جاندار ہے"۔

"صرف مرد ...؟"

"میں نے انسان کہا ہے۔ تم سے ایک ہی بات کہوں گا کہ میں تمھارے ساتھ کبھی دھوکا نہیں کروں گا"۔

"میں تو بہت خوش ہوئی۔ میں نے بھی کہا 'میں بھی وعدہ کرتی ہوں کہ اگر کسی مجبوری کے تحت آپ کا من اُچٹ جائے تو مجھ سے کہہ دیجیے'۔

"وہ ہنس پڑے۔ دو سال گزر گئے ہیں۔ معمولی انسان ہیں لیکن ہم دونوں کا دل غیر معمولی ہے۔ اس لیے غلط فہمیاں ہوتی ہیں، لڑ بھی پڑتے ہیں، لیکن اعتماد کے پاک پتھر سے ٹکرا کر وہ ساری غلط فہمیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہیں۔ خاندان میں بھی سب ٹھیک ہیں۔ میں اُن کے گرجا گھر جاتی ہوں۔ وہ میرے گھر میں ہونے والے ہر مذہبی رسومات میں شامل ہوتے ہیں"۔

وبھا بولی "کاش، ہر جگہ یہ سادگی ممکن ہو"۔

سمیتا نے فوراً جواب دیا "کیوں، تم نے کتنی آسانی سے اتنے بڑے تہمت کو اچھائی میں بدل دیا اور ورتیکا جی نے کیا..."

کہتے ہوئے سمیتا ایک دم رُک گئی۔ پھر فوراً بولی "ورتیکا جی یہی تو کہتی ہیں کہ چاہنے پر سب کچھ ممکن ہے۔ لیکن تمھاری بات بھی ٹھیک ہے۔ صدیوں سے ہماری رگوں میں جذب سنسکار آسانی سے تھوڑے ہی مٹنے والے ہیں۔ رخنہ ڈالنے والے خود غرض لوگ کیا کم ہیں۔ پھر بھی گھپ تاریکی میں یہ حادثے روشنی کی کرن کا کام کرتے ہیں۔

جس دن ورتیکا کو جانا تھا اس شام دیر تک سمیتا اُن سے باتیں کرتی رہی۔ وبھا کہیں گئی ہوئی تھی۔

"جی جی، ہم سب نے سہا ہے اور اتفاق ہے کہ پتا جی کی وجہ سے ہم سب نے ہمت اور اعتماد کو اپنے خون میں جذب کر لیا۔ لیکن سماج تو بہت بڑا ہے۔ جتنی جہالت ہے اُتنی غریبی بھی ہے اور مذہبی اندھاپن بھی۔

"جہاں تک عورت کا تعلق ہے، وہ اگر معاشی طور پر آزاد، اچھے خاندان کی ہے تو اُس کی ہمت بڑھ جاتی ہے، لیکن جو شیاملا جیسی بغیر ذرائع کی ہیں، وہ کیا ہیں؟ مرنے کے لیے کہنا بہت آسان ہے، لیکن سنسکاروں میں جکڑی عورت آسانی سے مر بھی تو نہیں سکتی ہیں۔ جہیز یا دوسری وجوہات سے جل مرنے والی یا جلا کر مار ڈالی جانے والی عورتوں کی بات نہیں کہتی، میں کہتی ہوں، کسی مقصد کے لیے مرنے والی، سماج میں مختلف مکھوٹے لگائے بھیڑیوں سے لڑنے والی بغیر ذرائع کی عورتوں کی بات ..."

ورتیکا بولی" میں بہت گھومی ہوں۔ ہر طرف عورت کی بدحالی میں نے دیکھی ہے۔ ایک دن یا ایک سال میں یہ مٹنے والی نہیں ہے۔ ابھی تو انقلاب کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ ہاں بیداری ضرور آئی ہے۔ لیکن بھابھی، جو غریب ہیں، وہاں عزت کبھی مجبوری نہیں بنتی، نہ کوئی دوشیزگی کی بات کرتا ہے۔ یہ ساری فضولیات متوسط طبقے میں جو سماج کا ۵ فی صد بھی نہیں ہے۔"

لیکن جی جی، حکومت تو وہی کرتی ہے، وہی نیتا پیدا کرتی ہے، وہی باخبر بھی ہے۔"

" ٹھیک ہے، لیکن یہ اس کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ جو ۵۷ فی صد ہیں وہ بھی آگے آ رہے ہیں۔ اگلے بیس سال میں بہت کچھ بدل جائے گا، لیکن ملکیت کے جذبے سے نجات انھیں بھی نہیں ملے گی۔ اُس کے لیے عورت کو منظم ہو کر جدوجہد کرنی ہوگی۔ ابھی کچھ واضح نہیں ہے۔ لیکن ہمیں چلتے رہنا ہے۔ منزل کی فکر کیے بغیر اور ہمیں انھیں ۵۷ فی صد کے بیچ جانا ہوگا۔ تمھاری شیاملا نائر خاندان کی عورت ہے، وہ اتنی غریب بھی نہیں تھی۔ بیدار ہو کر سہاگ اور اولاد کے جال میں پھنس کر ٹھگی گئی۔ اسے اکیلے رہنا سیکھنا تھا۔ اب بھی وقت ہے، اس سے بات کر، وہ چاہے تو میرے پاس بمبئی آ سکتی ہے۔"

" رہنے کو تو وہ یہاں بھی رہ سکتی ہے، لیکن شوہر کو چھوڑ کر کسی کا سہارا نہیں چاہتی۔ شوہر اُسے ملا، لیکن صرف بیٹا دینے کے لیے۔ جینے کا سہارا دے سکے نہ ذریعہ — اُلٹا بوجھ بن گیا۔"

ورتکا نے گہری سانس کھینچی ۔ لمحے بھر کے لیے خلا میں بھٹکی، پھر آہستہ آہستہ بولی "اس میں غلطی تو اُسی کی ہے ۔ اور وہ بھی کیا کرتی، جس آلودہ سماج میں ہم رہتے ہیں وہاں یہی ہو سکتا ہے ۔ ضرورت ہے، پورے سماجی نظام کو بدلنے کی ۔ ۔ ۔"

تبھی اجیت آ گئے اور بولے "تمھارا اور وبھا کے جانے کا پورا انتظام ہو گیا ہے ۔ صبح چار ساڑھے چار بجے اٹھنا ہو گا، چھ بجے گاڑی روانہ ہوتی ہے ۔ ٹیکسی کا انتظام بھی ہو گیا ہے ۔ سونے سے قبل سامان پیک کر لینا ۔ صبح تو بس چائے پینے اور چند قطرے آنسو کے ۔ ۔"

ورتکا چونک اٹھی ۔ "اجیت، تم کبھی کبھی بہت سخت طنز کرتے ہو، شبنم کی بوندیں تو سبھی کو پیاری لگتی ہیں، لیکن آدمی وہی ہے جو کسی کی آنکھ کے آنسو پی سکتا ہے ۔"

"معاف کرنا دیدی، میں واقعی بھول گیا کہ ۔ ۔ ۔"

اور وہ جملہ پورا کیے بغیر نیچے اترتا چلا گیا ۔

کرن پکار رہی تھی "کھانا میز پر لگ گیا ہے، آپ لوگ کہاں ہیں؟"

سمیتا جو اب تک خاموش تھی، جی جی کو ساتھ لے کر نیچے اترتی ہوئی بولی "معاف کرنا دیدی، اجیت سچ مچ بھول گئے تھے ۔

"دھت!" ٹلکے سے گال پر چپت چپکا دیا "تو وکالت کرے گی اجیت کی اور وہ بھی مجھ سے ۔ میں تو ویسے ہی ۔ ۔ ۔"

لیکن بات وہ بھی پوری نہ کر سکی ۔ سامنے سے وبھا، شیاملا، اجیت بھی اُدھر ہی آ گئے تھے ۔

صبح کی جھرمٹ میں وداع کی وہ گھڑی واقعی بھاری ہو گئی تھی، خاص طور سے اس لیے اور بھی کہ وہ لوگ اس بات میں یقین کرتے تھے کہ درد کہا نہیں سہا جاتا ہے ۔ اسی لیے جو رہ گئے تھے وہ جی جان سے اپنے کام میں لگ گئے ۔ کبھی کبھی تو سناٹا بھائیں بھائیں کرنے لگتا ۔ شیاملا کو چھوڑ کر سبھی باہر نکل جاتے وہ سب بھولنے کے لیے جو بھول نہ سکتے تھے ۔ شیاملا گھنٹوں بیٹھی پتاجی سے باتیں کرتی رہتی ۔ بیچ بیچ میں ملنے والے آتے، ان کے لیے چائے تیار کر دیتی ۔ ان کی باتوں کے نوٹس بھی لیتی رہتی ۔ وہ مصنّفہ ہے، پر وہ کبھی نہیں بھولتی تھی ۔

سب سے پہلے انکت لوٹتا اور سکمارن کو لے کر گھر کو گونج سے بھر دیتا۔ شیاملا کا باطن خوش ہو جاتا۔ پھر آتی کرن جو اپنی پڑھائی اور کچن کے درمیان توازن بنائے رکھنے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ اُس نے شیاملا سے کہا تھا " دیدی، آپ نے میری کتنی مدد کی۔ میں تو نام کو کچن سنبھالتی ہوں، کام تو سارا آپ کرتی ہیں۔ آپ تو ابھی نہیں جا رہی ہیں ؟"

شیاملا کہتی "جی تو نہیں کرتا جانے کو۔ پیار ہی پیار ہے یہاں، تکلیف میں بھی پیار لیکن کرن جانا تو ہوگا ہی، کب تک بوجھ بنوں گی ؟ گھر تو میرا وہی ہے، خاص کر جب تک ماں ہے۔ پھر نوکری بھی ملے گی ہی۔ کیشون کا خط آیا تھا۔ عدالت ہمارے حق میں فیصلہ دینے ہی والی ہے، اُسی کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ مجھے آئے تین مہینے ہو گئے۔"

ایک مہینہ اور گزر گیا، سب کچھ ٹھیک تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق، بس فرق اتنا تھا کہ اب تک جو پڑوسی، بالخصوص سامنے والے سب سے زیادہ نفرت کرتے تھے، وہی سب سے زیادہ آنے لگے۔ گایتری انھیں کے گروپ میں شامل ہو گئی تھی۔ سمیتا کو اچھا لگتا تھا۔ رات کو اجیت کے پاس لیٹ کر وہ نہ جانے کن کن موضوعات پر صلاح و مشورہ کرتی۔ اچانک ایک دن اجیت اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے " جانتی ہو سمی! میں کبھی کبھی تمھارے ہی الفاظ میں تم سے پیار کیوں کرتا ہوں؟"

" جانتی ہوں۔"

" کیوں ؟ "

" کیونکہ تم مجھ سے ڈرتے ہو۔"

اجیت نے ایک طویل سانس کھینچا " ہاں سمی! میں تم سے ڈرتا ہوں، تمھاری عظمت سے محصور ہوں۔"

سمیتا بھی اُسی طرح اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے سامنے اور اُس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی " اجیت بہت سیدھے، بہت بھولے، بہت پیارے انسان ہو، اپنی ماں کی طرح۔ اور تمھارے پتا جی بھی کتنے سیدھے، کتنے مخلص اور کتنے بڑے ادیب۔ تم واقعی خوش قسمت ہو۔ تم اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے۔ پھر بھی مرد تو ہو ہی۔ جانتے ہی ہو، کتنا ہنگامہ کیا ہے تم نے، کتنے لہو لہان ہوئے ہو اپنے ہی حملوں سے..."

وہ پل بھر کے لیے رکی۔ اجیت بھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اس طرف سے انجان اپنے آپ میں ڈوبی ہوئی وہی پھر بولی " وہ سروے کرتے وقت میں کیسے کیسے مردوں سے ملی ہوں اور عورتوں سے بھی۔ ایسے خاندان اب بھی ہیں جہاں شوہر اپنی ہی بیویوں سے عصمت فروشی کراتے ہیں "۔

وہ ایک لمحے کے لیے پھر رکی جیسے ہمت بٹورنا چاہتی ہو۔ وہ سب کہنے کو جو اس نے اب کہا۔ وہ نہ جانے کہاں سے بولی "تم اُن لوگوں میں سے ہو سکتے تھے، ویسی تو میں سوچ بھی نہیں سکتی، لیکن اُن میں تو ہو ہی سکتے تھے جو مجھے کبھی گھر نہ لاتے۔ یقین کرو گے، میں ایسی ماؤں سے ملی ہوں جنھوں نے روتے روتے مجھ سے کہا تھا 'اب وہ ہمارے کس کام کی۔ بس، اس کی لاش مل جائے'۔"

یکبارگی سمیتا پھر خاموش ہوگئی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ درد سے کسی بھی لمحے پھوٹ سکتی تھی۔ دونوں کے درمیان کئی لمحے تک خاموشی تیرتی رہی، اس بار اسے سمیتا نے ہی توڑی بولی "لیکن اجیت، تم تم ہو، یہ شاید تم خود بھی نہیں جانتے۔ اسی لیے ہر لمحے تمھیں زیادہ اور زیادہ پیار کرتی ہوں۔ تم پر پوری طرح منحصر ہوں۔ منحصر معاشی طور پر نہیں، محبت کی نگاہ سے۔ تم مجھے کاٹ بھی ڈالو تو بھی میرا ہر ٹکڑا تمھیں مکمل سے بھی زیادہ پیار کرے گا۔ ماں کے اس دل کی طرح، جسے معشوقہ کے کہنے پر نکال کر لے جاتے ہوئے جب بیٹے کو ٹھوکر لگی تو ماں کے دل نے یہی پوچھا تھا 'بیٹے، تمھارے پیر میں زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟'"

" یہ جذباتیت نہیں ہے، اشتیاق کی علامت ہے۔ تم مجھ کمزور کی طاقت ہو۔ میں تمھیں کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ اپنے حقوق کو محفوظ رکھتے ہوئے بھی۔ میں نے مارکس کی سوانح میں پڑھا تھا کہ ان کی بے بس مفلس زندگی میں کئی بار وہ لمحے آئے جب اُن کی بیوی جینی چھوڑ کر جانے کے لیے تیار ہوگئی، لیکن ہر بار یہ سوچ کر لوٹ آئی، میں تو چلی جاؤں گی لیکن انھیں کون دیکھے گا؟۔

نہ جانے کس گہرے نشے میں اجیت پہنچ گیا تھا۔ مارکس کا نام سن کر چونکا "مارکس، میں مارکس..."

سمیتا ہنس پڑی "میں بھی باتوں میں بہہ گئی تھی۔ عادت سے لاچار ہوں نا، تم مارکس ہو نہ میں جینی، لیکن ان کے پاؤں کے دھول تو ہیں ہم۔ معاش اور تاریخ کی کشمکش کو صحیح معنی دینے

کی کوشش اُسی نے کی تھی۔ مکمل اور آخری تو کہیں کچھ نہیں ہے لیکن اُن کی تعلیم میں اس طرف جانے کا راستہ تو ہے ہی۔ اس لیے میرے اجیت! میں وہی ہوں۔ وہی رہوں گی جو شنکر کے اردھ ناریشور کے طور پر تخیل کیا گیا ہے۔"

اجیت اب بھی خوابوں کی دنیا میں تھا۔ اس نے سمیتا کو کھینچ کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

"تمھارا اردھ ناریشور بھی اس وقت سو رہا ہوگا۔"

"تو آؤ، ہم بھی سو جائیں۔" سمیتا نے اپنے آپ کو چھڑا کر اُسے لِٹا دیا۔ اس عمر میں اتنا رومانس کافی ہے۔ اب وہ زمین پر لوٹ آئے۔ "بہت کام ہے کل مجھے۔ ایک تو یہ تمھاری شیا ملا جاؤں جاؤں کی رٹ لگائے ہے۔ ایک شاہدہ ہے کہ چار مہینے ہوئے..."

"کل ہی تو دیکھا تھا بمبئی دوردرشن پر۔ کیسے چہک رہی تھی۔ دِبھا سے دو قدم آگے جائے گی"۔

"دو قدم جائے لیکن اس کے خاندان والے جانے دیں گے؟ انھوں نے دیکھا ہوگا تو بس خیر نہیں..."

"جو انقلاب کی راہ کے راہی ہیں ان کی ڈکشنری میں' خیر' لفظ نہیں ہوتا۔"

"ہاں، سو تو ہے۔" سمیتا کو نیند آ رہی تھی۔ لیکن وہ پھر اُٹھ بیٹھی "اجیت ایک بات دیکھی تم نے، کل تمھاری بہن کتنی پُرسکون کتنی شانت تھی۔"

اجیت نے ہنس کر کہا "وہ تمھاری شاگردہ جو ہے..."

لیٹے لیٹے سمیتا نے ہنستے ہوئے کہا "آپسی تعریف اچھی لگتی ہے..."

اور اس نے آنکھیں موند لیں، جلد ہی نیند کے آغوش میں پہنچ گئی۔ اجیت کہنی پر سر ٹکائے مبہوت سا کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ یہ بھی نہیں جان سکا کہ وہ کب اور کیسے ایک انوکھے اجالے اور منوّر ماحول میں پہنچ گیا۔ جہاں ننھی ننھی گھنٹیاں ایک سطح پر بج رہی ہیں، ایک خوبصورت موسیقی کی دلفریب آواز پیدا کرتی ہوئی۔ اور ایک آواز گونج رہی ہے — سمیتا نے ہر کسی کے دُکھ سُکھ کے ساتھ اپنے آپ کو بھی ایک سار کر لیا ہے اور آزاد ہو گئی ہے آسودگی اور تشنگی کے بندھن سے...

اس دن اتوار تھا۔ سب چھٹی کے موڈ میں تھے۔ چائے کی میز پر بے فکری سے قہقہے لگا رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ سُمیتا نے دروازہ کھولا۔ سامنے شاہدہ تھی اور اس کے ساتھ تھا ایک سانولا سا نوجوان۔ اسی وجہ سے سُمیتا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ پھر بھی دھیرے سے پوچھا "کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

شاہدہ نے حیرت سے بھابھی کی طرف دیکھا اور کہا "ابھی بتاتی ہوں، کس سے ملنا ہے" کہہ کر وہ ٹیکسی کی طرف مڑی اور نوجوان سے بولی "آپ تو رک نہیں سکتے۔ میں بھی سوچتی ہوں..."

سُمیتا نے اس بار آگے بڑھ کر، اسی طرح لیکن کچھ تیز آواز میں کہا، میڈم راستہ ادھر ہے۔ چپ چاپ اندر آجاؤ۔"

پھر اس نوجوان سے کہا "آؤ بھائی آپ بھی آؤ۔ اس کی عادت ہے دو چار سُنے بغیر سیدھی ہوتی ہی نہیں۔ چار مہینے سے لاپتہ تھی اور اس پر یہ نخرے۔"

شاہدہ روہانسی ہوگئی۔ "بھابھی جان، مجھے یہیں ذبح کر دو گی۔"

سُمیتا نے مسکرا کر بانہوں میں بھر لیا "میری نندی کیوں ذبح ہوگی، ذبح ہوں گے اُس کے دشمن۔ جا اندر سب بیٹھے ہیں۔"

اُسے اندر دھکیل کر اُس نے نوجوان سے کہا "آپ کچھ سامان لے کر اندر چلیں، کچھ میں لاتی ہوں۔ چلو، چلو، ہاں جی (وہ ٹیکسی والے کی طرف مڑی) کتنے پیسے ہوئے؟"

"جی، چالیس۔"

اُسے کرایہ چکا کر اور اٹیچی لیے جب اندر آئی تو میز پر پھول بکھرے تھے۔ سبھی پوچھ رہے تھے "اتنے دن کہاں رہیں آپ؟ یہاں سب سونا سونا تھا۔ جب پرسوں آپ کے دور سے درشن کیے دوردرشن پر تو پتہ لگا اسی زمین پر ہیں..."

وہ کہنے والی تھی 'تو آپ میرا مرثیہ پڑھ چکے ہیں' لیکن اسد کو آتے دیکھ کر زبان کاٹ لی۔ سنجیدہ ہو کر بولی "ہاں، بھائی صاحب، مجھے اکادمی کے لیے ایک پروجیکٹ تیار کرنا تھا۔ اسی کے لیے، کئی جگہ جانا پڑا۔ کچھ لوگوں سے ملنا تھا۔ لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ، گوہاٹی، پھر بمبئی..."

"کچھ بھی ہو دیدی!" کرن نے کہا "آپ بولیں بہت اچھا۔"
شیا ملا نے اپنے موڈ میں کہا "اتنا جوش میں تھا آپ کہ ہم تو ڈر گیا کہیں..."
سمیتا نے فوراً بات کاٹ کر کہا "شاہدہ مہارانی، پہلے تو ذرا ان بھائی صاحب کا تعارف کراؤ۔"
شاہدہ نے پُرسکون آواز میں کہا "بھابھی جان، ان کا نام اسد ہے..."
سمیتا نے اور بھی سنجیدہ آواز میں کہا "جیسے تمھارے بھائی کا نام ہے اجیت؟"
شاہدہ کچھ شرما کر، کچھ لوکھلا کر بولی "بھابھی جان، بہت وقت پڑا ہے بدلہ لینے کا۔
اب تو بخش دو۔ خطا معاف۔ ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔"
"چل، کر دیا معاف، اب ٹھیک ٹھیک بتا۔"
"یہ ڈاکٹر اسد پرویز ہیں۔ اردو اکادمی میں پروجیکٹ افسر ہیں۔ انھیں کا کام تھا۔ میں
تو ان کی اسسٹنٹ ہوں۔"
"یہی بنی رہے گی زندگی بھر؟"
"بھابھی جان، میں اب چلی جاؤں گی اور پھر نہیں آؤں گی۔"
سمیتا تب تک اُس کے پیچھے آ چکی تھی۔ گلے میں بانہہ ڈال کر منہ اپنی طرف کیا اور ماتھا
چومتے ہوئے بولی "جا کے تو دیکھ، سب سمجھ گئی۔ اب جا، فریش ہو لے۔ انکت بیٹے! انکل کو
نیچے لے جاؤ۔ اور کرن، گرم گرم حلوہ بنا۔ شیاملا آیا بنا لے گی۔"
پھر اجیت کی طرف مڑی، "رک سکتے ہو یا جانا ہی ہوگا۔"
اجیت نے کہا "ایک بار تو جانا ہی ہے، لیکن کھانے سے پہلے آ جاؤں گا۔"
سمیتا مسکرائی "سمجھ تو گئے ہی ہوں گے۔"
اجیت نے مسکراتے ہوئے عرض کیا "حضور کے دربار میں جب عقل تقسیم ہو رہی تھی،
تب بندہ بہت پیچھے نہیں تھا۔"
سمیتا ہنستی ہوئی پتا جی کے کمرے میں چلی گئی۔ انھیں بتایا کہ شاہدہ آئی ہے۔ ساتھ میں
اردو اکادمی کے پروجیکٹ افسر ہیں ڈاکٹر اسد پرویز۔
پتا جی نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر ایک خط اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سمیتا نے

حیران ہو کر دیکھا، وہ خط تو شاہدہ کا تھا، سیدھی سادی ہندی میں۔
وہیں بیٹھ کر وہ اسے پڑھنے لگی۔

پروجیکٹ۔ کے سلسلے میں جانے سے پہلے شاہدہ سمیتا سے نہیں مل سکی تھی۔ جاتے ہوئے ایک کارڈ لکھ گئی۔ "اکادمی کے ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں۔ کب لوٹوں گی پتہ نہیں۔ خط لکھتی رہوں گی۔"

لیکن شروع شروع میں دو چار خط ملے۔ پھر کبھی کسی سے پتہ لگا کہ وہ اب فلاں شہر میں ہے۔ ایک ماہ سے کچھ بھی خبر نہیں تھی۔ بس ٹی۔وی پر دیکھا تو پتہ لگا، ماجرا کیا ہے۔

شاہدہ پریشان تو برابر رہتی تھی۔ اندر ہی اندر ٹوٹ رہی تھی۔ لیکن اوپر سے پرسکون تھی۔ ایک دن وہ بہت اداس تھی۔ سمیتا اجیت سب باہر تھے۔ بس کرن بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اسی سے باتیں کرتے ہوئے شادی بیاہ کی بات چلی۔ اچانک شاہدہ بولی "تو اب کسی پڑھے لکھے نوجوان سے شادی کرے گی؟"

کرن نے جواب دیا "وہ تو کرنی ہی چاہیے، لیکن میں نے ابھی سوچا ہی نہیں۔"

"اپنی ذات میں کرے گی یا کسی اونچی ذات والے سے؟"

کرن نے تلخی سے جواب دیا "پڑھ لکھ لینے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ذات ہی چھوڑ دیں۔"

شاہدہ ٹھگی سی کرن کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ کرن ادھر دھیان دیئے بغیر کہہ رہی تھی "اچھا ہی نہیں، یہ مناسب بھی ہے اور ہمارا فرض بھی، اپنی ذات میں شادی کریں اور انھیں اونچا اٹھانے، تعلیم یافتہ کرنے، بیدار کرنے کی کوشش کریں۔"

شاہدہ کے ذہن میں سے جیسے کسی نے جالے صاف کر دیئے۔ اس کے سارے جسم میں روشنی کی کرنیں بکھر گئیں۔ اس نے کرن کو گلے لگا کر کہا "شاباش، یہی ہونا چاہیے، میں بھی یہی کروں گی۔"

سارے سفر میں یہی سوال شاہدہ کو پریشان کرتا رہا۔ شونا تھ کے ساتھ گذارے رومانس کے لمحے اُس کی رگ رگ میں پیوست تھے۔ جب اُس نے ناروے کی لڑکی سے شادی کی تو اُسے

بے انتہا غصہ آیا تھا، نفرت کی حد تک۔

لیکن کبھی کبھی اس کے اندر ایک آواز اُٹھتی ___ 'تُو اسے تو قصوروار ٹھہرا رہی ہے' اپنے آپ کو نہیں دیکھتی۔ ہم سب اپنے اپنے ماحول کی پیداوار ہیں۔ اسے رفاقت کی ضرورت تھی اور تُو وہاں جا نہیں سکتی تھی'

'مَیں تو جانا چاہتی تھی فوراً'

'چاہنے اور ہونے میں کچھ فرق نہیں ہے کیا؟'

'جہاں سچّی محبت ہوتی ہے وہاں سارے فرق مٹ جاتے ہیں'

جیسے کوئی بہت پاس ہی ہنس پڑا ہو " ہاں، فرق پڑتا تھا، لیکن مجنوں، شیریں فرہاد کے زمانے میں۔ محبت تب پیدل چلتی تھی یا بیل گاڑی یا اونٹ گاڑی میں۔ بہت ہوا تو گھوڑے پر دوڑتا ہوگا۔ اب تو موٹر ہے، سپر فاسٹ ٹرین ہے، آواز کی رفتار سے چلنے والے پلین ہیں۔ اب ایسے تیز رفتار زمانے میں کوئی کب تک ٹھہر سکتا ہے...'

'ہاں، کب تک، لیکن...'

'لیکن؟'

شاہدہ تب اکیلی اپنے ہوٹل کے کمرے میں سو رہی تھی۔ یکبارگی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے پسینہ آ رہا تھا۔ وہ کس سے بات کر رہی تھی، اپنے آپ سے؟

اُسے پھر جھپکی آنے لگی، 'یہ اپنے آپ کیا ہے؟ کیا ہے یہ اپنے آپ؟ اپنا باطن... با... طن... یعنی کمپیوٹر...'

وہ پھر گہری نیند میں جا چکی تھی۔ کہیں دُور گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اس نے یکبارگی اپنے آپ کو ایک بہت خوبصورت مکان میں پایا۔ وہ حیران رہ گئی۔ وہ محل کرن کا تھا۔ درج فہرست ذات کی لڑکی کا اس کے شوہر اس کے ساتھ تھے، وہ اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ہنسے جا رہے تھے، ہنسے جا رہے تھے۔

وہ اس کے پاس آئے۔ اُسے پہچانا۔ کرن بول اُٹھی ' او دیدی، آپ!... آؤ، آؤ، میرے شوہر سے ملیں ___ برج کشور۔ میں تو کشور کہتی ہوں'

'یہ کیا کہتی ہو تم، تمھارا گھر ہے یہ؟'

'نہیں، نہیں دیدی، یہ گھر نہیں، اسکول ہے، یہاں ہماری ذات کے بچے بچیاں، نوجوان لڑکے لڑکیاں، مرد عورتیں پڑھنے آتے ہیں۔ شام کو آتے ہیں ان کے ماں باپ، تاؤ چاچا یہاں تک کہ دادا دادی۔'

'سرکار مانتی ہے تمھارے اسکول کو؟'

'کیوں نہیں؟ وہیں سے تو پیسہ ملتا ہے۔ جو پابندی سے اسکول میں جانے لائق ہوتے ہیں انھیں وہاں بھیج دیتے ہیں۔'

'حرف شناس کراتی ہو یا کچھ اور بھی کرتی ہو؟'

'کرتے ہیں، بلکہ وہی زیادہ کرتے ہیں۔ جیسے ــ نشہ کرنے کی برائیاں بتاتے ہیں، صفائی رکھنا سکھاتے ہیں، جادو ٹونا جیسی برائیوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ جتنے اندھے عقائد ہیں، سب سے نجات پانے کی راہ دکھاتے ہیں۔'

'اور جو ذات سے باہر شادی کرنا چاہیں؟'

کرن ہنس پڑی ــ 'اوہ دیدی! آپ میری بات بھولی نہیں۔ ہم اُس کے خلاف نہیں ہیں' لیکن سوچو تو پڑھ لکھ کر اپنے ہی ذات کے لیے کچھ نہیں کیا تو کیا فائدہ؟ ہاں جب اونچی ذات والے ہمارے درمیان آکر ہمارے ہو کر، کام کرنے لگیں تو کوئی پابندی نہیں رہے گی۔ ویسے پابندی تو اب بھی نہیں ہے، لیکن ہوتا کیا ہے، اونچی ذاتوں میں جاکر؟ ویسے ہی ہو جاتے ہیں ہم' اپنوں سے ہی نفرت کرنے لگتے ہیں۔ بہت سی باتیں ہیں۔ تلخ بھی، میٹھی بھی، لیکن میرا مطلب تو آپ سمجھ گئیں...'

تبھی یکبارگی منظر بدلا۔ وہ نشہ کرنے والوں کے ہسپتال میں پہنچ گئی۔ وہاں کی حالت دیکھ کر اُسے بہت تکلیف ہوئی۔ تعجب کرن وہاں بھی تھی۔

منظر بدلتے رہے ــ اسکول، کھیت کھلیان، پنچایت گھر، ہر طرف وہی منظر، ہر جگہ کھِل کھِلاتی کرن۔

ایک مقام پر تو جو کچھ اس نے دیکھا اُس سے وہ حیران رہ گئی۔ پوری بستی، چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے گھر، ہر گھر میں کوئی نہ کوئی صنعت کہیں امبر چرکھا، کہیں چمڑے کا کام، کہیں دیاسلائی

کہیں تیل، کہیں صابن، کہیں آرٹ کی خوبصورت چیز پہ۔ کڑھائی بُنائی...

اور بھی بہت کچھ، لیکن ہر جگہ کرن اور کشور...

اس نے کروٹ بدلی۔ پکارا، کرن! مَیں بھی کچھ دن تیرے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، کرن، کرن...!

لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کھڑکی سے آتی روشنی سے کمرہ ہلکے اُجالے سے بھرا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ دروازہ کھولا، باہر چائے لیے بیرا تھا۔

"میم صاحب، چائے۔"

"رکھ دو بھیّا، اور دیکھو، کمرہ نمبر پانچ میں جو صاحب ہیں اُن سے پوچھو، مَیں جاؤں یا وہ آئیں گے؟"

وہ چائے پی ہی رہی تھی کہ بیرا آیا، بولا "وہی آرہے ہیں تیار ہوکر۔"

"اچھا بھیّا، شکریہ۔ ہاں دیکھو جب وہ آئیں تو چائے اور دے جانا، کچھ بسکٹ بھی۔"

جب تک اسد آتے وہ تیار ہو چکی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مسکرا کر کہا،

"آداب۔"

"خوب سوئیں نا؟"

"نہیں، اسد صاحب! وہی بات کرنا چاہتی ہوں۔ تم میری کہانی تو جانتے ہو کچھ کچھ..."

"کچھ، کچھ کیا، میں تو سب کچھ جانتا ہوں۔"

ہاتھ سے روک کر شاہدہ انجم بولی "کئی دنوں سے رات کو نہ جانے کہاں کہاں چلی

جاتی ہوں۔ کیا کیا دیکھتی ہوں۔"

پھر اس نے بالترتیب سمیتا بھابھی، ورنکا دیدی، وبھا دیدی، شیلا دادی، یہاں

تک کہ راج کلی اور کرن کی کہانی سنادی۔ پھر بولی "میں چاہتی ہوں..."

ایک دم اسد بول اُٹھے، "میں سمجھ گیا۔ تم چاہو تو میں دنیا کے آخری کنارے تک..."

"نا، نا، نا، تب تو کچھ ہاتھ نہیں لگے گا۔ ابھی شروع ہی ٹھیک ہے۔" اور وہ ہنس

پڑی اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

اسد نے اسے پکڑا اور کس کر دبا دیا اور ہونٹوں سے چھو کر بولا "تم اپنی والدہ سے بات

کرلو۔ میرے بھائی جان اور بھابھی تو تیار ہیں۔ بہن تو کئی بار رشتہ مانگنے جانے کے لیے کہہ چکی ہے۔"

پھر وہ دیر تک وِبھا کے نئے اخلاقی دستور کی بات کرتے رہے۔ شریعت، پرسنل لا، شاہ بانو کا کیس، نیا قانون ــــ سبھی کا تذکرہ کیا۔ شاہدہ بولی "خطرہ ہے اپنوں ہی سے خطرہ ہے انھیں میں سے ہم خیال ڈھونڈنے ہوں گے۔"

"ہم ڈھونڈیں گے۔ کم ہیں، لیکن زیادہ بھی ہوں گے۔ اور خطرہ تو کہاں نہیں ہے۔ اور میں تو تم جانتی ہو، ان خطروں میں ہی پلا بڑھا ہوں۔"

"تبھی تو سب کچھ کہہ سکی۔ جو کچھ بھی ہوں، تمھارے سامنے ہوں، وعدہ کرتی ہوں کبھی دھوکہ نہیں دوں گی۔"

اسد سے رہا نہیں گیا۔ وہ ایک دم اٹھا اور شاہدہ کو اپنی باہوں میں دبوچ لیا۔ شاہدہ نے دھیرے سے اپنے آپ کو چھڑا کر کہا "بہت سکون ملا۔ لیکن ابھی نہیں، ابھی جنگ لڑنی ہے۔ بس اتنا ہی کہوں گی، میں تمھاری ہوں، صرف تمھاری، تا قیامت تمھاری، آؤ اب چلیں، بالکل پہلے کی طرح۔ تم افسر اور میں..."

شکر ہے شاہدہ نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ اٹھی اور بالکنی میں جا کھڑی ہوئی۔ دھوپ چمک آئی تھی اور ہارن بجتے جا رہے تھے۔ اسد کے جانے پر اس نے کپڑے بدلے۔ تھیلا اور کتابیں لیں۔ کہاں کہاں جانا تھا، وہ فہرست بنائی اور پھر دروازے پر تالا لگا کر اسد کی راہ دیکھنے لگی۔

اس دن کے بعد دنیا ہی بدل گئی۔ بمبئی پہنچنے تک وہ پکے ہو چکے تھے۔ وِبھا اور ورتکا ــــ دونوں نے ان کی خوب خاطر مدارات کی۔ سیر سپاٹا بھی ہوا اور غور و فکر بھی۔ بیچ بیچ کارے کے بغیر تو محفل جمتی ہی نہیں تھی۔ اردو کے کئی نوجوان ادیب بھی ان میں آملے۔ وِبھا پیش پیش تھی۔ اس کے خیال، اس کا اخلاق، سب کچھ جیسے ایک معجزہ۔ شاہدہ تو ہر وقت وردون کو چپکائے رہتی تھی۔

ایک دن وِبھا سے نہیں رہا گیا، بولی "دیدی ایک وردون اِس کو بھی چاہیے۔"

شاہدہ نے چٹکی لی "کارخانہ کھول رکھا ہے کیا؟"

"وہ بھی کھل جائے گا بی بی رانی۔ بادل تو دکھائی دینے لگے ہیں، برسیں گے کہیں تو،

لیکن ابھی تو ہمیں دوردرشن کا پروگرام دیکھنا ہے۔ میں سبھی سے مل چکی ہوں۔ بس، ہمیں قلعہ بندی کرنی ہے۔ کوئی تلخی نہیں، کوئی حملہ نہیں، پیار بھری دلیلیں سننا زیادہ، بولنا کم۔ کمانڈ میرے ہاتھ میں رہے گی۔"

یہی پروگرام دہلی میں اجیت، ورتیکا، شیاملا کرن، سُمیتا، انکت اور بڑودس میں بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا۔ بتاجی نے بھی دیکھا تھا۔ اب جو خط بتاجی نے سُمیتا کو دیا، اُس میں شاہدہ نے اپنے باطن کی کہانی لکھی تھی اور ان کا آشیرواد چاہا تھا۔

اب جب وہ دونوں ان کے پاس آئے تو انھوں نے اُن کا ماتھا چوم کر اور سر پر ہاتھ رکھ کر اتنا ہی کہا تھا "بس، اتنا ہی یاد رکھنا کہ منزل ایک چھلاوہ ہے۔ وہی جھگڑے پیدا کرتی ہے۔" وبھا نے پروگرام کو سم اپ کرتے ہوئے بہت ٹھیک کہا تھا "ہم نے خیال آپ کے سامنے، عوام کے سامنے رکھے ہیں۔ سوچیے، راستہ لمبا ہے۔ ہم سے پہلے بہت چلے گئے کہیں انجانے میں منزل ڈھونڈنے ہم بھی چلے جائیں گے۔ تب جھگڑا کیسا؟ میرا خیال ہے، یہ نظریہ رکھیں گے تو راہ مزے سے کٹے گی۔ حادثے ہماری طاقت بنیں گے۔ بس 'میں' کو مارنا ہے۔ یعنی 'خود' کو 'خودی' سے آزاد کرنا ہے یعنی آدمی بننا ہے۔ منزل کوئی بھی ہو تو یہ آدمی بننا ہے۔"

پتہ نہیں، وہ وبھا بول رہی تھی یا بتاجی، یا وقت۔ اسد نے قدم بوسی کر کے رخصت چاہی۔ "میں گھر جا رہا ہوں، وہیں سے ایک اور دفتر جاؤں گا۔ شاہدہ تم اپنے گھر چلی جانا۔ اچھا، کل دفتر میں ملیں گے، ہمیشہ کی طرح دو اجنبی۔"

وہ چلا گیا تب سمیتا نے شاہدہ کو جو چھاتی سے لگایا تو الگ ہی نہ کر سکی۔

"اب چھوڑو بھی، امّی جان راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ اُن کی گالیاں کھانی ہیں۔"

"تبھی تو کہتی ہوں پیار کا زرہ بکتر پہن لے۔"

"وہ تو ایک بار پہنا تھا ٹوٹ گیا۔ اب دیکھتی ہوں۔"

"بس یہی سوچنا چھوڑ دے۔"

یہ کہہ ہی رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی ــــ سامنے چھوٹی بہن آمنہ کھڑی تھی۔ شاہدہ چیخی ــ "ارے تو کیوں آئی، میں تو آ رہی تھی۔"

"سیدھا گھر کیوں نہیں آئیں آپ ؟" آمنہ نے شاہدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔
"یہ بھابھی جان کھینچ لائیں۔ وبھانے تار دے دیا تھا۔" شاہدہ نے پیار سے چھوٹی بہن کو تھپ تھپایا۔

"اسد بھائی کہاں ہیں ؟"
"وہ تو وہیں سے گھر چلے گئے تھے، دفتر کے لوگوں کے ساتھ۔"
سمیتا نے کہا "آمنہ اندر تو آ۔"
شاہدہ نے کہا "اب جانے دو، بھابھی جی۔"
"نہیں، نہیں آمنہ چائے پی کر جائے گی۔ میری مدد تو یہی کرے گی۔"
اب آمنہ چہکی "سچ آپا جان! پرسوں کا پروگرام دیکھ کر بہت مزہ آیا۔ بہت اچھا لگا۔ لیکن امّی جان، چچا جان بہت لال پیلے ہو رہے تھے۔"
شاہدہ چہکی ۔ "سچ، تب تو خدا خیر کرے۔"
"آپا، تم بھی ڈرتی ہو! وہ نہ ہوں لیکن میں تو آپ کے ساتھ ہوں۔"
"تب تو بات بننے کا راستہ ہے۔"
یہ جملہ اس نے کچھ ایسی معصومیت سے کہا کہ وہاں بیٹھے سبھی یکبارگی ہنس پڑے۔

دوردرشن کے اس پروگرام کے دور رس نتائج ہوئے، کیونکہ اس کی نظامت وبھا نے بڑی خوبی سے کی تھی۔ اسی لیے جو ناموافق ردِّ عمل ہوئے وہ بھی پرتشدّد نہیں تھے۔ وبھا کو کوئی حیرانی نہیں ہوئی جب کچھ اقلیت کے لوگوں اور تنظیموں نے واضح الفاظ میں کہا کہ وہ کسی بھی شرط پر اپنے پرسنل لا کو نہیں چھونے دیں گے۔ لیکن حیرانی اس بات کی تھی کہ وبھا اور درتکا کی امید کے خلاف انھیں حمایت دینے والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی، بالخصوص لڑکیوں کی کئی عورتیں بھی اس سے ملنے آئیں۔ بڑی نرم دلی، بڑے پیار سے بولیں "بیٹی، واقعی ہم دوزخ میں پڑی ہیں۔ کبھی نکل سکیں گی، اس سے؟ خدا کی رحمت ہو تم پر۔ تم نے راستہ دکھایا ہے، لیکن جن کے ہاتھ میں حکومت ہے، طاقت ہے، وہ مانیں گے؟"

" مانیں گے چچی جان، مانیں گے، لیکن وقت لگے گا۔ آپ جس دوزخ میں پڑی ہیں آپ کی اولاد اُسی کو جنّت بنا دے گی۔"

وہ سب کو تسلّی دیتی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کام کتنا مشکل ہے، ناممکن جیسا ہے۔ لیکن یہ آدمی ہی ناممکن کے 'نا' کی جڑ کھود دے گا۔

لڑکیاں آتیں اور پورا تعاون دینے کا وعدہ کرتیں۔ ایسے ہم خیال لڑکے اور لڑکیوں نے ایک تنظیم بھی بنائی لیکن وہ سب اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھا۔

اچانک اپنی ہی بات پر وہ ہنس پڑی —" یہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہی کیوں، ہاتھی کی سونڈ میں چینٹی بھی تو ہو سکتی ہے میری اسکیم..."

ایک دن وہ چائے پیتی یہ سب سوچتی ہوئی بیٹھی تھی کہ شریمتی وسودھا آ پہنچی۔ وبھا ایک دم اُٹھی —" ارے مسز پگارے، بغیر اطلاع کے صبح صبح کیسے آ گئیں؟"

وسودھا بیٹھی ہوئی بولی" پہلی بات تو یہ ہے کہ تمھارے لیے میں وسودھا تھی، اب بھی وسودھا ہی رہوں گی۔ مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ تمھیں نے سونپا ہے انھیں مجھے۔"

وہ ٹھٹھکی —" میں نے سونپا ہے۔"

وسودھا نے وبھا کے ہاتھ سے پیالہ لیتے ہوئے کہا" جانتی ہوں، آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ ویسی کوئی بات نہیں۔ میں انھیں بہت پیار کرتی ہوں۔ شروع سے کرتی رہی ہوں۔ وہ بھی مجھے اتنا ہی پیار کرتے ہیں۔ ہم مل جُل کر پیار کے کھیل کھیلتے ہیں تو مِل جُل کر میگزین کا ایڈیٹوریل بھی لکھتے ہیں۔ وہ اتنے سچے ہیں کہ کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتے، لیکن..."

وبھا تب نہ جانے کہاں تھی، وہیں سے بولی" مرد کا کچھ بھروسہ نہیں۔ لیکن..."

" اوہ دیدی، یہ 'لیکن' ہی تو..."

وبھا کو جیسے اب ہوش آیا۔ معافی مانگتی ہوئی بولی" معاف کرنا، میں کہیں چلی گئی تھی۔ یہ میرا مزاج بن گیا ہے۔ تم کہہ رہی تھیں کہ وہ کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتے، لیکن..."

وسودھا گہرے طنز سے مسکرائی، لیکن اوپر سے اُسی طرح پُرسکون لہجے میں بولی" لیکن وہ تمھیں بہت پیار کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ بات مجھ سے چھپائی نہیں۔ تم نے مجھے شادی کے موقع پر دو خوبصورت

ساڑیاں دی تھیں نا۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں ہمیشہ انھیں ہی پہنوں۔"

"یعنی وہ مجھے بھولنا نہیں چاہتا۔"

"اتنا ہی نہیں، کچھ زیادہ بھی ہے۔ تمھیں ہمیشہ اپنے پاس دیکھنا چاہتے ہیں۔"

وبھا نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ وسودھا نے شاید امید بھی نہیں کی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں چائے کا پیالہ لیے ایک گھونٹ لی۔ پھر پوچھا "دیدی، برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔"

"پوچھو۔" وبھا نے سادگی سے جواب دیا۔

"تم نے اُن سے شادی کیوں نہیں کی؟ مَیں جانتی ہوں، تم نے اِسی سوال کے جواب میں کہا تھا — میں دوسرا طلاق نہیں دینا چاہتی۔ لیکن کیا اتنا ہی سچ ہے؟"

"میں کہوں یہ سچ ہے تو کیا تم یقین نہیں کروگی؟"

وسودھا رک گئی۔ پھر بھی ہمت کرکے آہستہ آہستہ بولی — جیسے معافی مانگتی ہوئی "دیدی میں نے سوال پوچھا، اس کا کیا مطلب ہے، وہ آپ نہ جانتی ہوں، اتنی نادان تو آپ ہو نہیں سکتیں۔ دیدی، آپ کے لیے میرے دل میں بے پناہ پیار ہے اور عقیدت بھی۔"

تعجب وبھا اپنی کرسی سے اُٹھی۔ وسودھا کے پیچھے آئی۔ اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس کا ماتھا ہی نہیں گال بھی چوم لیا۔ پھر وہیں سے بولی "میں نے جو کہا تھا سچ کہا تھا سمجھاتی ہوں۔"

اور اب اُس کے سامنے آکر بیٹھ گئی اور بولی، دھیرے دھیرے ایک ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی "وہ بہت سادہ سیدھا اور سچّا انسان ہے، اندر باہر ایک۔ کبھی گرجتا نہیں۔ اس لیے اتنا الھڑ، اتنا غیر منظم ... اس کے برعکس۔ کتنے تجربات سے میں گزر چکی ہوں الھڑ غیر منظم ہو ہی نہیں سکتی۔ اپنے بارے میں اپنے منہ سے کیا کہوں، جیسی ہوں، سب جانتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو شدّت سے پیار کیا ہے اور شادی کے بعد بھی کرتے، لیکن ابتدائی جوش کے بعد ہمارا ٹکرانا فطری اور لازمی ہوتا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ ایک بار پھر پیار کا ترجمہ کردوں۔ میں پیار کو پیار ہی رہنے دینا چاہتی تھی، اور چاہتی ہوں۔ میں اُس سے ٹکرا جاتی، سنبھال نہیں پاتی۔ تم سنبھال سکتی ہو۔ کیونکہ تمھارے ٹکرانے کا ویسا امکان نہیں۔"

وسودھا ایک ٹک وبھا کے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور ایک ایک لفظ کو پی رہی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔ تب بھی وہ کئی لمحے مسحور سی بیٹھی ہی رہی۔ وبھا نے اُس طرف دھیان دیے بغیر آخری جملہ کہا "یقین کرو، میرا پیار ایک دوست کا پیار رہے گا۔ تمھاری راہ کا کانٹا نہیں بنے گا۔ اور کبھی..."

" نہیں، نہیں" وسودھا جانے کہاں سے بول اٹھی "نہیں، اب ایک لفظ بھی نہیں، اور ابھی ہی کیوں، کبھی بھی نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھی اور وبھا کے پاس آکر اُس نے پاؤں چھو لیے " بڑی دیدی ہیں۔ اتنا حق تو ہے میرا۔ میرا بھی یقین کرو۔ میں کبھی وہ موقع نہیں آنے دوں گی جب دوستی کا ترجمہ کرنا پڑے۔"

" ایک بات اور یاد رکھنا ___ سماج کی ساری سہولتیں بھوگنے والا مرد بہت بزدل ہے، اس لیے پرتشدد بنتا ہے۔ بلکہ میں کہوں گی کہ مجبور ہوتا ہے پرتشدد بننے کے لیے۔"

" دیدی، سبھی مجبور ہیں تو اس مجبوری کو قبول کر کے اسے یقین میں کیوں نہیں بدل سکتے؟"

" بدل سکتے ہیں، اگر خود کو خود سے آزاد کر لیں۔"

" یعنی؟"

" اس یعنی کا جواب تمھیں خود اپنے باطن میں ڈھونڈنا ہوگا۔ میں تو ابھی اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ مرد غالب سماج ہے، پہل اُدھر سے ہی ہونی ہے۔ اپنے پاس، خاندان کی مثال دے سکتی ہوں۔ میرے شوہر نہیں سمجھ سکے، سمجھانا پڑا۔ میرے بھیا خود سمجھ گئے ہیں۔ وجے بھی سمجھتا ہے۔ شیاملا کا شوہر بالکل نہیں سمجھتا، کیونکہ وہ بے کار ہے۔ بیوی ہی کماتی ہے کچھ پیسے۔ اس احساس کمتری نے جو انا کی ہی دوسری شکل ہے اسے اور بھی پُرتشدد بنا دیا ہے۔ ایک بات اور بتاتی ہوں۔ میرے بہنوئی مشہور صحافی ہیں، جنھیں تم خوب جانتی ہو۔"

"میں کیوں، صحافت کی ساری دنیا جانتی ہے۔ کہوں گی..."

"جی ہاں، وہ اوپر سے جتنے بہادر آزاد خیال دکھائی دیتے ہیں اتنے ہی بزدل ہیں، تبھی تو بھاگ کھڑے ہوئے جی جی کو چھوڑ کر اور وہ نکنج بھیا اور میگھا بھابھی..."

"یتیم خانہ میں پلی ہیں وہ تو۔"

"اسی لیے تو..."

اچانک جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ وبھا سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ وسودھا نے دیکھا تو گھبرا گئی "کیا ہوا دیدی؟ دورے پڑتے ہیں کیا آپ کو؟ لیٹ جائیے، لیٹ جائیے۔ میں پانی لاتی ہوں..."

تب تک وبھا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ پُرسکون آواز میں بولی "مجھے کچھ نہیں ہوا..."

"پھر...؟"

لمحے بھر کے لیے رُکی پھر بولی "معاف کرنا وسودھا، میں بہت بڑی غلطی کرنے جا رہی تھی۔ میرا غرور بھی کیا کم ہے؟ مجھے کیا حق ہے، دوسروں کا تجزیہ کرنے کا؟ میں ابھی تک وہ حق کہاں حاصل کر سکی ہوں؟"

وسودھا وبھا کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ کیسا کڑوا سچ بول رہی ہیں یہ۔ ہمیں تو دوسروں کی غلطیاں ڈھونڈنے میں ہی لطف آتا ہے۔ اپنے باطن میں کوئی نہیں جھانکتا۔ وہ یکبارگی اُٹھی اور ان کی چھاتی سے چپک گئی۔ "کاش دیدی، میں یہ سیکھ ہمیشہ یاد رکھ سکوں۔"

وبھا کھلے دل سے ہنسی "بس، بس، بہت ہو گیا۔ میرے پاؤں میری زمین پر ہی رہنے دو۔ بیٹھو دس منٹ میں ابھی تیار ہو کر آئی۔ تمھیں 'سوربھ' کے دفتر میں چھوڑتی ہوئی اپنے 'جن مت' کے دفتر چلی جاؤں گی۔ آج ہفتہ وار کا مواد دیکھنا ہے۔ آج کل ڈاک بہت آتی ہے، اُس پروگرام کو لے کر۔"

وسودھا کچھ کہے، وبھا آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ دُور سے اتنا ہی سن سکی "بس دس منٹ۔ میں نے بھی اپنا راستہ چن لیا ہے۔ ہے نہ وہ شعر ـــ

منزل ہے نہ منزل کا پتہ ہے

محبت راستہ ہی راستہ ہے"

یکبارگی وسودھا کے باطن کی تاریکی میں الفاظ کی کرن چمک اُٹھی 'ہاں' راستہ ہی ٹھیک ہے کیونکہ کچھ لوگ منزل پر پہنچ کر بھی بھٹک جاتے ہیں۔

دفتر پہنچ کر ایک حیرانی اس کی راہ دیکھ رہی تھی — تھیلا ٹانگے جیسے ہی کرسی پر بیٹھی، دیکھا کہ سامنے ایک چٹ رکھی ہے۔ وبھا خوشی اور حیرانی سے چیخ اٹھی "رام پھل، یہ چٹ کس نے دی؟"

رام پھل بولا "دیدی، ایک نوجوان لڑکی اور ساتھ میں ایک لڑکا دونوں ریسپشن میں بیٹھے ہیں۔"

"بھابھی!"

بھابھی وہاں پہنچی تو دیکھا، واقعی کرن ہے۔ پاگلوں کی طرح گلے سے لگالیا "کب سے بیٹھی ہے یہاں؟ گھر کیوں نہیں آئی؟"

کرن کی آنکھیں نم تھیں اور چہرہ پُر نور۔ بھرّائی آواز میں بولی "بڑی دیدی نے بتایا تو تھا، چھٹّی بھی دی تھی، لیکن گاڑی میں وہ ہمارا تھیلا کسی نے اُٹھا لیا۔ بس آپ کے اخبار کا نام یاد تھا۔ وہی پوچھتے ہوئے آ گئے۔ یہ کشور ورما میرے ساتھ آئے ہیں — پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اب تو آپ مل ہی گئیں، گھر پہنچ گئے سمجھو۔"

"اچھا، آ میرے کمرے میں، آپ بھی آیئے، چائے ناشتہ ہوا؟"

"وہ تو دیدی، سب اسٹیشن پر ویٹنگ روم میں کرلیا۔"

"اچھا، تو پھر میں تمہیں گھر چھوڑ آتی ہوں۔ آفس کی گاڑی ہے۔ تم وہاں نہا دھو کر آرام کرنا، چائے ناشتہ کرنا، جو مرضی ہو بنا لینا۔ مجھے تو ذرا کام ہے، شام کو ہی ملوں گی۔ ورتکا دیدی کو فون کردوں گی، وہ فری ہوئیں تو آ جائیں گی۔"

رام پھل کو سب کچھ سمجھا کر وہ اپنے فلیٹ پر لے گئی۔ سب کچھ دکھا دیا۔ پھر ورتکا جی جی کو فون کیا۔ وہ فوراً مل گئیں۔ بولی "دیدی دہلی سے کرن آئی ہے۔ میں آج بہت مصروف ہوں، آپ کب لوٹیں گی؟"

اِدھر سے جواب آیا — "میری کلاس دو بجے ختم ہو گی۔ سیدھی وہیں آ رہی ہوں۔"

رات کھانے کی میز پر دہلی کا سا عالم تھا۔ اُن دونوں کے علاوہ وبھا، ورتکا، وردن، وسودھا، وجے، شالنی — سبھی چہک رہے تھے۔ کرن اور کشور تو اتنے خوش تھے کہ ان کے چاروں طرف

نہ تب کوئی ریکھا تھی نہ دائرے ۔ ماضی کے حدود سے آزاد نیلا آسمان ان کی سرحد تھی ۔ وہ معزز مہمان تھے ۔ کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے ورتکا نے ان دونوں تک آنے کی وجہ بتائی۔ اُن کے پورے منصوبے پر روشنی ڈالی، کہا " میں ان دونوں کے فیصلے سے بے حد خوش ہوں۔ انھیں اپنی ہی ذات میں اُن کا ہو کر ہی اُن کے دل جیتنا ہے ۔ مجھے تو شرم آتی ہے اس دھرتی کو اپنی مادرِ وطن کہتے ۔قلم کے نوک سے کاغذ پر کچھ بھی لکھا جا سکتا ہے ۔ ضرورت ہے ہماری رگوں میں جذب خیالات کو آپریشن کر کے نکال پھینکنے کی ۔ دل کے پردے پر دائروں کو مٹانے کی' لیکن ہر سماج طاقت کی زبان سمجھتا ہے ۔ طاقت تلوار میں نہیں، خیالوں میں ہوتی ہے ۔لفظ کے معنی کو جینے میں ہوتی ہے ۔ وہی طوفان پیدا کرتا ہے ، وہی سیلاب لاتا ہے، ایسا امنڈتا سیلاب جو سب کچھ بہالے جائے ۔۔۔"

پھر یکبارگی یاد آیا کہ وہ تو بھاشن ہی دینے لگی ۔ ہنسی، بولی "پروفیسر ہوں نا، ۴۵ منٹ بولنے کا تو موروثی حق ہے ۔"

شالنی تائی بولیں "تو بولیے نا، یا وجے کو کھڑا کر دیجیے ۔ ۴۵ منٹ نہ جانے کہاں رہ جائیں گے ۔"

وجے نے سبھی کو حیران کرتے ہوئے پُرسکون انداز سے کہا " آج کل مَیں ایجوکیٹ کیا جا رہا ہوں ۔اب مَیں بولتا کم ہوں، لکھتا زیادہ ہوں، آپ کل کے 'جن مت' میں میرا مضمون پڑھیے، آج کی اس نشست پر ۔ ۴۵ منٹ تو لگ ہی جائیں گے ۔"

" وسودھا اجازت دے دے گی، اتنا لمبا مضمون لکھنے کی؟ " وبھا نے چٹکی لی ۔

وجے نے فوراً جواب دیا " وہ بھی تو لکھتی ہے ۔ دونوں پیٹھ سے پیٹھ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں ۔"

وسودھا چُو کنے والی نہیں تھی "اب آپ سوچ لیجیے ،ایسی حالت میں کیا لکھا جا سکتا ہو گا ۔"

تب اتنے زور سے قہقہہ اٹھا کہ کافی کے پیالے چھلک اُٹھے ۔شالنی تائی اُسی ہنسی کی رَو میں بولیں "کرن بیٹی ، دیکھ لو، یہ سبق ہے تیرے لیے ۔ ابھی شادی نہ کرنا ۔"

وبھا مسکرائی " سمیتا بھابھی کے راج میں کوئی ایسا کرنے کی جرأت کر سکتا ہے ؟ اِس میدان میں وہ پوری تاناشاہ ہیں ۔"

کرن ایک دم بول اٹھی "نہیں چھوٹی دیدی، وہ کبھی تا ناشاد نہیں ہو سکتیں۔ وہ تو ماں ہیں۔"
تبھی وبھا کو اپنی ماں کی یاد آ گئی۔ ماحول میں اچانک اداسی چھا گئی۔ وبھا نے کرن کو اپنے پاس کھینچ کر کہا، "پگلی ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ وہ تو ہم سب کی ماں ہیں۔"

اس رات واقعی وبھا اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی یہی سوچتی رہی، کیا ہوا ہوتا ہم سب کا اگر سُمیتا بھابی نہ ہوتیں... میرا یہ سارا حوصلہ خبط کی حد تک پہنچا ہوا بغاوت کا جذبہ جو بھابی کے سکھانے کی وجہ سے 'برابری' پر آکر رک گئی ہے...
دو پل اس نے اوپر دھوئیں سے بھرے آسمان کی طرف دیکھا، جس کے بیچ سے کہیں کہیں تارے چمک رہے تھے، بے چارے...
وہ اپنے ہی تجزیے پر چونک پڑی —'بے چاری کہیں میں ہی تو نہیں؟ میں بھی نہیں گھری کیا جانے انجانے زہریلی گیسوں کے دھوئیں سے؟ کہیں کوئی خانہ خالی ہے میرے اندر؟ خالی گھر کا خالی پن، یا آسمان کا خالی پن، لیکن آکاش تو کچھ نہ ہو کر بھی کبھی خالی نہیں رہتا۔ کیسی تھی وہ زندگی انیتہ کے ساتھ، مکمل آسودہ، لیکن پھر خوفناک تاریکی۔ وجے کے پاس ہوتی تو مکمل پاک اجالے سے بھری رہتی۔ لیکن وہاں بھی میں نے تلاش کر لیا تھا ایک سونا گوشہ جو اکثر ڈراتا تھا۔
'کیا یہ خالی پن ساری عورتیں محسوس کر لیتی ہیں اور تقدیر کی پناہ میں آزاد ہو جاتی ہیں...'
وہ پھر چپ ہو گئی۔ کروٹ بدل لی، آسمان کے خالی پن سے نجات پانے کے لیے، لیکن خالی پن سے نجات تو اس کے مرنے پر ہی مل سکتی ہے۔ جو پیار ہمیں آسودہ، مطمئن کرتا ہوا لگتا ہے کیا وہ پچھتاوے کی وجہ سے اپنے آپ میں شدت پیدا کر لیتا ہے؟"
وہ جیسے ہانپنے لگی، لیکن کیوں، کیا تھا وہاں؟ دوسری طرف سوئے تھے اپنے آپ سے مطمئن، خوشیوں اور مسرتوں سے لبریز اور کچھ کرنے کی چاہ لیے۔ لیکن کھانے کی میز پر اٹھنے والے قہقہے آسودگی اور افسردگی کے قہقہے تھے یا اس آسمان کے اندر چھپے شہاب ثاقب کی علامت تھے جو جانے انجانے آسمان اور زمین کے درمیان برباد ہوتے تھے۔ آسے دیکھوان دیکھا...

اور دھوئیں سے بھر کر...

کیا وہ سب ہراساں تھے؟ کیا ان کے اندر خالی جگہیں نہیں تھیں ـــ ورتکا جی، شالنی تائی وجے پگار رے، وسودھا مانے؟ وسودھا کی ایک کہانی میں میں نے کہیں پڑھا تھا، جیسے میری کہانی کا پورا سچ اُس نے انڈیل دیا ہو۔ میں نے جو اپنی زندگی کے پانچ سال انیتہ کو سچے تن من سے وقف کر دیے تھے وہ کیا گنگا کو سپرد پنڈ دان کی طرح نہیں تھا جو شاید مچھلیوں کے پیٹ کو ہی آسودہ کرتے ہیں...؟

میں نے وجے کو وسودھا کے حوالے ایسے ہی تو نہیں کر دیا ہے؟

اپنے ہی اس خیال سے وہ کانپ گئی۔ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی اور مبہوت سی چاروں طرف دیکھنے لگی ـــ 'یہ عیار حسینہ کہاں سے آگئی...؟'

بہت ہی پاس سے کسی نے جواب دیا 'اُسے باہر کہاں ڈھونڈ رہی ہو' اندر آؤ۔ وہیں بیٹھی ہے وہ عیار حسینہ۔ ڈرو نہیں، یہ ہر انسان کے اندر رہتی ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لیے اس کا ہونا بھی ضروری ہے...'

'کیا میں اپنے آپ کو نہیں جانتی؟'

'خود سے ہی پوچھ۔ تم نے اندر کی تھکان کو بہت برداشت کیا ہے؟'

جیسے باطن کے دروازے وا ہو گئے ہوں۔ کرن آج اُس کی استاد بن کر آئی ہے۔ دتاتریے کے ۲۴ گوروں کی طرح۔ کتنا ادھورا علم ہے انسان کا، اور وہ سمجھتا ہے وہ سب کچھ جانتا ہے...

چہ۔ چہ۔ چہ۔ بے چارہ۔

کرن نے کتنی سادگی سے کتنا صحیح فیصلہ کیا ہے... اور وہ کہتی تھی، شاہدہ بھی محبت کے اُسی راستے پر چل پڑی ہے، جس کی منزل نہیں ہے...

پھر کوئی ہنسی بہت پاس سے ـــ 'دیکھا عیار حسینہ کا کام۔ وہ بھی کبھی کبھی صحیح راہ ڈھونڈنے میں معاون ہوتی ہے۔ تمھیں کرن سے حسد ہوئی نا... نا... نا... ہوئی ہے اور میری وجہ سے ہوئی ہے، لیکن اُسی حسد نے تمھیں اپنے باطن میں جھانکنے کا موقع دے دیا۔ اب سو جاؤ۔ میں عیار حسینہ تمھاری کامیابی کی دعا کرتی ہوں ـــ آمین !!!'

وہ خود یکبارگی غائب ہو گئی۔ اُس نے پکار کر کہا 'سنو، سنو...'

کوئی اور پیاری پیاری سی آواز اُس کے باطن میں اُٹھ رہی تھی — 'دیکھا عیّار حسینہ آخر اپنا کام کر گئی، لیکن تم کامیابی کی فکر نہ کرنا۔ بس چلتے چلنا۔ روی ٹھاکر کے گیت کی طرح کسی کو پکارنا بھی مت...'

پَل بھر میں سب کچھ بدل گیا۔ اب وہ پوری طرح بے خطر اور پُر سکون تھی جیسے پہلی اولاد پاکر نوجوان ماں محبت سے چمک اُٹھتی ہے۔

اُسے نیند آنے لگی کہ عیّار حسینہ پھر بولی پیار بھری آواز میں 'تو اولاد کی خواہش جاگ اُٹھی نا۔ لیکن وہ فطری ہے۔ سوجا، سوجا۔ اب پُر جوش مت ہو...'

اور وہ سچ مچ سو گئی۔

صبح کرن کی آواز سُن کر وہ حیران سی اُٹھ بیٹھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا — چائے کی ٹرے لیے کرن کھڑی ہے۔

"یہ کیا، یہاں بھی تو...؟"

"کیوں! میرا گھر نہیں ہے یہ؟ مجھے نکالو گی کیا یہاں سے؟"

وبھا نے چپ چاپ ٹرے لے کر پاس کی چھوٹی میز پر رکھ دی اور اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا "رات بھر تیرے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ تجھے نکالنے سے پہلے میں خود..."

کرن نے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ دیا — "ہمیں جلدی تیار ہونا ہے۔ یہاں دلت سبھا کے صدر اور سکریٹری سے دس بجے ملنا ہے۔ وہاں سے سیدھے تمھارے دفتر آئیں گے۔ تمھیں سب بتاؤں گی اور پھر تم اپنے 'جن مت' میں لکھو گی۔ لکھو گی نا...؟"

وبھا کو مذاق سوجھا، مسکرا کر بولی "میں کیوں لکھوں؟ میں تو بس تم دونوں کی تصویر چھاپوں گی۔"

"ہٹو دیدی، اُس کے چھپنے میں تو ابھی بہت دیر ہے۔ سپریم کورٹ کی اجازت نہیں ہے۔ اچھا اب چائے پیو اور مجھے اجازت دو۔"

کرن نے یہ بات کچھ اس طرح سے کہی جیسے کوئی پختہ ہیروئن بول رہی ہو۔ اس کی ہنسی پھوٹ گئی۔ لیکن تبھی وہاں کشور آ گیا تھا۔ تینوں چپ چاپ چائے پینے لگے۔ بیچ بیچ میں وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیتے تھے۔ اور وہ مسکان کچھ کہہ جاتی تھی کہ لفظ اُسے پکڑ ہی نہیں سکتے تھے۔

دو بجے کے بعد ہی وہ دونوں وبھا کے دفتر پہنچ سکے۔ لیکن وہ بہت خوش تھے۔ دلت سبھا نے انھیں یقین دلایا تھا اور وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اُن کی مانگوں کے لیے ہونے والی ریلی میں حصّہ لینے دہلی ضرور آئیں گے۔

تبھی وجے اور دسودھا آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وجے نے اپنے مزاج کے مطابق ”مے آئی کم اِن میڈم؟“ کہا اور اندر داخل ہو گئے۔

میڈم نے بھی ویسے ہی جواب دیا۔ ”جب بغیر اجازت آ ہی گئے ہو تو بیٹھ بھی سکتے ہو۔“

”تھینک یو۔“ دبی ہوئی ہنسی کے درمیان دونوں بیٹھ گئے۔ اور اسی موڈ میں وجے نے گذارش کی ”آپ کی دعوت شیراز سے لوٹ کر میں نے تین گھنٹے بیٹھ کر یہ چھ صفحات لکھے ہیں۔ دیکھ لیجیے۔“

اور وہ دونوں اُٹھ گئے ”اچھا دزنکا جی جی کے گھر رات کے کھانے پر پھر حاضر ہوں گے۔“

اور جب تک وہ ہوش میں آتے دونوں جا چکے تھے۔

وبھا مسحور سی بول اُٹھی ”اِٹ اِز جسٹ لائک یگارے۔“

اور اس نے مضمون کرن کی طرف بڑھا دیا۔ تعجب، کرن کو پڑھنے میں بارہ منٹ لگے پڑھ چکی تو آنکھیں موند لی۔

”دیدی، یہ مضمون نہیں ہے۔ یہ تو آتشی اسلحہ ہے۔ کل ہماری خیر نہیں جتنی آگ، اتنی ہی محبت، اتنی ہی پُر اثر زبان۔ پہلی بار ایسا لگا کہ ہیرے اور کوئلے کے ایک کان میں ہونے کا راز کیا ہے۔“

تب تک کشور بھی پڑھ چکا تھا۔ وبھا نے پڑھے بغیر ہی پریس مین کو بُلا کر حکم دیا ”ایڈیٹوریل کے صفحہ پر یہ مضمون جائے گا، اِن دو تصویروں کے ساتھ۔“

پریس مین چلا گیا تو کرن نے پوچھا" آپ نے نہیں پڑھا؟"
وبھا ہنس پڑی "ہم ایک دوسرے کا مضمون بغیر پڑھے ہی پڑھ لیتے ہیں۔"
کرن کو اس وقت جو احساس ہوا اسے کوئی لفظ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اعتماد کا صرف اقرار نہیں تھا، یہ وہ سادگی تھی جو یقین کے امرت کلش سے بوند بوند گرتی ہے اور پورے وجود کو غرق کر دیتی ہے...

اگلے دن جب ورتیکا دیدی کے فلیٹ پر پہنچے تو حیران رہ گئے۔ وہاں شاہدہ اور اسد میز کو سجا رہے تھے اور انکت ویڈیو گیم لے کر مصروف تھا۔ انھیں دیکھ کر دوڑا دوڑا آیا "بوا جی، نمستے دیدی، نمستے انکل! ہم ابھی شام کو ہی آئے تھے۔ شاہدہ بوا کو آکاش وانی کے مشاعرے میں غزل پڑھنی ہے۔"
اس کا ماتھا چوم کر وبھا بولی "تم نے ہمیں فون کیوں نہیں کیا؟"
"ہم تو کر رہے تھے، لیکن شاہدہ بوا بولیں — نہیں، نہیں انھیں آنے دو۔ ہمیں دیکھ کر کتنا حیران ہوتی ہیں۔ بڑا مزہ آئے گا۔"
"بھابھی بھی آئی ہیں کیا؟"
"نہیں بوا، ہم اکیلے آئے ہیں۔ تین دن کی چھٹیاں تھیں نا۔ شاہدہ بوا کھینچ لائیں، بڑا اچھا لگ رہا ہے۔"
شاہدہ چپ چاپ مسکرا رہی تھی۔ وبھا نے پاس جا کر ایک گھونسہ جما دیا کمر پر۔ "تجھے دیکھ کر مجھے حیرانی نہیں غصہ آ رہا ہے۔"
شاہدہ درد سے کراہنے کا ڈرامہ کرتی ہوئی بولی "یہ تو ہوا نہیں کہ بیٹھ تھپ تھپاتی، اُلٹے توڑ دی۔"
"تیری جیسوں کی کمر ایسے ہی تھپ تھپائی جاتی ہے، اسد بھائی، آپ ادھر نہ دیکھیے ہمارا اس کا پیار ایسے ہی پروان چڑھتا ہے۔"
"تب تو خدا خیر کرے۔" اسد نے ہنس کر جواب دیا "میرا کیا حال ہوگا؟"

"خدا کے فضل سے تو دیکھنے میں اچھے خاصے مرد ہو، باقی..."

جملہ پورا ہو پایا تاکہ ایک طرف تو کچن سے ورتیکا دیدی نے پکارا تو دوسری طرف سے شالنی، وجے پگارے اور وسودھا کے ساتھ پانچ چھ صحافی اور دلت سبھا کے صدر اور سکریٹری وہاں تشریف لائے۔ پھر تو دو گھنٹے تک وہ گھر مختلف طرح کی آوازوں سے گونجتا رہا۔ کرن نے بغیر کسی جھجک کے ہر سوال کا سیدھا سچا جواب دیا۔

لیکن جب شاہدہ سے صحافیوں کا تعارف کرایا گیا تو اُس نے کہا "میں معافی چاہتی ہوں۔ ہمارے لوگ بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ میں دھیرے دھیرے چلنا چاہتی ہوں۔ آپ اپنی طرف سے جو ٹھیک و صحیح سمجھیں لکھ سکتے ہیں۔ لکھ سکتے ہیں کہ مسلم سماج میں بھی کچھ ایسے نوجوان اور کچھ ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو تبدیلی چاہتے ہیں۔ وہ بھی مادرِوطن کو اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا کہ اُن کے ہندو بھائی۔ مذہب اور سیاست دو الگ چیزیں ہیں، وغیرہ وغیرہ..."

صحافی کھانے کے لیے نہیں رُکے۔ دلت سبھا کے صدر اور سکریٹری کھانا کھا کر ہی گئے۔ اُن کی وجہ سے ہنگامہ تو نہیں ہوا لیکن وجے نے بہت سنجیدگی سے انھیں ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیا۔ کہا "میں بھی نان برہمن ہندو ہوں۔ میرے پتاجی کے ورنا کیولر فائنل کے سرٹیفکیٹ میں یہ لکھا تھا۔ سو میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ ہاں وسودھا ضرور خالص برہمن ہے لیکن خیر، پچاس فی صد کافی ہے پاس ہونے کے لیے اور ان پچاس فی صد میں سے بھی کم سے کم آدھے تو ملیں گے ہی۔ بس ۷۵ فی صد یا خصوصی لیاقت!"

ہنستے ہوئے جب وہ لوگ بھی چلے گئے تب کہیں وہ اپنے آپ میں لوٹے۔ خوب قہقہے لگے۔ ہاں، شاہدہ بیچ بیچ میں کہیں کھو جاتی تھی۔ اُسے وجے کو گھسیٹ کر لانا پڑتا تھا۔ حقیقت کیا تھی۔ وہ بس وبھا جانتی تھی۔ وبھا کے نام اپنے خط میں اُس نے اپنے دل کے درد کو بیان کر دیا تھا۔

...تم نہیں جانتیں وبھا دیدی! مجھے کس طرح ذبح کیا جا رہا ہے۔ طعنہ لفظ تو بہت چھوٹا ہے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی بھابھی نے طعنہ دیا 'ارے بھائی، ایسے کیا گم صم کھڑے ہو، گجرے لاؤ، شہنائی بجواؤ، نیتاجی جلوہ افروز ہو رہے ہیں'،

میں بھی نہیں چوکی بھابھی جان! نادان نہیں ہوں۔ تیار ہو کر آئی ہوں ذبح ہونے کے لیے۔
لے آؤ کٹاری اور کٹورہ بھی لہو بھرنے کے لیے۔
یکبارگی سناٹا سا چھا۔ سب سکتے میں آ گئے۔ میں سب کو آداب بجا، بچوں کو پیار کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عائشہ کے ساتھ بھابھی جی بھی آئیں بولیں 'سچ شاہدہ' میں تو مذاق کر رہی تھی۔ پھر اتی جان اور چچا جان کا خیال تھا۔ میں تو بہت خوش ہوئی تھی!
میں نے بھابھی جان کو گلے سے لگا لیا۔ ویسے میں انھیں خوب اچھی طرح سے جانتی تھی۔ وہ نیتاؤں کی طرح کبھی بھی پالا بدل سکتی ہیں۔ پھر بھی اتنا ہی بہت تھا آگے کی لعنت ملامت سہنے کے لیے۔ سچ مچ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ نہ لکھوں تو ٹھیک ہے۔ ویسے جو نہیں لکھا جاتا وہ پڑھا بڑی آسانی سے جا سکتا ہے۔ اس لیے ہم کیوں بتائیں 'تصور میں کون ہے' آپ پڑھ بھی لیں گی اور محسوس بھی کر لیں گی۔ دل کو دل سے راحت ہوتی ہے۔
میں کہاں سے آ گئی تم لوگوں کے بیچ ؟ تمھاری پریشانیاں کیا کم تھیں کہ میں بھی کو دپڑی دکھ کا سمندر لیے۔ تم لوگوں کے شنکر بھگوان کی طرح زہر کو گلے میں روک نہیں سکی۔
کیسے ہو جاتا ہے یہ سب جسے ہم نہ ہونے دینے کے لیے جی جان سے کوشش کرتے ہیں۔ سچ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ تڑپ جو محسوس کرتی رہی ہوں اس کی خبر تک نہ پہنچے، لیکن تم لوگوں نے اتنا پیار دیا کہ وہ زہر مجھے ٹھگتا ہوا آپ ہی آپ باہر آ گیا۔
اور میں کسی انمول چیز کے کھو جانے کی ڈر سے خاموش ہو گئی۔ ساری دنیا خود غرض ہے۔ سونا تھ کی طرف اسی لیے لپکی تھی، لیکن وہ تو بھابھی جان نے بچا لیا۔ لیکن دیدی اب میں تھوڑی سی مطمئن ہوں۔ اسد مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔ یہاں کرن نے مجھے راہ دکھائی۔ اپنا گھر جلتا چھوڑ کر دوسروں کی آگ بجھانے جانا قربانی ہو سکتی ہے، لیکن دیدی، اپنی ماں کو پیار کر کے ہی ہم دوسروں کی ماں کو پیار کر سکتے ہیں، یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے۔
کبھی کبھی چپ چاپ جب میں تنہائی میں بیٹھی کہیں کھوئی رہتی ہوں — غزل کا مصرع ڈھونڈتی' گنگناتی تو کوئی چپ چاپ میرے پاس آ جاتا ہے 'جن کے لیے تم اتنا گھٹ رہی ہو، وہی ایک دن تمھارے دشمن بنیں گے!

میں کانپ کر کہتی ہوں 'نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ نہیں دیکھتے کہ کیا کر میں رات دن ایک کیے رہتی ہوں۔ کیا اپنے لیے؟ لیکن دیدی، وہ بھی تو میرے اپنے ہی ہیں...!'

'لیکن تو کیا ان کی رہے گی تب تک؟ تیرے ان کے بیچ میں پیسہ آ گیا ہے۔ جب تک پیسہ دے گی تو ان کی رہے گی۔ جیسے ہی الگ ہوئی کہ وہ سب بھی ہوئے دشمن...'

'نہیں۔ نہیں۔ نہیں...' میں چیخی تھی۔

وہ ہنسا تھا 'دیکھ لینا!'

اور دیدی، وہی دیکھا اس رات۔ سارے رشتے جھوٹے پڑ گئے۔ چچا جان پہلے گئے۔ امی جان اب زار زار رونے لگیں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ان کے گلے میں بانہہ ڈال کر کہا 'امی جان' مرحوم والد صاحب مجھے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ اسی پیار کی قسم، میں تمھیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔'

وہ بھی چلی گئیں، لیکن میں نہ جا سکی۔ مجھ سے نیند بھی روٹھ گئی، لیکن صبح ہوتے ہوتے خود کو سنبھال لیا ــــ اسد دھوکہ نہیں دے گا اور یہ رشتہ بھی نامنظور نہیں کریں گے، کسی اور رشتو ناتے کے ڈر سے...

اِسی خط کی وجہ سے وبھا، کرن اور کشور کو وہاں چھوڑ کر شاہدہ اور اسد کو اپنے ساتھ لے گئی۔ تنہائی پاتے ہی بولی "میں تو تیرا خط پڑھتے پڑھتے رو پڑی تھی۔ اب تو سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں دیدی، اوپر سے سب ٹھیک ہے۔ آسمان کی طرح اس میں چمکتے چاند تارے اور سورج ہی ہم دیکھتے ہیں، لیکن اندر کیا ہے...؟"

وبھا بولی "چھوڑ و اب فلسفے کو۔ یہ بتا یہ رشتہ انھیں منظور ہے...؟"

"ہاں، وہ تو منظور ہو گیا، لیکن دیدی، میری زندگی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی۔"

"پگلی، ٹکڑے ہو کر بھی تو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ ایسا کون ہے جو مکمل ہے؟ سب منقسم ہیں۔ تو تو اتنی ہمت والی ہے، ان ٹکڑوں کو ایک کر لے گی۔ دیکھ ہاتھ، پیر، منہ، ناک، کان وغیرہ دس حواس خمسہ سے جسم بنتا ہے۔ وہ الگ بھی ہیں اور ایک بھی۔ تو بس

دل کو حصّوں میں نہ بانٹنا۔ پورے دل سے اسد کو اپنانا اور اسی لگن سے ماں کی دیکھ بھال کرنا اور چھوٹی بہن کی بھی۔ اسد سے چھپائے گی تو تقسیم ہونا پڑے گا اور وہ موت ہو گی — نہ اُسے اپنا بنا سکے گی، نہ اُن سب کی ہو سکے گی۔

"یہی کہنے میں تجھے یہاں لائی تھی۔ ہمارے اندر نہ جانے کتنے 'مَیں' بیٹھے ہیں اُن سب کو پہچان لے گی تو ڈر نہیں رہے گا۔"

چمکتے تاروں کی طرف دیکھتے ہوئے شاہدہ بولی "ہاں دیدی، سمندر اوپر سے پریشان ہے، لیکن اندر کتنا پُرسکون، کتنا خوش حال اور اوپر اِن تاروں کے درمیان سے ہی کتنے تارے ٹوٹتے بکھرتے رہتے ہیں۔"

"اتنا سمجھتی ہے تو کیوں پریشان ہوتی ہے؟ تُو نے ہی تو وہ شعر مجھے سنایا تھا۔

جن حادثوں سے ڈرتے ہیں لوگ

ان حادثوں نے ہمیں پالا ہے"

شاہدہ نے وبھا کے سینے میں اپنا منہ چھپا لیا "تم نے کتنا سہا اور کتنا سہہ رہی ہو۔"

"درد سہا ہی جاتا ہے، کہا نہیں جاتا تبھی تو وہ طاقت بنتا ہے۔"

شاہدہ یکبارگی بول اٹھی "اور تبھی غزل بھی بنتی ہے۔"

اور اگلے دن آکاش وانی کے مشاعرے میں واقعی شاہدہ انجم کی غزل سے انوکھا سماں بندھ گیا۔

اُس رات اسد نے تنہائی ڈھونڈ ہی لی اور اپنے تپتے ہونٹ شاہدہ کے ہونٹوں پر رکھ اُسے اپنی باہوں میں دبوچ لیا۔

کئی لمحے کے لیے تو شاہدہ بھی اس دنیا کو بھول گئی — بس، وہ تھی اور اسد پرویز تھا، ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا، بولی "بھول گئے سبھی قسمیں وعدے۔"

"تم ہو ہی ایسی، شتوا بھی تو..."

شاہدہ تڑپ اٹھی "خبردار، جو کبھی یہ نام لیا تو۔ یہ بخبری مَیں بھی کر سکتی ہوں، اور سن لو، مَیں تمھیں چاہتی ہوں۔ دل و جان سے چاہتی ہوں اور تم سے بھی تمھیں ہی مانگتی ہوں، تمھاری مہربانی نہیں..."

تبھی ودبھا نے پکارا "شاہدہ، کہاں ہو تم؟ کافی تیار ہے۔ اسد کو بھی بلالو۔ مجھے تو صبح ہی جانا ہے۔
شاہدہ بھاگتی ہوئی پہنچ گئی۔ اسد دو منٹ بعد آئے۔
بہت صبح ورتکا نے فون کیا "ودبھا، ہیں نے طے کیا ہے کہ ہم سب پرسوں ایک ساتھ دہلی چلیں گے۔ میں نے چھٹی لے لی ہے۔"
"تب تو بہت اچھے رہے گا، لیکن ہاں، مجھے تو کل صبح ہی جانا ہے، ایک ضروری اسائنمنٹ ہے۔ شاہدہ اور اسد کو چھوڑتی ہوئی نکل جاؤں گی۔ ذرا شاہدہ کو پیار سے تھپ تھپا دینا، بہت سہ رہی ہے بے چاری۔"
سبھی کے اپنے اپنے درد تھے۔ انھیں کی جاذبیت سے وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچے تھے...

اُن سب کے جانے کے بعد سمیتا کے پاس شیاملا رہ گئی تھی۔ اُسے آئے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ اس کی ماں کا خط بھی آیا تھا۔ اس نے بھی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بار بار کہتی "دیدی، اب جانے دو، آخر نوکری کے لیے جو کوششیں چل رہی ہیں ان کے لیے مجھے تو وہاں ہونا چاہیے۔"
"ٹھیک ہے،" سمیتا بولی "تو بھی جا، اجیت سے کہوں گی یا میں خود ریزرویشن کرادوں گی۔"
اتفاق سے تیسرے دن کا ہی ریزرویشن مل گیا۔ اب اُس کی یہ حالت کہ ایک دم سے خاموشی اختیار کر لی۔ تنہائی ملتی تو باندھ ٹوٹ پڑتا۔ سمیتا سے تو کچھ چھپ نہیں سکتا تھا۔ بولی
"ارادہ بدل گیا ہو تو ریزرویشن کینسل کروا دوں؟"
"نہیں، نہیں بھابھی" روتی ہوئی شیاملا بولی "مجھے اب جانا ہی ہوگا۔ نہیں جاؤں گی تو وہ یہاں بار بار آکر تمھیں بھی تنگ کرے گا۔ کب تک کروں گی تمھاری اس پاک محبت کا غلط استعمال؟ لیکن میری بھابھی، یقین کرو، آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اب میں پیسے دے کر پیار نہیں خریدوں گی۔ وہ مارے گا تو پولس میں جاؤں گی۔ بار بار مرنے سے ایک بار کا مرنا اچھا ہے۔"
سمیتا ہنس پڑی "یہ ہوئی نہ کچھ بات شیاملا جیسی۔ اچھا رو مت۔ مجھ پر یقین کرنا، جھجکنا نہیں۔ اب آنسو پونچھ لے، نہیں تو میں رو پڑوں گی۔"

شیاملا ہنس پڑی "جس دن تمھارے آنسو ٹپکیں گے، قیامت آجائے گی۔"

"پگلی" سمیتا بھی ہنس پڑی۔

اُسی شام کیشون کا تار ملا "ہم کیس جیت گئے۔ کسی بھی وقت اسکول سے خط آ سکتا ہے۔ فوراً آجاؤ۔"

تار پڑھتے ہی شیاملا دوڑی ہوئی مندر گئی اور کرشن کی مورتی کے آگے سرنگوں ہوگئی۔ جیب میں تین چار روپے پڑے تھے، سبھی اُن کے چرنوں میں ڈال دیے۔ گھر لوٹی۔ عجیب حالت تھی، کبھی سُکمارن کو گود میں اُچھال کر ہنس پڑتی۔ کبھی رونے لگتی۔ بھابھی سے بولی

"مجھے کچھ روپے دو، سب کے لیے مٹھائی لاتی ہوں۔"

سمیتا ہنس پڑی، بولی "تُو تو پاگل ہوگئی ہے۔ دیکھ تجھے پرسوں جانا ہی ہے۔ تُو اپنی تیاری کر۔ میں سارا انتظام کردوں گی۔ مان گئی تیرا کرشن بھی عجیب ہے۔ تیرا ریزرویشن پہلے ہی کرادیا۔"

"بھابھی، تم نہیں مانتی، کرشن بھگوان کو؟"

"اری، گیتا میں وراٹ روپ انھوں نے ارجن کو دکھایا تھا، میرے تو اندر کرشن ہیں۔ میں تو ڈر جاتی ہوں ارجن کی طرح۔ تب وہ میرے اجیت کی شکل لے کر مجھے بے خوف کردیتے ہیں۔"

شیاملا کے منہ سے ایک لمبی سانس نکل گئی "کاش، وہ کرشن مجھے بھی ملا ہوتا۔" لیکن جواب دینے کے لیے سمیتا وہاں کہاں تھی؟ وہ کار لے کر بازار کی طرف نکل گئی تھی۔

شیاملا آنکھوں میں آنسو، ہونٹوں پر مُسکان لیے مہندر جی کے پاس پہنچی۔ انھوں نے نگاہ اٹھائی تو اُن کے ہاتھوں میں تار تھما دیا اور پاس ہی بیٹھ گئی۔

انھوں نے تار پڑھا۔ اُسے پاس کھینچ کر ماتھا چوم لیا بولے "آخر تو جیت ہی گئی۔"

"ہاں پتا جی، میں جیت گئی، لیکن میرا دل اب بھی دھڑکتا ہے، پاؤں ڈگمگاتے ہیں۔ کیشون سکون سے جینے بھی دے گا؟ پندرہ سو ملیں گے۔ تین سو سے پانچ سو کے بیچ مکان کا دینا ہوگا۔ ڈپازٹ الگ۔ اسکول میں فنڈ وغیرہ بھی کٹے گا۔ کیا بچے گا کھانے پینے اور پہننے کے لیے؟ کرشن کیشون کو بھی عقل دے دیں تو..."

"دے گا، اُسے بھی عقل دے گا۔ تو ڈر مت۔"

"آپ سچے لوگ ہیں۔ آپ پرارتھنا کیجیے۔ سچ پتاجی۔ بھابھی میرے لیے چپ چاپ پرارتھنا کرتی رہی ہیں۔ نہیں تو میں پاپن ..."

مہندر جی ایک دم سے بول پڑے۔ "یہ خود اذیت کیوں؟ اب ماضی کو بھول جا۔ اُس کا ترجمہ مت کر۔ حال کو پکڑ۔ ادیب ہوکر ہمت ہارتی ہے؟ تیرے اندر کی حقارت تجھے حقیر بناتی ہے۔ تبھی تو قدم لڑکھڑاتے ہیں..."

"پتاجی، سچ مچ میرے اندر حقارت ہے، وہی مجھے پاگل کر دیتی ہے۔ میری حالت میں کسی کو بھی حقیر کر سکتی ہے۔ ان سارے سالوں میں مجھے کوئی پیار بھری تھپکی یا تسلی نہیں ملی۔ مجھے جو کچھ بھی اِن دنوں یہاں سے ملا، اس لیے اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب میں ماضی کے یقین کو حال میں حائل نہیں ہونے دوں گی۔ آشیرواد دیجیے۔"

مہندر جی نے اُس کے جھکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا "خوف کو دل سے نکال دے۔ کب جا رہی ہے؟"

"پرسوں۔"

"ٹھیک ہے، یہاں اتنے دن جو کچھ دیکھا، اسے دل میں رکھنا۔ بیٹی دُکھ سہنے کی چیز ہے، آنسوؤں میں ڈھالنے کی نہیں۔"

اور سمیتا کے آنے تک وہ دونوں باتیں ہی کرتے رہے۔ تبھی وہ اُٹھی جب ہارن بجا۔ اجیت بھیا بھی ساتھ آئے تھے۔ ہنستے ہوئے "لے تیرے رس گلے۔ سب سے پہلے مجھے کھلا، پھر..."

"نہیں، پہلے بھابھی کو، پھر کسی اور کو۔"

ہمیشہ کی طرح رخصت ہونے کا وقت بھی المناک تھا لیکن شیلا خوش بھی تھی۔ آخر نوکری تو مل گئی ہی آسے۔ ہمیشہ کی طرح بھابھی نے بہت کچھ ساتھ میں باندھ دیا تھا۔ نکمارن ضرور کچھ اُداس اُداس سا تھا۔ اس کے بچہ ذہن پر اس جانے سے کچھ اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ ممّی نے پاپا سے ملنے کی بات کہی تو وہ کھِل کھِلایا۔ لیکن پھر اُداس ہو گیا۔ اپنی ممّی سے بولا "انکت بھیا کہاں ہیں؟"

سمیتا بولی "بیٹے ! وہ بُوا کے پاس بمبئی گیا ہے۔ تمھارے پاس وہیں آئے گا"
سکمارن کا بچپن کِھل کِھلا پڑا ۔ اور گاڑی نے رفتہ رفتہ کِھسکنا شروع کر دیا۔
کچھ ہی لمحوں میں شیاملا سے سب کچھ چھوٹتا چلا گیا، بس یادیں رہ گئیں ۔ یادیں جو درد پیدا کرتی ہیں۔ یادیں جو اندھیرے کو اُجالوں سے بھی بھرتی ہیں ۔
کافی دیر تک ماں بیٹے نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے رہے، تب تک جب تک کنڈکٹر نے ٹکٹ نہیں مانگا۔
ادھر اجیت اور سمیتا جب گھر لوٹے تو دبھا ان کی راہ دیکھ رہی تھی۔
سمیتا مسکرائی "اکیلی آئی ہے ؟"
" ہاں بھابھی ! اکیلا آدمی سب سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ وہ سب بھی آ رہے ہیں کل صبح ۔ میں پرسوں لوٹ جاؤں گی ایک بہت ضروری اسائنمنٹ ہے ۔ پارلیمنٹ چل رہی ہے نا. دیکھنا کتنے دن چلتی ہے ۔ ان دو دنوں میں کئی اہم فیصلے لینے والے ہیں یہ بڑے بڑے لوگ"
سمیتا کی ہنسی پھوٹ گئی ۔ "تو بھی رنگ گئی ان بہروپیوں کے رنگ میں"
" بھید لینے کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے ۔ اچھا چائے بناتی ہوں اور بھیا مجھے کرشی بھون کے پاس پریس کلب چھوڑ دینا"
" بیٹھ بیٹھ، پتاجی سے بات کر ۔ چائے میں وہیں لاتی ہوں"
سمیتا واقعی خوش تھی ۔ گھر میں پھر رونق آ گئی ۔ کتنا کاٹتا ہے یہ سونا پن ۔ یہ مشینی زندگی ... کالج میں کچھ پڑھائی ، کچھ قہقہے ، ان سے بھی زیادہ مختلف طرح کی افواہیں سیاست کی یا اور عورت مردوں کے ۔ انگلی ہمیشہ دوسروں کی طرف اُٹھتی رہتی ہے ۔ اپنے باطن میں جھانکنے کا نہ کسی کا مزاج تھا، نہ اتنی طاقت ۔ ایک انجانے خوف نے اُسے نایاب بنا دیا تھا۔
چائے و ناشتہ تیار ہونے تک یہی خیال اُسے پریشان کرتے رہے ۔ دبھا نے پکارا "بھابھی! چائے بنا رہی ہو یا مال پوے ؟"
" خوب یاد دلایا، کل شام کی چائے پر مال پوے ہی بنیں گے، تب تک سبھی آ چکے ہوں گے"
دبھا بولی "میرا بھروسہ نہیں" لمحے بھر کے لیے رُکی "ٹھیک ہے ، بناؤ مال پوے ۔ میں تو

پرسوں صبح کی بلین سے جارہی ہوں"۔
وبھا چائے پی کر گئی تو اگلے دن شام کو ہی لوٹی۔ رات میں فون آگیا "بھابھی، کام بہت تھا۔ اخبار کے مقامی نامہ نگار کے گھر سے بول رہی ہوں۔ پتاجی وبھیّا اُن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اُن کی بیوی، کبھی جب وہ پڑھتی تھیں تو ہماری ماں سے ملی تھیں پتاجی کے ساتھ۔ بہت تعریف کر رہی تھیں۔ مجھے تو رُلا دیا۔ پتاجی سے کچھ نہ کہنا۔ وہ بولتے نہیں لیکن محسوس بہت کرتے ہیں۔ اچھا بھابھی، رات کو نہیں آسکوں گی۔ صبح اُس ہنگامے میں ضرور حصہ لوں گی۔ وہ بھی تو لمحے ہوتے ہیں جب ہم خود کو خود سے آزاد کیے رہتے ہیں، اَن چاہے، انجانے"۔
فون رکھنے سے پہلے سیمتا نے اتنا ہی کہا "تُو نے اُن لمحوں کو بھی باندھ لیا"۔
وبھا جواب دینے سے بچ گئی۔

شکر ہے گاڑی وقت سے آگئی تھی۔ سات بجے تک وہ سب گھر آگئے اور ایک بار پھر وہ گھر قہقہوں اور چہل پہل سے گونج اُٹھا۔ آہیں تو رات کو سنّاٹے میں دیواروں سے سر پھوڑتی رہتی ہیں اور صبح سب کچھ کھلے چمن میں بدل جاتا ہے۔
وبھا ان کے آنے سے پہلے ہی آگئی۔ جب تک وہ گھر پہنچے، چائے بن چکی تھی۔ پکوڑے تلنے کی تیاری تھی۔ سیمتا اندر آکر بولی "اتنی بھی کیا جلدی تھی؟"
وبھا نے جواب دیا "بھابھی، دجے د وسودھا بھی آرہے ہیں صبح کی بلین سے اور انھیں تین گھنٹے بعد کلکتے جانا ہے۔ وسودھا کا پتہ نہیں۔ شاید ساتھ جائے گی یا یہیں اپنی بہن کے پاس رہے گی دو دن"
تب تک کرن بھی آگئی تھی اور شاہدہ بھی۔ عجیب گہما گہمی ــــ کوئی باتھ روم بھاگتا، کوئی کچن میں۔ بے چارہ انکت، سکمارن کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا، کہیں نہیں دکھائی دیا تو باباجی کے پاس پہنچا "باباجی، ہم بمبئی میں خوب گھومے، سمندر دیکھا۔ باپ رے، کتنا پانی ہے۔ میں کنارے پر کھڑا تھا کہ ایک بڑی سی نیلی سفید لہر بھاگتی ہوئی آئی اور مجھے بھگو کر سمندر میں جا چھپی۔

"لیکن با باجی، شیلا بُوا کہاں ہیں؟ کہاں ہے سکمارن؟"

"بیٹے، وہ اپنے گھر گئے۔ تار آیا تھا تمہاری بوا کا اسکول کھل گیا۔"

"وہ اسکول میں پڑھاتی ہیں؟"

"ہاں بیٹے، وہ ہندی پڑھاتی ہیں۔"

چائے کی میز پر سبھی چہک رہے تھے۔ کرن، کشور، ورنیکا، اسد جہاں آپس میں کھلے جذبے سے ایک دوسرے سے برتاؤ کر رہے تھے، شاہدہ کبھی کبھی جانے انجانے اندر کے درد کو روکنے کی کوشش میں بھدّگی کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ اندر کا جمع غصّہ چھت پر جمے بارش کے گندے پانی کی طرح پرنالے کی راہ ہی نیچے آتا ہے۔ نہ جانے کیا کیا بہا لاتا ہے ساتھ میں۔

سب سے پہلے کشور اور اسد گئے۔ شاہدہ جان بوجھ کر کچھ دیر سے گھر پہنچی۔ وبھا اس کے ساتھ تھی۔ وہیں سے اُسے 'جیوتی' کے دفتر جانا تھا۔ وہ جامع مسجد کے آس پاس تھا۔ اُسے گھر چھوڑ کر اور اس کی امّی سے دو چار منٹ باتیں کر کے چلی گئی اور پھر مال پوے کے وقت ہی پہنچ سکی۔ جاتے ہوئے شاہدہ سے کہہ گئی "ارے شاہدہ آج بھابھی نے مال پوے بنائے ہیں، ضرور آنا۔ اس کے بعد میں پلین سے بمبئی لوٹ جاؤں گی۔ آٹھ بجے جانا ہے۔ دس بجے تک پہنچ جاؤں گی۔"

اور یہی ہوا، لیکن شاہدہ نہیں آئی۔ اس کے منہ سے نکل گیا "بے چاری" اور اُسے یاد آیا، جب وہ اُسے چھوڑنے گئی تھی تو اُس تنگ گلی کے نہ جانے کتنے دروازے کھلے اور بند ہوئے تھے۔ اوپر کی کھڑکیاں تو جب تک وہ لوٹ نہ گئی۔ بند ہی نہ ہوئی۔ مال پوے کھانے کے لیے نہ شاہدہ آئی نہ کشور۔ بس ورنیکا تھی، وبھا تھی، سمیتا تھی، اجیت تھے۔ انکت ایک مال پوا مسل مسل کر وردان کو کھلا رہا تھا۔ ہاں اچانک گایتری کے آجانے سے ماحول کچھ خوشگوار ہو گیا۔ یوں باتیں وہ مسلسل کھل کر کر رہے تھے۔ لیکن سب کے اندر اپنے اپنے ریزرویشنز تھے۔ وبھا سوچ رہی تھی کہ وہ بھی آج کلکتہ جا رہا ہے، رات کی فلائٹ سے۔

"اور وسودھا؟"

"وہ تو دو دن میں جائے گی۔"

اُس نے سوچا تھا اور اب بھی سوچ رہی تھی کہ ہوائی اڈّے پر اس سے ملاقات ہو سکتی ہے اور واقعی ہو گئی۔ اُسے چھوڑنے اجیت، سمیتا اور ورتِکا تینوں آئے تھے۔ انھوں نے دیکھا۔ وجے اور وسودھا بھی لاؤنج میں موجود ہیں "یہ کہاں جا رہے ہیں؟" اجیت نے پوچھا۔

"وجے تو کلکتہ جائیں گے۔ آفس میں فون پر بتایا تھا۔ وسودھا شاید چھوڑنے آئی ہے" سب کی باہر ہی ملاقات ہوئی۔ اندر تو کوئی جا نہیں سکتا تھا۔ وہ وہیں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ لوٹنے لگے تو ورتِکا نے پوچھا "وسودھا تم کیسے جاؤ گی؟"

"ٹیکسی لے لوں گی۔"

"ٹیکسی کیوں؟ ہمارے ساتھ چلو نہ، آپ کو گھر چھوڑتے نکل جائیں گے۔"

وجے نے فوراً کہا "میں تو یہی کہنے والا تھا۔ اپنی ہی کار ہے۔"

آواز لگنے لگی تھی۔ پکارے اور وبھا اندر چلے گئے۔ معنی کو بے معنی کرتی وسودھا کی چبھتی نگاہیں ان کے پیچھے تھیں۔ یہ سمیتا نے دیکھ لیا تھا، لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔ اُسے تلک نگر چھوڑ کر لوٹتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ اسٹینڈرڈ میں کافی پینے کی حسرت کو نہ روک سکے "آٹھ ہی تو بجے ہیں۔ وبھا کا پلین ٹھیک آٹھ بجے اُڑے گا۔ اب اُڑنے والا ہو گا۔"

"اور وجے کا؟"

"اس کا جہاز سات بجے کے لگ بھگ جاتا ہے۔ وہ چلا گیا ہو گا" وسودھا ہنس کر کہہ رہی تھی۔ "وہ تو اُڑ گئے۔ تب سات ہی تو بجے تھے۔"

آرڈر دینے کے بعد سمیتا نے کہا "اجیت تم نے دیکھا، جب وہ دونوں اندر جا رہے تھے تو وسودھا کیسی چبھتی نگاہ سے انھیں دیکھ رہی تھی۔"

"کوئی فکر نہیں۔ وبھا خود کو جانتی ہے۔ تبھی تو اتنی اپنائیت سے صاف کہہ دیا تھا — میں دوسرا طلاق نہیں دینا چاہتی۔" اجیت نے کہا۔

"میں بھی جانتی ہوں، لیکن وسودھا کے باطن میں عیّار حسینہ نے جنم لے لیا ہے۔"

"عیّار حسینہ! یہ کون سی بیماری ہے؟" اجیت نے کچھ ایسے موڈ میں کہا کہ وہ تینوں ہنس

پڑے، لیکن اِس ہنسی میں ہمیشہ کی طرح بیباکی نہیں تھی۔ اُن کے باطن میں کہیں کوئی پھانس لگ گئی تھی۔ ورتیکا نے کہا "عبّار حسینہ کوئی بھی ہو بھابھی، لیکن تمھارے اردھ نار یشور نے روپ لے لیا ہے۔ تمھاری شاگردہ شاہدہ اور کرن نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔"

"میرے الفاظ میں خود کو خود سے آزاد کر لیا ہے۔" اجیت نے دھیرے سے کہا۔

سمیتا سنجیدہ آواز میں بولی "جی جی، شاہدہ تو تمھاری ہی شاگردہ رہی ہے۔"

"کیسی رہی ہے، تم جانتی ہو، لیکن درد نے اسے مانجھ دیا ہے۔ تم نہیں ہوتی تو شاید وہ ٹوٹ جاتی۔ اب تو وہ فولادی چٹان بن گئی ہے اور کرن۔"

سمیتا بیچ میں ہی بول اٹھی "وہ بھی تمھاری ہی دین ہے۔"

"دین تو میری بہت ہے، لیکن کندن تو تمھیں نے بنایا۔"

اجیت آج کچھ عجیب ہی موڈ میں بول اٹھا "اچھا دیکھو، وہ دونوں تم دونوں کی دین ہیں لیکن سارا ساز و سامان تو میں نے جٹایا ہے اور وہ بن گئیں وہ جس کی آج ملک کو ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ ذات بڑھتی رہے۔ جہاں خاندانی منصوبہ بندی نہیں بلکہ خاندان کی توسیع کا قانون بنایا جانا چاہیے۔ میری تجویز قبول ہے تم دونوں کو؟"

"قبول ہے۔" دونوں ایک ساتھ ہنس پڑیں۔ اجیت تو پہلے ہی ہنس رہا تھا۔ بیرا تب تک سامان لے آیا تھا۔ کھاتے ہوتے بھی وہ موضوع کچھ بھی ہو لیکن کرن، شاہدہ اور وبھا پر ہی پہنچ جاتے تھے۔ تبھی اجیت اور سمیتا نے دیکھا کہ ورتیکا چپ چاپ دیر سے پیالے میں چمچے سے چینی ملائے ہی جا رہی تھی، ملائے ہی جا رہی تھی...

دونوں کی نگاہیں ملیں اور جھک گئیں۔

معمول کے مطابق بنے رہنے کے لیے گہری خاموشی چاہیے۔

سارے مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر وجے اور وبھا کو ایک ہی لاؤنج میں آنا تھا۔ وجے پہلے آچکا تھا۔ وبھا کو دیکھ کر اُسے اپنے پاس ہی بلا لیا۔ وہ جان بوجھ کر تنہائی میں بیٹھا تھا۔ اُس کا پلین آنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ وہ اپنے مزاج کے برعکس کچھ زیادہ ہی سنجیدہ

تھا۔ اُس نے دھیرے دھیرے وبھا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا" وبھا مجھے تمھیں ایک تنبیہہ کرنی ہے۔"

"کیا؟"

"وسودھا کو شک ہو گیا ہے کہ ہم اب بھی پہلے کی طرح ملتے ہیں۔"

کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ وبھا نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بس تلخی سے مُسکرا دی۔ وجے بجھ گیا۔ اس نے پہلے جیسے ہی کہا" دل کا کمپیوٹر بڑا عجیب ہے، ایک بار اگر عیار حسینہ جنم لے لیتی ہے تو مٹائے نہیں مٹتی۔"

اُن کچھ ہی لمحوں میں وبھا کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور مٹ گئے۔ اس نے وجے کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ پھر اُسے مطمئن کرتی ہوئی بولی" تم فکر مت کرو، میں ایسا جال بنوں گی کہ وہ عیار حسینہ مجھ تک پہنچ ہی نہ سکے۔ پہنچے تو بس وسودھا پگارے، شریمتی وسودھا پگارے۔ میرے سامنے جو رشن ہے وہ کرشن کے عظیم روپ کی طرح ہے۔ اُس میں عیار حسینہ کے لیے بھی جگہ ہے۔ کون سا مرد یا عورت ہے جو کہہ سکے کہ وہ اُس سے آزاد ہے؟ خود سے خود کے آزاد ہونے کا یہی مطلب ہے کہ وہ رہے لیکن اپنی جگہ پر۔۔۔"

وہ پھر رُکی، ایک لمحے کے بعد بولی" میرے سامنے عیار حسینہ نہیں، کرن اور شاہدہ ہیں۔ مجھے انھیں کی ذات بڑھانی ہے۔ اُس عمل میں میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہوگا کہ میں کسی عیار حسینہ کے سامنے پڑوں؟ یہ تو میرے اندر رہی ہے، جیسے تم ہو میرے دوست۔ تم دوست ہو، دوست ہی رہو گے۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہوگی اور میں جانتی ہوں وہ ہمیشہ ملے گی۔ ہاں، اگر کبھی۔۔۔"

وجے یکبار گی اُٹھا، اس نے وبھا کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وبھا نے کسی مہارانی کی طرح دھیرے سے اُسے چوم لیا۔ اُسے خوشی تھی اُس کا پرانا دوست وجے لوٹ آیا تھا۔ وہ شفق کی روشنی کی طرح ایک اُجالے سے بھر گئی۔

وجے کے جہاز کے مسافروں کے لیے اعلان ہو رہا تھا۔ اُس نے کھلے دل سے کہا "میں تمھارے ساتھ تھا اور ساتھ ہی رہوں گا۔ مجھے بھی عیار حسیناؤں سے نپٹنا آتا

ہے۔ وہ مجھے اب اور بھی زیادہ محبت کرتی ہے۔ اچھا تمھارا سفر مبارک ہو... ہاں مجھے یاد ضرور کر لینا۔"

اور پھر اُس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ وبھا کی آنکھوں میں اُمنڈتے سیلاب کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ نم آنکھوں سے وبھا مسکرائی، بولی "ہمیشہ کی طرح یو آر انکورِجیبل وجے... سو لونگ۔"

اور جب تک اس کا جہاز اڑ نہ گیا وہیں کھڑی نم نگاہوں سے دیکھتی رہی کہ شاید...

لیکن وجے نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

وبھا کے پاس ابھی پندرہ منٹ باقی تھے، لیکن اس کے باطن میں مسلسل گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ منظر ایک دم بدل گیا ـــ بے پناہ پھیلاؤ ہے اُس کے سامنے۔ نیلے آسمان جیسا روشن، بے چین سمندر جیسا خوشحال، اُفق جیسا پُر اسرار، جہاں زمین و آسمان ملتے ہوئے دکھتے ہیں۔ لا متناہی آکاش گنگائیں، سب کے ساتھ ہماری خوبصورت زمین جیسی خوبصورت دنیا ہے۔ وہ جیسے اگلے ہی لمحے سب سے خوبصورت دکھنے والی دنیا میں پہنچ گئی، لیکن یہاں تو چوکیدار ہے۔ وہ کہتا ہے، تم ہماری دنیا میں داخل نہیں ہو سکتیں۔'

حیرت زدہ اس نے پوچھا ـــ 'کیوں؟'

'کیونکہ تم نامکمل ہو۔'

'میں نامکمل؟' وبھا نے خود اپنے آپ کو دیکھا، پوچھا 'کیا نامکمل ہے مجھ میں؟ کون ہوتا ہے مکمل؟'

جواب میں چوکیدار نے ایک طرف اشارہ کیا 'دیکھو، وہ ہے مکمل انسان۔'

وبھا نے دیکھا، خوشی سے چیخ اُٹھی ـــ "ارے، یہ تو ہمارے ہی بھگوان اردھ ناریشور ہیں۔"

چوکیدار ہنسا 'تم لوگ ہر کسی کو بھگوان بنا دیتے ہو اور وہ ہونے سے بچ جاتے ہو جو در اصل وہ ہے۔'

گھنٹیاں پھر بج رہی تھیں۔ وہ چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اعلان ہو رہا تھا ـــ "بمبئی جانے والا جہاز تیار ہے۔ مسافروں سے گذارش ہے کہ وہ جلد سے جلد وہاں پہنچ جائیں۔"

جہاز میں بیٹھتے ہی وہ پھر من کے وسیع آکاش میں کھو گئی ـــ یہ کون سی وبھا تھی جو میرے

باطن کی آواز بن گئی تھی :

وہیں سے جواب بھی ملا۔ وہی تو اصل وبھا تھی۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ہم خود نہیں جانتے ہیں۔ کچھ کچھ جانتے بھی ہیں تو کسی سے کہہ نہیں سکتے۔ ان کا بوجھ صلیب کی طرح ہمیں خود اپنے کندھوں پر ڈھونا پڑتا ہے۔ لیکن فکر نہ کرو۔ تمھاری تلاش جاری ہے، اردھ ناریشور کی طرح۔ تمھیں مکمل کرنے والا ملے گا۔ خود کو خود سے آزاد کر لو۔

اب وبھا ہر حملے کے لیے تیار تھی۔ راہ لمبی ہے اور اُسے راہ ہی چاہیے، منزل نہیں۔ اس کا کہیں کوئی وجود نہیں ہوگا تو وہ خود چل کر اُس کے پاس آئے گی۔ اس کا مقصد تو یہی ہے ؎

'میری زندگی اک مسلسل سفر ہے
جو منزل پہ پہنچا تو منزل بڑھادی!

ٹھیک اُسی وقت دہلی میں اس کے بھائی بھابھی اور دیدی گھر لوٹ رہے تھے اب اسٹرنگ وہیل سمیتا کے ہاتھ میں تھی۔ ورتکا جی کے پاس بیٹھی تھی۔ پیچھے وردن اجیت کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ مین روڈ سے کچھ اندر آکر ایک اور چھوٹی سڑک تھی۔ اس کے بعد بڑی لین میں کچھ دور جاکر داہنے طرف کی چھوٹی لین میں اُن کا گھر تھا۔

تبھی ایک حادثہ ہو گیا۔ چھوٹی سڑک پار کرنے سے قبل جب سمیتا نے دائیں طرف دیکھا تو پاس ہی ایک لیمپ پوسٹ کے پاس سے ایک ادھیڑ سا آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ چونک پڑی ـــــ پیٹھ پر میلا سا تھیلا۔ لڑکھڑاتی چال، بار بار رکتا ہے جیسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ جیسے ہی لیمپ پوسٹ کے نیچے آکر آگے بڑھا تو چہرے پر روشنی پڑی۔ اُس کا ہاتھ تھر تھرا گیا۔ جھٹکا لگا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور تیزی سے سڑک پار کر گئی، بولی "تم نے دیکھا اُسے دیدی؟"

"کسے ؟"

"اُس آدمی کو جو ہماری دائیں طرف سے آرہا ہے، کون ہے، وہ دیکھو تو ذرا پیچھے!"

حیران، متحیر ورتکا نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا "وہ... وہ... وہ تو نارائن ہے!"

وِرنِکا کی چیخ نکل گئی ــــ "نہیں... نہیں..." اجیت کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ جب تک وہ سنبھلے سمیتا نے تیزی سے گاڑی اپنی لین میں گھمائی اور گھر کے آگے کھڑی کردی۔ نیچے اتر کر سمیتا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "دیدی! وہ سچ مچ نارائن بھیا ہیں۔ جاؤ ذرا انھیں سنبھال کرلے آؤ۔ وہ واقعی اپنے نارائن ہی ہیں۔"

وِرنِکا جیسے سحر زدہ تھی، بولی ــــ "میں نہیں پہچانتی اس بے بس شخص کو تمھیں وہم ہوا ہے۔" اور وہ اندر آنے کے لیے آگے بڑھی۔ اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا تبھی سمیتا نے بڑے پیار سے اُن کا ہاتھ تھام لیا اور اس طرف موڑ دیا جدھر سے وہ آئے تھے۔ بولی ــــ

"راستہ ادھر ہے دیدی، اس وقت اُسے تمھاری سب سے زیادہ ضرورت ہے۔"

وِرنِکا نے اب اپنی گردن کو جھٹکا دیا۔ حواس لوٹ آئے تھے۔ پھر بھی کئی لمحے تک وہ شادی سے قبل کی سمٹی سمٹائی اجنبی لڑکی کی طرح کھڑی رہی۔ باطن میں بہت تیزی سے گھنٹیاں سی بج رہی تھیں ــــ نہیں، نہیں، نہیں ــــ تبھی یکبارگی وہ بڑے اعتماد سے آگے بڑھی اور لڑکھڑاتے نارائن کو اپنے ہاتھوں کے گھیرے میں سنبھال لیا۔ اُپلوں کی آگ جیسا اس کا جسم تپ رہا تھا۔ وہ تپش اور گھٹن اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ نارائن کی غیر موجودگی اس کی موجودگی سے کہیں زیادہ خوفناک تھی۔

حیرت زدہ اس نے اپنے آپ سے کہا "میں واقعی جانتی تھی، نارائن! پھر تم آؤ گے اور تم آگئے۔ میں یہی چاہتی تھی..." اُسی لمحے وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی..." میں چاہتی تھی، میں... نہیں، نہیں۔" اُس کی آواز... لیکن آواز تھی کہاں وہ تو اندر کا کمپیوٹر تھا۔ پھر بھی اُسے لگ رہا تھا کہ وہ نارائن کو باہوں میں باندھ کر چوم لے کہ تبھی نارائن نے مڑ کر وِرنِکا کی طرف دیکھا۔ کچھ بولا نہیں، لگا جیسے پورا وجود پگھل گیا ہے۔

اُس کا بھیانک چہرہ بے پناہ آسودگی سے منور ہو اُٹھا جیسے اودی گھٹائیں بنجر دھرتی پر جھک گئی ہوں۔

وِرنِکا کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس کے باطن میں جیسے محبت کا جذبہ اُمڈ آیا۔ پوری شدت کے ساتھ۔

سمیتا نے سب کچھ دیکھا اور وہیں کھڑے کھڑے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا "بے چارہ مرد۔"